TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224379

UNIVERSAL
LIBRARY

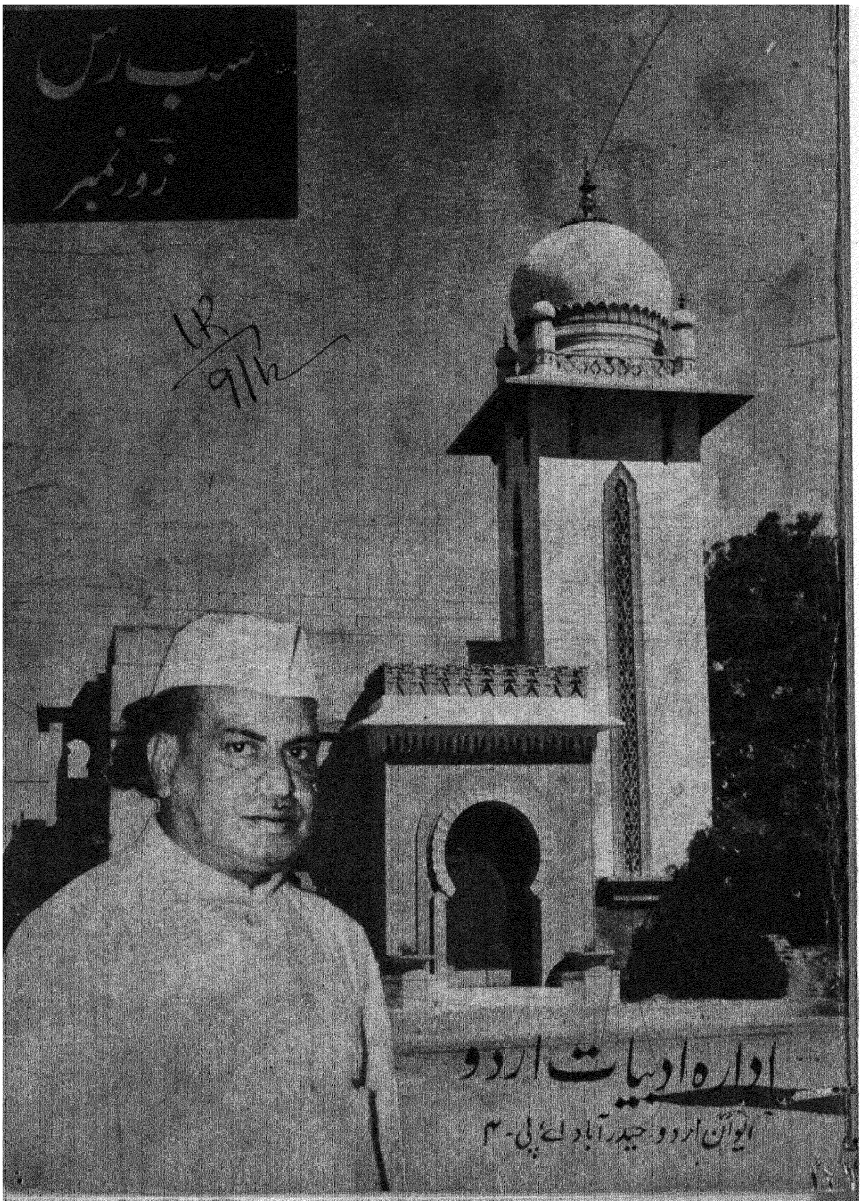
Osmania University

Call No. 8 91543.05 Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.


نشاب رحمن
زور نمبر
ادارہ ادبیات اردو
ایوانِ اردو، حیدر آباد ۴ پی۔ ۴

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء
جلد ۲۶ شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

فون نمبر ۳۵۲۰۹
اکتوبر، نومبر و دسمبر
۱۰ ۱۱ ۱۲

سب رس

زورؔ نمبر

نگران

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ نصیرالدین ہاشمی۔ رمن راج سکسینہ۔ منظور احمد۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبرالدین صدیقی

زرسالانہ ہندوپاک سے چھ روپے
ششماہی تین روپے
غیر ممالک سے دس روپے
زورؔ نمبر کی قیمت چھ روپے

محمد جمال الدین مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیرت آباد۔ حیدرآباد دکن ۲ سے شایع ہوا۔

ترتیب

حصّہ اوّل

(۱)

شخصیت

۱	زورصاحب!	نواب مہدی نواز جنگ	۹	۱۷	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	احمد جمال پاشا	۹۴
۲	ایسا کہاں سے لاؤں!	حیرت بدایونی	۱۰	۱۸	ڈاکٹر زور صاحب	یوسف ناظم	۹۵
۳	خدا رحمت کند!	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۱	۱۹	ڈاکٹر زور مرحوم چند تاثرات	پروفیسر سید احتشام حسین	۹۸
۴	زور ایک دلچسپ انسان اور مخلص عالم	ڈاکٹر محمد باقر	۱۴	۲۰	اردو کا قدیم دکنی ادیب	محمد خاں	۱۰۲
۵	ایک تاثر	خواجہ حسن ثانی نظامی	۱۷	۲۱	ڈاکٹر زور کی شخصیت	سید محمد اکبر قاقانی	۱۰۸
۶	زور مشاعروں میں	محمود عبدالقدیر	۲۱	۲۲	شاہ گنج سے ایوان اردو تک	پروفیسر سید محمد	۱۱۲
۷	ڈاکٹر زور سے میری آخری ملاقات	سید بادشاہ حسین	۲۶	۲۳	آسمان اردو ادب کا ایک اور تارہ	احمد الدین احمد	۱۱۵
۸	چند تاثرات	بدر شکیب	۳۱	۲۴	ڈاکٹر زور حیدرآباد سے کشمیر تک	حبیب ابراہیم	۱۱۸
۹	ڈاکٹر زور مرحوم	پروفیسر محمود حسین	۳۴	۲۵	ڈاکٹر زور مرحوم	جہاں بانو نقوی	۱۲۱
۱۰	ڈاکٹر زور صاحب	محمد اکبر الدین صدیقی	۴۰	۲۶	زور صاحب	نظر حیدرآبادی مرحوم	۱۲۴
۱۱	ڈاکٹر زور شخصیت	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۴۹	۲۷	ڈاکٹر زور۔ ایک دوست	پنڈت دتاتریہ دتاتریہ ہنگار	۱۲۷
۱۲	راستا و محترم	پروفیسر سید مبارز الدین رفعت	۶۵	۲۸	حسب قاعدہ	احمد جلیس	۱۳۱
۱۳	ڈاکٹر زور۔ چند تاثرات	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۷۱	۲۹	ڈاکٹر زور سے چار ملاقاتیں	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱۳۵
۱۴	ڈاکٹر زور مرحوم	سیدہ جعفر	۸۳	۳۰	چند یادیں چند آہیں	میر لیق علی خاں	۱۳۸
۱۵	ڈاکٹر زور مرحوم	سید محمد مورخ بیدری	۸۷	۳۱	ڈاکٹر زور کشمیر میں	محمد یوسف ٹینگ	۱۴۵
۱۶	ڈاکٹر زور سے ایک ادبی ملاقات	قاضی عیاض انصاری	۸۹	۳۲	ڈاکٹر زور کی شخصیت	وقار خلیل	۱۴۹
۳۳	بابا کی زندگی کے آخری تین دن	سید رفیع الدین قادری	۱۵۵				

(۲)

فن

۱	تاریخ دکن میں ڈاکٹر زور کا حصہ	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	۱۶۱	۴ دکنی اردو ادب کا ایک محقق	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	۱۷۹
۲	میرے عزیز دوست ڈاکٹر زور مرحوم	نصیر الدین ہاشمی	۱۶۴	۵ اردو لسانیات کے ابوالآبا	ڈاکٹر گیان چند	۱۸۶
۳	ڈاکٹر زور کی شخصی اور ادبی زندگی	سید حرمت الاکرام	۱۷۰	۶ لسانیاتی ادب میں ڈاکٹر زور کا حصہ	مولوی غلام رسول	۱۹۱

۴۶ قطعات تاریخ — ابوالقاسم سید مہدی حسن قادری — ۲۷۵

۴۷ - میرکارواں — سید احمد اللہ قادری — ۲۷۶

حصہ دوم

ڈاکٹر زور کے منتخب مضامین خطبات۔ خطوط۔ نظمیں غزلیں اور مقالہ نما

(۴)

منتخب مضامین

۱ محمد قلی قطب شاہ — ۲۰۹ — ۴ پیش لفظ "سب رس کا پہلا اداریہ" — ۲۹۴

۲ بھاگ متی اور بھاگ نگر — ۲۸۱ — ۵ پنڈت تنسکھ دھرجی — ۲۹۶

۳ پیام غالب — ۲۹۱ — ۶ میرا کشمیر کا سفر — ۲۹۷

(۵)

خطبات

۱ خطبہ صدارت شعبہ اردو آل انڈیا ٹمل کانفرنس ۱۹۴۰ء — ۵ خیر مقدمی تقریر بر یوم محمد قلی قطب شاہ جبلی پور ۱۹۴۴ء — ۱۹۶۰ء — ۳۲۱

۲ خطبہ صدارت جلسہ سالانہ انجمن اساتذہ میڈیکل کالج حیدرآباد ۱۹۴۰ء — ۶ خیر مقدم صدر جمہوریہ ہند — ۱۹۶۰ء — ۳۲۴

۳ خطبہ استقبالیہ کل ہند ترقی اردو کانفرنس ۱۹۴۳ء — ۷ [illegible] — ۳۲۶

۴ خطبہ صدارت اردو کانفرنس برہان پور — ۸ خیر مقدمی تقریر بر یوم محمد قلی قطب شاہ — ۳۳۰

(۶)

خطوط

۱ بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — ۳۴۳ — ۵ بنام [illegible] — ۳۴۷

۲ بنام عارف الدین حسن معتمد ثعبۂ امتحانات [illegible] — ۳۴۱ — ۶ بنام [illegible] — ۳۵۲

۳ بنام ممتاز حسن احسن صدر شعبۂ اردو [illegible] — ۳۵۴ — ۷ بنام [illegible] — ۳۵۷

۴ بنام [illegible] — ۳۶۲ — ۸ بنام [illegible] — ۳۶۸

۹ بنام [illegible] — ۳۶۹

اپنی بات

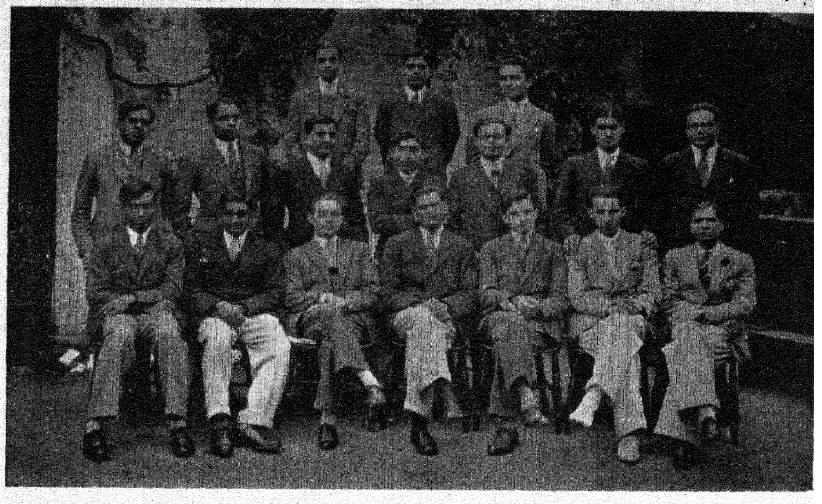
"سب رس" کا یہ خصوصی نمبر کسی قدر اہتمام کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔ اس میں تین مہینوں کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ ناظرین جانتے ہیں کہ سب رس آج ۲۶ سال سے ادارۂ ادبیات اردو کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس مدت میں سب رس نے اردو زبان اور ادب کی جو مقدور بھر خدمت کی وہ بے مایہ نہیں ہے۔ ماہوار اشاعتوں کے علاوہ دوسری کئی خصوصی اشاعتیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں لیکن یہ خصوصی اشاعتیں کسی نہ کسی خوش آئند تقریب کی آئینہ دار ہوتی تھیں یا کسی خوشگوار واقعہ کا پیغام دیتی تھیں۔ لیکن یہ خاص اشاعت جو آج ناظرین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ خوش آئند تقریب کی حامل نہیں بلکہ حزن و ملال کا مرقع ہے۔ یہ اشاعت اس غرض سے پیش کی جا رہی ہے کہ ہم سب مل کر سب رس کے بانی اور ادارۂ ادبیات اردو کے معمار ڈاکٹر زور مرحوم کی یاد تازہ کریں اور ان کی حیات جاوید اور ان کے علمی اور اخلاقی کارناموں کو خراج تحسین پیش کریں۔ آج زور کو پیوند خاک ہوئے پورے بارہ مہینے ہو رہے ہیں لیکن ان کی جیتی جاگتی تصویر ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ان کی تازہ اور توانا یاد ہمارے دلوں کو مضطرب کر رہی ہے۔ اس اشاعت کی ہر سطر ایک "نالۂ خاموش" اور ہر لفظ "ایک اثر باختہ آہ" سے کم نہیں ہے۔ جہاں علماء نے اس اشاعت کے لیے مقالے سپرد قلم کیے ہیں وہ سوز و گداز کی گھٹاؤں میں لکھے ہیں۔ یہ رشحات قلم نہیں بلکہ رشحات قلب اور قطرات اشک ہیں۔

ڈاکٹر زور ان شخصیتوں میں تھے جو ایک بیدار دل اور متلاطم ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے، اور اس غرض سے پیدا ہوئے تھے کہ اپنے گرد و پیش کو اپنے موجزن خیالات اور شعلہ پرور جذبات سے مضطرب کریں۔ اور سماج میں زندگی اور تحریک کی روح پھونکیں۔ زور ایسے صاحب عمل تھے کہ ان کا ہر لمحہ کیف پرور اور ان کی ہر ساعت محرک عمل ہوتی تھی۔ ان کے دل و دماغ میں ہر آن نت نئے خیالات کی موجیں اٹھتی تھیں، اور یہ موجیں وہیں ختم نہیں ہو جاتی تھیں بلکہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ حیز عمل میں آتی تھیں۔ وہ خود کام کرتے تھے اور دوسروں کو کار آمد بناتے تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد ایک نئی دنیا بسائی جس میں علم و عمل کے دریا بہنے لگے۔ اور اس میں تصنیف و تالیف کے چراغ روشن ہوئے۔ وہ دنیا ابھی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ زور نے دنیا کو خیر باد کہہ دیا لیکن انھوں نے اپنے علم و عمل کا ایسا نقش بٹھایا ہے کہ وہ محو نہیں ہوگا۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی کہ صاحب ذوق خود بخود ان کی طرف کھنچے آتے تھے اور ان کے فیض صحبت سے دامن امید بھر لے جاتے تھے۔ یہ حلقۂ علم ہر روز وسیع ہوتا گیا۔ نئی نئی شخصیتیں اس میں جذب ہوتی گئیں اور اس حلقۂ علم سے بڑے بڑے انشاپرداز اور صاحب تصنیف باہر نکلے جو اب حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کی علمی دنیا میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

اس کو کون نہیں جانتا کہ اردو کی بقا اور اس کی ترقی تو زور کا وظیفۂ حیات تھا۔ وہ یہ وظیفہ عمر بھر دہراتے رہے وہ اسی لیے زندہ تھے اور اسی لیے مرے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ زور اردو کے بہت بڑے محسن اور علمبردار تھے۔ اردو کے لیے انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ ہندوستان کے جن مناصب پر اردو کی خدمت کی اور اس کی بقا کا سامان جمع کیا زور کا رتبہ ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ ان سے زیادہ ہی ہے۔ زور نے "ایوان اردو" کے نام سے اردو کا نہ صرف ایک بڑا مرکز بنایا اور ایک عظیم الشان عمارت بنا کر اس میں اردو کو جلوہ گر کیا بلکہ اردو کے امتحانات جاری کر کے تمام ملک میں اس کو قبول عام بنایا۔ اور

سب رس زور نمبر

حیدر آباد کانفرنس منعقدہ لنـــدن ۱۹۲۸ء کا ایک تاریخی گروپ





کاٹو بی گوپال ریڈی ادارہ میں (۱۹۵۶ء) حیدر آباد کے ادیبوں کے ساتھ۔

سب رس جاری کرکے اردو کے اصل العین کو ملک کے ہر گوشے میں پہنچایا، اور تمام ملک کے علما کو دعوت دی کہ سب اردو کی بقاء کی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اس کے علاوہ اپنے مقالوں اور تصنیفوں سے جو بے گنتی ہیں اردو کا دامن ایسا بھر دیا کہ اس کی مثال نہیں۔

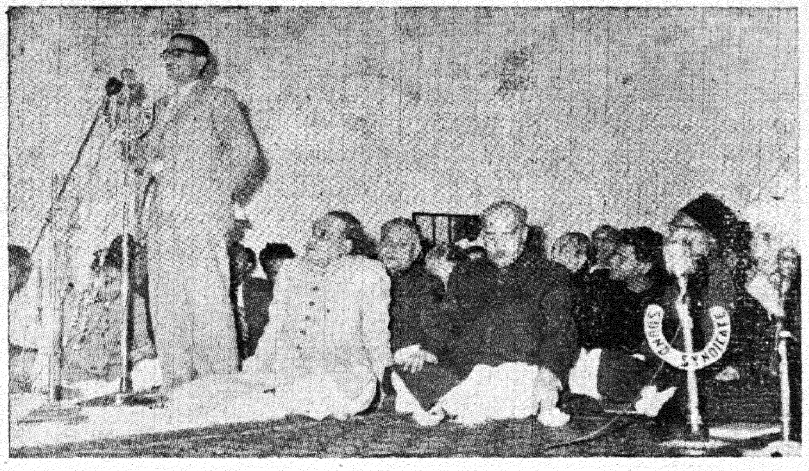
زور جس طرح آسمان علم کے ستارے تھے اسی طرح دکنی سماج کے معمار بھی تھے۔ دکنی سماج کو سنوارنا اور احساس کمتری کی زنجیروں کو توڑ کر اس میں جرأت اور خود اعتمادی کی روح پھونکنا زور ہی کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ اس وقت پیدا ہوئے تھے جب کہ اہل دکن نامساعد حالات میں دبے جا رہے تھے اور ان کے خدمات عمل پذیر ہو رہے تھے۔ اگر زور اس وقت میدان عمل میں نہ آتے تو بہت ممکن تھا کہ ایسے دور خیال نہ ہوتا جیسے آج ہے۔ اور یہ ذہنی بیداری جو زور کی رہبری میں منظر عام پر آئی ہے وہ کبھی نہ آتی۔ زور نے وقت پر اہل دکن کو آواز دی، اور ان کی آواز سے سوئی بستیاں جاگ گئیں۔ اور ان میں ایسا جذبۂ عمل پیدا ہوا کہ اپنی نوا نیوں کے ساتھ تمام شعبہ ہائے حیات پر چھا گئے۔ چنانچہ آج ڈاکٹر زور کے فیض یافتہ بے شمار نوجوان میدان عمل میں سرگرم کار ہیں۔ اور ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کا سکہ بٹھا رہے ہیں۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کی اشاعت جو دکنی زبان اور ثقافت کا ایک خزانہ ہے، اسی جذبۂ عمل کی ایک کڑی ہے۔ جب یہ شائع ہوا تو ماضی کے تمام پردے کھل گئے اور جب اس کے چند روز بعد حیات ولی شائع ہوی تو دکنی تہذیب کے زمین دوز چشمے باہر ابلنے لگے۔ ان گراں بہا اشاعتوں سے دکنی سماج کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس سے ذہنی تلاطم پیدا ہو گیا اور ہر طبقہ زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکنی سماج نشۂ مے پیا ہوا ہے اور جب زور نے اس کو چھیڑا تو تمام دلوں کے تار بجنے لگے۔

یہ قومی اور علمی جذبہ زور کو ان کے بزرگوں سے ملا تھا۔ زور قدیم دکنی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے آبا و اجداد وسطی دکن کے آباد کار اور تاریخ و تمدن کے معمار تھے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ چودھویں صدی کے اوائل میں دکن ترکوں نے آباد کیا تھا۔ جو خلجی اور تغلق حکمرانوں کے ساتھ یہاں آکر بس گئے۔ ان آبادکاروں کو ایران صدہ کہتے ہیں۔ یہ وہ ترک تھے جنھوں نے وسطی دکن کو نئے قالب میں ڈھالا اور تہذیب و تمدن کے چراغ روشن کیے۔ ان لوگوں نے جو بستیاں بسائی تھیں ان میں قندھار کا ایک پرانی قصبہ بھی ہے جو شمالی دکن میں واقع ہے۔ ڈاکٹر زور کے بزرگ اسی قصبے کے رہنے والے تھے اور اکثر صوفی مشرب تھے۔ جنھوں نے دکنی سماج کی اخلاقی اور روحانی تربیت کی اور اپنے علم و اخلاق سے اس قصبے کو منور کیا۔ اسی علمی اور اخلاقی فضا میں زور کی پرورش ہوی تھی ان ہی اثرات میں ان کی زندگی بنی اور شخصیت ابھری تھی۔ ان ہی اثرات نے ان کو آگے بڑھایا۔ اور بالآخر وہ ایک بہت بڑے سماجی عمل کی حیثیت میں آئے اور علم و اخلاق کا بہت بڑا سرمایہ چھوڑ گئے جو کبھی فراموش نہیں ہوگا۔

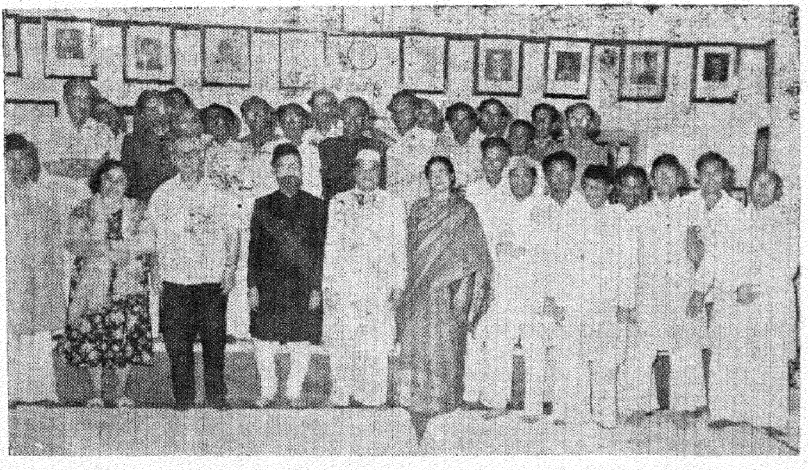
کچھ نہیں تو ایوان اردو کی عظیم الشان عمارت زور کے جذبۂ عمل کو ہمیشہ یاد دلائے گی۔ اور اس کا بلند مینار دور سے آواز دے گا کہ بیسویں صدی کے وسط میں جدرآباد میں ایک صاحب عمل پیدا ہوا تھا جو آئندہ نسلوں کے لیے بڑا سرمایۂ حیات چھوڑ گیا اور آئندہ زمانے کے لیے ہدایت کی شمعیں روشن کر دیں۔

مجلس ادارت ڈاکٹر زور کی ابتدائی دور کی تصویروں کے لیے ان کی ہمشیرہ محترمہ عظیم النساء بیگم صاحبہ کی ممنون ہے اور آخری دور کی تصویر والد کے لیے ان کے صاحبزادے الحاج سید شاہ تقی الدین صاحب قادری کی۔

(پروفیسر عبدالمجید صدیقی)

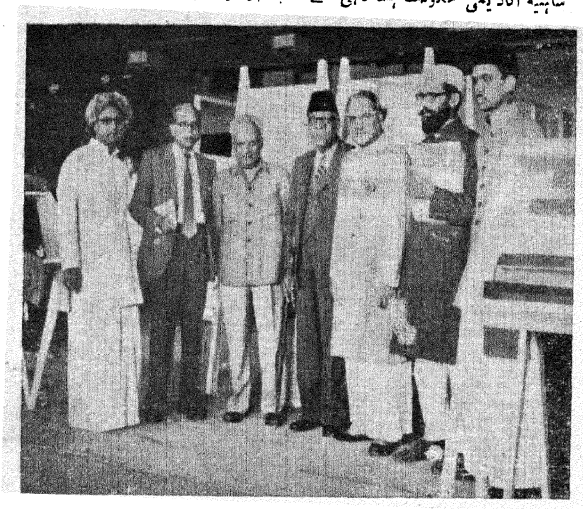


ہند و پاک مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ (۱۹۶۱ ء) جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے ہیں۔
تلوک چند محروم، ، حیرت بدایونی جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر زور

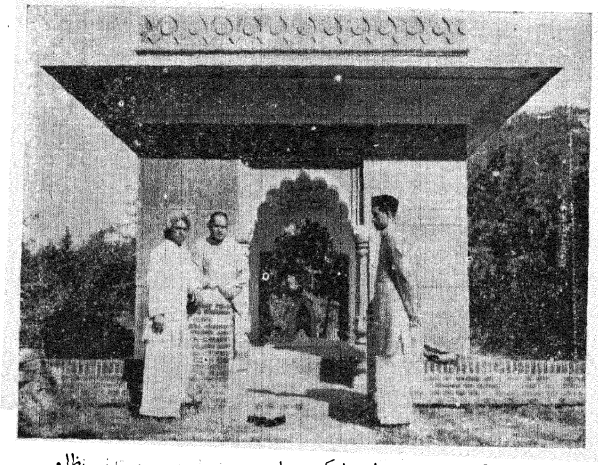


سجاد ظہیر، ادارہ میں، حیدر آباد کے شاعروں کے ساتھ ۱۹۶۲ ء

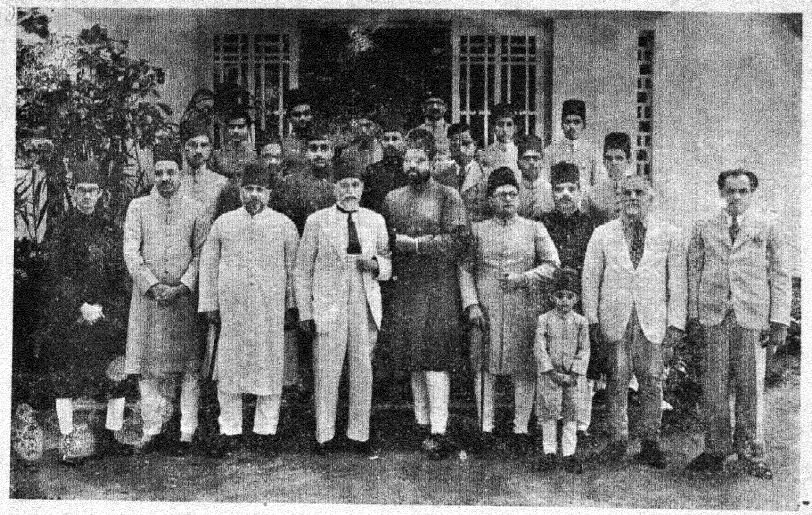
ساہتیہ اکاڈیمی حکومت ہند دہلی کے شعبہ اُردو کا یادگار گروپ -



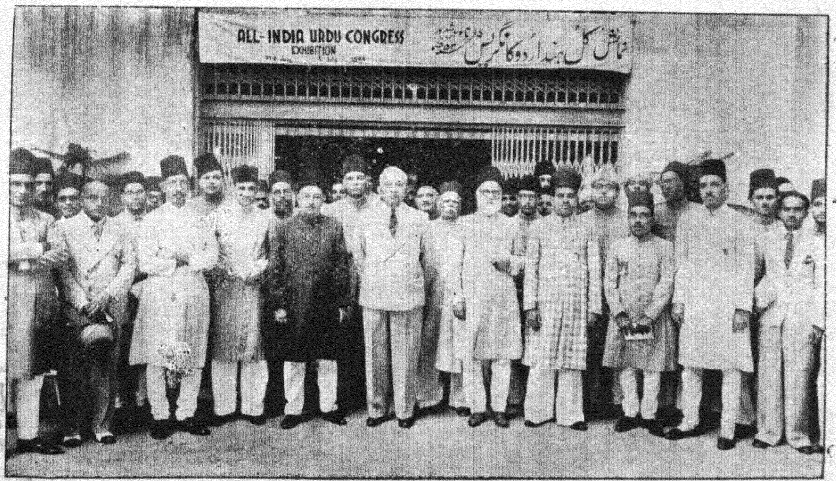
خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی ، امتیاز علی خاں عرشی ، ڈاکٹر زور
پروفیسر مسعود حسن رضوی ، قاضی عبدالودود ، آل احمد سرور ، قیصر زیدی
۱۹۵۷ء



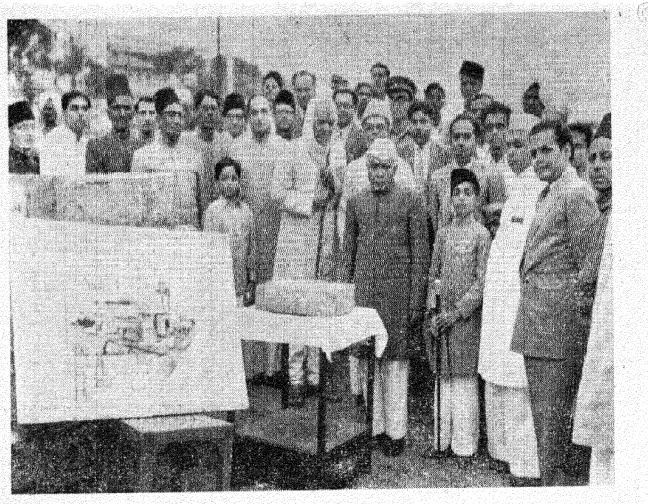
دہلی میں ڈاکٹر زور ، مرزا بیدل کے مزار پر - خواجہ حسن ثانی نظامی
اور قیصر زیدی کے ساتھ (۱۹۵۷ء)



سر شیخ عبدالقادر اور نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر زور (سوٹ میں)



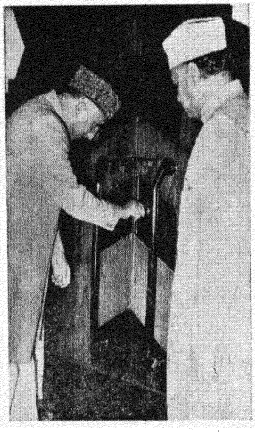
حیدرآباد میں ادارہ کے زیر اہتمام منعقدہ تاریخی کل ہند اردو کانگریس (۱۹۴۴ء) کا گروپ
اگلی صف میں :- حمید الدین شاہد، سیف علی خان، معادت علی رضوی، ڈاکٹر زور، مولوی عبدالحق،
سالار جنگ (سوٹ میں) عالم یار جنگ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اعظم جنگ، زین یار جنگ



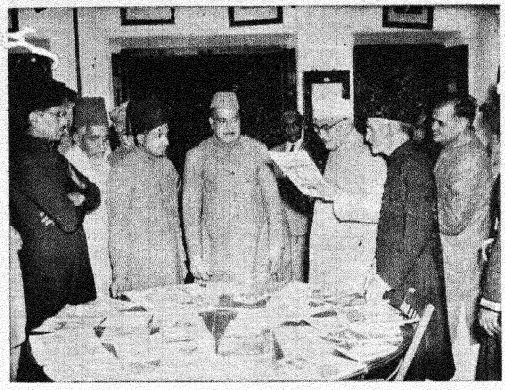
ڈاکٹر بی رام کشن راؤ نے «ایوان اردو» کا سنگ بنیاد رکھا تھا ۔ حضرت امجد حیدر آبادی نے دعا کی تھی ۔ ڈاکٹر زور اور حیدر آباد کے مشاہیر سنگ بنیاد عمارت ادارہ کی تقریب میں
٦ ۔ نومبر ۱۹۵۵ء



«ایوان اردو کی کہانی زور صاحب کی زبانی»
۱۹٦۰ء



بخشی غلام محمد «ایوان اردو» کا افتتاح کررہے ہیں (۱۹٦۰ء)



ڈاکٹر سید محمود،
ادارہ ادبیات اردو میں
۱۹۵۶ء



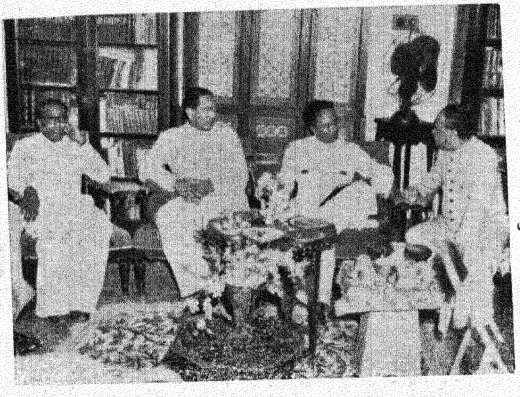
خواجہ غلام السیدین
« ادارہ ادبیات اردو » کے نوادر
کا معاینہ کر رہے ہیں، ڈاکٹر زور
اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں
بھی ہمراہ ہیں (۱۹۵۶ء)



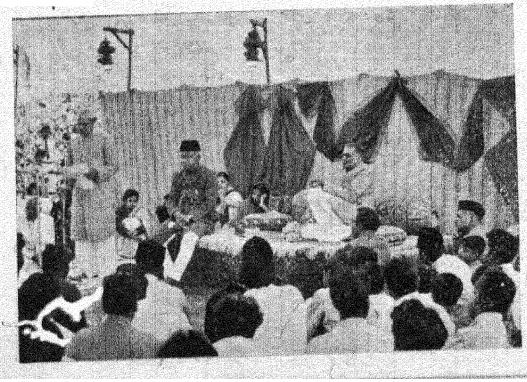
ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر،
ڈاکٹر زور کے ساتھ ادارہ ادبیات اردو میں
حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ
۱۹۵۴ء



پرنس مکرم جاہ اور شہزادی اسری برجیس
ڈاکٹر زور کے ساتھ ادارہ میں
۱۹۵۶ء



پروفیسر ہمایون کبیر
اور
ڈاکٹر زور
ادارہ کی خیر مقدمی
تقریب میں
۱۹۵۸ء



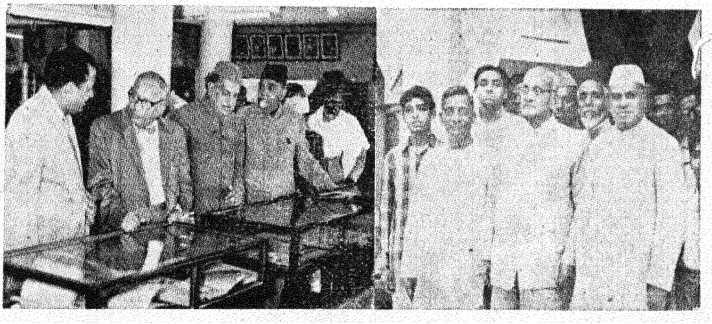
ڈاکٹر زور «یوم محمد قلی قطب شاہ» کے
موقع پر خیر مقدمی رپورٹ سنا رہے ہیں
شہ نشین پر نواب زین یار جنگ
صدر ادارہ اور ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی
صدر جلسہ ۱۹۵۸ء



سر اکبر حیدری صدر اعظم ریاست حیدر آباد
ڈاکٹر زور کے ساتھ ، ادارہ ادبیات اردو میں
(۱۹۴۰ ء)



برطانوی سفیر مسٹر میلکم میکڈانلڈ ، ڈاکٹر زور اور پروفیسر سید علی اکبر
ادارے میں (۱۹۵۹ ء)

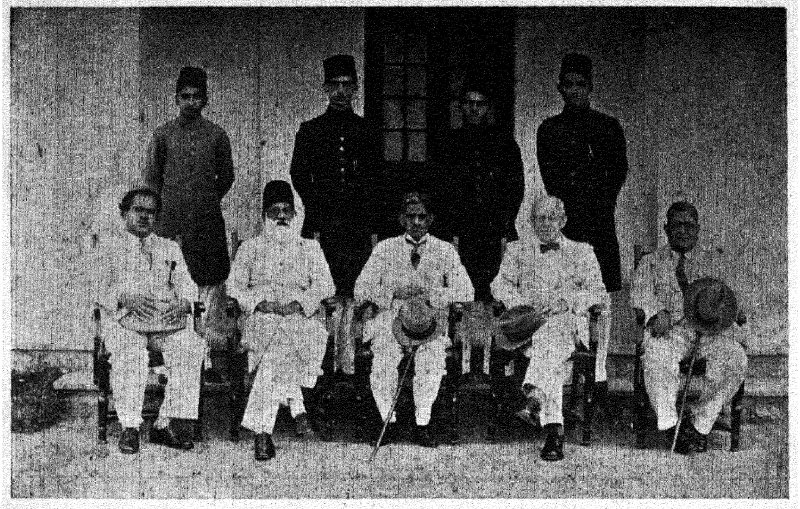


ڈاکٹر تارا چند ادارے میں سنہ ۱۹۶۱ ء

سردار پانیکر ، ڈاکٹر زور ، ڈاکٹر ڈی - یس ریڈی
اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ ادارے میں ۱۹۶۱ ء

سب رس زور نمبر

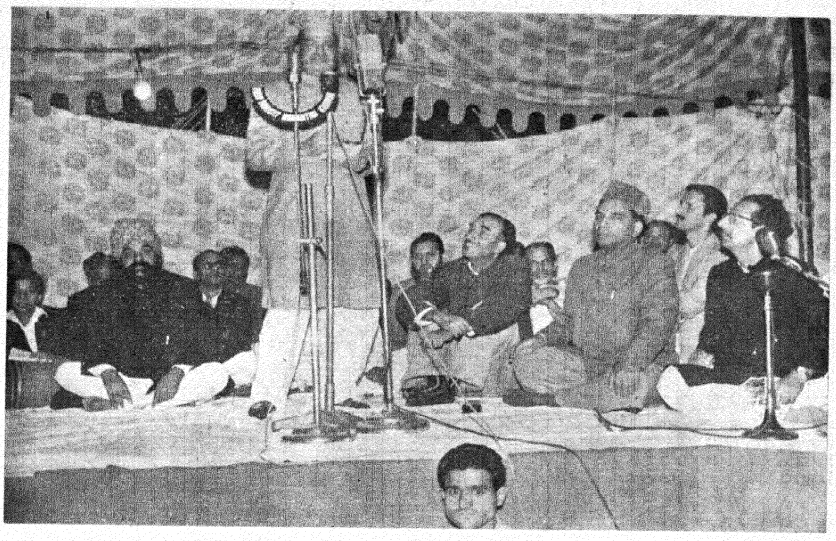
مجلۂ عثمانیہ کی ادارت کا ایک گروپ (۱۹۳۶ ء)



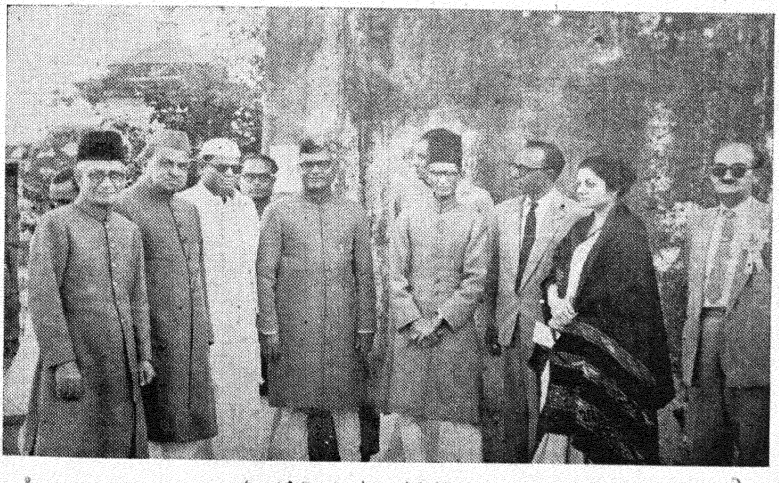
وحید الرحمن ، پروفیسر اسپتھ ، قاضی محمد حسین وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ ، مولوی عبدالحق ، ڈاکٹر زور
عباس علی خاں ، زاہد علی کامل ، سکندر علی وجد ، صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش



نشستہ : ڈاکٹر زور ، مہدی نواز جنگ ، زین یار جنگ ، بیگم مہدی نواز جنگ ، ڈاکٹر غلام یزدانی
(۱۹۶۰ ء)



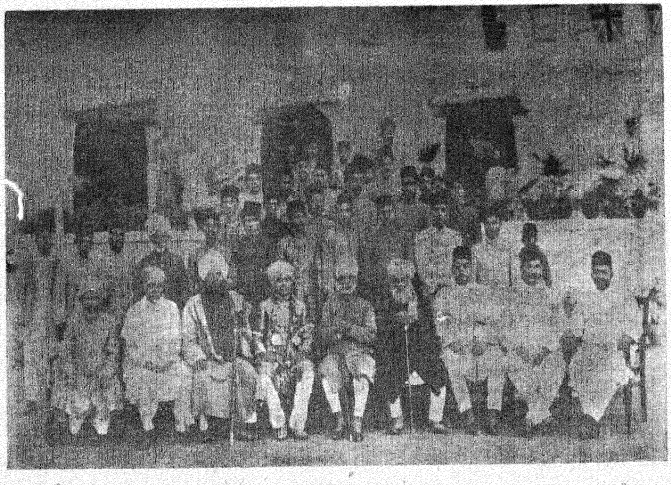
ڈاکٹر زور کشمیر کے ایک مشاعرہ میں (۱۹۶۲ ء)



یوم محمد قلی قطب شاہ (۱۹۶۲ ء)

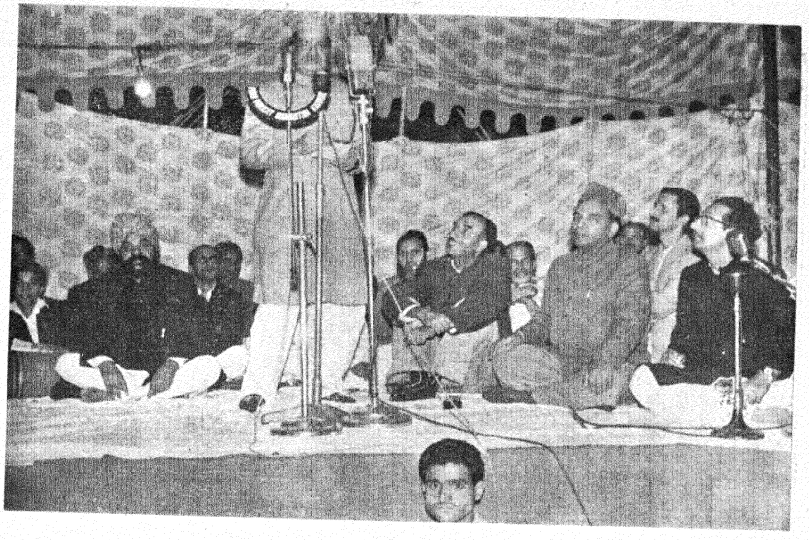


ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہور یہ ہند ادارہ میں (۱۹۶۲ ء)

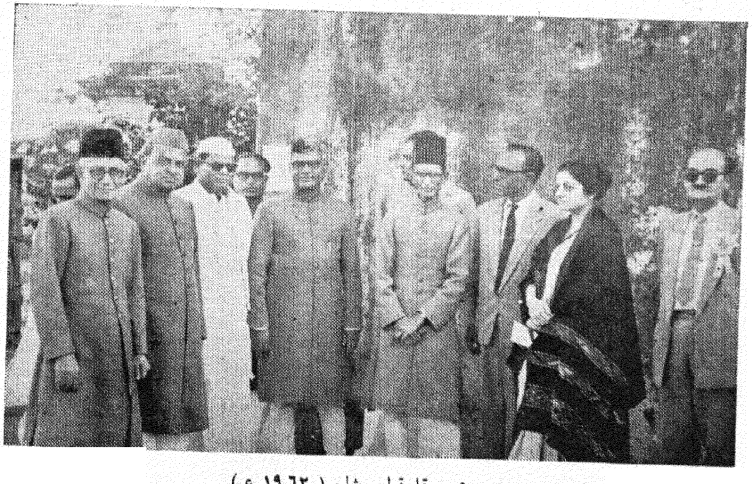


ڈاکٹر زور کی شادی کی یادگاری تصویر (۱۹۳۱ ء)

معین یار جنگ ، احمد حسن ، عظیم الدین ، مولانا نور الحیدر ، رفعت یار جنگ ، ڈاکٹر زور ، حضرت زعم ، اعظم اللہ اطہر ، وہاب الدین



ڈاکٹر زور کشمیر کے ایک مشاعرہ میں (۱۹۶۲ ء)



یوم محمد قلی قطب شاہ (۱۹۶۳ ء)

ڈاکٹر زور

ایک شخصیت

پانچ روپ



لنـــدن جانے سے ۱۵ روز پہلے
۱۹۲۷ء میں



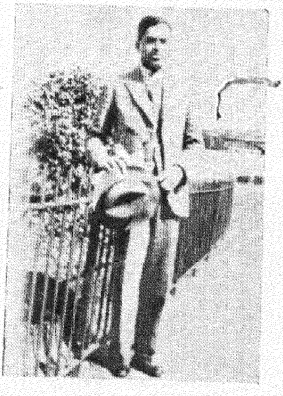
۱۹۲۱ء میں



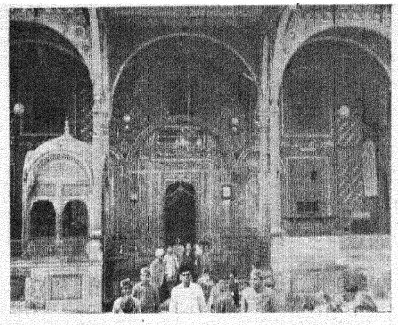
ڈاکٹر زور



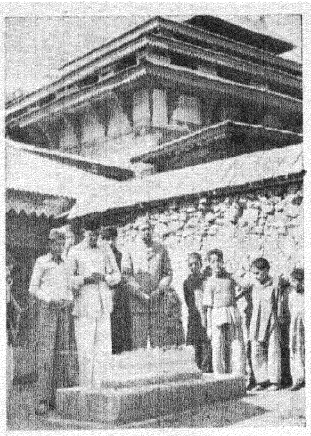
یورپ میں ۱۹۲۹ء



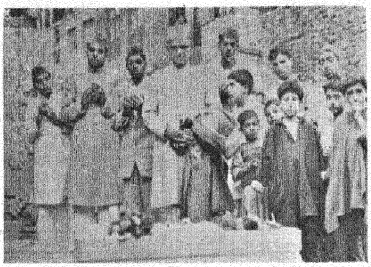
لنـــدن میں ۱۹۲۸ء



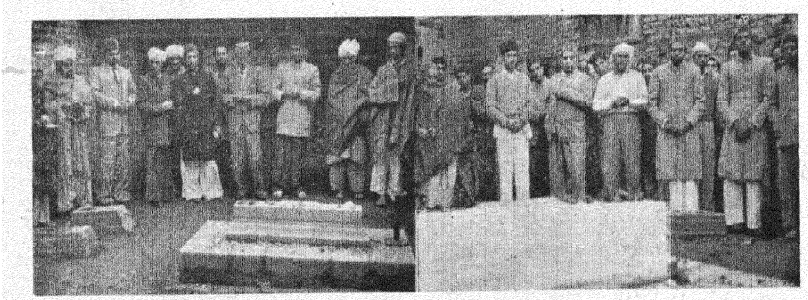
خانیار شریف (سری نگر)



خانیار شریف کے ایک گوشہ میں
مزار ڈاکٹر زور پر مرزا ضامن علی غازی معہ ،
صاحبزادگان ڈاکٹر زور فاتحہ خواں ہیں



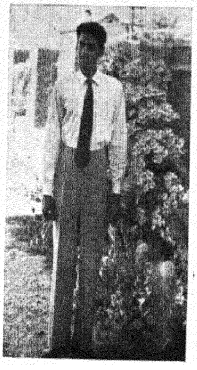
پروفیسر ہارون خاں شروانی معہ صاحبزادگان ڈاکٹر زور
مزار ڈاکٹر زور پر فاتحہ خواں ہیں ۔



فاتحہ سوز کے موقع پر :- رفیع الدین ۔ علی الدین ، تقی الدین ، انسر یزدانی ، علی جواد زیدی
مخمور حسین بدخشی ، سجادہ صاحب خانیار شریف (کوٹ اور بالوں کی ٹوپی) امین یزدانی
امین چشتی ، اسد اللہ کامل (شروانی میں) پنڈت شیام لال ، جناب خواجہ شمس الدین (سوٹ میں)
سابق وزیر تعمیرات و حال چیف منسٹر



الحاج سید شاہ تقی الدین قادری
سجادہ نشین درگاہ حضرت زعم

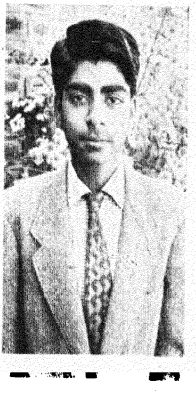


سید علی الدین قادری



سید صفی الدین قادری

صاحبزادگان



سید رفیع الدین قادری

ڈاکٹر
ز
و
ر



سید رضی الدین قادری

ڈاکٹر زور

★

کی

★

شخصیت





نواب مہدی نواز جنگ
(گورنر گجرات)

زور صاحب

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی رحلت بڑا سانحہ ہے۔ یوں تو مرحوم کی قابلیت سے ہندوستان کے سب ہی اردو داں واقف ہیں لیکن مرحوم کی ادبی خدمات کے پیچھے جو ولولہ اور ایثار تھا اسکو وہی جانتے ہیں جو نزدیک یا دور سے ان کی کوششوں میں ان کی پسپائیوں یا کامیابیوں کے ردِ عمل کو دیکھا ہو۔ زورؔ مرحوم عالم باعمل صاحب ایقان اور ایمان تھے جو جرأتِ رندانہ اور ہمت مردانہ سے اردو کی خدمت میں گامزن تھے۔

مرحوم کے ذہن رسا نے نت نئی تجویزوں کو ہاتھ میں لیا اور کامیابی سے انکو انتہا تک پہنچانے میں مقدور بھر کوشش کی۔

ادارۂ ادبیات اردو کی ابتدا، سب رس کے ذریعہ ثقہ ادبی خدمت، ایوان اردو کی تعمیر اور اس کی ایک میوزیم اور کتب خانہ کی شکل میں تکمیل، ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں مرحوم کا انہماک اور اسی انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ ریسرچ میں جو کچھ کام اب تک ہوا ہے مرحوم کی حسن تدبیر کا روشن ثبوت ہے۔

مرحوم نے اپنی اسکیموں کے تعلق سے میرے خانگی اور سرکاری وقت پر تصرف کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا اور میں اُن تصرفات پر ہمیشہ ان کی قدر اور عزت کرتا رہا۔ زورؔ مرحوم کے دنیا سے بے وقت گزر جانے کا مجھے گہرا رنج ہے اور مرحوم کے خدمات کا جو خاص ہیں انکو قائم اور جاری رکھنا ہمارا فرض ہے۔

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

خیرت بدایونی

آج ایوان اردو بھی ہے اور ادارۂ ادبیات بھی، کتب خانہ بھی ہے اور دار المطالعہ بھی، سب رس بھی ہے اور سب تصنیفات و تالیفات بھی، آزاد انسٹی ٹیوٹ بھی ہے اور تمام علمی و ادبی تحقیقات بھی۔ غرض کہ ۳۰، ۳۵ برس کی ہمہ وقتی جد وجہد میں تعمیر کی ہوئی ایک سجی سجائی بارات موجود ہے، مگر اس بارات کا دولہا کہاں ہے۔ ایوان اردو کا معمار موجود نہیں۔ ادارہ ادبیات کا بانی گذر چلا گیا۔ کتب خانے اور دار المطالعے کا مونس آج غیر حاضر ہے۔ سب رس کا مدیر اردو کا شاعر و ناقد، کتابوں کا مصنف و مولف کیا ہو گیا۔ علی اکبر، ولد اکبر حسین، ہندو راج سکسینہ اکیلے رہ گئے۔ حبیب الرحمن کا شیرو رفیق غائب ہے۔ آج وہ شخصیت کہاں ہے جس نے قلی قطب شاہ کو اردو کا سب سے پہلا شاعر ثابت کیا اور منوایا۔ یا اللہ یہ کشمیر سے کیسی سنامونی آئی۔ یقین نہیں آتا کہ زور صاحب چل بسے۔ وہ تو اچھے خاصے ہنستے کھیلتے تھے۔ اللہ کرے خبر جھوٹی ہو۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ مگر دشمن، دشمن تو ان کا کوئی تھا ہی نہیں۔ خبر ٹھیک ہی ہے، جھوٹی خبر سے کسی کو کیا مل جاتا مگر یا اللہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ حیدرآباد کی تہذیب، کشمیر میں تعزیت بن گئی۔ پیرزادے یتیم ہو گئے۔ دکن کا کوہ نور کشمیر کی وادی میں کھو گیا۔ جنوب کا خزانہ شمال نے لوٹ لیا۔ دکن کی عزت و شہرت کا تار و پود لٹ گیا۔ مشرقی روایت و شرافت کا چراغ بجھ گیا۔ جنوبی اردو ادب کی آبرو لٹ گئی۔ عزت چھن گئی۔ دکن کے فخر و عزت کا سرینچا ہو گیا جیسے علم و ادب کے ایک مجسمے کو کسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جیسے ہم نے زندگی بھر ایک خواب دیکھا صبح کو اخبار میں پڑھا کہ وہ تو رصاحب نہیں تھے ایک خواب تھا۔ جیسے دماغ میں کسی کے وجود کا ایک خیال جم گیا تھا۔ اچانک دماغ پر ایک ضرب کاری لگی اور وہ خیال خواب بن گیا۔ دل پر دوستی کا ایک گہرا نقش بیٹھ گیا تھا ایک تار آیا اور وہ دل کا نقش دل کا گھاؤ بن گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک دولت تھی اور کوئی اُچک کر لے گیا۔ ہم دوستی کے نشہ میں مست و بے خبر تھے کسی نے بھرپور وار کیا اور ہم آن کی آن میں زخمی ہو گئے۔ کسی کا دل ٹوٹا۔ کسی کا بازو ٹوٹا۔ کسی کی کمر ٹوٹی۔ کسی کی آس ٹوٹی۔ میر کاروان کے جانے سے سارا کارواں مجروح سبیل ہو گیا۔ اور سارے ملک پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عبدالمجید و اکبرالدین کا دل چیر کر کوئی دیکھے کتنے ناسور پڑ گئے۔ خواجہ حمیدالدین شاہد سے لکھ کر کوئی پوچھے تم پر کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک علمی و عملی صلاحیت دفن ہو گئی، ایک ہمہ گیر جامعیت کا جنازہ اٹھ گیا ایک مخصوص انفرادیت نے دم توڑ دیا۔ ملک و قوم زبان کی تاریخ بنانے والا خود ہی ایک تاریخ بن گیا۔ دکن کو دنیا سے روشناس کرانے والا خود ہی روپوش ہو گیا جو کل تک حال تھا آج ماضی ہے۔ اچھی رفاقت کی خوب دوستی تباہی مذاق مذاق میں خنجر ہی بھونک دیا۔ ہنسی ہنسی میں نشتر ہی چبھو دیا۔ ہنساتے ہنساتے رلانے لگے۔ بیگم کی آہ و زاری پر بھی رحم نہ آیا اولاد کے سر سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ نقی میاں کیلئے دلہن ڈھونڈھتے ہی رہے سہرا بھی نہیں دیکھا۔ ایک جم غفیر کی چیخ پکار ہائے وائے پر بھی ترس نہ کھایا ایک دم سے منہ پھیر لیا۔ دنیا اور دنیا والوں کو اللہ حافظ کہا اور چلتے بنے۔ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے تو گویا جاتے جاتے بھی زندگی کی بے وفائی کا سبق دیتے ہوئے گئے۔ اور یہ بھی بتا گئے کہ موت ہر وقت ہر جگہ آ سکتی ہے مختصر یہ کہ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

خُدا رحمت کند!

مکرمی : تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ جس میں آپ نے زور صاحب مرحوم پر کچھ لکھنے کی فرمایش کی ہے۔ ایک لمحے کے لئے دم بخود ہو گیا کہ زور صاحب رحلت فرما گئے'۔ یہی نہیں بلکہ اس پر ایک سال ہونے کو آیا۔ کسے نہیں معلوم کہ زندگی ہے تو جلد یا بدیر ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر رہیں گے۔ لیکن کافی مدت سے یہ خیال ذہن میں جاگزیں رہا کہ اس طرح کی مفارقت سب سے پہلے میرے حصے میں آئے گی لیکن ہوتا یہ رہا کہ بیشتر عزیز عمر میں بڑے ہوں یا چھوٹے' بہت چھوٹے' برابر مفارقت کرتے جاتے ہیں اور ان سب کا ماتم کرنے کے لئے' میں باقی ہوں۔ کتنی غیرت و عبرت کی بات ہے۔

دیکھتا ہوں تو اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ جتنے جاننے پہچاننے اور جان چھڑکنے والے تھے' دنیا کی دوسری سمت پہنچ چکے ہیں اور میں حیات کے مرض الموت میں گھستا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ زندگی کے سفر میں نہ اتنی گرم روی اچھی نہ ایسی واماندگی جس میں اپنے کو مبتلا پاتا ہوں۔ ایسے عزیزوں کی جدائی سہنی پڑی ہے جس کے بدلے اپنی موت کتنی ارزاں اور کس درجہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ موت نے اپنے شکار کا معیار کیا مقرر کر رکھا ہے۔ جب سارے یا بیشتر ساتھی داغ مفارقت دے چکے ہوں تو یہ دنیا اور اس میں رہنے کی ہوس یا خوشی کیسی۔ یہ تو ایک قید ہوئی بے بسی اور تنہائی کی۔ روز افزوں شدت کے ساتھ۔ لیکن بقول اکبر ؎

بڑھے بھی مرنہ جائیں تو ناچار کیا کریں!

یہ باتیں تو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ چاہے ان پر کوئی خوش ہو' ناخوش' لیکن کوئی سانحہ پیش آ جاتا ہے تو ذہن میں یہ خیال آتے ہی ہیں۔ پہلے عریضے میں اس کا اعتراف کر چکا ہوں کہ کسی عزیز یا بزرگ کی رحلت پر کچھ لکھنا پڑتا ہے تو دل بہت بے قرار ہوتا ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا ہے ایسے مواقع سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنانچہ بعض عزیزوں اور دوستوں کی یاد میں کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن ایسا کر نہ پایا جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ بایں ہمہ دوستوں کے اصرار پر کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ؎

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

زور صاحب کی وفات سے چند سال پہلے ان کی صاحبزادیاں امتحان میں شریک ہونے علی گڑھ آئی تھیں۔ مجھ سے بھی ملیں۔ دل خوش ہوا جیسے ان لڑکیوں کے ساتھ زور صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی ہو۔ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب رخصت ہو گئیں۔ دن رات اس طرح گزرتے رہے جیسے ایسے ہی گزرتے رہیں گے۔ واقعۃً

ایک دن خبر آئی کہ زور صاحب کشمیر میں رحلت فرما گئے۔ ذہن بے اختیار ان لڑکیوں کی طرف منتقل ہو گیا کہ ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لڑکیاں باپ سے بالعموم زیادہ مانوس ہوا کرتی ہیں اور باپ بھی بغیر کسی قصد و اہتمام کے لڑکوں سے زیادہ اپنی لڑکیوں کا خیال رکھتا ہے۔ پھر وہ شام یاد آئی جب ان لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی اور زور صاحب کی سرگرمیوں کا تا دیر بڑا دل چسپ تذکرہ رہا۔

لیکن وہ ایک شام ہی تو تھی دوسری شاموں کی طرح۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی ہوگی، اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہوں گی اور گھر داری کی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کے ہجوم میں اس سانحہ سے شاید اتنی بے قرار نہ ہوئی ہوں اور ہوئی بھی ہوں گی تو غدا نے چاہا اس کو جلد ہی بھول جائیں گی۔ زندگی اتنی سخت گیر ہے کہ وہ کسی سانحے کی یاد کو تا دیر قایم نہیں رہنے دیتی۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ مصیبت میں گزشتہ خوشگواریادوں سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں۔

مرحوم کیسے کیسے ارمانوں کے ساتھ کشمیر گئے ہوں گے۔ اپنے خلوص محنت اور قابلیت سے اردو کے لئے کشمیر میں ایک نیا حیدر آباد قائم کر دینے کا حوصلہ رہا ہوگا۔ ہم سب کو امید تھی کہ اپنی ان تھک کوششوں اور کام کرنے اور کام لینے کے طریقوں سے وہ کشمیر کے باشندوں میں اردو کے تحفظ و ترقی کا ایسا جوش پیدا کر دیں گے کہ اس زبان سے جو عام بے اتفاقی برتی جا رہی ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ اس وقت اجنبی چنار کے سائے میں ماضی کے اپنے تمام کارناموں اور مستقبل کے خوابوں اور منصوبوں کے ساتھ اس طرح محوِ خواب ہیں کہ اب ایسا وقت اٹھیں گے جب خواب اور بیداری ہی نہیں دنیا ہی کا تصور معدوم ہو چکا ہوگا۔

بالکل یاد نہیں آتا کہ زور صاحب سے پہلے پہل کب اور کہاں ملاقات ہوئی لیکن ان کی کتاب "اردو کے اسالیب بیان" میں اپنے بارے میں تحسین کے کلمات پڑھ کر خوش ہوا۔ اپنے سے بھی زور صاحب سے بھی۔ زور صاحب اکثر علی گڑھ آتے رہے۔ دو بار میں بھی حیدر آباد گیا۔ جس میں ایک بار ان کی زمایش پر کسی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے جانا ہوا تھا۔ زور صاحب کے دولت کدہ اور ادارۂ ادبیہ میں حاضری کا بھی موقع ملا۔ مرحوم نے ادارہ اور اس کے نوادر بڑی تفصیل اور شوق سے دکھائے۔ اس زمانے میں مرحوم کو اس کا شوق تھا کہ حیدر آباد اور اس کے نواح کی تاریخی عمارات کی رو کار یا کچھ ایسے جو کتبے نصب ہوں ان کا چربہ فراہم کریں۔ ایسے چند کتبے اسجاز مانے میں حاصل کئے تھے۔ شاید بڑی تلاش اور دشواریوں کے بعد۔ اس پر اتنے خوش تھے جیسے ان کو غیر متوقع طور پر کوئی دولت یا اعزاز مل گیا ہو۔ جیسے ادارہ کی حیثیت و اہمیت میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا ہو۔ ایسی خوشی اور سرفرازی صرف کوئی ادب شناس ہی محسوس کر سکتا ہے جو اپنے مشغلے کو دنیا کے تمام دوسرے مشاغل سے افضل اور قابل قدر سمجھتا ہے۔

میرا خیال ہے زور صاحب اور بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات شگفتہ نہ تھے۔ ممکن ہے اس کے اسباب اور بھی ہوں لیکن قیاس ہے کہ اس میں اردو بالخصوص دکنی اردو کے ادب اور مشاہیر سے دونوں کے غیر معمولی شغف کو بھی دخل ہو۔ دکنی اردو کو بقیہ ہندوستان سے روشناس کرانے میں دونوں پیش پیش تھے۔ دکنی اردو ادب کو وا نع کرنے میں مولوی صاحب نے پہل کی اس کے بعد زور صاحب یورپ تشریف لے گئے اور وہاں سے جدید علم لسان

اور فنِ تنقید کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے اور ایک ماہر تنقید نگار اور عالم لسانیات کی حیثیت سے جیدآباد کے ادبی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے دکن اور "دکنیات" کو اپنے مختلف النوع تصانیف سے بیش از بیش ترقی دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس بارہ خاص میں دوسرا کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مرحوم نے ادارۂ ادبیات کو انجمن ترقی اردو کے متوازی خطوط پر قائم کیا ہو۔ ممکن ہے یہ محض وہم ہو۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہ دونوں ادارے اردو داں طبقے کی نظروں میں یکساں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

مرحوم نے کثیر التعداد، مختلف النوع اور گرانمایہ تصانیف اور مضامین چھوڑے ہیں۔ ان تصانیف اور مرحوم کے دوسرے شاغل جن میں فرائض منصبی کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی تنظیم کا بھی کام تھا۔ نظر میں رکھئے تو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ اتنے طرح طرح کے فرائض وہ تنہا کس طرح انجام دیتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا شمار اردو کے عظیم خدمت گزاروں میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے تحفظ اور ترقی کے سوا انھو زندگی کے کسی اور کاروبار سے اتنا شغف نہ تھا۔ اور یہ معلومات نہیں ہے۔

مرحوم سے آخری ملاقات کئی سال ہوئے علی گڑھ میں ہوئی۔ جب وہ "علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر" کے پہلے جلسے میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔ مرحوم کے بعض فقروں سے جلسے میں تھوڑی سی گرمی بھی آگئی تھی لیکن وہ اتنے تخلص اور شریف الطبع تھے کہ صلح کا ہاتھ بڑھانے میں بے تکلف پہل کرتے اس لئے ناخوشگواری زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی اور اس طرح جلد گھل مل جاتے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

مرحوم کا صوفیا اور مشائخ گھرانے سے تعلق تھا جس کا وہ بڑا لحاظ رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی رکھیں۔ متذکرہ صدر تاریخ کی پہلی جلد کے ابتدائی ابواب میں سے بعض کے ترتیب دینے کا کام مرحوم نے اپنے ذمے لیا تھا۔ توقف ہونے پر تقاضے کے جو خطوط میں نے لکھے اور جس انداز کے جواب مرحوم نے دئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کے دل میں دونوں کیلئے کتنی گنجایش تھی۔ میں نے ان کی صوفیا اور مشائخ کے گھرانے سے متعلق ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے بعض تفریحی جملے بھی لکھ ڈالے تھے اس کا جواب مرحوم نے اس سے بھی زیادہ تفریحی انداز میں دیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم میں خوش طبعی کا بھی کتنا اچھا ذوق تھا۔

مرحوم کو دکن اور دکن کی ہر چیز سے عشق تھا۔ دکن کی ادبی و تہذیبی اہمیت کو واضح کرنے میں جو خدمات مرحوم نے جن عنوانات سے دیں، مرحوم کے محدود ذرائع اور وسائل کے شاید ہی کسی اور "باشندۂ دکن" نے دی ہو۔ سب سے اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ مرحوم نے اپنے کام کو بڑھانے پھیلانے اور مستحکم کرنے کے لئے ایسے کارکن چھوڑے ہیں جو اس کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے نہ صرف اہل ہیں بلکہ اس پر اپنی اچھی سے اچھی صلاحیتوں کو صرف کرنا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ خدا ان کے عزائم میں برکت دے۔ آمین۔

بڑے آدمی کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے اعلیٰ مقاصد کے انصرام کے لئے کس پائے کے کتنے کام کرنے والے چھوڑے۔ اس اعتبار سے میں مرحوم کو بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ حق مغفرت کرے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

زور — ایک اونچا انسان اور مخلص عالم

یہ غالباً ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے جب ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا دوسرا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا اور اردو سے چند ابنائے محبت کو اردو دوستی کا ڈھونگ رچانے کے لئے قراردادوں کے سلسلے میں اردو کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کی قرارداد بھی پیش کی۔ اس وقت تک ڈاکٹر زور صاحب سے میری ذاتی ملاقات نہیں تھی لیکن خط و کتابت کا رابطہ قائم تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ اردو کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے ہیں۔

جب یہ قرارداد پیش ہوئی تو میں نے اطلاعاً اور بہ سبیل تذکرہ یہ کہہ دیا کہ جناب زور صاحب یہ منصوبہ تیار کر چکے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ بجائے ہم ایک نیا منصوبہ تیار کرنے کی قرارداد منظور کرنے کی بجائے ان کی کمک کریں۔ اس مجمع میں مرحوم سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ہندوستان کے نامی اور عالم حاضر تھے۔ مرحوم پروفیسر محمد شفیع (اس وقت پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور) صدارت فرما رہے تھے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ ان میں سے ذکر حضرات کھٹ کر وہاں ہو گئے۔ اور ایک صاحب نے (اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے) بھپر کر کہا: "زور صاحب کلغیاں میں گرہیں لگا رہے ہوں گے۔ ہمیں تو اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔"

اتفاق سے میرے پاس وہ ساری مطبوعہ سکیم موجود تھی جو زور صاحب نے تیار کی تھی۔ اور انھوں نے ازراہ کرم مجھے بھجوائی تھی۔ میں نے وہ پیش کرتے ہوئے کہا: حضرات یہ سکیم سارے ہندوستان میں تقسیم کی گئی ہے۔ معلوم نہیں آپ تک کیوں نہیں پہنچی! اور اگر پہنچی ہے تو آپ خواہ مخواہ اس کام کے لئے کریڈٹ لینا چاہتے ہیں جو زور صاحب کر رہے ہیں۔

اس پر یہ حضرات جزبز ہوئے اور قرارداد منظور کرلی گئی۔ معلوم نہیں زور صاحب کے منصوبے کا کیا حشر ہوا۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ قرارداد پیش کرنے والے اور زور صاحب پر تعریض کرنے والے اللہ کو پیارے ہو گئے اور اردو انسائیکلوپیڈیا کا خواب شرمندۂ تعبیر ابھی تک نہیں ہو سکا۔ (یہ میرے علم میں ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے) کہنا یہ مقصود ہے کہ میرا پہلا تعارف زور صاحب سے علمی میدان میں اس وقت ہوا جب بہت سے لوگ اردو سے عشق و محبت تو جتاتے تھے لیکن زور صاحب کی طرح عملی کام نہ کر تے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ صرف قراردادوں اور اخباری اشتہاروں پر زور تھا۔

چنانچہ بعد میں زور صاحب نے اپنی علمی سرگرمیوں اور ان کے نتائج سے جب مجھے مطلع فرمانا شروع کیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مرحوم مولوی عبدالحق کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے اول تو اردو کے سلسلے میں علمی سطح پر خود بہت کم کام کیا ہے۔ اور زور صاحب کی ہمت اور جرأت سے شرمائے عار سے مدد لے کر ہی کچھ شائع کیا ہے۔ لیکن زور صاحب نے لندن سے لے کر حیدر آباد (دکن) تک جو اونچی علمی سطح کا کام کیا ہے۔ اس کی نظیر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ میری دانست میں زور صاحب نے یک وقت

(۱) اردو کی اعلیٰ اور معیاری تدریس (۲) اردو کے متعلق تحقیقی کام (۳) ادارۂ ادبیات اردو کا قیام (۴) ادارۂ ادبیات اردو کے کتابخانہ کی
طرف توجہ مبذول کی اس کی مثال پاکستان اور ہندوستان میں اردو کے شیدائیوں کے ہاں نہیں ملے گی۔ اس سلسلے میں زور کا کردار جس قدر مخلص
اور پامردی کا حامل تھا میں نے ایسا کردار اس صدی کے اور کسی ادیب سے نہیں لیا۔ وہ ہر قسم کی تحریص، لالچ اور رتبہ خواہی سے بلند ہو کر
صرف اردو کے لئے جیے اور صرف اردو کے لئے مرے۔

میری باتوں سے شاید مبالغہ کی بُو آئے اور ایک انگریزی مثل کے بقول مقالمہ کرنا بھی مستحسن نہیں ہوتا لیکن بات جب تک مقالمہ تک
نہ پہنچے دلیل قاطع نہیں بنتا۔ اس لئے ذاتی معلومات کی بنا پر صرف ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید کچھ لوگوں کو معلوم ہے کہ تاسیس
پاکستان کے بعد زور صاحب کو بھی پاکستان منتقل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ یہاں آتے تو کیا صورت حالات ہوتی لیکن انھوں نے فوراً
اس دعوت کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ میں ادارہ اور حیدرآباد کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ تقسیم ہند کے وقت میں دہلی میں صوبہ دہلی کا
ڈائرکٹر اوایجوکیشن تھا اور مجھے یہ بیان کرتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس حیثیت سے پہلی دفعہ جامعہ ملیہ اور انجمن ترقی
اردو کی گرانٹ حکومت ہند سے منظور کرائی تھی کیونکہ یہ امور مجھ سے متعلق تھے۔ دونوں گرانٹوں کی منظوری میں فرق صرف اتنا
تھا کہ جب گرامی ڈاکٹر ذاکر حسین آخری وقت تک اس پر اڑے رہے کہ میں گرانٹ کے لئے حکومت ہند کو عرضی نہیں دوں گا
کیونکہ ہم نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ اور میری منت سماجت کے باوجود وہ عرضی دینے پر رضامند ہوئے اور گرانٹ کا تعین حکومت
ہند کو خود ہی کرنا پڑا اور خود ہی جامعہ ملیہ کو گرانٹ پیش کی گئی۔ مولوی صاحب کا یہ وطیرہ تھا کہ میرے وزیر مولانا ابوالکلام
آزاد سے لے کر لیاقت علی خاں کے حق میں نارواباتیں کہتے تھے اور اُدھر گرانٹ کے لئے دھڑا دھڑ عرضیاں دے رہے تھے۔
بالآخر میری وساطت سے یہ امر بخوبی طے پا گیا اور انجمن ترقی اردو کو پہلی دفعہ گرانٹ ۱۹۴۷ء میں دی گئی۔ میں اتفاق
سے رہتا بھی دریا گنج میں مولوی صاحب کے قریب ہی تھا۔ انجمن کو گرانٹ ملنے کے چند دن بعد تقسیم ہند کی خبر عام ہوئی تو
میں نے مولوی صاحب کو اُن کے رفقائے کار (بالخصوص مولوی عبدالرشید) صاحب کے توسط سے یہ کہلوایا کہ آپ کو اب پاکستان
کا رخ کرنا چاہیے۔ لیکن مولوی صاحب نے حسب معمول بڑی نخوت اور حقارت سے پاکستان پر دو حرف بھیجے اور دریا گنج (دہلی)
میں ڈٹے رہے۔ میں اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلا آیا۔ بعد میں جیسا کہ عام لوگوں کو معلوم ہے انجمن کا دفتر اور کتب خانہ
غلط بیں لوگوں کی آتش اشتعال کی نذر ہو گیا اور مولوی صاحب بھاگ کر پاکستان آ گئے۔ اور زور صاحب کے علی الرغم
یہاں آ کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان صرف اردو کی وجہ سے بنا ہے اور ہندوؤں سے بنائے مخاصمت ہی اردو بھی۔
[حالانکہ عام لوگوں کو معلوم ہے کہ انجمن ترقی اردو اور اردو زبان و ادب کے سرپرستوں میں بڑے بڑے نامور لوگ مثلاً
سر تیج بہادر سپرو، خود پنڈت جواہر لعل نہرو) اور کئی ادیب اور شاعر ہندو تھے] اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ
چند سال پیشتر آپ نے اسلامیہ کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: جب میں ہندوستان کو چھوڑ نہیں رہا تھا مولانا
ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ اگر تم پاکستان نہ گئے تو تمہارے مکان میں یا تو فلک یا چرس رکھوا کر تمھیں پکڑوا دیا جائے گا۔
اب ان دونوں بزرگوں کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے لیکن میں اور بہت سے اور دوست اس بات کے گواہ ہیں کہ زور صاحب
کے برخلاف جب آپ کو پاکستان آنے کی دعوت دی گئی تو آپ نے یہاں آنے سے انکار کر دیا لیکن جب جان پر بنی تو
ہندوستان سے فرار کیا اور یہاں پہنچکر "اردو" کا نعرہ اس جوشیلے اور غلط انداز میں لگایا کہ لوگوں کو اس سے

فطرت ہونے لگی اُن کے مقابلے میں زور بہت اونچا اور علی انسان تھا جس نے اردو دوستی میں کچھ اس انداز سے کام کیا کہ اردو ان حلقوں میں بہت محبوب ہے جہاں زور کا اثر موجود تھا۔

زور صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں انگلستان سے ۱۹۳۹ء میں واپس آیا۔ اب یہ صحیح طور پر یاد نہیں کہ سن ۱۹۴۰ء تھا یا اس کے بعد وہ غالباً کشمیر جا رہے تھے اور لاہور چند دنوں کے بعد رُکے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے مکان پر دعوت تھی اور ڈاکٹر صاحب نے بے تکلفی کا ماحول برقرار رکھنے کے لئے زور صاحب کے علاوہ صرف مجھے ہی سرفراز فرمایا تھا۔ گرمی کا موسم تھا لیکن سیاہ کاجریں ابھی تک مل رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غذا میں لاہوری عنصر شامل کرنے کے لئے ان کی کانجی بنائی ہوئی تھی۔ زور صاحب نے کئی گلاس پیئے اور اس لاہوری دعوت کی بڑی تعریف کی۔ اُس زمانے میں زور صاحب بڑے جوان اور توانا تھے۔ اردو ادب سے لے کر سیاسیات حاضرہ تک گفتگو رہی۔ اُس وقت وہ ادارہ ادبیات کے کتاب خانہ کی تاسیس میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کر رہے تھے۔ پھر غالباً ۱۹۵۰ یا ۱۹۶۰ء میں وہ لاہور تشریف لائے۔ اب وہ پیری سے ہم کنار ہو رہے تھے مفصل صحبتیں رہیں اور میں نے یہ محسوس کیا کہ تیور اور دم خم وہی ہے۔ لاہور میں اب اردو کے نظام مرکزی نے چاہنے والے پیدا ہو چکے تھے ۲۵ سال صدی کی چوتھائی ہوتی ہے۔ میرا تعلق خاطر زور صاحب سے اس عرصے سے تھا۔ جب نئے عشاق زور صاحب سے معرکہ استفسارات گرم کرتے تو کبھی کبھی میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے "بمبئی آپ نے ڈاکٹر صاحب کے وہ مقالات نہیں پڑھے جو انھوں نے اردو کے قدیم کے متعلق لکھے ہیں" اور کچھ لوگ چونک چونک جاتے۔

زور کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ اور اُن کے کچھ علمیات بھی۔ افسوس ہے اس وقت میں مری میں ہوں جہاں میرا کتاب خانہ مجھ سے دور ہے اس لئے میں صرف یہ چند حروف زور کی یاد میں لکھ سکا ہوں۔ اور یہ بالکل ذاتی اور نجی چیزیں ہیں۔ کبھی فرصت ملی تو اُن کے علمی مرتبہ کے متعلق پھر کچھ عرض کروں گا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی

ایک تاثر

ڈاکٹر زور صاحب کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سچائی کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں جو ہر بڑے آدمی کے متعلق تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ اب تک کہی جا چکی ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے اپنی ان تھک محنت سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کی سیرت آنے والوں کے لئے ایک نمونہ بنی رہے گی وغیرہ!

مجھے اس قسم کی کوئی بات عرض نہیں کرنی ہے کیونکہ زور صاحب کی عوامی زندگی اور علمی ادبی خدمتوں سے بے شمار لوگ واقف ہیں۔ اور بہت عمدگی سے اس زندگی اور ان خدمات کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف وہ واقعات اور وہ تاثرات لکھنے جا رہا ہوں جن سے مجھے زور صاحب کے قریب آنے کے بعد سابقہ پڑا۔ اور جن کی وجہ سے وہ مجھے بڑے آدمیوں میں بھی بڑے نظر آنے لگے۔

میرے والد حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم ڈاکٹر زور صاحب کے بڑے قدر داں تھے۔ ان کے "ادارۂ ادبیات اردو" کو "ایوانِ اردو" کا خطاب ۱۹۲۶ء میں خواجہ صاحب ہی نے دیا تھا۔ اور ڈاکٹر زور صاحب بھی خواجہ صاحب سے بڑا خلوص رکھتے تھے۔ اس لئے ہوش سنبھالنے کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے دلّی اور حیدرآباد میں ملنے کا اکثر اتفاق رہا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے اور میں ان سے اسی ادب اور احترام کے ساتھ ملتا جس ادب اور احترام کے ساتھ مجھے اپنے والد کے دوستوں سے ملنا چاہئے تھا۔

لیکن والد کے انتقال کے بعد دسمبر ۱۹۵۵ء میں میں حیدرآباد گیا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوا تو وہ بالکل نئے انداز میں مجھ سے ملے۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس انداز میں بڑے بھائی کی جھلک زیادہ ہے یا بے تکلف اور مخلص ترین دوست کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد ملاقات میں ان کی بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ اور مجھے ان کو کسی قدر قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور جتنا میں ان کے قریب ہوا اتنا ہی ان کی بڑائی کا احساس زیادہ ہوتا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ خامیاں بھی یقیناً ہوں گی۔ لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو مجھے ایسا نظر آیا جو غالباً سب پہلوؤں سے نمایاں تھا۔ اور جس کی وجہ سے ان کی ہر خوبی میں چار چاند لگ جایا کرتے تھے اور ہر کمزوری نظر کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جب خلوص برتتے تھے تو اس میں بناوٹ اور دکھاوے کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ کہنے کو یہ بات معمولی سی ہے۔ لیکن اس کا علم کچھ ڈاکٹر صاحب کے خلوص سے آشنا ہونے کے بعد ہی ہوتا تھا کہ روزمرہ ہم جس قسم کے خلوص سے سابقہ رہتا ہے۔ اس میں کتنے فی صدی تکلف کی ملاوٹ ہے۔ کتنے فی صدی

مروت کا لحاظ ہے۔ کتنا دکھاوا ہے کس قدر منافقت ہے اور اس کے بعد اصل خلوص کی مقدار کتنی رہ گئی ہے! ڈاکٹر زور صاحب کے خلوص میں منافقت اور بناوٹ تو کیا، مروت اور تکلف کو بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ وہ بڑے عملی آدمی تھے۔ تھوڑے وقت میں بہت سارا کام کر ڈالتے تھے۔ اور اس کا راز ان کی محنت کے علاوہ غالباً یہی تھا کہ وہ ادھر اُدھر کی بیکار، فضول اور لاگ لپیٹ کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہر بات اور ان کا ہر کام ٹو دی پوائنٹ (To the Point) ہوتا تھا۔ ان کے اس خلوص میں اس قدر شدت تھی کہ بعض اوقات اپنی باغ و بہار طبیعت کے باوجود اجنبی آدمی کو وہ کچھ اکل کھرے سے معلوم ہونے لگتے تھے۔

ہر آدمی کے دل میں نیاں کام کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ تاکہ وہ سب کے سامنے آسکے اور اس کو خوش حالی میسر آئے۔ یہ جذبہ کچھ برا جذبہ نہیں ہے لیکن اس جذبے کو ہماری تہذیب کے تکلفات اور بناوٹوں نے ایسا گھیر رکھا ہے کہ کچھ لوگ تو بے غرض کام کے نام پر اغراض پوری کرکے اپنے آپ کو ساری عمر دھوکا دیتے رہتے ہیں اور کچھ یا تو خاکساری کے مارے کچھ کام نہیں کر پاتے یا چوروں کی طرح میدان میں آتے ہیں۔ اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس جذبے کی شدت میں ایسے حد سے آگے بڑھتے ہیں کہ شہرت طلبی کی تہمت ان کے سر دھری جاتی ہے اور ان کے اچھے کام کو بھی بنا بہت بے اعتنائی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خلوص اس بہت کدۂ آذری میں ابراہیمی انداز رکھتا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب نے جن جن لوگوں سے کام لیا اور جن جن کو وہ کچھ بنا گئے" ان سب کو انھوں نے پہلے کام کے مقصد اور اصلی خلوص سے آگاہ کیا۔

بے تکلفی کی پہلی ہی ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر واضح کر دیا کہ "حسن میاں ہم اس دنیا میں کچھ کام کرنے آئے ہیں اور یقیناً کام کریں گے اس کا پورا پورا معاوضہ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو ہم کو ملنا چاہئے۔ اس لئے کام کرو اور ایسے سلیقے سے کرو کہ وہ کام دنیا کو نظر بھی آئے اور لوگ اس کو دیکھ کر فائدہ بھی اٹھا سکیں اور تم کو اس کا کسی نہ کسی شکل میں معاوضہ بھی ملے!"

ایک دفعہ میں ہندوستان کے مشہور آرکی ٹیکٹ برادرم مولوی فیاض الدین فیاضی صاحب کے بلاوے پر اورنگ کو اطلاع دئے بغیر حیدرآباد گیا تھا تاکہ کچھ دن سکون کے ساتھ حیدرآباد کے موسم اور خلوص کا لطف اٹھایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ "رفعت منزل" پہنچا تو مجھے دیکھ کر بہت بگڑے کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ نہ تمھارے آنے کی خبر اخبار میں چھپی نہ کسی مخلص کو خط سے اطلاع ملی۔ یہ ڈھنگ اچھے نہیں۔ میں نے ہنس کر عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ ہم لوگ پیدا ہونے سے پہلے ہی خواجہ صاحب کے روزنامچے میں چھپنے لگے تھے اس لئے چھپنے اور شائع ہونے کا شوق نہیں رہا! کہنے لگے نہیں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ مجھے شمالی ہندوستان میں خواجہ صاحب نے بہت متعارف کرایا، میرے تعارف سے لوگ "ادارۂ ادبیات اردو" سے واقف ہوئے اور اس واقفیت نے سب کو فائدہ پہنچایا۔ تم بھی ایک مشن اور ایک کام سے وابستہ ہو۔ اس لئے خواہ مخواہ کی خاکساری دکھا کر آنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مشن کو نقصان پہنچاتے ہو جس میں ملنا جلنا بہت ضروری ہے۔ تم کو تفریح کے وقت بھی کام کو یاد رکھنا چاہئے۔ آج کل کٹیا میں بیٹھنے سے تصوف کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی!

ڈاکٹر صاحب حیدرآباد کے ایک مشہور قادری بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے بجائے اپنے بڑے فرزند حضرت میاں تقی الدین صاحب کو گدی پر بٹھادیا تھا اور خود اپنے لئے کام کی دوسری اور ذرا آزاد روش مقرر کرلی تھی جس سے سب واقف ہیں۔ چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب دلی آئے اور معمول کے مطابق میرے ساتھ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں بھی حاضری دی۔ وہ روضے شریف کے اندر فاتحہ پڑھ رہے تھے اور میں باہر کھڑا تھا۔ اتنے میں کسی خادم نے مجھ سے پوچھا کہ اندر کون صاحب ہیں؟ میں نے بتایا کہ حیدرآباد کے فلاں مشہور بزرگ کے صاحبزادے ہیں اور یہ تمام ہے۔ خادم صاحب بڑے منہ پھٹ تھے۔ انھوں نے بڑی بدتمیزی سے ایک فقرہ کہا جسے ڈاکٹر صاحب نے بھی روضے کے اندر سن لیا۔ تھوڑی دیر بعد مسکراتے ہوئے باہر نکلے اور بڑی زندہ دلی سے پوچھنے لگے کہ یہ شخص تم سے کیا دریافت کر رہا تھا۔ میں نے کہا آپ کو پوچھتا تھا۔ میں نے بتادیا کہ فلاں صاحب ہیں۔ بولے اور کچھ؟ میں نے عرض کیا اور کچھ بھی نہیں! خوب ہنسے اور کہنے لگے کہ حسن میاں! میں نے اس کا ریمارک سن لیا ہے مگر ایک دفعہ تمھاری زبان سے اور سننا چاہتا ہوں تکلف نہ کرو کہہ دو! چنانچہ مجھے کہنا پڑا کہ خادم نے یہ کہا تھا کہ "یہ بزرگ کے صاحبزادے ہیں؟ شکل سے تو ایکٹر معلوم ہوتے ہیں!" ڈاکٹر صاحب پھر خوب ہنسے اور اس کے بعد ایک دم سنجیدہ ہوگئے اور کہنے لگے "کیسی سچی بات کہی اس نے! بالکل ٹھیک کہا! مگر افسوس کہ اس کو یہ خبر نہیں ہے کہ وہ خود بھی ایکٹر ہے۔ ہم سب ایکٹر ہیں۔ اور اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ مگر کسی کو اپنے پارٹ کی خبر ہے۔ کسی کو نہیں۔ شکر ہے کہ میں اپنا پارٹ جانتا ہوں! مگر آئندہ تم کسی سے میرا یہ "بزرگانہ" تعارف نہ کرانا۔ یہ تعارف تقی میاں کے لئے مخصوص رکھو۔ کیونکہ انکو یہی پارٹ کرنا ہے۔ میرا پارٹ دوسرا ہے!"

پھر کہنے لگے کہ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ تقی میاں کچھ دن تمھارے ساتھ رہیں اور تم میرے ساتھ رہو۔ تقی میاں یہاں رہیں گے تو ان میں طریقت اور شریعت کا ذوق پیدا ہوگا۔ اور تم میرے ساتھ رہوگے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ دنیا سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ تم نہ لمبا کرتا پہنتے ہو۔ نہ سر کے اور ڈاڑھی کے بال بڑھاتے ہو۔ نہ پیروں اور مرشدوں کی طرح بزرگی کرتے ہو اور شوق یہ ہے کہ کچھ بزرگوں کے مشن کا کام کریں! مجھے اس نصیحت پر ہنسی آگئی۔ کہنے لگے کہ تم ہنستے ہو! واقعی یہ بات ہنسی کی بھی ہے کہ ایک معقول کام اور معقول طریقے کو لوگوں نے تماشا بنا لیا ہے مگر یاد رکھو خاص وضع قطع اختیار کئے بغیر لوگ تم سے متاثر نہیں ہوں گے اور متاثر کئے بغیر تمھیں کامیابی نہیں ہوسکتی!

مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس آخری رائے سے اختلاف تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کام کے متعلق جو اصول انھوں نے بنا رکھے تھے۔ یہ مشورہ ان کے عین مطابق تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے شاید ڈیڑھ دو ہفتے پہلے "ایوان اردو" حیدرآباد میں قوالی کی مجلس ہوئی۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ اور بچے سب کشمیر میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب اکیلے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے انہی دنوں میں بھی حیدرآباد پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب افسردہ سے تھے۔ نشست کی چوکی کے پاس خلاف معمول سوٹ کیس رکھا تھا۔ اور کمرے کے دوسرے کونوں کے دروازے بند تھے۔ کہنے لگے دیکھو گھر میں بھی یہ رکاب ہوں! طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ تم آگئے بڑا اچھا ہوا۔ ایوان اردو میں قسمہ کے بعد سے اب تک قوالی کی کوئی مجلس نہیں ہوئی ہے۔

ایک زوردار محفل ہو جائے۔ چنانچہ پروگرام بنا اور حیدرآباد کے بہت سے عمائد اور مشائخ مدعو کئے گئے۔ اور عزیز احمد خاں کی قوالی ہوئی (افسوس ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں "ایوان اردو" کی یہ آخری مجلس تھی!) ڈاکٹر صاحب کے ہاں جب بھی محفل ہوتی تھی ان کے بڑے فرزند تقی میاں صاحب کو مشائخ کے ساتھ صدر میں بٹھایا جاتا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب خود الگ مودب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس دفعہ تقی میاں کشمیر میں تھے۔ اس لئے میں نے بڑے اصرار سے ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاس بٹھایا اور قوالی میں نذریں ان کی طرف بڑھانی شروع کیں تو وہ بہت جز بز ہوئے۔ بار بار میرا ہاتھ دباتے تھے اور جھک کر کان میں کہتے تھے کہ مجھے نذر نہ دو۔ یہ میرا کام نہیں ہے!

ڈاکٹر صاحب کو اگر محض بڑا بننے کا شوق ہوتا تو وہ اپنے والد کی گدی نہ چھوڑتے۔ سجادہ نشیں ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے علمی اور ادبی مشاغل جاری رکھ سکتے تھے۔ اردو کی تو تاریخ ہی سجادہ نشینوں اور صوفیوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن انھوں نے دوسری روش اختیار کی اور اس روش کا حق کسی شریک کے بغیر اس طرح ادا کیا کہ ایک دنیا جانتی ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی پرخلوص رنگ تھا جسے دیکھ کر دل میں ان کی عزت دن بدن بڑھتی ہی جاتی تھی اور جب وہ کام کے معاوضے کی تلقین کرتے تھے تو نیچے ہونے کے بجائے اور بلند ہو جاتے تھے!

اُردو کے نامی گرامی قلمکار اور خدمت گزار ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی فنی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بڈھوں کے بارے میں تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن یہاں تو آئے دن بڑے بڑے کڑیل جوانوں کو رونا پڑتا ہے مگر موت کی اس گرم بازاری کے باوجود یہ خیال کسی کو نہیں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور بھی یوں آناً فاناً ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے کام نے اور اُن کی رفتار کی توانائی نے اور ان کے زندگی بخش ولولے نے سب کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نوجوانوں سے زیادہ جوان اور زندوں سے زیادہ زندہ ہیں۔ موت ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔ لیکن موت آئی اور ایسے دبے پاؤں آئی کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد ہی چونک بھی سکے۔ بچانے والوں کو یہ حسرت ہی رہی کہ کاش کچھ کوشش تو کر سکتے: نتیجہ جو بھی ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے لئے کچھ کرنے کا ارمان تو ضرور نکل جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے کشمیر یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمنٹ کو سنبھال رکھا تھا۔ وہیں یکایک دل کا دورہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایوان اردو کو سنسان کر گئے۔ اللہ اردو والوں کو صبر دے اور جانے والے کی مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "منادی" نمبر ۹-۱۰-۱۹۶۲ء)

ابوالبیان محمود عبدالقدیر (نظامی)

زور مشاعروں میں

سچ ہے :—

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ، دوم خاکِ گور

آہ! کس کو خبر تھی کہ ہمارا زور اپنی بہتر قابلیت اور اچھی صلاحیتوں کا ثبوت دینے وادیٔ کشمیر پہنچے گا۔ اور وہاں اس طرح سلب ہو جائے گا کہ ہم بدیدۂ پرنم اس کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے بھولی بسری باتوں کو طاق نسیاں سے ٹٹول کر پیش کر رہے ہیں کہ زور کے کاروان حیات کا ہر غبار آئینۂ تاریخ پر محفوظ رہے۔ چنانچہ جب مجھ سے میرے احباب نے سب رس کے زور نمبر میں کچھ لکھنے کے لئے ارشاد فرمایا تو میں عجیب کش مکش میں پڑ گیا کہ آخر ایسے شخص کے لئے جو دنیائے ادب اردو میں اپنے زور قلم سے ادب قدیم و جدید کے ایسے دریا بہا دیئے کہ جس کا نام ادبیات اردو کے سلسلہ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ جو بلاشبہ زور کے نام کے ساتھ زندۂ جاوید رہیں گے۔ جس کے آثار بے تک عیاں ہیں اور یقیناً بیان ہوں گے۔ مگر وہ خاک پر زور جو ایک خطۂ سر دم خیز قندھار سے بگولہ بن کر اٹھی۔ مکتب نظامیہ میں بجلی بن کر چمکی اور دارالعلوم پر گھٹا بن کر چھائی اور وہی گھنگھور گھٹا جامعہ عثمانیہ پر رحمت کی طرح ایسی برسی کہ پھر فضائے ادب میں آدم آخر اپنی ضیا پاشی سے اوراق کو منور کرتی رہی اور پھر ظاہر ہے کہ علوم جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد زور نے اپنی ذہنی کاوشوں سے جو شہ کار چھوڑے وہ سند دوام حاصل کر چکے۔ اس پر یقیناً ان کے کالج کے ساتھی۔ رفقائے ادارہ اور ایوان اردو کے نمائندین روشنی ڈالیں گے۔ مگر یہ تمام علمی بوجھ جس کندھے پر فطرت کو ڈالنا مطلوب تھا اس کی بنیاد جس کردار پر تھی اور اس کا نشو و نما جس آب و ہوا پر ہوا اس کا ورق بھی الٹ لینا موجودہ قنوطیت میں طلباء کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوگا۔ اس لئے میرے دلی وجانی دوست زور مرحوم کے ان مشاعروں کا تذکرہ اجمالاً کروں گا جس میں ہم شریک رہے۔

زور کے والد محترم حضرت زعم اپنے وطن مالوف قندھار شریف سے زور کو ساتھ لاتے ہیں۔ ۱۹۱۹-۲۰ء کا زمانہ ہے۔ میں اور زور مدرسہ نظامیہ کی یکجائی کی وجہ سے مسجد چوک کے کتب خانہ میں ملتے اور وہیں طبع آزمائی ہوتی۔ زور کے والد محترم حضرت زعم خود بھی ایک اچھے شاعر تھے جس کی وجہ سے زور کی طبیعت پر بھی شاعرانہ زور غالب تھا۔ اب زور میرے ساتھ نصاب مولوی کی تکمیل کر کے میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک دفعہ ہم دونوں افضل گنج کے چمن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ایک ہمارے ساتھی تشریف لائے۔ یہ بھی فن ادب سے دلچسپی رکھتے اور اخبارات میں مضامین لکھتے تھے۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ بارہ دری چندولال میں طرحی مشاعرہ ہے جس میں ؎

جس گھر میں پھوٹ ہوگی وہ گھر خراب ہوگا

مصرعہ ہے۔ جوں ہی زور نے سنا اپنی خاص مسکراہٹ و انداز سے میری طرف دیکھ کر کہا چلو قدیر بھائی اس مشاعرہ میں غزلیں سنائیں گے۔ میں نے بھی سر ہلا دیا۔ بس ہم نے وہیں سونٹھ کی ناس لی اور الگ الگ فکر کرنے لگے۔

ابھی مشاعرہ کے لئے دس روز باقی تھے غزل کی فکر ہو رہی ہے۔ زور مجھ سے اور میں زور سے گرید گرید کر قافیے اور مصرعے پوچھ رہے ہیں۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ حضرت زعم، زور کو پُر زور کریں گے۔ اور زور سمجھتے ہیں کہ میرے فارسی کے استاد حضرت علامہ رضی الدین کبھی میری غزل میں کیف بھریں گے۔ چنانچہ عین مشاعرہ سے چند گھنٹے قبل جب ہم دونوں ملے تو آپس کی فکر بازی نے مجبور کر دیا کہ ایک دوسرے کو غزل سنا دیں۔ زور نے غزل سنائی۔ پھر میں نے بھی اپنی غزل سنائی۔ مجھے میری غزل کا ایک شعر یاد ہے۔ اور زور کی غزل کا بھی ایک ہی شعر یاد رہا۔ جس کے یاد رہنے کا سبب آپ بھی سنیں گے تو بہت لطف اٹھائیں گے۔ اس مشاعرہ میں شرکت سے پہلے ذرا ہماری حالت بھی دیکھ لیجئے کہ ہم نے بچپن کو خدا حافظ کہہ کر لڑکپن کے کھیل کود کو سلام کرنے کا زمانہ محسوس کر لیا ہے جس کو تمدن و تہذیب میں شاید عنفوان شباب کہا جائے۔ اللہ غریق رحمت کرے زور کا حسن و جمال جو آخری زمانہ میں حسن مقدس تھا تو اس زمانہ کا اندازہ لگائیے کہ وہ کیسے گلاب کی پنکھڑی ہوں گے اور میں بھی اپنا کیا سمجھئے کہ ؎

جمالِ ہم نشیں بر من اثر کرد

کچھ جامہ زیب ضرور تھا۔ بہر کیف وقت آیا اور ہم دونوں چلے۔ پہلے مشاعرہ کا مقام دیکھئے کہ بارہ دری کی اونچی کرسی کے بڑے دو ہال جس کے سامنے لبالب حوض میں چمک چاندنی نے آسمان کو زمین دوز کر دیا ہے اور دو دھ باؤلی کے دروازہ سے بارہ دری تک بجلی کے گولے ہر پچاس قدم پر دودھ ہی دودھ اگل رہے ہیں۔ بارہ دری میں بہترین سفید فرش گاؤ تکیے اور اس کا لوازمہ جما ہوا ہے جب ہم وہاں پہونچے تو دیکھا کہ اس وقت کے نامور اساتذہ حضرت ضیاء گورگانی دہلوی، حضرت جلیل، حضرت ثاقب، حضرت ضیغم، حضرت برتر، حضرت ضامن کنتوری، حضرت کیفی، حضرت ساقی، حکیم ظہور احمد صاحب، جناب صغیر صاحب وغیرہ سب جمع ہیں اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی غزل کا انتظار ہے۔ غزل آئی اور نرنگ راج عالی نے ان کی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا اور اب مبتدی شعرا پکارے جانے لگے۔ ایک فرنگی عرب شاعر تھے وہ بیٹھے ان کے بعد دو ایک طلبا بھی بیٹھے۔ یہ غریب داد کیا پاتے بلکہ آگ۔ گولہ شمع کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ اب ایسے میں سید محی الدین قادری جناب زور پکارے گئے مجوزہ ہیئت سفید ملبوس سے ملکف سر پر بانکی ترکی ٹوپی سجائے صبا رفتار شمع کے قریب تشریف لے گئے مطلع پڑھا اور اس کے بعد یہ شعر سنایا ؎

اپنے کئے پہ ظالم کیوں اس قدر ہے نازاں
ہم کو خراب کر کے تو بھی خراب ہو گا

زور سخت اللفظ پڑھتے اور اس زمانہ میں یہی شائستگی سمجھی جاتی تھی جب "خراب ہو گا" اپنی گرجدار آواز سے کہا تو مجمع کے ایک کونہ سے آواز آئی "ہائے میری جان کس نے" بس مشاعرہ میں ایک آن قہقہہ پڑا اور ساتھ ہی اہل ذوق برہم ہوئے کہ یہ کون ہے۔ پکڑو۔ پھر ایک مشہور مغل پوشاک کے شخص ہاتھ باندھ گردن جھکائے سامنے لائے گئے اور ابراہیم خاں صاحب صدر امین نے کچھ ان کی مرمت کی اور پھر طوفان بدتمیزی تھما تو راقم الحروف کو پکارا گیا۔ اب یہاں میرا سانس پھولنے لگا کہ الٰہی وہ ذات شریف تو قہر الٰہی کی طرح محفل میں موجود ہے۔ میرا غنچہ طبع سا تھی اس طرح عرق عرق ہو گیا ہے کہ ہمارا آئندہ مشاعروں میں جانا ختم ہے گویا یہ پہلا مشاعرہ ہمارے حق میں آخری مشاعرہ ہے اور میں نے یہ تصفیہ کر لیا کہ اب غزل پڑھنے سے انکار کر دیا جائے۔ لیکن حضرت کیفی اور حضرت ضیاء گورگانی نے اصرار آیا۔ فرمایا مجھے بھی میرا مطلع یاد نہیں

گردوشعر کے بعد جب یہ تیسرا شعر پڑھا ؎

ان بے وفاؤں کو کیا گن سکے گا کوئی
تیرا حساب ظالم یوم الحساب ہوگا

پس یوم الحساب کا قافیہ زبان سے نکلنا تھا کہ اس اللہ کے بندے نے اک زور کا نعرہ "اللہ اکبر" بھی سے "ایسا کہا کہ مجھ پر ایک بجلی گری۔ مگر اتفاق ہی حضرت نعم کے کہتے پر لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور مشاعرہ درہم برہم ہوگیا اور وہ صاحب کہاں کہاں دست بہ دست دگراں باہر نکال دیئے گئے اور اس گڑبڑ میں ہم دونوں بھی باہر نکل گئے اور آتے ہوئے یہ سوچ۔ بچار ہونے لگا کہ مشاعروں کو ان غیر شائستہ عناصر سے کیسے محفوظ رکھا جا سکے گا۔

زور کی یہ رائے تھی کہ مشاعرے دعوت ناموں تک محدود رہیں اور طلبا کے داخلہ کے لئے اساتذہ کی سفارش لازم کی جائے۔ اسی اصول پر ہم نے تفصیلات سوچیں اور دوسرے روز حضرت علامہ نیاز فتحپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ اسی اصول پر ایک اور طرحی مشاعرہ عید کی خوشی میں حضرت نیاز کی صدارت میں یہ طرح ۔ ؎

عید آتی ہے تو کیا لاتی ہے

یہ دلیڑھی فیروز یار جنگ قرار پایا۔ زور پیدائشی منتظم اور اپنے ساتھیوں سے کام لینے میں ماہر تھے۔ چنانچہ افسر اور نواب حمید الدین عمر کو بھی انھوں نے ساتھ لے لیا۔ تقریباً دو سو رقعے تقسیم کئے گئے مشروبات کا انتظام بھی رکھا گیا اور مشاعرہ کا وقت پانچ ساعت سے مقرر کیا گیا تھا۔ وقت مقررہ پر دو شعرا کرام جن کی تعداد (۲۱) یا (۲۲) ہوگی جن میں حضرت صدر کے ساتھ ان کے تلامذہ مرحوم صفی اورنگ آبادی اور مفتی ہادی جناب اشرف علی صاحب اشرف اور اساتذہ میں حضرت نیاز، گورگانی، نواب تسنیم علامہ نیاز فتحپوری، مولانا عجیب، نثر صاحب عجیب، مولانا ابوالحمید صاحب آزاد، حضرت فروغ، حضرت باغ اور ان کے ساتھ دوسرے شعرا جناب محمد حسین صاحب آزاد، جناب رنگ اور جناب صغیر صاحب وغیرہ بھی موجود تھے۔ تقریباً مغرب تک بجز شعرا سامعین میں صرف ایک جناب عمر یا فعی صاحب اور چار محلے کے دوست موجود تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد حضرت نیاز کے ارادہ پر مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ چنانچہ افسر نے اپنی غزل پڑھی مطلع سے تخلص تک اساتذہ ہر شعر پر سر ہلاتے۔ کوئی خوب فرمایا تو کوئی "اچھا آگے چلئے" ارشاد فرماتا اور ہم دم بخود اساتذہ کے سامنے ٹک ٹک دیکھتے رہے کہ کہیں ہماری آہ یا واہ کو بے ادبی نہ سمجھیں۔ افسر عمر وہ بھی موقع جنھیں اپنی ادبیت کا بہت خیال تھا۔ تیوری چڑھائے ہوئے ہمارے بازو بیٹھے بیٹھے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ لوگ تو بہت بنے ہوئے ہیں۔ افسر کے بعد حمید الدین عمر نے اپنی غزل سنائی۔ ان کی غزل پر حضرت فروغ نے کچھ داد و تحسین کا اظہار بھی فرمایا تھا کہ حضرت رنگ نے فرمایا کہ ماشاء اللہ استاد ہی کا رنگ معلوم ہوتا ہے۔ عمر میاں خدا نور جت کرے بڑے غیور تھے تین ہی شعر پر غزل ختم کی اور اٹھ گئے۔ میں اور زور دم بخود تھے کہ ایسا روکھا پھیکا مشاعرہ گزر رہا ہے۔ ایسے میں جناب قبلہ مجیب متخلص مشاعرہ کے فرائض انجام دے رہے تھے بھائی زور کو پکارا۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر غزل سنبھالے ہوئے چلے تھے کہ حضرت فروغ نے کہا کہ نعم کے ساتھ جو زور آرہے ہیں شعرا میں بہت ہی نازک مسکراہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور انھوں نے اپنی غزل سنائی۔ اب حضرت نعم بھی خاموش سن رہے ہیں کہ محمد حسین صاحب آزاد نے زور کے مصرعہ ؎

موت کیا بار بار آتی ہے

پر داد دی اور بار بار کے قافیہ پر دوبارہ زور دیا اور بار کہہ بجائے "باد" کہہ دیا جس سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور فوری زور بھاگ

تیوری چڑھائے ہوئے سلام کرکے اپنی جگہ پر آ گئے اس کے ساتھ ہی راقم الحروف کا نام مفید صاحب نے پکارا " قدیر نواب ترنم سے " میں اپنے استاد ضرت ضیا کی طرف دیکھا ہی تھا کہ شہزادگی کی شان و متانت سے تیوری چڑھا کر فرمایا کہ " کیا سازندوں کو بھی بلوایا ہے " اب کیا بتاؤں اور کیا لکھوں کہ مجھ پر کیا عالم طاری تھا۔ گردن جھکائے ہوئے میں نے تحت اللفظ ایک ہی سانس میں غزل سنا دی۔ اس زمانہ میں ترنم سے پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ مگر نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی جو داغ اسکول کے بڑے استاد تھے ہمیشہ ترنم سے ہی پڑھتے۔ مگر وہ ہمارے قدیم وضع دار بزرگ خوش الحانی کو کلانوت کی میراث سمجھتے اور بہت بڑا عیب مانتے بہرکیف استاذہ نے اپنا اپنا کلام سنایا اور خوب بنا کھول کر ایک دوسرے پر داد و تحسین کے پھول برسائے۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہی رہ گئے۔ کچھ پلے کا رہ دہلا۔ اساتذہ تشریف لے گئے۔ اور ہم ایک دوسرے پر برستے تھے۔ افسر نے یہاں تک زور صاحب سے کہدیا کہ میری غزل حاصل مشاعرہ تھی مگر تم لوگوں نے جان بوجھ کر خموشی اختیار کی اور غضب تو یہ ہوا کہ ٹوکا تک نہ۔ ہم نے کہا تھا کہ آپ کہہ رہے تھے کیا خدمت تھی کہ آپ کہہ دیتے اشعار پر داد دیتا۔ چلو سہلاؤ آئندہ ٹھیک ہوں گے اور نہ مشاعرے۔

اب ہم نے پھر وہی کہ مشاعرہ کی عمومیت جس میں اصحابِ ذوق کے ساتھ شوخ و شنگ لوگ جمع ہو جاتے ہیں بہتر ہے یا یہ دعوت ناموں کے مشاعرے جہاں مبتدی آہ و واہ کی ہمت بھی نہ کر سکیں؟ پس اسی طرح ہم مشاعروں میں شریک ہوتے اور ایک آخری مشاعرہ جو یادگار ہے لکھ کر قلم کو تباہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ سٹی کالج اپنی جدید عمارت میں منتقل ہو چکا ہے اور یہاں جناب اعظم صاحب (اعظم یار جنگ) کی صدارت کا دور دورہ ہے۔ سر اقبال کا یہ مصرعہ طرحی ہے ؎

اے عندلیب اب تک نالہ ہے خام تیرا

یہ مشاعرہ علامہ سید ریاض حسین نظم طباطبائی کی صدارت میں منعقد ہوا ہے۔ زور کالج میں شریک ہیں اور اپنے استاذ مولانا وحید الدین سلیم کے منظورِ نظر ہیں اور اپنا اچھا اثر ان پر رکھتے ہیں اور مشاعرہ میں بالکل مولانا سلیم ہی کی طرح تحت اللفظ پہنچ ہی گرجدار آواز میں پڑھتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں تلمیذانِ حضرت سلیم اکثر موجود ہیں۔ میں اس زمانہ میں مدرسۂ نظامیہ سے نکل کر گورنمنٹ لا کلاس اور مشیر قانونی رائے بہادر صاحب کے ہاں منعقین ہوں اور قانونی شغف کا آغاز ہے۔ مجھے اس مشاعرہ میں شرکت کا دعوت نامہ خود زور نے دیا اور خواہش کی کہ ضرور شریک رہوں۔ چنانچہ مشاعرہ میں شریک رہا۔ دیکھا کہ حیدرآباد اور بیرونِ ہند کے نامی گرامی شعرا موجود ہیں۔ پرنسپل کالج بھی براجمان ہیں۔ آغازِ مشاعرہ پر ہی سامعین کلیانت نئے انداز سے غور و غل کر رہے ہیں۔ اسی اثناء میں زور پکارے جاتے ہیں وہ اپنے خاص انداز میں ڈائس پر میز مشاعرہ سے کچھ پہلو لئے ہوئے اپنی غزل سناتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہی طرز جیسے لوگ کہیے کہ شور کا وزن نمایاں ہو گرجدار آواز میں سنا رہے ہیں۔ جوں ہی سامعین سے کچھ بدذوقی کا اظہار ہوا وہ واپس لوٹ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اور مجھ سے فرمایا بھئی ان مشاعروں کی اصلاح ناممکن معلوم ہوتی ہے اور اب تو ہم کسی مشاعرہ میں غزل نہیں سنائیں گے۔ میں بہت متاثر ہوا اور سامعین سے مخاطب ہو کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کالج کے اسٹاف سے ایک بلند ہمت استاد نے ایک اچھی ڈانٹ پلائی اور ان کی اس تقریر کا اثر مشاعرہ کے سکون میں نمایاں ہوا۔ اور میرا نام پکارا گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے حضرت حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر سے غزل کا آغاز کیا ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ این دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

جس پر مولانا تسلیم نے حسب عادت بڑے زور سے کہا کہ کیا خوب" یہ آپ کے مکتب کا اثر ہے"۔ چنانچہ اس کے بعد جس جس مشاعرہ میں زور نے اپنی محبت سے مجھے یاد فرمایا۔ وہ خود پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ اپنے والد مرحوم کے یادگار طرحی مشاعروں میں بھی وہ خاموش ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ مگر اس خاموشی کا بدل بہ حیثیت صدر مشاعرہ اس عمدگی سے ادا کرتے تھے کہ ان کی صدارت کے مشاعرے جس قدر منظم و کامیاب رہے آج ان کی مثال مشکل ہے۔ صدارت کے فرائض میں حاضر جوابی و بذلہ سنجی سے مشاعرہ کو اس طرح متوازن رکھتے تھے کہ صاحبان ذوق بعض دفعت بذوقی کے گھونٹ بھی ہنستے ہوئے پی جاتے تھے اور یہی زور کی صدارت کا کمال تھا۔ لیکن خدا معلوم یہ مہر سکوت کیوں آج سے غالباً دو سال پہلے اس طرح ٹوٹی کہ وہ خود حضرت فیض علیہ الرحمہ کے سالانہ مشاعرہ کی طرح ؎

آگہی کب تھی اضیں رسم دعا سے پہلے

لیتے آئے اور کہا کہ قدیر بھائی یہ اپنا آخری مشاعرہ ہوگا ضرور آئیے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور غزل بھی کہی مگر عین مشاعرہ کے روز بیمار ہو گیا۔ اس لئے اپنی غزل ان کے ایک شاگرد رشید کے ذریعہ بھیجی تاکہ مشاعرہ میں سنا دیں۔

زور نے اپنا آخری کلام جو مجھے سنایا اس میں زیادہ تر روحانیت کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ مصرعہ محمود بالا کی غزل میں سراسر انھوں نے تصوف کے موتی پروئے تھے۔

یقیناً زور ہمیشہ ادارۂ ادبیات اردو اور اپنی تصنیفات کے عکس میں زندہ رہیں گے ؎

زندہ دارد مرد آثار دارد

"خدمت اردو و شغف و انہماک کے لحاظ سے بابائے اردو مرحوم کی جانشینی کا مستحق اگر کوئی فرد واحد ہو سکتا تھا تو وہ زور مرحوم ہی تھے۔ ولایت سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لانے کے بعد اپنے وطن حیدرآباد میں خدمت اردو پر لگ گئے اور علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی میں منسلک ہونے کے خانگی طور پر بھی ایک زبردست "ادارۂ ادبیات اردو" قائم کر دیا۔ اس نے بھی خوب خوب کام کیا اور ایک مستقل سلسلہ امتحانات کا جاری کر دیا۔ ایک اردو انسائیکلو پیڈیا کی بھی طرح ڈالی دی تھی۔ غالباً مخزن العلوم کے نام سے اور اس کے ابتدائی حصے شائع بھی کر دئے تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف، تالیف اور ترتیب کے بعد شائع کیں۔ دن گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ابھی کل تک اُن کا شمار نوجوان اور ہونہار ادیبوں اور ناقدوں میں تھا۔ دیکھتے دیکھتے بچپن اور ساٹھ کے درمیان ہو گئے۔

مذہبی رنگ کے تھے اور بڑے شریف النفس۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔"

عبدالماجد دریابادی

(صدق جدید لکھنؤ ۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

سید بادشاہ حسین

ڈاکٹر زور سے میری آخری مُلاقات

ستمبر ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے۔ اُن دنوں میں چند ہفتوں کے لئے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ ایک شام میں زور صاحب کے گھر پہنچا۔ موٹر کی آواز سنکر وہ کمرے سے باہر برآمدے میں آئے۔ ڈھیلی ڈھالی چیک ڈزائن کی شیروانی۔ ڈھیلا پاجامہ۔ پاؤں میں سلیپر، سر ننگا اور بال بڑے بڑے اور منتشر۔ پان چباتے اور سیدھے ہاتھ کی چٹکی سے ہونٹوں کے دونوں کونے پونچھتے۔ نوکر کو ہدایتیں دیتے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔

"میں کئی روز سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ———"

میں نے مناسب لفظوں میں معذرت شروع کی مگر انھوں نے سنی ان سنی کر دی۔

"آیئے! میں آپ کو پہلے ایوان اردو کی نئی عمارت دکھا دوں ——— ابتدا سے تو آپ واقف ہیں ——— اب چل کر دیکھئے خواب کی تعبیر۔"

زور صاحب میں مجھے کوئی فرق دکھائی نہ دیتا تھا۔ چہرہ مہرہ، جسم جسامانیت، چال ڈھال، بول چال اور وضع قطع سب وہی پانچ دس سال والی تھی۔ "چشم بد دور! زور صاحب آپ تو بالکل نہیں بدلے ———" میں نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ انھوں نے ایک قہقہہ لگایا جو ان کا اپنا خاصا تھا جو نہ تو تقریبی تھا اور نہ سہمی بلکہ "زور دار" تھا۔

"آپ بوڑھے ہو رہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ سبھی بوڑھے ہو جائیں گے۔" پھر اسی انداز کا قہقہہ دوہرایا۔

میں نے اکثر سنا تھا کہ پُرخلوص کا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ زور صاحب دن رات دماغی کاموں میں مصروف رہتے تھے لیکن جسمانی محنت و مشقت کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتے تھے۔ بس کبھی کبھار باغبانی سے شوق کر لیا کرتے تھے یا کبھی کبھی ٹہلنے پر تھوڑی سی چہل قدمی بھی کر لیتے تھے۔ صبح اور شام جو وہ وقت عام طور پر تفریح کے ہوتے ہیں، ان اوقات میں بھی لکھنے پڑھنے یا ادارہ کے کام کاج میں مصروف رہتے۔ اردو دوستوں میں تبادلہ رہتے یا ادارہ ادبیات اردو کی بقا اور ترقی کی فکر کرتے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتے لگتا کہ ملازمت اور اس کی مصروفیات بھی مجبوری حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور اصل مطمح نظر اردو اور ادارہ کی ترقی ہے۔ دن رات اسی کی فکر کرتے اٹھتے بیٹھتے بھی سوچتے۔ اس سلسلہ میں کسی سے کوئی نئی بات بتا دی یا خود کی سمجھ میں کوئی بات آ گئی تو اس کو فوراً عمل لانے کی تگ و دو شروع کر دیتے۔ مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے اور ان لفظوں کی پروا نہ کرتے۔ "معرفہ مساعدین" سے کام لینا جانتے تھے بلکہ مخالفوں کو بھی شریک کار بنا لیتے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ عمارت اور اس میں رکھنے کے لئے جو جو نوادرات دکھاتے رہے بلکہ اس سارے عرصہ میں

عمارت کی خوبیاں، سنٹرل گورنمنٹ کی فیاضی، فیاض الدین صاحب کا ذوق تعمیر، ولد احسین صاحب کی فنی کارکردگی، عنایت جنگ کی روایتی اعانت، نرسنگ راج عالی کا شوق، سکسینہ صاحب کی تگ و دو اور خدا معلوم کتنے ایسے نام انھوں نے لیے اور ان کی مہر بانیاں گنائیں۔ پھر صدر ہندوستان کی آمد، عمارت کا افتتاح اور بہت سی تفصیلات بتائیں۔ فوادرات میں سے کچھ میرے پہلے کے دیکھے ہوئے کچھ نئے تھے اور کچھ کے بارے میں میرا ذہن کام نہ کرتا تھا۔ ہال میں لگی ہوئی تصاویر دکھاتے ہوئے انھوں نے خاص طور پر کہا "حمید الدین صاحب شاہد سے کہہ دینا کہ ان کی تصویر بھی میں نے ٹانک دی ہے"۔ وہ شاید صاحب پر اسی طرح مہربان تھے جس طرح وہ ان کا اور ادارہ کا کام انتہائی خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔

واپس آکر ڈائننگ روم میں بیٹھے اور میں نے دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح سلیپر چھوڑ کر دونوں پاؤں کرسی پر رکھ کر اطمینان اور آرام کے ساتھ بیٹھ گئے۔ فوراً ہی وہ تپائی کھسکا کر میز پر پاندان رکھا تھا اور پان لگانے میں مصروف ہو گئے۔ متعلقین کی خیر و عافیت پوچھی اور ان ساتھیوں اور احباب کو بھی پوچھا جو اس وقت پاکستان میں تھے۔

"آپ کو دیکھ کر فوراً مرحوم فیض محمد یاد آ گئے ـــــ کاش اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام مکمل ہو جاتا!"

اکیس بائیس برس کی پرانی یاد تازہ ہو گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ کل کی بات ہے۔ مرحوم فیض محمد ہی مجھے زور صاحب کے پاس اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز پیش کرنے لے گئے تھے۔ دو چار دفعہ کی تفصیلی گفتگو کے بعد ہم نے کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی ایک کمیٹی قرار پا گئی۔ ہم نے طے یہ کیا تھا کہ انسائیکلو پیڈیا پر یا تو انسائیکلو پیڈیا اسلام اور دوسری حوالہ جاتی کتابوں کی تمام جلدوں کا سرسری معائنہ کیا جائے عنوانات کا انتخاب کیا جائے۔ ظاہر تھا کہ یہ کام بڑا وقت بڑی محنت اور بڑا استقلال چاہتا تھا اور دو ایک آدمی کے کرنے کا بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے دوستوں میں سے کاظم حسین، غلام جیلانی، منظور حسین، ڈاکٹر مہدی علی وغیرہ کا انتخاب کیا اور اس سرسری مطالعہ میں اور عنوانات کی فہرستیں مرتب کرنے میں اعانت طلب کی۔ منظور حسین تو چند روز بعد اپنی بعض مصروفیات کی وجہ کام جاری نہ رکھ سکے، البتہ کاظم حسین، غلام جیلانی اور ڈاکٹر مہدی علی نے مدتوں ساتھ دیا۔ ان کے علاوہ کچھ اور ساتھی بھی کام پر لگ گئے۔ روزانہ کئی گھنٹوں تک یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ شروع شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود ادارہ کے بعض افراد کو یقین نہ آتا تھا کبھی کبھار ادھر ادھر سے کچھ ایسی باتیں بھی کان میں پڑتی تھیں کہ جن سے بہت تکلیف ہوتی تھی لیکن زور صاحب تھے کہ سب سے نپٹ لیتے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں نہ صرف کام کو سراہتے بلکہ خود بھی زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے۔ جب سے انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع ہوا ان کی توجہ سب سے زیادہ اسی شعبہ کی طرف ہو گئی تھی۔

تقریباً سات آٹھ مہینے بعد عنوانات کی فہرست کا پہلا مسودہ مرتب ہوا۔ طے پایا کہ ان عنوانات کی تقسیم علوم و فنون کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ دو چار مہینے اس کی بھی نذر ہو گئے۔ پھر متعلقہ علوم و فنون کی تفصیلی کمیٹیاں بنیں۔ تراجم ہوئے، اضافے اور اخراج کا کام ہوا۔ اس درمیان میں میں نے سارے ہندوستان کے چار پانچ دانشوروں سے علمی اعانت کی درخواست کی۔ تقریباً تین سو ماہرین علوم و فنون نے اپنے اپنے مضامین پر دیئے ہوئے عنوانات کے تحت مضامین لکھنے کا تحریری وعدہ کیا۔ بیرونِ ہندستان بھی بعض ماہرین نے اعانت کے وعدے کئے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھی بہت سوں کو یہ کام نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ حکومت حیدرآباد کا دروازہ بھی

مالی امداد کے لئے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ کچھ اعلیٰ عہدہ داروں کو کام کے معیاری ہونے کا یقین نہ آتا تھا اور اس کی ہمہ گیری پر بھی شک و شبہ تھا۔ زور صاحب نے طے کیا کہ نمونہ شائع کیا جائے۔ اب ان کا سارا وقت اسی پر صرف ہوتا تھا انھیں اصرار تھا کہ نمونہ جلد بلکہ فوراً ہی شائع کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو نہ صرف اندازہ ہو جائے بلکہ یقین بھی آجائے۔ جوں توں کرکے بہرحال ایک نمونہ بھی شائع کر دیا گیا۔

نواب علی یاور جنگ (جو اُس وقت معتمد محکمہ امور عامہ تھے) اور مرحوم غلام محمد صاحب (جو اُس وقت وزیر مالیات تھے) نے دلچسپی لینی شروع کی۔ کبھی زور صاحب ان کے ہاں جاکر تفصیل سمجھاتے اور کبھی یہ حضرات خود ادارہ آکر حالات کا اندازہ کرتے۔ کبھی امداد کی رقم کا تعین کیا جاتا۔ کبھی اس کی طباعت کا انتظام دارالطبع سرکار عالی میں کیا جانا طے پاتا اور کبھی ایک علیحدہ محکمہ کے قیام کی تجویز ہوتی۔ زور صاحب کام کی رفتار سے بہت خوش تھے اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی اعلیٰ عہدہ دار کو گھیر کے لاتے اور کام کی تفصیلات بتاتے۔ انھیں دن رات یہی فکر تھی کہ کام جلد سے جلد آگے بڑھے اور اشاعت کا انتظام ہو جائے۔ وہ مشکلات سے گھبرانے والے انسان نہ تھے بلکہ میرا یہ اندازہ ہے کہ مین مشکلات ہی میں وہ ڈٹ کر کام کرنے کے عادی تھے۔ گھبرا جانا یا مایوس ہونا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔

کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور لوگوں کو یہ امید بندھنے لگی کہ اگر رات۔دن کی یہی سرگرمیاں جاری رہیں تو اردو انسائیکلوپیڈیا مرتب اور شائع بھی ہو جائے گی۔ حیدرآباد کے ایسے ایسے صاحبان ذوق بھی اس حلقے میں شامل ہونے لگے جن سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ عملی حصہ لیں گے۔ فہرستوں کی تکمیل اور عنوانات کے تعین اور تراجم کا کام بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما تھا۔ اس بنیادی کام کی تکمیل کے بعد تقلیل روشن نظر آنے لگا۔ فہرستوں کے کارڈ تیار کئے گئے اور ان کی ترتیب عمل میں آئی۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کی انتظامی کمیٹی اور اس کے مشیروں کو اب اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ کام کا معیار بلند سطح پر رکھنے کے لئے مضامین صرف ماہرین علم و فن ہی سے لکھوائے جائیں اور یہ کہ اس میں بڑا تنوع بھی ہو۔ معاونین کی فہرست طویل تھی اور اس میں ہر موضوع، ہر زبان اور ہر علم و فن کے مستند متاہیر شامل تھے۔ ایک طرف مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، قائد اعظم محمد علی جناح، شری راجگوپال چاری، ابوالکلام آزاد، شریمتی سروجنی نائیڈو وغیرہ جیسی شہرہ آفاق ہستیاں شامل تھیں۔ اور دوسری طرف سر رامن، سر راد ھاکرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر شانتی سروپ، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر بینی پرشاد، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر سائی، جیکر وغیرہ جیسے علوم و فنون کے مستند ماہرین اور مصنفین شامل تھے۔

شریمتی سروجنی نائیڈو کو جب اردو انسائیکلوپیڈیا کا کام دکھایا گیا تو یہ خواہش بھی کی گئی کہ وہ بعض بزرگان سند کو بھی چھپائیں لکھ کر ادارہ کے اس کام میں عملی حصہ لینے کی ترغیب دیں۔ یوں تو وہ حیدرآباد اور حیدرآباد کے ہر کام میں دلچسپی لیتی تھیں لیکن ادارہ کے اس کام سے وہ بہت متاثر ہوئی تھیں اور انھوں نے بڑی خوشی سے اپنے بعض رفقاء کار رہنماؤں کو بڑے زور سے لکھا تھا کہ وہ بس علمی ادبی کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ "الف" کی پہلی جلد میں ان بیسیوں نے مضامین لکھنے کا وعدہ کر لیا تھا اور بعضوں نے تو وعدہ وفا بھی کیا۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو قید میں تھے۔ سروجنی نائیڈو کا

تعارف نامہ اور میرا خط انھیں وہیں ملا۔ جواب میں انھوں نے کام کو سراہا اور جذبہ کی تعریف کی۔ لفظ "آزادی" ان کے تقریض ہوا تھا۔ مضمون لکھنے پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ وہ اس وقت قید میں ہیں اور جیل میں حوالہ جاتی کتب فراہم نہیں کی جاتیں اور بغیر ان کتب کے انسائیکلو پیڈیا کے لئے شایان شان علمی مضمون لکھنا ممکن نہیں۔ اس لئے ان کی آزادی اور رہائی تک کا انتظار کیا جائے۔ میں نے لکھا کہ ادارہ کی طرف سے صوبائی حکومت کے سربراہ سے درخواست کی جائے گی کہ وہ یہ سہولتیں پنڈت جی کو مہیا کریں تاکہ وہ ایک خالص علمی کام میں اعانت فرما سکیں۔ جواب میں پنڈت جی نے فوراً لکھا کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے کیونکہ وہ حکومت ہند سے کسی قسم کا مراعات حاصل کرنا ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتے ـــــ جب میں نے یہ خط زور صاحب کو دکھایا تو کہنے لگے "اسے کہتے ہیں کردار کی بلندی اور اصول پرستی!"

گاندھی جی کی پوسٹ کارڈ نویسی کا حال ان سے خط و کتابت کرنے والوں کو معلوم ہے لیکن عوام زیادہ واقف نہیں ہیں۔ سروجنی کی اور میری چٹھی کے جواب میں مہاتما جی کے پرائیوٹ سکریٹری کا پوسٹ کارڈ آیا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف ہیں اس لئے شاید "آہما" پر مضمون نہ لکھ سکیں۔ ادارہ کی جانب سے اصرار پر اصرار کیا گیا کہ ان کا مضمون ضروری ہے اور بغیر اس کے پہلی جلد شائع نہ ہو سکیگی۔ بالآخر ایک پوسٹ کارڈ ملا کہ وہ مضمون لکھنے آمادہ ہیں ـــــ خطوں کا جواب پوسٹ کارڈ سے دینے والوں میں مشرق میں گاندھی جی اور مغرب میں جارج برنارڈ شا مشہور تھے۔

قائداعظم نے بھی بڑی ردوقدح کے بعد "اقلیت" پر مضمون لکھنا منظور کر لیا تھا۔ مغربی علماء و مصنفین میں سے تین مشاہیر نے خندہ پیشانی سے اور بہ آسانی مضامین لکھنے پر رضامندی ظاہر کی تھی ان میں "برٹرانڈرسل" نمایاں تھے۔

ترتیب کی طرف سے مطمئن ہو کر زور صاحب نے طباعت کی فکر شروع کی۔ وزیر مالیات مرحوم غلام محمد صاحب نے دارالطبع میں اس کی طباعت کا انتظام کر لیا اور نیرم صاحب جو اس وقت ناظم دارالطبع تھے کو ہدایات دیدیں۔ چند ملاقاتوں کے بعد دارالطبع کے نئے ٹائپ میں انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت طے پائی۔ یہ ٹائپ خوبصورت بھی تھا اور پڑھنے میں آسان بھی۔

چند سو صفحات کمپوز ہوئے اور دو سو کے قریب چھپ بھی گئے کہ حکومت حیدرآباد میں بھونچال آیا۔ جلد تبدیلیاں ہونے لگیں اور انتشار تیز سے تیز تر ہوتا رہا۔ حکومت کی سرپرستی باقی نہ رہی۔ کام رک گیا حتیٰ کہ زور صاحب کے زور سے بھی بات نہ بنی۔

انسائیکلو پیڈیا کا ذکر چھڑ کر زور صاحب نے میری یادوں کو تازہ کر دیا تھا اور نہ جانے کب تک میں اُن میں گم سم رہتا کہ دفعتاً انھوں نے مجھے چونکا دیا "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" میں نے جواب دیا "انسائیکلو پیڈیا کے مراحل" ہنسنے لگے اور کہا "پان کھائیے"۔ زور صاحب کو پان کھانے کا شوق تو تھا لیکن کوئی خاص اہتمام نہ کرتے تھے۔ جالی دار پاندان جس کی ظاہری حالت بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی ہمیشہ ان کے آس پاس ہی ہوا کرتا تھا۔ ایک پان خود کھایا اور تمباکو کی چٹکی منہ میں ڈالی۔ دوسرا مجھے دیا۔ اگالدان میں پیک تھوکا اور کہا:

"آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے ـــــ اسی سال کے ختم پر میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو جاؤں گا ـــــ حکومت کشمیر مجھے بلا رہی ہے ـــــ"

"کس خدمت پر"

"اردو کی پروفیسری یا نظامت تعلیمات پر"

"ایک پیشین گوئی تو زور صاحب آپ کے بارے میں پوری ہوئی، دوسری کا بھی انتظار کیجئے"

"کونسی پیشین گوئی؟"

"تو یاد صاحب نے آپ کا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ آپ کو حکومت سے خطاب ملے گا۔ چنانچہ حکومت ہند نے ادبی خطاب دے دیا۔ دوسری بات انھوں نے یہ بتائی تھی کہ آپ کو وائس چانسلری قسم کا کوئی عہدہ ملے گا"

"آپ کو یاد ہے مرزا علی صاحب طالع نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں بتائی تھیں؟"

ایک زمانہ میں زور صاحب ہم جفر، جوتم، رمل وغیرہ سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ طالع صاحب کو ان ہی میں سے کسی علم میں دخل تھا۔ ویسے وہ ادارہ کے متعلق شخصیات میں کام کرتے رہتے تھے مگر ان کا زیادہ رجحان بزرگان دین کی طرف تھا۔ سیدھے سادے پرخلوص انسان تھے۔ فرصت کے اوقات میں زور صاحب ان سے اس سلسلہ میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ جلسوں اور تقاریب کی تاریخیں مقرر کرتے وقت ان سے مشورہ کر لیا کرتے تھے کہ کونسی تاریخ نیک اور کونسی بد ہے۔

میں نے کہا کہ زور صاحب پہلے تو مجھے آپ کا حیدرآباد سے باہر جانا اسلئے پسند نہیں کہ ادارہ کی صحیح معنوں میں دیکھ بھال کون کریگا۔ میرے اندازہ میں آپ کی رائے مشورہ کافی کے بغیر وہ ٹھیک سے چل نہیں سکیگا۔ دوسرے یہ کہ وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد آپ پورا وقت اسکی تنظیم اور ترقی پر صرف کر سکیں گے۔ میرے خیال میں تو یہی کام آپ کے کرنے کا ہے اور آپ کو اسی پر لگے رہنا چاہئے۔

کہنے لگے کہ اب ادارہ ایک اہتمام اور انتظام کے ساتھ چل رہا ہے۔ میری خاص توجہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ کشمیر میں بھی اردو کی ترویج کے اچھے مواقع ہیں اور کیوں نہ میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔ شاید حیدرآباد کی طرح کشمیر میں بھی اردو کو عام اور زیادہ مقبول کرنے کا کام کر سکوں۔

"تو پھر یونیورسٹی کی وائس چانسلری مانگئے"

"حکومت کشمیر سے مراسلت کا کام میں نے مولانا حسین صاحب کے ذمہ کر دیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ مراعات اور سہولتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ویسے بخشی صاحب سے میرے بھی ذاتی تعلقات اچھے ہیں" انھوں نے کہا

"معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے ——— جایئے اور اس کی وادیوں کی خوب سیر و تفریح بھی کیجئے" میں نے کہا

اُن کی خواہش پر میں نے کشمیر اور کشمیریوں کے اپنے سفر کے وہ حالات سنائے جو میں نے ۱۹۳۹ء کی گرمیوں میں کیا تھا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ میں نے وداع کرنے کا ارادہ کر کے اجازت لی مگر پھر جا نہ سکا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات ان سے آخری ہو گی۔ پچھلے سال ۱۹۶۱ء میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو دل پر ایک دھچکا سا لگا۔ دل اس منحوس خبر کو ماننے پر آمادہ نہ تھا دن بھر کوفت میں گزرا۔ شام کو حمید الدین صاحب شاہد سے ملا۔ وہ اتنے متاثر تھے کہ بیان سے باہر۔ بڑی دیر تک پچھلے واقعات کا ذکر ہوتا رہا اور کئی بھولی بسری باتیں تازہ ہو گئیں۔ حق مغفرت کرے عجب زور مرد تھا! فقط

بدر شکیب

ڈاکٹر زور — چند تاثرات

فرزندان جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر زور شہاب ثاقب کی طرح چمکے اور دیکھتے دیکھتے سارے دکن کو اور اس کے بعد پورے برصغیر کو اپنے فیضان علم و عمل سے منور کر دیا۔ حیدرآباد میں آج تک اردو کا اتنا بڑا شیدائی پیدا نہیں ہوا اور سارے برصغیر میں بجز ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے کوئی دوسرا ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جہاں تک حیدرآباد اور دکن کی زبان و ادب اور تہذیب و معاشرت کے اُجاگر کرنے کا تعلق ہے ڈاکٹر زور کا ثانی نہ دکن میں پیدا ہوا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔

اردو زبان اور ادب کی خدمت کی لگن ان کو زمانۂ طالب علمی ہی سے تھی۔ اپنی مشہور کتاب "روح تنقید" کی تالیف کا سلسلہ[1] جس سے علمی دنیا میں وہ پہلی مرتبہ روشناس ہوئے انھوں نے اس وقت شروع کیا تھا جبکہ وہ سال سوم کے طالب علم تھے۔ اسی زمانہ میں ایک ادبی رسالہ "ارتقا" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے جو سکندرآباد سے اشتمل شریف نامی ایک صاحب نکالتے تھے[2] ان کے توسط سے جامعہ کے اکثر طلبا کے مضامین اس پرچہ میں چھپنے لگے تھے۔ یہ رسالہ انکی ادبی کاوشوں کی پہلی جولانگاہ ہے۔ جامعہ سے بی۔اے کرنے کے بعد ہی ان کی پہلی کتاب "روح تنقید" منظر عام پر آئی اور اس کے ذریعہ پورے ہندوستان میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ بی۔اے کے طالب علم تھے جملہ عثمانیہ کا امتحان عمل میں آیا اور معین الدین قریشی کے ساتھ ڈاکٹر زور اس کے اولین ماہر منتخب ہوئے۔ جملہ عثمانیہ نے علمی دنیا میں جو معیار حاصل کیا تھا وہ ان ہی دونوں ماہروں کی بالغ نظری کا نتیجہ تھا۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر زور کو حکومت حیدرآباد کی جانب سے یورپی وظیفہ عطا ہوا اور وہ لندن یونیورسٹی ڈاکٹریٹ حاصل کرنے چلے گئے۔ یہاں ڈاکٹر زور کی علمی زندگی کا ابتدائی باب ختم ہوتا ہے۔

قیام یورپ کے زمانہ میں ڈاکٹر زور کے ذوق علم و ادب میں بڑا نکھار پیدا ہوا۔ ان کی مشہور کتاب "اردو شہ پارے" انھوں نے لندن کے قیام کے زمانہ میں تصنیف کی اور ان کے یورپ سے واپسی کے قبل ہی وہ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب نے ان کی ادبی شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ موضوعات پر ان کی معرکتہ الآرا کتاب یورپ سے واپس ہونے کے بعد لکھی گئی۔ ڈاکٹریٹ کے لئے انھوں نے لسانیات جیسا دقیق مضمون لیا تھا اور اس کے بعد علم موضوعات کی تکمیل کے لئے پیرس کی مشہور درسگاہ جامعہ سوبورن میں بھی انھوں نے شرکت کی تھی۔

یورپ سے ڈاکٹر زور کی واپسی ایک نکھرے ہوئے عالم کی حیثیت سے ہوئی۔ اردو زبان اور ادب کی خدمت کیلئے

---

[1] ڈاکٹر زور حیدرآباد منزل ہاسٹل میں میرے ہم کمرہ تھے۔ وہ بی۔اے سوم اور میں سال اول میں تھا۔ [2] اس رسالہ کا نام "ارتقا" تھا۔

انھوں نے جو خاکے اور نقشے تیار کئے تھے اس کو عملی جامہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی مدد گار پروفیسری پر تقرر کے بعد شروع کیا۔ یہ زمانہ ان کے حیدرآباد مراجعت کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ڈاکٹر زور کا ایک عظیم کارنامہ ہے جو اس وقت تک ان کے نام کو روشن رکھیگا جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ ادارہ کے قیام میں ڈاکٹر زور کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ اس کو حیدرآباد کے ایک طبقے انجمن ترقی اردو کا مدمقابل قرار دے لیا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ انجمن کے موجود ہوتے ہوئے ادارہ کے قیام کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ چیز حقیقت کے خلاف ہے۔ انجمن ترقی اردو در اصل مولوی عبدالحق کی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنے مخصوص دائرہ کی حد تک محدود تھی۔ جامعہ عثمانیہ کی بچت سے انجمن کو سالانہ ۵ ہزار کی رقم اس غرض سے منظور کی گئی تھی کہ مختلف علوم و فنون پر سالانہ کم از کم بیس کتب عام تعلیم انداز میں پیش کی جائینگی۔ فرمانروائے جامعہ کے ذریعہ یہ کام بہت آسانی سے انجام دیا جا سکتا تھا لیکن انجمن کئی سال تک یہ رقم لیتی رہی اٹھاتی رہی اور کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ اس کے خلاف پہلی مرتبہ میں نے آواز اٹھائی تھی جس کی بنا پر سر مرزا اسماعیل کے دور صدارت عظمیٰ میں یہ امداد مسدود کر دی گئی تھی۔ یہ بھی حکومت کا ایک غلط عمل تھا۔ بجائے اس کے کہ انجمن کو اس رقم کے صحیح مصرف کے لئے پابند کیا جاتا اس کو بند کرنا صحیح نہ تھا۔ اس پر بھی میں نے احتجاج کیا تھا اور یہ رقم بعد میں بحال بھی ہو گئی تھی لیکن ایک سال کے بعد حیدرآباد کی بساط سیاست ہی الٹ گئی۔ علاوہ ازیں انجمن کو تختانیہ اور فوقانیہ جماعتوں کی درسی کتب کا بھی اجارہ تھا جو برسوں اس کے پاس رہا جس سے انجمن نے لاکھوں روپیہ کمایا لیکن ان کتب کی ترتیب اور طباعت تک بھی حیدرآباد میں نہیں ہوتی تھی۔ انجمن کے طرز عمل سے جامعہ عثمانیہ کی نئی پود مایوس تھی اور اردو کی خدمت کیلئے انھیں ایک علیحدہ میدان کی ضرورت تھی۔ اس کمی کو ڈاکٹر زور نے ادارہ کے قیام کے ذریعہ پورا کیا۔ ابتدا میں حکومت نے ادارہ کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی اور ڈاکٹر زور نے تنہا اپنے وسائل کے ذریعہ اس ادارہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ چند ہی سال میں اس ادارہ نے حیدرآباد میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ ڈاکٹر زور نے چن چن کر اہل علم کو اپنے اطراف جمع کیا اور ادارہ کے کام کو اتنی وسعت دی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں خادمان اردو کی اتنی منظم جماعت کوئی بھی نہ تھی۔ ادارہ کے سامنے انجمن ترقی اردو کا کام بھی ماند پڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر زور میں غیر معمولی تنظیمی صلاحیت تھی۔ اپنی پرکشش شخصیت سے انھوں نے ایک طرف عہدہ داروں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا تو دوسری طرف امراء جاگیردار اور ملک کے ہر طبقہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا جس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ جامعہ عثمانیہ نے اردو کا جو چراغ روشن کیا تھا اس کی روشنی کو ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا۔ اردو دانشگاہ کی جو طرح انھوں نے ڈالی تھی وہ ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے مراکز حیدرآباد اور اس کے باہر ہر صوبہ میں قائم تھے۔ اس سے اردو کی تحریک کے فروغ میں بڑی مدد ملی۔

ادارہ ادبیات اردو کو اگر وہ سہولتیں حاصل رہتیں جو حکومت حیدرآباد نے انجمن ترقی اردو کو مہیا کر رکھی تھیں تو ادارہ کی جانب سے بہت قبل اردو انسائیکلو پیڈیا کی عظیم الشان اسکیم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہوتی۔ ادارہ نے یہ کام ایسے زمانہ میں شروع کیا جبکہ حیدرآباد کے سیاسی مطلع پر سیاہ بادل چھانے لگے تھے اور عجب یہ برسے تو اس کے سیلاب میں حیدرآباد کی مسلم سلطنت ہی غرق آب ہو گئی۔ انسائیکلو پیڈیا کا کام ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر زور نے اس کی جو اسکیم مرتب کی تھی اور سارے ہندوستان کے

دانشور، ادیب اور مصنفوں کو جس طرح اس سے متعلق کر لیا تھا اور اس کام کے انجام دینے کے لئے جو اصول اور سانچے مرتب کئے تھے اس سے نہ صرف ان کی شخصیت کی ہمہ گیری اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ چیز بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچتا تو اردو زبان کی کتنی بڑی خدمت ہوتی اور اس کا دامن کتنا مالا مال ہو جاتا۔ کاش حیدرآباد کی موجودہ حکومت کو اس کام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا۔ اگر ڈاکٹر زور بقید حیات ہوتے تو وہ ممکن ہے اس کی تکمیل کی کوئی صورت پیدا کرتے لیکن ان کے بعد تو ساری امیدیں منقطع ہو گئی ہیں۔ ممکن ہے پاکستان میں یہ کام کبھی تکمیل پائے۔

ڈاکٹر زور کا ایک اور بڑا کارنامہ تو وہ ہے جو انہی تحقیقات کے ذریعہ انھوں نے اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان قلی قطب شاہ کو علمی دنیا سے روشناس کرایا اور اردو میں شعر گوئی کی تاریخ کو ولی دکھنی سے بھی ڈیڑھ سو سال قبل ثابت کر دیا۔ یہ کام ڈاکٹر زور ہی انجام دے سکتے تھے کیونکہ "دکھنیات" پر انھیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم کلیات کو جو بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل ہے مرتب کر کے ڈاکٹر زور نے اردو پر ایک احسان کیا ہے۔ یہ ضخیم جلد خاص اہتمام سے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ کو ایک خاص نظم و تنظیم کے ساتھ قائم کیا تھا اور اس میں تقریباً پچیس ہزار اردو، فارسی اور عربی مخطوطات جمع کئے تھے۔ یہ انھوں نے بہت بڑا کام کیا۔ انجمن ترقی اردو کا مشہور کتب خانہ دلی منتقل ہونے اور پھر تقسیم ہند کے بعد بیشتر کتب کے ضائع یا تلف ہونے کے بعد اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور ارتقا پر ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ قلمی کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ آج برصغیر کے کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان مخطوطات کی ایک خاص حسن و ترتیب کے ساتھ تہذیب کی تھی اور ان کا تفصیلی مواد پانچ جلدوں میں "تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کی مزید جلدیں بھی زیر ترتیب تھیں جو ادارہ کے موجودہ ارباب کی نگرانی میں شائع ہوں گی۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں دکن میں دو شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ ایک بہادر یار جنگ اور دوسرے ڈاکٹر زور۔ پہلے میدان سیاست کے شاہ سوار تھے اور دوسرے زبان و ادب کے، اور دونوں نے اپنی پروقار شخصیت سے دکن اور پورے برصغیر کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ایک نے خطابت میں نام پیدا کیا تھا اور دوسرے نے ادبیات میں۔ اول الذکر کی جواں مرگی نے ان کے سیاسی مشن کو ناکام کر دیا لیکن ثانی الذکر کے کارنامے اسوقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان زندہ ہے۔

دنیا میں شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں، ابھرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں لیکن ان کا کام باقی رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر زور جسمانی حیثیت سے اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا کام ان کے نام کو باقی رکھیگا۔ اردو کی جس تحریک کو وہ لیکر اٹھے تھے اور اپنے اطراف شیدایان علم کی جس جماعت کو پیدا کیا تھا وہ انکے کام کو آگے بڑھائے گی۔ اسی طرح ادارۂ ادبیات اردو اپنے وجود کو برقرار رکھ سکیگا اور اردو زبان کی خدمت کا جو بیڑا ڈاکٹر زور نے اٹھایا تھا وہ جاری رہے گا۔

پروفیسر محمود حسین

ڈاکٹر زور مرحوم

آج ڈاکٹر زور صاحب کی تیسری بچی کی شادی میں تہنیت منزل گیا تو ڈاکٹر صاحب کی یاد بُری طرح ستانے لگی ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اُس دروازے سے نکل کر آرہے ہیں یا اُن صاحب سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ ایوان اردو میں مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ ایوان کی دیواروں پر اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر لگی ہیں۔ ان ہی میں ڈاکٹر زور کی جوانی کی تصویر بھی آویزاں ہے۔ اس تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا اور جب آنکھیں اشک آلود ہونے لگیں تو محفل و موقع کا لحاظ کرتے آنسو پی لیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے سے بغل گیر ہو کر مبارک باد دی تو میری آواز بھی گلو گیر تھی اور ان کی آواز بھی واپسی میں وقار خلیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اکبر الدین صاحب سے کئے ہوئے وعدہ کی یاد دہانی کی کہ سب رس کے زور نمبر کے لئے مجھے کچھ لکھنا ہے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان پر ایک مضمون لکھا تھا۔ مرحوم کے دوست عزیز ساتھی محمد بن عمر صاحب نے جب ادارے کی سلور جوبلی کے موقع پر ڈاکٹر زور صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ایک کتاب پیش کرنے کا خیال کیا اور اس کا خاکہ یوں بنایا کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست احباب ساتھی اور شاگرد ان پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں اور محمد بن عمر صاحب اپنے تعارف کے ساتھ ان مضامین کو ایک کتاب کی شکل دے دیں تو میں نے اس کی بھرپور تائید کی تھی۔ مرحوم نے مجھے پکڑ لیا اور جب تک مضمون کا وعدہ نہ لے لیا نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ میں ضرور لکھوں۔

لیکن جب دوسری مرتبہ ستمبر ۱۹۶۲ء میں میں نے ڈاکٹر زور پر مضمون لکھا تو اس وقت نہ تو محمد بن عمر نے تحریک کی اور نہ ڈاکٹر زور نے تائید۔ دونوں اس دار فانی کو چھوڑ چکے تھے، غم و الم کے جذبات نے جو لکھوایا وہ لکھ دیا۔ سوچا تھا کہ اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے ادبی و علمی کارناموں سے متعلق کچھ لکھوں لیکن: ڈاکٹر صاحب کی یاد کے ساتھ ہی جذبات کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی کارنامے اپنی تابناکیوں کی وجہ سے اتنے ظاہر و باہر ہیں کہ ان پر کچھ لکھنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ان کے بہت سے مداحوں اور نقادوں نے ان کے علمی و ادبی کارناموں پر اب تک بہت کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کی زندگی کے سب ہی پہلو بہت نمایاں رہے ہیں اور ان کے دوست احباب اور ساتھ کام کرنے والوں کی نظر سے سرکاری، ادبی، علمی، خانگی کوئی پہلو چھپا نہیں رہا پھر بھی ممکن ہے بعض ایسے گوشے ہوں جو ان کی متنفرد شخصیت کے تابناک پہلوؤں کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہے ہوں اور اب اس مجسم روشنی کے غیاب میں نمایاں ہو سکیں میں ایسے ہی کچھ گوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کروں گا۔

اس موقع پر مجھے انگریزی کی ایک نظم یاد آرہی ہے جس میں شاعر نے ایک اچھوتے خیال کو اجاگر کیا ہے۔ اَن دیکھی چیزیں عموماً خوف پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ جنت میں جب آدم سے یہ کہا گیا کہ دن کے بعد رات آنے والی ہے تو انھیں بڑا خوف معلوم ہونے لگا۔ لیکن جب رات آئی تو چاند اور ستارے بھی ساتھ لائی۔ انھیں رات کا سکون، چاند کی ٹھنڈی روشنی اور تاروں بھرے آسمان کی سجاوٹ بہت اچھی معلوم ہوئی۔ انھیں اس پر سخت تعجب بھی ہوا کہ سورج کی روشنی نے جہاں ہر چھوٹی بڑی چیز کو نمایاں کر دیا تھا وہیں چاند اور ستاروں کو آدم کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا رات کے اندھیرے نے انھیں روشنی بخشی۔

اسی طرح ڈاکٹر زور صاحب کی زندگی میں ان کے علمی و ادبی کارناموں، اُن کی شہرت اور ان کی اقبال مندی نے عام لوگوں کی نظروں سے ممکن ہے بعض گوشوں کو اوجھل رکھا ہو جو اب ان کے غیاب میں نمایاں ہو جائیں تو ان کی شخصیت پر مزید روشنی ڈال سکیں اور ہمیں ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے میں مدد دیں۔

میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کے چند معمولی سے واقعات کا تذکرہ کروں گا اور آپ ان سے بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ کس واقعہ سے ان کی زندگی کے کس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ میں ان پر اپنی رائے کے اظہار سے عمداً گریز کروں گا اسلئے کہ ممکن ہے میری رائے متاثرہ قرار دی جائے اور یہ صحیح بھی ہے اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کے اور میرے جو تعلقات رہے ہیں انکے مدنظر میری رائے کا متاثر ہونا ضروری ہے۔

میں نے انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے میں چار سال ڈاکٹر صاحب سے اردو پڑھی ہے اور گو مجھے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم، ڈاکٹر سید سجاد مرحوم، پروفیسر سروری اور پروفیسر سید محمد سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں ڈاکٹر زور مرحوم ہی سے زیادہ متاثر رہا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے بڑے بھائی صاحب کو چھ سال اردو پڑھائی اور ان کے والد اور میرے والد دونوں دوست تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب میرے والد بیمار تھے اور دواخانہ عثمانیہ میں شریک تھے تو حضرت زخم ایک روز ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ عیادت کے لئے لائے اور یہ کہہ کر میرے والد صاحب سے ملایا کہ میرے بہت قدیم دوست ہیں اس لئے میں چاہتا تھا کہ تم ان سے مل لو۔ دواخانہ کے کمرے میں بھائی صاحب کو اور مجھے دیکھ کر جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے والد کے دوست ہمارے والد ہیں تو انھیں بڑی خوشی ہوئی اور ہمارے رشتے اور استوار ہو گئے۔ اس طرح میرے اپنے خاندان سے قدیمی تعلقات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے میرے سسرال سے بھی برادرانہ تعلقات تھے۔ میرے چچا خسر مولوی ضامن علی صاحب غازی سے ان کے اتنے گہرے تعلقات تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد حیدرآباد سے اگر ان کا کوئی دوست کشمیر صرف اس غرض سے گیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھے تو وہ غازی صاحب تھے۔ غازی صاحب کی بیگم صاحبہ بشیر النسا بیگم حیدرآباد کی مشہور شاعرہ ہیں اور ڈاکٹر صاحب ان کے بہت مداح تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر بشیر النسا بیگم صاحبہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ لوگوں کو یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ ان کا دماغی توازن متاثر ہو گیا۔ اقبال کی موت کے بعد ڈاکٹر صاحب کی موت ہی نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔

ان واقعات کا اظہار یہاں شاید کچھ بیجا سا معلوم ہو لیکن اس سے میں صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات ان رشتوں کی وجہ سے بھی بہت قریب کے ہو گئے تھے اور پھر تعلیم و تعلم کے چار سالوں کے علاوہ میں نے

بحیثیت لکچرار تقریباً بارہ سال ان کی ماتحتی کی ہے۔ کبھی اپنے گھر پر، کبھی دبیر پورے میں کبھی تہنیت منزل میں اکثر و بیشتر ادارے میں اور تقریباً روزانہ کالج میں میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ ان سے محبت کی وجہ تھی کہ میرا تبادلہ ہو جانے کے بعد بھی میں تقریباً روزانہ چادر گھاٹ کالج جایا کرتا تھا اور اس کالج ہی سے جیسے ایک قسم کی محبت ہو گئی۔ اس طرح یہ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ میری رائے ان سے متعلق بے لاگ نہیں ہو سکتی۔ اسی سبب سے میں نے اوپر ارادہ ظاہر کیا ہے کہ چند واقعات بیان کر دوں اور آپ پر چھوڑ دوں کہ آپ جو چاہیں نتیجہ اخذ کریں۔

۱۹۴۶ء میں جب ڈاکٹر زور صاحب دارالعلوم کالج کے پرنسپل بن کر آئے تو انھوں نے سب سے پہلے باقی صاحب مرحوم سے مصافحہ کیا اور کہا کہ آج آپ کی اور ہماری دوستی کا نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ میں نے یہ خیال کیا کہ باقی صاحب اسٹاف میں سب سے سینیر تھے شاید اس لئے ان سے پہلے مصافحہ کیا گیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ باقی مرحوم اور ڈاکٹر صاحب مرحوم میں کچھ رنجش تھی اس لئے سب سے پہلے ان سے مصافحہ کر کے دوستی کی تجدید کی اور نئے باب کے اضافہ کے ساتھ رنجش کے باب کو بالکلیہ بند کر دیا۔ بعد میں باقی مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں ڈاکٹر زور کے پرنسپل بن جانے پر ڈر رہا تھا لیکن انھوں نے بڑی فراخ دلی اور بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔

دارالعلوم کالج میں ایک مرتبہ ایک اہلکار نے گمنام درخواست دی اور ڈاکٹر صاحب کی شکایت کی۔ ڈائرکٹر نے وہ درخواست ڈاکٹر صاحب کے پاس بھجوا دی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے اس اہلکار کے استقلال کی تحریک چاہ معہ بھجوا دی۔ ڈاکٹر وفی محمد جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر تھے اور سخت آدمی مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حکم نکالا کہ ہر پرنسپل کو ہفتہ میں کم از کم چھ گھنٹے پڑھانا چاہئے۔ کچھ دنوں بعد وہ سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے آئے اور پرنسپل صاحب کے اجلاس کچھ دیر تک بیٹھے رہے۔ میں بھی وہیں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ چاہتے ہوں کہ طلبا مجھ سے فائدہ اٹھائیں تو مجھے ام۔ اے کی کلاس کے چند گھنٹے دے دیجئے یا پھر پی ایچ ڈی کے طلبا بھجوا دیجئے۔ اس کے بعد ہی سے ڈاکٹر صاحب کے پاس دارالعلوم کالج کے پی ایچ ڈی کے طلبا اپنے مقالے تبلانے کے لئے لاتے رہے۔

اپنے ایک طالب علم سے جو ایم۔ اے کامیاب کر چکے تھے ڈاکٹر صاحب دارالعلوم کالج میں ادارے کی کتابوں کی فہرست بنوا رہے تھے۔ کسی بات پر ناراض ہو کر انھیں ڈانٹ دیا۔ اتفاق سے میں بھی وہاں تھا۔ ان صاحب نے شاید میری موجودگی میں برا بھلا کہنے کا برا مانا۔ ان کے اترے ہوئے چہرے نے ڈاکٹر صاحب کو متاثر کیا۔ اسی وقت ایک کالج کے پرنسپل صاحب کے نام خود بھی چٹھی لکھ دی اور مجھ سے بھی لکھوا دی۔ ان طالب علم صاحب کو اس کالج میں بھیج دیا گیا اور وہ وہاں لکچرار بن گئے۔ آج وہ کافی ترقی کر چکے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں دارالعلوم اور چادر گھاٹ کالج کا انضمام عمل میں آیا۔ چادر گھاٹ کالج کی موجودہ عمارت میں نیچے چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل صاحب اجلاس کرتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر زور صاحب سے اپنے اجلاس پر بیٹھنے کی خواہش کی لیکن انھوں نے کہا نہیں میں علیحدہ بیٹھ جایا کروں گا آپ اپنے اجلاس پر تشریف رکھیں۔ چنانچہ اوپر ایک علیحدہ کمرے میں انتظام کیا گیا۔ ایک ہی کالج میں دو پرنسپل، دو دفتر، معہ اسٹاف و اساتذہ عجیب قسم کی دوعملی تھی۔ ایک مرتبہ یہ سنا گیا کہ چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل صاحب نے اس کالج کے ایک استاد کو اس بات پر ڈانٹا کہ وہ زور صاحب کے اجلاس پر کیوں گئے تھے۔ زور صاحب کو معلوم ہوا تو

انھوں نے دارالعلوم کے اساتذہ سے خواہش کی کہ وہ چادر گھاٹ کے اساتذہ اور پرنسپل صاحب سے روزانہ ملا کریں اس لئے کہ پرنسپل خواہ کوئی ہو انھیں تو یہیں رہنا ہے۔

جب جامعہ کی کونسل نے اس کا تصفیہ کیا کہ زور صاحب ہی دارالعلوم اور چادر گھاٹ کالج کے مستقل پرنسپل رہیں گے تو زور صاحب کو اس کا افسوس ہوا کہ ان کی وجہ سے چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل صاحب کو ہٹنا پڑا۔ جامعہ نے اس نئے کالج کا نام دارالعلوم چادر گھاٹ کالج رکھا لیکن زور صاحب نے اس لمبے سے نام کو جس سے پرانی یادوں کے ساتھ پرانی تلخیاں بھی ابھر آرہی تھیں صرف چادر گھاٹ کالج کر دیا۔

اکثر ایسا ہوا کہ دفتر کے کسی اہلکار سے کوئی غلطی سرزد ہوئی یا کسی استاد سے متعلق جامعہ سے کوئی سرزنش ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے اسے اپنے پر لے لیا اور اہلکار ہو کہ لکچرار اس کو بچا لیا۔ کبھی غصہ میں آکر کسی کی شکایت لکھ دی لیکن مراسلہ جاری ہونے سے پہلے ہی اس کو منگوا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ لکچرار صاحب اس غلط فہمی میں رہے کہ ان کی شکایت ہوئی اور جب انھوں نے جامعہ جا کر پیروی کی کہ ان پر برا اثر نہ پڑے تو انھیں معلوم ہوا کہ شکایت ہی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد جب وہ لکچرار صاحب خود شرمندہ نظر آئے تو انھیں بلا کر ڈاکٹر صاحب نے وہ شکایتی مراسلہ دے دیا کہ وہ پڑھ لیں اور چاک کر دیں۔

ایک مرتبہ ایک لکچرار صاحب سے گرما کی تعطیلات سے استفادے کے سلسلہ میں ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ انھوں نے جامعہ میں بڑا اثر استعمال کیا کہ ان کے ساتھ رعایت کی جائے لیکن جب ہر طرف ناکامی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوئے۔ یہ وہ صاحب تھے جنھوں نے ڈاکٹر زور صاحب سے متعلق بعض غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ماضی کی تلخیوں کو بھلا دیا اور بہ یک جنبش قلم ان کے ساتھ وہ رعایت کی جو کوئی اور شاید ہی کرتا۔ وہ صاحب آج تک ان کے ممنون احسان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کا عرس کیا اس سلسلہ میں کالج کے سب اساتذہ کو تناول طعام کی دعوت دی۔ ہندو اساتذہ کے لئے علیحدہ بریانی پکوائی۔ ان کا علیحدہ دسترخوان بچھوایا اور خود انتظام کے لئے وہیں کھڑے رہے۔ جب ان لوگوں نے ان سے اتنی زحمت نہ کرنے کو کہا تو ہنس کے کہنے لگے کہیں گوشت کی بریانی آپ کے پاس نہ بھیج دی جائے ممکن ہے آپ لوگ کھائیں لیکن دوسروں کا نقصان ہو جائے گا اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ ایک ہندو لکچرار صاحب نے ایک عیسائی لڑکی کو گود لے لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بالالتزام ان کے ساتھ اس بچی کو بھی دعوت دیتے تھے اور اصرار کر کے اس کو لانے کے لئے کہتے تھے۔

چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی کے اجلاس پر ڈاکٹر صاحب سے مختلف لوگ ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ جن میں ڈاکٹر صاحب کے کچھ قدیم احباب بھی تھے۔ اگر چند روز ان میں سے کوئی نہ آتا تو خط لکھ کر دریافت کرتے یا آدمی بھجواتے کہ صحت تو اچھی ہے نہ آنے کی وجہ یہ تو نہیں کہ مجھ سے ناراض ہیں۔ ایک مرتبہ ایک دوست سے فرمانے لگے "نواب صاحب میرا نہیں تو اس چائے کی پیالی کا تو خیال کیجئے جسے آپ کے نہ آنے کی وجہ سے چپراسی پی لیا کرتے ہیں"۔

ایک دفعہ کالج کے دارو غہ صاحب نے شکایت کی کہ ایک چپراسی جس کے ذمہ پانی بھرنے کے فرائض تھے کئی روز سے کام نہیں کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا کر اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ کمر میں درد ہے اس لئے پانی کے مٹکے نہیں اٹھا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر دار وغہ سے کہا اس کے لئے "ہتھنیاں" یا "کلیاں" منگوا دیجئے تاکہ اس پر گھڑے اٹھانے کا بار نہ پڑے۔ کچھ روز بعد اسی شخص کی پھر شکایت پیش ہوئی۔ شاید کسی بات پر پہلے ہی سے خفا تھے اس کو سخت سست کہہ دیا۔ چپراسی نے رونی صورت بنالی اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے بلایا اور نزدیک آنے کو کہا۔ وہ کچھ کھچا کھچا سا رہا تو اپنے قریب بلا کر اس کی پیٹھ پر آہستہ سے ایک ہتڑ مارا اور کہا میں پیٹھ پر مارتا ہوں پیٹ پر نہیں مارتا۔ دوسرا ہوتا تو اور کچھ نہ کرتا تو کم از کم جرمانہ ہی کر دیتا۔ میری باتوں کا اگر برا مانا ہو تو مجھے معاف کر دو۔ چپراسی نے پیر پکڑ لئے اور آنکھوں سے آنسو گرا دیئے۔ شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آئندہ شکایت کا موقع نہ دو۔ ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں پھر اس کی شکایت نہیں آئی۔

آئیلو اجلاس کا چپراسی تھا اس سے بہت کام لیتے تھے اور اسے بہت چاہتے بھی تھے بعض لوگوں نے اسے واس پر نسپل کہنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سنا تو کہا مجھے تو برا نہیں معلوم ہوتا لیکن اس سے کہیں کسی لکچرار صاحب کی دلشکنی نہ ہو۔ دفتر کے محاسب صاحب نے ایک مرتبہ تین سو روپیوں کی ضرورت ظاہر کی۔ بچوں کی علالت خانگی پریشانیوں اور سرکاری مصروفیات سے وہ پریشان تھے۔ دوسرے روز ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلمدان سے مجھے تین سو روپیہ نکال کر دیئے اور کہنے لگے اپنے نام سے محاسب کو قرض دے دو اور پرامیسری نوٹ لکھوا لو۔ میں نے محاسب صاحب کو روپئے دیدئے اور کاغذ لکھوا لیا۔ لیکن شاید اس کا علم ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے نام سے کاغذ لکھ دیا۔ اس پر خفا ہوئے کہنے لگے میں تو گواہی کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کرنا چاہتا تھا۔ یہ تمہارے نام سے ہونا چاہئے تھا خیر اب اسے اپنے پاس ہی رکھو محاسب صاحب کیا روپے واپس دیں گے جب کہ پرامیسری نوٹ میرے نام سے لکھا گیا ہو۔

دفتر کے ایک اہلکار اکثر غائب رہتے۔ دفتر آتے بھی تو تھوڑی دیر کے لئے۔ کبھی کبھار پوچھ لیا تو کہتے کہ فلاں کام پر گیا تھا۔ آدمی باتونی تھے اور بڑی دل لبھانے والی درباری گفتگو کرتے تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب ہنس کر کہتے مرزا تمہاں آپ کو تو واجد علی شاہ کے دربار میں ہونا چاہئے تھا۔ ارباب قضا و قدر کی بھول سے آپ چادر گھاٹ کالج کے اہلکار بن گئے۔

ایک مرتبہ جنوبی ہند کی کسی اہم کانفرنس میں شرکت کی۔ ایک اجلاس کی صدارت پنڈت نہرو نے کی تھی اس میں بڑا زوردار خطبہ پڑھا اور اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی طرف حکومت ہند کی توجہ منعطف کرائی۔ ڈاکٹر صاحب کے واپس آنے کے بعد کانفرنس کے سکریٹری (ایک پارسی خاتون) کی طرف سے توصیفی خط وصول ہوا۔ اجلاس پر بہت سے لوگ موجود تھے سب کے سامنے خط پڑھ کر سنایا اور آخر میں مسکرا کر کہنے لگے اس تعریف کے مستحق ایک اور صاحب بھی ہیں جنہوں نے اس سلسلہ میں مدد کی تھی۔ لوگوں نے اشارہ سمجھ لیا۔ ایک بہی خواہ نے بعد میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ سب کے سامنے اس بات کے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چند روز بعد اجلاس پر پھر لوگ موجود تھے وہ بہی خواہ بھی موجود تھے ان کے سامنے ہی پورا واقعہ دہرایا اور کہا کہ حقیقت کے اظہار میں شریف آدمی کو بے باک ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب آل انڈیا لٹریری اکاڈمی کے رکن چنے گئے اور اجلاس میں شرکت کے لئے دلی گئے تو وہاں اکاڈمی کا اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے کمرے میں ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انھوں نے مولانا کو

السلام علیکم کہا۔ مولانا نے جواب میں جے ہند کہا۔ آواز بھی بلند تھی نظر میں بھی معنی خیز۔ آل احمد صاحب سرور بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے مولانا کا مطلب تاڑ لیا اور مسکرانے لگے۔ اجلاس برخاست ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے جاتے ہوئے پھر "السلام علیکم" کہا۔ اس پر مولانا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اکاڈمی کے اجلاس میں مولانا کے منشا کے خلاف کہنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے مولانا کے منشا کے خلاف ڈاکٹر ابوالفضل (مرحوم) کی کتاب "تاریخ ادب عربی" پر انعام دئے جانے کے لئے دو بار اصرار کیا۔ ایک اور سلسلہ میں ایک مرتبہ انہوں نے (Note of dissent) بھی بھیجا تھا۔

ایک مرتبہ پرنسپل صاحب چادر گھاٹ کالج کے اجلاس پر ایک شاعر صاحب کو اپنی غزلیں لہک لہک کر پڑھتے سنا گیا جو لوگ موجود تھے ان کی رائے شاعر کے موافق نہیں تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان شاعر صاحب کی تائید میں پرزور خط لکھا جس کی بنا پر انھیں وظیفہ جاری ہو گیا۔ جب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے اس شخص کو فراغت حاصل نہیں۔ یہ نصیب ہو جائے تو لکھے گا بھی اچھا اور پڑھے گا بھی اچھا۔ آپ اسے چند دنوں بعد سنئے۔

ڈاکٹر صاحب کی مہربانیوں نے ہم سب لوگوں کو کچھ گستاخ سا بنا دیا تھا اسی لئے بعض اوقات ان کے عزیز شاگرد صاف گوئی پر اتر آتے تھے۔ ایک مرتبہ زینت ساجدہ صاحبہ بھی اجلاس پر ایسی ہی کوئی بات کہہ دی جو شائد تحفظ مزاج کو صاف گوئی پر ترجیح دینے والوں کو اچھی نہ لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے ٹاڑ لیا اور کہا زینت میری شاگرد ہیں اور مجھے ان کی یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ میری ہی طرح بے باک ہیں۔

۱۹۶۰ء میں جب ڈاکٹر صاحب کے وظیفہ پر علیحدہ ہونے کا وقت آیا ان کے سب ہی دوست، احباب، ساتھی، شاگرد اور چادر گھاٹ کالج کے اساتذہ اور عملے کے لوگ دلگیر نظر آ رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بشاشت کا وہی عالم تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا جو وداعی جلسہ ہوا وہ ایک یادگار جلسہ تھا۔ اس میں جامعہ کے جتنے اساتذہ کو ان کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا (خواہ اس وقت وہ کسی کالج میں کام کر رہے ہوں) سب ہی کم و بیش شریک تھے۔ جلسہ ہوا، تقریریں ہوئیں، تحفہ دیا گیا اور پرتکلف ڈنر ہوا۔ کئی کالجوں کے پرنسپلوں نے تقریریں کیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے آئے تھے وہ تقریر کرتے ہوئے رو پڑے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی تو معلوم ہوا کہ وظیفہ پر علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ان کی امنگیں اتنی ہی جواں تھیں جتنی کہ اس شخص کی جو اپنی زندگی شروع کر رہا ہو۔ کام کرنے کی دھن میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس موقع پر جہاں مختلف اساتذہ نے یہ کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی افسر و ماتحت کے فرق کو محسوس نہیں ہونے دیا وہیں دفتر کے عملہ اور چپراسیوں کے نمائندوں نے بھی اسی قسم کے احساسات کا اظہار کیا۔

جس روز پرنسپلی کا ڈاکٹر صاحب نے جائزہ دیا کرسی سے اٹھ کر مولوی باقر فریدی صاحب نائب پرنسپل کو اپنی کرسی پر بٹھلایا اور کچھ دیر تک خود سامنے بیٹھے مسکرا مسکرا کر گفتگو کرتے رہے۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے چند گوشے تھے۔ اگر یہ ان کی خوبیاں تھیں تو آج بھی یہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی خوبیوں کی یاد باقی ہے ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر زور صاحب

۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی صبح اخباروں اور ریڈیو کے ذریعہ ڈاکٹر زور صاحب کے بارے میں خبر ملی کہ وہ ۲۴ ستمبر کو ساڑھے آٹھ بجے شب سری نگر میں اچانک قلب پر حملہ ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

ڈاکٹر زور صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس طرح کہ وہ رجائیت پسند تھے۔ مایوسی یا پسپائی اور بے بسی کے الفاظ ان کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ انھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو اس سلیقے سے کر دکھایا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ گویا ڈاکٹر زور صاحب "مرد عمل" تھے لوگ ۲۴ گھنٹے کا پروگرام بناتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اور کامیابی چلے جا رہے تھے۔ کہ کہیں سفینۂ حیات ساحل پر نہ آ لگے۔ یہ آج کل کی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ابتدا ہی سے یہ بات ان کی فطرت میں داخل تھی۔

میں بچہ تھا ۸ - ۹ سال کا اور ڈاکٹر صاحب ۱۸ - ۱۹ سال کے ہوں گے حیدرآباد کے ایک قدیم محلے شاہ گنج میں "آبدار خانہ بشیر الدولہ" کے پیچھے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ ان کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا جو ۱۲-۱۴ فٹ لمبا اور ۸ - ۹ فٹ چوڑا تھا۔ درمیان میں ایک میز اور اس کے ساتھ ایک کرسی لگی ہوئی پانچ چھے الماریاں کتابوں سے بھری دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ ۱۰ - ۵ تصویریں بھی ادھر ادھر آویزاں تھیں۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے اور مختلف رسالے زبان، شباب اردو، نگار، مخزن، تحفہ وغیرہ۔ یہ ڈاکٹر زور صاحب کی طالب علمی کا دور تھا۔ وہ ابھی گریجویٹ نہیں ہوئے تھے لیکن اتنی زیادہ کتابیں جمع کر لی تھیں اور اتنے رسائل میں مضامین لکھ کر نام آوری حاصل کر لی تھی۔ صرف مضامین ہی نہیں بلکہ نظمیں بھی۔ یہ نظمیں "شعرائے عثمانیہ" مرتبہ عبدالقیوم خاں باقی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں اس کمرے سے متصل نچلی منزل میں اپنے والدین کے ساتھ بحیثیت ایک مہمان کے ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک مہینے کے قیام کے دوران میں میں نے انھیں کبھی گپ شپ اڑاتے، دوست احباب میں وقت ضائع کرتے یا دن میں سوتے ہوئے نہیں دیکھا جب بھی کمرے پر پہنچا تو یا تو مطالعے میں مصروف نظر آئے یا لکھتے ہوئے۔ دستر خوان پر بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ خورد و نوش برائے زیستن پر عمل پیرا ہیں جبھی تو انتہائی خفیف، دبلے پتلے، جوشیرہ فی پنجے ڈھیلی معلوم ہوتی۔ لیکن آواز میں کھن گرج تھی۔ للطنطنہ تھا رُعب تھا۔

میرے والد کا وہ بڑا احترام کرتے اور ان سے اکثر فارسی شعرا اور حالی اور سرسید وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی۔ یہ سب گفتگو میری سمجھ سے باہر ہوتی۔ نام کے سوا اور کچھ پلے نہ پڑتا۔ وہ کبھی افسانے سناتے اور کبھی نظمیں۔ مہینہ دیکھتے دیکھتے گذر گیا ہم لوگ واپس ہو گئے کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب کی کتاب "روح تنقید" اور پھر "طلسم تقدیر" اور "فسانۂ زیبا" والد کے نام آئی۔ روح تنقید تو میرے لئے بیکار سی کتاب تھی۔ البتہ "طلسم تقدیر" اور "فسانۂ زیبا" کو دو تین بار پڑھا۔ سبب یہ کہ قصہ دلچسپ تھا اور ایک دیکھے بھالے شخص کا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو اس میں [illegible]

آتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں "تنقیدی مقالات" شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایم اے کی ڈگری ملی۔ اور معلوم ہوا کہ وہ لندن جا رہے ہیں۔ اور تین سال رہ کر ڈاکٹر ہوں گے۔ ان دنوں میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں حیدرآباد آیا ہوا تھا تو ۱۹۲۷ء میں یعنی دو ہی سال بعد ڈاکٹر صاحب لندن سے واپس ہوئے اور تین مہینے کے اندر اندر لگاتار کام کر کے "اردو شہ پارے" شائع کی اور پھر لندن واپس چلے گئے۔

ایسی مثالیں تو مل جائیں گی کہ کسی نے تین سال کی تعلیم کو دو سال میں مکمل کر لیا اور ڈگری حاصل کر لی لیکن ایسی مثال ابھی تک ایک بھی نہ ملی کہ ایک طالب علم تین سال کے لئے لندن جائے دو سال میں ڈگری لے اور ہندوستان آ کر تین مہینے میں بڑی سائز کے ساڑھے تین سو صفحات سے زائد کی کتاب بقول پروفیسر وغیرہ سے مزین چھاپے اور پھر الٹے پاؤں لندن واپس ہو کر تعلیم کی تکمیل کرے۔ "اردو شہ پارے" دکنی ادب کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ آنجہانی گراں مایہ کتاب اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مصنف کو دکنی زبان کا ماہر اور ادیب بنا دیا ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر صاحب ماہر لسانیات بن کر لوٹے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈری پر تقرر ہوا ان کی انگریزی کتاب ہندوستانی صوتیات اسی سال شائع ہوئی جس سے اردو لسانیات کا ایک نیا باب کھلا۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند اور نوجوان ساتھیوں نے جن میں سے چند نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی ایک علمی انجمن قائم کی جس کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی تھیں۔ مضامین پڑھے جاتے اور ان پر تنقید کی جاتی۔ ان نوجوانوں میں میر خالد (میر خورشید بیگ) ڈاکٹر طاہر علی خاں سلیم۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ڈاکٹر سیادت علی خاں۔ نسیم علی خاں انجنیر۔ پروفیسر محمد علی خاں۔ پروفیسر سید محمد۔ عبدالرحمن شریف۔ عبدالرزاق راشد اور عمر یا قمی شریک تھے۔ اس وقت حیدرآباد میں چند ایسے متفقہ رضاعت بھی تھے جنھیں ان نوجوانوں کا اس طرح جمع ہونا اور علمی مباحثے کرنا پسند نہ آیا۔ اور انھوں نے راست سرکار حیدری صدر المہام وقت سے ان کی شکایت کر دی کہ چند نوجوانوں نے ایک سیاسی انجمن بنائی ہے اور ریاست کے نظم و نسق کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ ان کا فوراً ہی تدارک نہ ہوا تو یہ ریاست کو لے ڈوبیں گے۔ حیدری صاحب نے سب کو فوراً فوراً چائے پر بلایا اور افہام و تفہیم کی۔ یہ انجمن برخواست ہو گئی۔ لیکن اس وقت ان نوجوانوں کو پتہ چلا کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور ہمیں اپنے علمی کاموں کو تیز تر کرنے کے لئے کھلے بندوں کام کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند ساتھیوں کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں "دارۂ ادبیات اردو" قائم کیا جس کے حسب ذیل مقاصد تھے۔

۱۔ اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت اور حفاظت۔

۲۔ سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ ملک کے نوجوانوں میں انشاء پردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

۴۔ عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا۔ اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنا۔

۵۔ اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

۶۔ تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت۔

۷۔ ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ اشاعت کے لئے وقف رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک انجمن کو جو محدود وسائل اور گنجائش میں کام کر رہی تھی ٹوٹتے ہوئے دیکھا لیکن انہی فروغ و حفاظت کی

تکمیل کے لئے علی الاعلان ایک بہت بڑے ادارے کے قیام کا اعلان کیا۔ جس کی بعد میں بارہ شاخیں بنائیں اور رفتہ رفتہ ان میں ایسے لوگوں کو بھی شریک کر لیا جو ان کے مخالف تھے حتیٰ کہ حمید ری صاحب خود ادارے کے سرپرست بن گئے ان کے دل میں جو شبہات تھے دور ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کے مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔

جب ادارہ کا قیام عمل میں آیا تو لوگوں نے بھی سمجھا اور ہم میں سے چند طلبہ نے بھی کہ ادارے کا قیام ہو یا کوئی کام۔ ذاتی مفادات ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ اور ہوشیار لوگ استحصال کے مختلف طریقے سوچتے ہیں۔ رقم جمع ہوگی۔ معتمد اور سوسیٹی، ادارہ کی کتابیں شائع ہوں گی۔ کھیا میں گڑ پھوڑا جائے گا۔ استحصال اور بلیک منفعت کا یہ سلسلہ جاری ہے گا۔ لیکن جب میر حسن اور مخدوم محی الدین کا ڈرامہ ہوش کے ناخن" ادارے کی پہلی کتاب کے طور پر شایع ہوا تو ہم میں سے کتنوں کی گردنیں ندامت سے خم اور جبینیں عرق انفعال سے تر ہو گئیں۔ یہ کتاب پروفیسر عبدالرحمٰن خاں سابق پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نام پر معنون تھی جن کی موت پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی مترت سے چند دن قبل لکھا تھا کہ

"وہ جامعہ کے ایک ایسے مزدور ثابت ہوئے جس کو عمارت کی تکمیل کے بعد ہی برخاست کر دیا جاتا ہے"

یہ ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت تھا اپنے استاد مشفق کی بارگاہ میں ادارے کی سب سے پہلی کتاب اس کے بانیوں کے شاگردوں نے لکھی اور بانیوں کے استاد کے نام معنون ہوئی۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اس کا دیباچہ لکھتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ

"اس سلسلے کی اشاعت و طباعت ممکن منت ہے بعض احباب کے الی اخیر کی۔ جنھوں نے از راہ علم دوستی اس کے لئے ایک ایک سو روپے کا عطیہ عنایت کیا۔ اور اس سلسلے کی بنیاد ڈالی جو ممکن ہے کہ آج خفیف نظر آئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام بڑے کام ابتدا میں بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں"

۱۹۳۴ء کی بات کو آج آپ ۱۹۶۲ء میں کسوٹی پر پرکھیے ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے بنی ہوئی ادارے کی حسین و جمیل عمارت اور اس میں لاکھوں روپیوں کا لاثمیت ذخیرہ جو اردو ادب صرف اردو زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان میں کسی کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔

ادارے کی دو نہیں چار نہیں بلکہ بارہ شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کے اراکین اور محققین الگ الگ تھے لیکن ہر بات کا فیصلہ ڈاکٹر صاحب پر چھوڑ دیا جاتا۔ اس لئے کہ فیصلہ کرنا آسان ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل۔ ڈاکٹر صاحب مشکل سے مشکل فیصلے کرتے اور ان کو جن طریقوں سے عملی جامہ پہناتے وہ انہی کا حوصلہ تھا انہی کا دل گردہ تھا کوئی دوسرا اس کا عشر عشیر بھی کرے تو اس کا پتا پانی ہو جائے۔ مخالفین رشک نہیں بلکہ حد کھائے ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے کانٹے بچھاتے پتھر نہیں بلکہ ڈھیوہ کھڑے کر دیتے۔ لیکن وہ ایک ایسا سیلاب تھا کہ سب کو بہا لیجاتا اور حاسد منہ تکتا رہ جاتا۔ عمل ہی میں ان کا یہ حال نہ تھا وہ اپنے زور قلم سے بھی ہر شخص کو شکست دیدیتے نہ کوئی ان کے برابر محنت کر سکتا نہ لکھ پڑھ سکتا اس کی مثال لیجئے۔

۱۹۳۵ء میں مرقع سخن کی اشاعت کا فیصلہ ہوا۔ طے پایا کہ دور آصفیہ کے سو شعرا کا تذکرہ لکھا جائے لیکن عملی دشواری کے سبب پچھتر شعرا منتخب کئے گئے۔ پہلی جلد کے لئے پچیس اور دوسری کے لئے پچاس۔ شعرا کو انھوں نے اپنے دو احباب اور تنقیح طلبہ میں تقسیم کر دیا۔ پھر کالج میں جہاں اور جس سے مدد ملی ہوگی، انھوں نے پوچھا کہ

"مضمون لائے" اور ایسے شدید تقاضے کئے کہ دو تین ہفتے کے اندر اندر تمام مضامین وصول ہو گئے۔ ایڈیٹنگ شروع ہوئی ہر ہر مضمون کے فوٹو بلک درست کئے جانے تھے کسی کو دوبارہ لکھ کر لانے کا حکم ہوا اور خود ہی تصحیح کی تاکید۔ تقاضوں میں کہیں نرمی

برق گئی کہیں گرمی۔ کسی کو گرمی سے بسورتا دیکھا تو پٹیہ تھپک کر اتنی حوصلہ افزائی کر دی کہ اس کی شکایت کا گلا رندھ گیا۔

وہ پڑھانے سے زیادہ کام لینے میں استاد تھے۔ انھیں کام لینے کے ایسے ایسے گر یاد تھے کہ اگر وہ سرسید کے معاصر ہوتے اور انھیں مل جاتے تو شاید سرسید ایک لمحے کے لئے بھی انھیں جدا نہ کرتے۔ کس سے کیا کام لینا چاہیئے وہ بہت جلد تاڑ جاتے تھے۔ اور اس سے وہی کام لیتے۔ ان کے کام کرنے والوں میں لدو ہیسل کی طرح کام کرنے والے بھی تھے اور ہرن کی طرح پھرتیلے بھی۔ وہ خود اس سے بڑھ کر پھرتیلے تھے۔ اگر ان میں اتنی چستی پھرتی نہ ہوتی تو وہ اردو دنیا کے لئے اتنا بڑا کارنامہ نہ چھوڑتے۔ ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ علمی کام بھی رکا ہوا نہ تھا ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب زیر ترتیب رہتی۔ کبھی تو یہ ہوتا کہ خود ان کی ایک کتاب پریس میں ہے تو دوسری کاتب لکھ رہا ہے۔ تیسری کاتب کے انتظار میں ہے اور چوتھی زیر ترتیب۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ دو دو کتابوں کی ترتیب کا کام ایک ساتھ چل رہا ہے۔ چنانچہ شعرا کے کلام کے انتخابات اسی طرح تیار ہوئے اور یہ سب یعنی متاع سخن، کیف سخن، بادۂ سخن۔ ایک ہی سال ۱۹۳۵ء میں شایع ہوئے۔

شامت اعمال کہ میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ میں اپنے خاندان کے بزرگوں اور علماء کے حالات لکھ رہا ہوں۔ کہنے لگے لاؤ ذرا میں بھی دیکھوں ایک دو مضامین کے مسودے ساتھ تھے حوالے کر دیا الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا کتاب کب تک مکمل ہوگی۔

دو مہینے۔

جب تک تو قیامت آجائے گی۔

میں اس سے پہلے پیش کر دوں گا۔

ایک مہینہ گذر گیا لیکن کام کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک دن فرمانے لگے چلو میرے ساتھ اور کتاب مکمل کرو۔ میں ہاسٹل جاکر بستر اٹھا لایا اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رفعت منزل پہنچ گیا۔ کھانا کر دوا دھر اپنی میز پر ڈٹ گئے ادھر میں نے ایک چھوٹی سی میز کرسی سنبھالی۔ دس بجے، گیارہ بجے، بارہ بجے، غنودگی طاری ہوئی آہستہ سے ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر اٹھا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ یہ سوچ کر کہ صبح جلد اٹھوں گا اور کام پر جٹ جاؤں گا لیکن صبح جب اٹھا ہوں تو ڈاکٹر صاحب اپنی میز سے لگے صفحے کالے کر رہے ہیں۔ ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھوں۔ دس دن ڈاکٹر صاحب کے جنگلے پر ہی رہا۔ یونیورسٹی ان کے ساتھ آتا جاتا رہا اور کتاب ختم کرکے حوالے کی۔ لیکن دس دن میں ایک رات بھی انھیں سوتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ میرے بعد سوتے اور مجھ سے پہلے اٹھ جاتے۔ دن گذرتے گئے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے پروگرام میں سونے کے لئے وقت نکال لیا۔ جلد سوتے سویرے اٹھتے۔ دوپہر میں کچھ دیر قیلولہ ضروری ہوگیا تھا۔ اور یہ پابندیاں انھوں نے کچھ تو اپنی صحت اور کچھ اپنے جگری دوست ہم جماعت اور فیملی ڈاکٹر۔ ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ کے اصرار پر اور ان کی خاطر اپنے اوپر عائد کر لی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب طالب علمی کے دور میں پروفیسر وحید الدین سلیم کی نگرانی میں مجلۂ عثمانیہ نکالنے کے محرک اور پھر ایڈیٹر بن چکے تھے۔ انجمن طلبائے عثمانیہ کے سہ ماہی ترجمان مجلۂ طلبائے عثمانیہ کی ادارت کی تھی۔ اب اپنا ادارہ قائم کرنے کے بعد وہ رسالہ کیسے نہ نکالتے۔ چنانچہ انھوں نے دو نوجوانوں صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش اور خواجہ حمید الدین شاہد کو منتخب کیا۔ ان کی کاوشوں سے جنوری ۱۹۳۸ء سے "سب رس" جاری ہوا اور اب تک جاری ہے اس کے بعد "بچوں کا سب رس" نکلا اور پھر . . . "سب رس معلومات" بھی۔ سب کے ایڈیٹر الگ الگ تھے لیکن نگراں ایک۔ مجلس ادارت بدلتی رہی لیکن اب موت نے نگران کو چھین لیا۔ ۱۹۴۷ء تک اضلاع اور قصبات میں ادارے کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اشاعت اردو کی غرض سے اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ملازمین رجمنٹ ہیرا شتہ آبکاری اور افواج باقاعدہ کے لئے اس کا ابتدائی امتحان لازمی کروا دیا۔ شرکت کرنے

والے امیدواروں کی تعداد سیکڑوں سے ہزاروں تک پہنچی اور اس طرح سیکڑوں اور ہزاروں کو اردو داں بنا دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہر کس و ناکس سے اپنے کاموں میں تعاون کرانے کا جو ملکہ تھا، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو ۱۹۴۴ء میں یہاں ایک بڑی شان دار کل ہند اردو کانگریس منعقد ہوئی۔ اس قدر شاندار کانگریس ہندستان میں اردو کے بارے میں شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔ انتظام سب کچھ ڈاکٹر صاحب کے ذمے تھا۔ لیکن انھوں نے بڑے بڑے نوابوں، جاگیرداروں اور عہدہ داروں کا تعاون حاصل کیا۔ نواب ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ ان کے شاگرد تھے ان سے کہہ کر بشیر باغ پیلیس میں باہر سے آنے والے ذی مرتبت ارکان کے قیام کا انتظام کیا۔ بشیر باغ پیلیس وہ قصر ہے جس کی زیارت بھی کسی کو نصیب نہ ہوتی تھی۔ اور ایسے قصر میں اردو کے امیران کارواں نے قیام کیا ہے۔ شرکت کرنے والوں میں پنجاب سے سر شیخ عبدالقادر، دہلی سے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، بھی گڈھ سے رشید احمد صدیقی۔ اور مدراس سے افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق۔ تین تو اللہ کے پیارے ہو گئے۔ رشید احمد صدیقی (خدا انھیں طول عمر دے) اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کمال تو یہی تھا کہ رشید احمد صدیقی جیسے گرگھنٹے قسم کے آدمی کو انھوں نے حیدرآباد کھینچ بلایا۔ بلانے اردو تو یہ ہمیں تھے غرض کہ حیدرآباد کی مرزمین اردو کے ان روشن ستاروں سے آسمان بن گئی تھی۔

اب سب کی خدمت کے لئے شاگردوں کا ایک جم غفیر کھڑا کر دیا تھا جنگ کا زمانہ۔ پٹرول پر راشن۔ لیکن مہمانوں کے لئے موٹریں حاضر تھیں۔ حکومت سے کانفرنس کے لئے پٹرول کے کوپن بھی حاصل کر لئے تھے گویا اس وقت پٹرول بھی جوئے شیر سے کم نہ تھا اور بے تیشے کا کوہ کن ساری دشواریوں پر قابو پاتا چلا جا رہا تھا۔

اب تک ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ تھا حکومت کی کوئی امداد نہ تھی۔ کتابوں کی فروخت اور سب سبس ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ یا پھر کچھ اشتہارات سے مل جاتا تھا۔ ادارے کا دفتر ڈاکٹر صاحب کا ڈرائنگ روم تھا۔ کام بڑھتا گیا دفتر بھی پھیلتا گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے بنگلے سے متصل ایک چھوٹی سی عمارت جس میں باورچی خانہ اور ایک ہال تھا تعمیر کی اور ادارے کو اس میں منتقل کر دیا۔ اس سے پہلے اور بعد بڑی بڑی شخصیتوں نے ادارے کا معائنہ کیا تھا اور خوب خوب داد دی تھی۔ جب غلام محمد وزیر خزانہ حیدرآباد (بعد کو گورنر جنرل پاکستان) نے ادارے کا معائنہ کیا تو فرمایا۔

"زور صاحب بھی چاہتا ہے کہ آپ کو خزانہ عامرہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جا سکتے ہو لیجاؤ۔"

اس کے بعد ہی انھوں نے ادارے کے لئے معقول رقم منظور کی۔ جس کا سلسلہ کمی و بیشی کے ساتھ ابھی تک جاری ہے۔ حکومت آندھرا پردیش بھی جس نے ہندوستان میں اردو سے تعلق سے وسیع تعلیمی اور بالغ نظری سے کام لیا ہے، ادارے کو گرانٹ دے رہی ہے۔ اس امداد کے بعد سے ادارے کے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور کام کرنے والوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔

ادارہ انسائیکلوپیڈیا کا کام بہت اہم تھا علماء کے قلم سے ایک جلد تیار ہو گئی۔ نوٹ کیا ستر صفحے چھپ گئے لیکن جنگ، گرانی، کاغذ کی قلت، اور دوسری مصروفیتوں نے مگر توڑ دی، اور وہ کام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

ڈاکٹر حفیظ سنید پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی نے خطبوں کا تیسرا شمارہ نعمت اللہ ولی کے مزار پر جو گجرات ہے اس کے چہرے کی ضرورت ہے۔ شمارہ صاحب نے مکمل مکتوب شاہ لے زمانے میں منتقل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کاغذ کا ایک ٹکڑا بھیج جانے کا مکمل، زمرہ قلعہ گولکنڈہ کے شمالی حصے میں بہت خراب راستے سے ہوتے ہوئے ایک بنگلے کے کچھ دور پیدل گئے جہاں کہ پہلے سے نظر آئی اندر مزار پر لگے پانی کا پانی بہت خراب تھا۔ اس کا چھڑکاؤ کیا اور وہاں کے خادموں سے گفتگو ہوئی۔

شاہ صاحب کی زندگی کے حالاتِ نامساعد سے بیان کئے۔ خادم و مخدوم اور دوست کرنے کے باوجود لاعلم اور بے لندن پلٹ ڈاکٹر صاحب درگاہ کی جزویات سے واقف کیسے بنے کب اور کیوں بنائی۔ صاحب مزار نے کیا کیا کرامتیں دکھائیں اور اب ان کی کونسی کرامت ہو رہی ہے۔

۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر صاحب پروفیسر ہوئے لیکن جامعہ عثمانیہ سے علیحدگی اس کے نئے ملحقہ قائم کردہ دارالعلوم کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے جائزہ حاصل کیا۔ انھیں اس کا افسوس تھا کہ اس سے ان کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ کیوں کہ اب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اور سارے کام انھیں کو انجام دینا پڑے گا۔ ان کا خیال صحیح نکلا وہ یونیورسٹی کیمپس سے باہر ہوئے اور اورنگ آباد میں علمی ذوق کو تعمیر کرنے اور شوق کو تازیانہ لگانے والا کوئی نہ رہا۔ البتہ انھیں اس کالج میں آنے سے سہولتیں زیادہ حاصل ہوئیں اور ادارے کے کاموں کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔ ان کے بہت سے تاگرد و نیچرار بن کر ان کے پاس پہنچے اور انھوں نے ان سے خوب ہی کام لیا۔ اب طلبہ کی صحبت سے وہ لکچراروں ہی سے زیادہ کام لینے لگے اگر کوئی پیلو ہی کرتا تو بری طرح اس کی خبر لیتے۔ محدود کی حیثیت سے نہیں بلکہ بزرگ اور استاد کی حیثیت سے۔ اور کبھی نرمی پر آجاتے تو لکچرر بھی میاں اور بابا کی شفقت میں کھڑے نظر آتے اور غصہ آتا تو بیوقوف معقول اور نالائق بن جاتے۔ اور ان گالیوں کو شربت کا گھونٹ سمجھتے۔ لقمی شیریں تھی ان لبوں سے جو زبان کی لالی سے ہمیشہ سرخ رہتے۔

۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی نے دارالعلوم کالج کو چادر گھاٹ کالج سے موسوم کیا اور مقام بھی بدل دیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کو کچھ فرصت ملی۔ سکون ملا۔ اندرون شہر کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر آئے۔ تذکرہ مخطوطات کی دوسری جلد۔ دکن اور سیدآباد۔ پھر حیدرآباد فرخندہ بنیاد نہیں لکھی۔ لکھنے کا یہ حال تھا کہ لوگ آرہے ہیں۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ سامنے کچھ کتابیں اور مخطوطے کھلے ہیں۔ بازو پانوں کا پیاکٹ دھرا ہے۔ ایک پان کھاتے ہیں کھاتے ہیں۔ قلم بھی چلتا ہے۔ منہ بھی چلتا ہے اور زبان بھی چلتی ہے۔ لوگوں سے بھی باتیں ہوتی ہیں اور ٹیلی فون پر بھی۔ اور تذکرہ اردو مخطوطات جیسی اہم کتاب لکھی جاتی ہے۔ ان سب پر مستزاد دفتر کی مثلوں اور گزری کاغذوں پر بھی دستخطوں کا کام جاری ہے ——— ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ایک وقت میں ایک کام کرنا تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ہر شخص ان کی طرح چوکھا وارکرتا رہے۔ اتنی ہمت کوئی اولوالعزم ہی سے ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کی اس رفتار کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے اور انگشت بدنداں ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد ذکم قادری الرفاعی نے انتقال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی تدفین کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں رود موسیٰ کی طغیانی میں ان کے جد امجد سید شاہ عنایت اللہ غرق ہوئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک بڑا قطعۂ اراضی خرید اور والد کی قبر پر شاندار گنبد قائم کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ ایک بہن اور ایک چھوٹے بھائی جمال الدین قادری اس گنبد میں آسودہ ہیں۔ وہ خود بھی یہیں رہنا چاہتے تھے لیکن گردش روزگار نے موقع نہ دیا اور یہاں سے ہزاروں میل دور سری نگر کے ایک شہر خموشاں "خانیار شریف" کے ایک گوشے میں جگہ پائی۔ اس گنبد سے متصل ڈاکٹر صاحب نے ایک خانقاہ تعمیر کی جس کا نام "خانقاہ عنایت اللہی" رکھا۔ اس میں ایک کتب خانۂ اسلامیات قائم کیا جس میں مطبوعات کے علاوہ فن تصوف پر مخطوطات کی بھی کافی تعداد محفوظ ہے۔ اور پھر اپنے بڑے صاحبزادے سید شاہ تقی الدین قادری کو اپنے والد مرحوم کی جگہ سجادہ نشین بنا دیا۔ ہر سال وصال مرحوم سے عرس ہوتا۔ قوالی کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ طرحی مشاعرے ہوتے۔ اور تین دن بزرگان دین اور سادات عظام کے تذکرے ہوتے۔

میں گزرتے۔

حکومت حیدرآباد، حکومت آندھرا پردیش بن گئی۔ لسانی بنیاد پر حیدرآباد کے تین ٹکڑے ہوئے۔ اس کو مدراس سے کچھ ملا اور میسور سے کچھ اور حیدرآباد سے مدھیہ پردیش کو کچھ ملا اور بمبئی کو کچھ۔ لوگ داویلا مچا رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ کوئی نئی تقسیم نہیں بالکل اصولی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا آپ ماہر لسانیات داد نہ دیں تو اور کون دے گا۔

"دیکھو ہنسنے کی صحیح نہیں اگر قسمیں آپ سے واقفیت ہو تو یہ بھی یاد ہوگا کہ محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت کے حدود یہی تھے۔ اور موجودہ آندھرا پردیش کا پورا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔ آج لسانی بنیادوں پر تقسیم میں اسی کی روح کارفرما ہے۔ جلوہ اُس کا عرس منائیں قلی قطب شاہ کی جئے"

پھر یوم محمد قلی منانے میں ڈاکٹر صاحب تن من دھن سے لگ گئے۔ اور ساتھیوں کی پُرکون زندگی میں ہل چل ڈال دی۔ گورنر سے لے کر ایک عام آدمی تک قلی قطب شاہ کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ثبوت اقتدار ہوں گے۔ نشان کا باغی ہوگا۔ ماہی مراتب ہوں گے نقیب اور چوبدار ہوں گے۔ پھر قلی قطب شاہ کی جگہ باغی پرسندرا کی کشتی ہوگی۔ ہاتھیوں پر شاہی نوبتیں ہوں گی۔ گھنٹیاں ہوں گی۔ سارا ساز و سامان ہوگا۔ پھر پالکی۔ نالکی۔ میانہ۔ ہوادار۔ یوجھ۔ رتھ۔ اور ٹٹیاں ہوں گی۔ غرض کہ جلوس کی ساری تفصیل سمجھا دی۔ اور ایک کو اپنی رتھ بنا دیا۔ وقتاً فوقتاً دیکھتے رہے کہ ہدایتوں پر عمل ہو رہا ہے کہ تمہیں گورنر صاحب سے کہنا کہ محمد قلی قطب شاہ کے گنبد پر جلسہ ہوگا آپ صدارت کریں گے۔ میر جملہ اور وزراء سے کہنا کہ آپ لوگ جلوس کی قیادت کریں گے۔

اس سے بڑھ کر ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ قلعہ کا چپہ چپہ عوام کو بتلانے کے لئے گائیڈز کی تربیتی جماعت قائم کی۔ تاریخی پس منظر کے لکچرز۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے دیئے اور ادبی حالات پر ڈاکٹر صاحب نے۔ اور اس تربیتی جماعت کو قلعہ کا ایک ایک چپہ بتلاتے پھرتے۔

دیکھئے ہم اب قلعہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کمان میں تالی بجائیے تو بالا حصار پر سنیئے۔ آگے بڑھیئے تو سیدھے ہاتھ پر نگینہ باغ تھا۔ وہ اس نیم کے درخت کے نیچے عبدالرزاق لاری اپنے گھوڑے سے گر کر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ سامنے اس بائولی سے جو فل نظر آتی ہیں ان سے پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا۔ انہیں طاقوں پر محل ہیں۔ یہ برابر ہیم قطب شاہ کا محل ہے۔ محمد قلی قطب شاہ یہاں پیدا ہوا بھاگ متی اس کمرے میں رہتی تھی۔ وہ اس دیوار میں چوپا کرتی اور قلی قطب شاہ اس سے لگی ہوئی اس مسجد میں نماز پڑھتا تھا یہ محلات سے متصل دوسری بائولی ہے۔ جب اورنگ زیب کی فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو ابوالحسن تانا شاہ کی حرم سرا سے سسکیوں کی آوازیں نکل اس میں کود گئیں۔

غرض ایک ایک اینٹ کی تاریخ اس طرح سمجھاتے گویا قلی قطب الملک سے ابوالحسن تانا شاہ تک کا سارا زمانہ انھوں نے دیکھا تھا۔ اس اختلاط کے ساتھ میں نے کسی کو پڑھاتے نہیں دیکھا۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ ادارے کے کارناموں کی تشہیر میں وقیع ہو گئے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے ہی موقع سے فائدہ اٹھایا اور ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے امداد باہمی کی سوسائٹی آف ابوالحسن تانا شاہ اور پروفیسر ہمایوں کبیر ادارے کے بارے میں سن چکے تھے مرکز سے امداد دینے میں انھیں تامل نہ ہوا۔ عمارت بننی شروع ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پاؤں میں گردش پرکار آ گئی۔ اپنے کمرے میں ادارے کی عمارت تک دن میں تین چار بار چکر لگاتے۔

اینٹ پتھر کا کام ہوتا رہا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر برابر آتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب ماہر شکلی۔ معماروں کو ہدایتیں دیتے کبھی اردو میں

کبھی تانگی میں اور کبھی اور سیر کو انگریزی میں۔

خدا خدا کر کے عمارت بنی۔ اور آرائش کی باری آئی۔ دن رات سوچ رہے ہیں کہ کونسی چیز کیسی ہو۔ فیاض الدین صاحب سے مشورے ہو رہے ہیں۔ دلدار حسین صاحب سے تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ عبدالرحمٰن شریف صاحب سے رائے لی جا رہی ہے۔ اور سب کی رائے کا خلاصہ بنا کر عمل کر رہے ہیں۔ الغرض گانے اور میوزیم سجانے کی باری آئی تو نواب عنایت جنگ بہادر کو زحمت دی۔ نواب صاحب تشریف لائے مسلسل چار پانچ گھنٹے بیٹھے بھی رہے۔ باتیں ہوئیں مشورے ہوئے۔ کچھ تاریخ دھرائی اور ایوان سجنے لگا۔ ایوان کے آرائشی وغیرہ نوادر خواہ وہ ہتھیار ہوں یا مواہیر، طغرے ہوں یا منظومات۔ نواب صاحب ہی کا عطیہ ہیں۔

افتتاح کے لئے بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر کے نام قرعہ پڑا کیونکہ عمارت کی تعمیر میں حکومت کشمیر کی امداد کا بھی دخل تھا۔ وہ آئے۔ بڑی شان سے افتتاح ہوا۔ اور اردو کی اپنی ایک شان دار عمارت "ایوان اردو" کے نام سے وجود میں آ گئی۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کے لئے "اردو ہال" کی تعمیر شروع ہوئی تھی تو انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اردو ہال بنا رہے ہیں اور آپ بھی ایوان بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر دس ہال اور دس ایوان بن جائیں تو میں کہوں گا کہ مجھے بھی ہال اور ایوان بنانا چاہیئے۔ اردو سے یہ عشق تھا ڈاکٹر صاحب کو۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب انجمن ترقی اردو میں بھی موجود ہوتے اور ہندی پرچار سبھا میں بھی۔ مہاراشٹر منڈل میں بھی نظر آتے اور آندھرا سرسوتی پریشد میں بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اداروں کی تقریبیں ڈاکٹر صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ اور ڈاکٹر صاحب ادارے میں سب اداروں کے عہدہ داروں کو مدعو کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کچھ اچھے مقرر نہ تھے لیکن ان کی شہرت ان کے کام اور ان کی مقبولیت نے بہت ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ انھیں کہیں جلسوں کی صدارت یونیورسٹیوں کے افتتاح اور مشاعروں کی میر کے لئے بلاتے صرف مقامی طور پر ہی نہیں بلکہ حیدرآباد سے باہر بھی۔ ڈاکٹر صاحب کسی کی درخواست ٹھکرا ہی رد کرتے اس کا نامہ انہیں ہوا کہ اچھے مقرر بن گئے۔ تقریر کا انداز نہایت شگفتہ اور دلآویز ہوتا۔ بعض موقعوں پر ایسی دلکش تقریریں کی ہیں کہ باید و شاید ہی ایسی تقریریں سننے کا موقع ملا ہو۔ اس سلسلے میں وہ بمبئی، سنگاپور، برہان پور، کرنول، اورنگ آباد اور بیدر وغیرہ بھی گئے تھے۔

چالیس پینتالیس سال کے نظر آنے والے زور صاحب ایک دو چھوٹے سال کے ہو کر وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہو گئے۔ خیال ہوا کہ اب ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ادارۂ ادبیات اردو پر پوری توجہ صرف کریں گے لیکن کشمیر سے پروفیسری کا پیش کش ہوا اور ساتھ ہی بخشی صاحب وزیر اعظم کشمیر کا تقاضا۔ کچھ خانگی اور کچھ سرکاری باتیں حیدرآباد میں خبر پھیلی کہ ڈاکٹر صاحب کشمیر کی پروفیسری قبول کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے پیسے کی خاطر جا رہے ہیں۔ جانے والے کہتے ہیں وہاں بھی ادارہ قائم کرنا اور اردو کا گڑھ بنانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض شاگردوں نے صاف کہہ دیا کہ آپ کو حیدرآباد نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ جب کہ آزاد اور ادارے کے دو کام آپ کے ذمے ہیں۔ اردو کی خدمت کا جذبہ آخر انھیں کشمیر لے گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں سری نگر میں انڈیسٹیل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شرکت کے لئے لکھا۔ ڈاکٹر شریف الحسن، مولوی غلام رسول، پروفیسر سید محمد، اور میں نے ان کی دعوت پر شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے مہمان رہے یونیورسٹی سے واپس ہوتے ہوئے ڈاکٹر شریف الحسن سے کہا تم کلیہ پر کام کر رہے ہو تو ہمیں اس کی قبر کی زیارت کرا دو۔ پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے صحیح سلامت پہنچے جس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے اسی عنوان پر اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ چھوٹا سا نہایت بلند جواب چوراہے سے کر گیا ہے۔

اس پر پڑھنا مشکل لیکن ڈاکٹر صاحب کے ذوقِ جستجو کے تقاضے میں ہر کوہ کاہ اور ہر مشکل کُل گویا اس فضل امجد کا کھولنا ڈاکٹر صاحب ہی جانتے تھے۔ اگر انھیں بہت ملتی تو نہ معلوم وہ سری نگر کے بھی ایسے ہی مورخ بن جاتے جیسے گوکنڈے کے تھے۔

وہ خود بہت بڑے آدمی تھے وہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن بزرگوں کا ادب بھی ان کے خمیر میں تھا۔ کئی بزرگ اس کمانہ ۔ یتی کریں گے۔ حضرت مخدوم علامہ خیر محمد بدایونی، عبدالحق، سرائے دہلی اور کئی دوسرے حضرات۔ اکثر ڈاکٹر صاحب کے پاس آتے، اور ڈاکٹر صاحب اٹھ کر ادھم ہو کر ملتے۔ اور مسئیل کانفرنس کے اجلاس میں ایٹ ہوم کے موقع پر خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر عابد حسین ایک میز پر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولوی غلام رسول صاحب کا ہاتھ پکڑ کے جا کر تعارف کرایا "آپ میرے استاد مولوی غلام رسول صاحب ہیں جن سے میں اب تک بھی کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا ہوں۔ ایسے سعادت مند شاگرد کتنے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب جانے کو تو کشمیر گئے لیکن دل ایوان اردو میں رہا۔ خطوں میں ہدایتیں ہیں فلاں کتاب پریس کو دو سب سے وقت پر نکالو۔ پروف ریڈنگ اچھی ہو۔ طباعت کا اہتمام کرو۔ دروازے کو پالش کراؤ اس کا رنگ جا رہا ہے۔ بارش کا موسم ہے۔ سارے بھیگ نہ جائیں، ان کا خیال رکھو۔ ہر کارہ سلیقے سے ہوتا ہے تم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو مجید صدیقی صاحب یا سکسینہ صاحب سے مشورہ کر لو یا مجھے لکھو میرے پاس وقت کی دائری آتی ہے۔ کوئی دن ناغہ نہ ہو۔

ہمیں مشورے دینے والا۔ ہمیں زیر تربیت کرنے والا۔ پیٹھ تھپک کر حوصلے بلند کرنے والا تھک جانے تک کام لینے اور کرنے والا۔ ادارے اور آزاد انسٹی ٹیوٹ کا بانی سیکڑوں شاگردوں کا استاد اور ہزاروں کا مرجع اعتقاد آج ہم میں نہیں۔ آج ہم اس کی قبر پر پھول بھی چڑھانے کے قابل نہیں۔ کہ وہ ہم سے ہزاروں میل دور سری نگر کے ایک شہر خموشاں خانیار شریف میں محوِ خواب ہے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بشکریہ "نقوش" لاہور)

ڈاکٹر زور کی ذات اس دور میں اردو کے لئے مینارۂ نور تھی۔ مرحوم کے انتقال سے اردو میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا بظاہر مشکل ہے۔ مرحوم نے اردو زبان و ادب خصوصاً قدیم دکنی ادب کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ مرحوم نے دکن میں "ادارۂ ادبیاتِ اردو" قائم کر کے وہاں اردو کو ختم ہونے سے بچا لیا۔

(ماہنامہ "فروغِ اردو" لکھنؤ۔ اکتوبر ۶۲ء)

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

ڈاکٹر زور شخصیت

ڈاکٹر زور کو میں ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے جانتا تھا۔ وہ میرے بزرگ بھی تھے اور دوست بھی۔ میں ان کا حلیف، مددگار بھی تھا اور حریف و ناقد بھی۔ بے شمار کاموں میں میں اُن کا شریک تھا اور بہت سے موقعوں پر میں نے اپنے آپ کو بالکل الگ بھی کر لیا تھا۔ وہ میرے بزرگ اسلئے تھے کہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ یوں تو میں نے ان سے درسی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ان سے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔ اُن کا ہم کار بن کر کاموں کے ڈھنگ سیکھے۔ میں ان کا دوست اس لئے تھا کہ اِن سے ملاقات کے چند ہی دنوں بعد وہ بہت سی باتوں میں مجھ سے رائے مشورہ کرنے لگے اور عمر اور مرتبہ کے فرق کے باوجود وہ مجھ سے دوستوں ہی جیسا سلوک کرتے رہے۔ یہ اُن کی بزرگی بھی تھی اور طبیعت کی افتادِ بھی۔ میری خود اعتمادی بھی تھی اور طبیعت کی اُٹھان بھی۔ میں اُن کا حلیف و مددگار اس لئے تھا کہ ربع صدی کے عرصہ میں ادارہ ادبیات اردو سب رس، شعبہ طلبہ تعلیم بالغان، کتب خانہ مخطوطات کی ترتیب، کانفرنسوں اور جلسوں کے انعقاد اور اسی نوعیت کے بے شمار منصوبوں اور مشغلوں میں ان کا شریک کار رہا۔ میں ان کا حریف و ناقد اس لئے تھا کہ اکثر مسائل اور معاملات میں ہم دونوں میں شدید اختلاف رائے تھا۔ اور ہم دونوں کی طبیعتوں کی افتاد جداگانہ تھی۔ طبیعتوں کے اس اختلاف اور رائیوں کے تصادم کے باوجود ہماری محبت و دوستی آخر دم تک متاثر نہ ہوئی۔ وہ تادمِ مرگ میرے بہی خواہ رہے اور میں ہر وقت اُن کی خیر خواہی اور خیر سگالی کی صورتیں پیدا کرتا رہتا۔ ڈاکٹر زور کی زندگی پر کچھ لکھنا در اصل ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ کے انھیں واقعات و متعلقات کی یاد تازہ کرنا ہے۔ ان ہی واقعات اور حالات کے آئینہ سے در اصل ڈاکٹر زور کی شخصیت جھلکتی ہے۔

(۲)

ڈاکٹر زور سے میری پہلی ملاقات ایک روز سر شام "رفعت منزل" کے پائیں باغ میں ہوئی۔ میں اس زمانہ میں مڈل اسکول کے آخری درجہ میں پڑھتا تھا۔ اور ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ کی اُردو ریڈری کی خدمت پر مامور تھے۔ مجھے مضمون نگاری کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اور میرے چھوٹے چھوٹے مضامین ادبی رسالوں میں شائع ہو رہے تھے۔ بیگم زور کے بھائی معین الدین احمد انصاری اور چند طالب علموں نے مل کر ایک "انجمن پیام برادری" کے نام سے قائم کی تھی۔ اور میں اس کا صدر بنایا گیا تھا۔ معین الدین احمد انصاری جو گھر والوں میں مقبول کے نام سے مشہور تھے اس کے معتمد تھے۔ انجمن کا دفتر بھی "رفعت منزل" کے پائیں باغ کے ایک کمرے میں قائم تھا۔ اس طرح میرا "رفعت منزل" آنا جانا شروع ہوا۔ ہمارے اکثر جلسے بھی رفعت منزل ہی پر ہوتے تھے۔ غرض ایک شام ہم رفعت منزل کی بلندیوں سے نیچے کی طرف آ رہے تھے کہ ایک صاحب سے

ڈھیلا ڈھالا ململ کا کرتہ پہنے، زلف انداختہ، ٹہلتے ٹہلتے رفعت منزل کی طرف آرہے تھے۔ سرخ و سفید چہرہ بھاری بھرکم بدن، مستانہ چال، لب رنگین، گلوری اس طرح چباتے تھے کہ گویا اس کو سزا دے رہے ہیں۔ تیز آنکھیں، ستوان ناک، کشادہ پیشانی، لبوں پر مسکراہٹ جو اکثر بلند قہقہوں میں ڈوب جاتی تھی۔ پاؤں میں آپتا ہی جوتا۔ یہ تھے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ تعارف ہوا، گفتگو شروع ہوئی۔ ہم ایک دوسرے سے غائبانہ متعارف تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر ادھر ادھر کی گفتگو میں گزرا۔ بے تکلفی کے ساتھ ہی ساتھ حوصلہ افزائی اور فراخ دلی کے بھی آثار۔ یہ اُن کی بڑائی تھی کہ اسکول کے ایک طالب علم کو اتنا وقت دینا انھوں نے تضیع اوقات نہ سمجھا۔ پہلی ملاقات ہی میں زور صاحب نے مجھے ادارہ ادبیات اردو کے کاموں میں دلچسپی لینے کی دعوت دے دی۔ پیام برادری کے خطوط پر ادارۂ ادبیات اردو میں ایک شعبۂ طلباء قائم کیا گیا۔ میں اس کا صدر اور معین الدین انصاری اس کے معتمد بنائے گئے۔ اس شعبہ کی طرف سے طلبہ میں اردو پھیلانے، لکھنے لکھانے اور تقریریں کرنے کا شوق دلانے اور علمی و ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے کا بہت کچھ کام ہوا۔ کہنے کو تو ادارۂ ادبیات اردو جانے کا ایک بہانا نکل آیا تھا۔ لیکن اس طرح مجھے ڈاکٹر زور سے قریب ہونے کا موقع مل گیا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میری اکثر شامیں اور چھٹیاں ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور کی نذر ہونے لگیں۔ ان ہی صحبتوں میں ہندوستان کے نامور ادیبوں، شاعروں اور عالموں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان صحبتوں میں مجھے کبھی اپنی علمی بے مائگی کا احساس نہیں ہوا۔ ان صحبتوں میں نیاز فتحپوری جوش، جگر، قاضی عبدالغفار، حسرت موہانی، سراکبر، نواب صاحب چھتاری، علی یاور جنگ، سر و جنگ، ٹائیڈو، انجد، علی منظور، علی اکبر صاحب، حسین علی خاں صاحب، مجید صدیقی صاحب، سروری صاحب، سید محمد صاحب، ہاشمی صاحب، صمد ساز رضوانی، وحید، مخدوم، میکش، غرض ان سب کو دیکھنے سننے اور سننے کا موقع ملا۔ میں نے حیدرآباد کی ایسی چیدہ چیدہ مجلسوں میں وہ سب کچھ پایا جو شاید عمر بھر کی کتابوں کے مطالعہ سے نہ مل سکتا تھا۔ مطالعہ بجائے خود اہمیت نہیں رکھتا اس کو چیز بنانے کے لئے صحبت کا فیض بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت کا عجیب رنگ تھا۔ ہندوستان بھر میں ان کے تحقیقی اور ادبی کاموں کی شہرت ہو چکی تھی۔ کوئی ادیب، شاعر یا عالم ایسا نہ ہوتا جو حیدرآباد آکر ادارہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ زور صاحب کو کوئی نہ کوئی ضرورت ان کو ادارۂ ادبیات اردو بلانے کی کرتے۔ جب کوئی مہمان ادارہ میں آتا تو زور صاحب نہایت سادگی لیکن پرکاری سے اپنے کاموں کی تفصیل پیش کرتے۔ کام اتنے زیادہ تھے کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر زور کا مشرب وسیع تھا۔ اس لئے ان مہمانوں میں مسلمان بھی تھے، ہندو، عیسائی اور پارسی بھی۔ ان میں ہر سیاسی مسلک کے لوگ شامل تھے۔ ان کی سیاسی عقائد سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اردو دوستی کو دیکھتے تھے۔ ان کی ذات سے ادارۂ ادبیات اردو اور اردو کو کوئی پیچیدہ دماغی سے جاتے۔ کاموں سے واقف کراتے ادارہ کو ترقی دینے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیتے۔ یہ گر ان کو خوب آتا تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور اس منصب پر فائز ہو کر ادارہ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ حیدرآباد میں سر اکبر اور سر علی یاور جنگ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ان دونوں میں عقائد کا اختلاف بھی تھا اور عزائم و آرزوؤں کا ٹکراؤ بھی۔ لیکن ڈاکٹر زور کو ان دونوں کی یکساں تائید حاصل رہی۔ انتہا یہ ہے کہ علی یاور جنگ جیسے سیاس بھی جو اپنے آپکو دیکھ سمجھ کر

اداروں سے متعلق کرنے کے فن کو خوب جانتے تھے۔ ان سے بے تعلق نہ رہ سکے۔

جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوا تو میں نے معاشیات و سیاسیات کو اپنایا۔ اس طرح شعبہ اردو سے میرا کوئی رسمی تعلق نہ تھا لیکن فرصت کے تمام اوقات ڈاکٹر زور ہی کے کمرے میں گزرتے تھے۔ یہاں سب پروفیسر اور طالب علم جمع ہوتے۔ پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر سروری، پروفیسر لوٹیا، پروفیسر فاروقی، پروفیسر ستیارا ڈو غرض وہ سب اصحاب جو کسی نہ کسی طرح زور صاحب کے شریک کار تھے یہاں آتے۔ ان میں استاد اور طالب علم بھی شامل تھے۔ ادبی و سماجی امور موضوع زیر بحث آتا۔ انسانی کرداروں پر بھی تبصرہ ہوتا۔ لوگوں پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ قہقہے بلند ہوتے۔ زور صاحب عام طور پر دس بجے آرٹس کالج پہنچتے اور ایک بجے تک ملاقاتیوں کا یہ تانتا بندھا رہتا۔ زور صاحب خندہ پیشانی سے ان سب سے ملتے جو ایک ہی آنے والے پر نظر پڑتی جملہ چست کر دیتے۔ زور صاحب کے ساتھیوں میں سے اکثر اور ہم طالب علم سب بلا کے حاضر جواب تھے۔ ہم بھی کوئی نہ کوئی دار کر ہی دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی زور صاحب نے کسی کے وار پر ناراضگی کا اظہار کیا ہو۔ انھیں دو ایک حد سے زیادہ متین بھی تھے اور ان کی متانت ہماری تفریح طبع کا سامان فراہم کرتی تھی۔ غرض زور صاحب کو کہنے سننے میں بڑا مزا آتا تھا۔ یہ محفلیں ایک بجے کے قریب دم توڑتیں۔ واپسی میں ہم میں سے کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ ضرور ہوتا۔ وہ کالج سے نکل کر دارالطبع پہنچتے وہاں کاتب کو مسودات دیتے اور جو کاپیاں لکھی جا چکی ہوتیں انکو ساتھ لیتے اور گھر کا رخ کرتے۔ چند دن ایسے بھی گزرے جبکہ زور صاحب دوپہر کا کھانا کالج ہی پر کھاتے تھے۔ ان کا یہ کھانا بہت مختصر تھا۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ شریک کر لیتے تھے۔ اگر کوئی اُن کی اس مختصر سی غذا پر جملہ چست کرتا تو کہتے "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است"۔

میں ابھی سال اول ہی میں تھا۔ ایک روز سر شام حسب معمول ان کے مکان تہت منزل پہنچا۔ زور صاحب کتابوں کے ذخیرے کو صاف کروا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے "مبارک باشد مبارک" میں حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی! کہا کہ مہاراجہ کشن پرشاد پر میرے مقالہ کو پہلا انعام دیا گیا ہے۔ میں ہنسکر اگر خاموش ہو گیا۔ زور صاحب نے مجھے بغور دیکھا گویا میری نفسیاتی کیفیت کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ کہنے لگے "انعام اول اسلئے ملا ہے کہ مضمون اچھا لکھا ہے۔ میں خاموش زور صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ زور صاحب نے کہا میں اس لئے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ کو یہ خیال نہ گزرے کہ دوستی اور تعلقات انعام دلاتے ہیں۔ انعام لیاقت اور محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں پھر بھی خاموش ہو گیا وہ ایک شیر کی طرح گرج کر کہنے لگے۔ کچھ سمجھے بھی آپ مولانا!! میں نے کہا آپ کہتے رہیے میں سنتا رہا۔ زور صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا کہ اجی مولانا میں آپ سے کچھ ستا بھی چاہتا ہوں۔ یہ ان کی طبیعت کی افتاد تھی۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کو بالکل چھپا نہیں سکتے تھے۔ رنج و خوشی کے احساسات اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے غمازی کرنے لگتے تھے۔ غصہ میں اکثر وہ بے قابو ہو جاتے اور ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی اُن کو اس حالت میں سہارا دے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ بے چین ہو جاتے اُن کا غصہ جتنی جلدی آتا اتنی ہی جلدی دفع بھی ہو جاتا تھا۔ ابھی کسی پر برس رہے تھے ابھی قہقہے بلند ہونے لگے۔ ایک روز کا ذکر ہے کچھ کتابیں میز پر رکھی تھیں۔ زور صاحب میری کتاب کا مسودہ پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے "مسودہ کتابوں کے

نیچے دبا دیا اور کسی طرف کو چل دئے۔ واپس ہوئے تو مسودہ نہ ملا۔ ادھر اُدھر دیکھا نہ پایا۔ اب کیا تھا برسنے لگے۔ کتابوں کے درمیان کاغذات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر مسودہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ دیکھا وہی مسودہ ہے جس کی وہ تلاش کر رہے تھے۔ برہمی پہلے ہی کافور ہو چکی تھی۔ وہ بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ گفتگو کا رخ اور ہنج بدل ڈالیں۔ یہ مسودہ کیا ملا گویا ان کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ایک قہقہہ بلند ہوا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ انکی طبیعت کا رنگ تھا۔ وہ بہت جلد متاثر ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود غضب کا ہمت و حوصلہ رکھتے تھے ان کی طبیعت کی اس افتاد اور ان کے عزم و ارادے کی اٹھان میں تضاد تھا۔ اور اسی تضاد نے ان کی قواویں وقت سے پہلے ہی مضمحل پیدا کر دیا تھا۔ وہ ایک بہت ہی حساس دل رکھتے تھے۔ مخالفت کا ان پر بجلی کی طرح اثر ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنے عزائم اور ارادوں کے سہارے اس کو پی جاتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان احساسات و جذبات پر قابو پاتے تھے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ وہ وقت سے پہلے مرے اور ان کی قبل از وقت موت کا سبب بھی یہی تھا۔

(۳)

ڈاکٹر زور کی زندگی اور اُن کے علمی و ادبی کارناموں کو ہم پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ۔ یہ دور اس وقت ختم ہوا جب کہ زور صاحب یورپ سے ڈاکٹریٹ کر کے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہو گئے۔ اس دور کے مطالعہ میں چند باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ڈاکٹر زور مشائخ خاندان کے فرد تھے۔ اُن کے والد اپنے مواعظ کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہ بڑے محنتی طالب علم تھے۔ انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ زمانہ وہ ہے جب کہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے علمی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ اُن کو وحید الدین سلیم جیسا یگانۂ روزگار استاد مل گیا تھا۔ انھوں نے اسی دور میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ اس زمانہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ کو حیدرآباد میں علمی اشاعت کا مرکز خیال کرنا چاہئے۔ ابتدا میں ڈاکٹر زور کی تحریری مشق بھی اسی ادارہ سے شروع ہوئی۔ بہت جلد ڈاکٹر زور نے روح تنقید کچھ کر اپنے مرتبہ کو بلند کر لیا۔ یہ کتاب اس موضوع پر پہلی کتاب تھی۔ اور اس موضوع کی انگریزی کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا تھا۔ استادوں کی ہمت افزائی اور ان کی محنت نے ان کو اپنے ساتھیوں میں ممتاز کر دیا۔ اسی زمانے میں وہ رفعت یار جنگ اور سر نظامت جنگ سے بھی ملے۔ سر نظامت جنگ کو حیدرآباد کی علمی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی وہ سیاسی اقتدار بھی رکھتے تھے۔ انگریزوں سے اُن کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ یورپین وفیقہ کی کمیٹی میں شریک تھے غالباً صدر تھے۔ اس خاندان کو حیدرآباد میں دکھنی تحریک کا محرک کہنا چاہئے۔ یہی وہ اسباب ہوئے کہ زور صاحب کو بہت جلد اس خاندان سے قرب حاصل ہو گیا۔ زور صاحب کی محنت اور اس خاندان کی سرپرستی نے اُن کو اچھے مواقع فراہم کر دئے۔ وہ یورپ کا وظیفہ پا کر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ جب واپس ہوئے تو اُن کو شعبہ اردو میں ریڈر کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ فیلالوجی کا شعبہ قائم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ کوشش تو یہ ہوئی تھی کہ ایک فیلالوجی کا شعبہ قائم کیا جاتا اور ان کو فیلالوجی کا پروفیسر مقرر کیا جاتا۔ لیکن یہ نہ ہو سکا اور آخر تک اردو کے شعبہ ہی سے وابستہ رہے۔

اس دور میں انھوں نے بے شمار مضامین مقالے اور نئے نئے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان میں تنقیدی مقالے افسانے لسانی اور صوتیاتی مسائل پر کتابیں شامل ہیں۔ لیکن اُن کی یہ دلچسپی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی بہت جلد

انھیں دکھنی موضوع اور تحاص کر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا۔ اور ان ہی اسباب نے اُن کو ایک طرح منفرد بھی بنا دیا اور ایک دوسرے نقطۂ نظر سے اُن کے میدان کو تنگ بھی کر دیا۔

(۴)

اُن کی زندگی کا دوسرا دور ادارۂ ادبیات اردو کے قیام سے شروع ہوا۔ ادارۂ ادبیات اردو در اصل دکھنی تحریک کا مرکز بننے والا تھا۔ اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دکھنی تحریک کے خدوخال سے واقفیت پیدا کی جائے۔ جب محمد بن تغلق بادشاہ نے اپنی سلطنت کا مرکز دولت آباد بنا لیا تو اس نے اپنے ساتھ منتخب امیر اور سپاہی صوفی، شاعر اور اہل حرفہ لئے تاکہ اس نئے شہر کو اپنی نئی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا سکے۔ اس نے علما کو اور خاص طور پر ان علما کو جو اس کے ہندی خیالات کی مخالفت کرتے تھے دلی ہی میں چھوڑ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندی قومیت اور شہنشاہیت کا ایک ایسا تصور پیدا کیا جائے جس سے اس کی سلطنت اور حکومت کی پشت پناہی ہو سکے۔ اس مقصد میں یہ خود کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ ۱۳۵۱ء میں اس کا سندھ میں بہت جلد انتقال ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سرداروں نے جو امیران صدہ کہلاتے دکن میں اس کے ہندی اور شہنشاہی مقصدوں کے خلاف ایک نئی سلطنت بہمنیہ کی داغ بیل ڈالی۔ وہ سب لوگ جو اس جماعت کے ساتھ دکن آئے تھے اور مخالفانہ جذبات سے مملو تھے دکھنی کہلانے لگے۔ اس کے بعد جو نو وارد ایرانی و ترکی دکن میں آنے لگے وہ آفاقی کہلاتے تھے۔ ایک تیسرا فریق جنتیوں کا تھا۔ چنانچہ دکھن کی سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانیں در اصل ان تینوں گروہوں کے تصادم، چشمک اور آویزش پر مشتمل ہیں۔ زور صاحب کے اجداد بھی کہتے ہیں کہ صوفیوں اور شاعروں کے اس گروہ میں شامل تھے۔ جو اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے۔ زور صاحب کے جب رفعت یار جنگ اور سر نظامت جنگ سے تعلقات بڑھے تو ان پر دکھنیت کا رنگ بھی چڑھ گیا۔ انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی۔ اس ادارہ کی حیثیت در اصل اس وقت کی اردو دنیا میں ایسی ہی تھی جیسے ایک باغی آزاد سلطنت کی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت کی اردو دنیا پر مولوی عبدالحق کی عملداری قائم تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی اور اس عملداری کے خلاف بغاوت کر سکے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو کل ہند حیثیت حاصل تھی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد اور سر اکبر جیسے با اثر اور با اقتدار وزرا ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے۔ علی گڈھ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے۔ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ اصحاب ملک میں با اقتدار تھے۔ ان حالات میں مولوی عبدالحق صاحب کی مخالفت کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر زور اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھے کہ مولوی عبدالحق صاحب سے ان کا اشتراک عمل نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی طبیعتوں کی افتاد جداگانہ تھی۔ دونوں قوی شخصیتوں اور کرداروں کے مالک تھے۔ سر نظامت جنگ کی وجہ سے زور صاحب میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ زور صاحب نے انھیں حالات میں ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی اور چند دکھنی ساتھیوں کو اس کام میں شریک کر لیا۔ ان کے رفیقوں میں عبدالقادر صدیقی، عبدالمجید صدیقی، عبدالقادر سروری اور نصیرالدین ہاشمی ... شامل تھے۔ واقعی ان نوجوانوں کا یہ بڑا ہی حوصلہ مندانہ اقدام تھا۔ اس میں بغاوت کے آثار بھی تھے اور اپنے آپ کو پانے کی جستجو اور دھن بھی۔ دکھن کے اُمرا دولت و ثروت کے نشہ میں بدمست آنے والے انقلاب سے غافل اپنی رنگ رلیوں میں وقت گزارتے تھے۔ دوسری طرف شمالی ہند کے بیشمار افراد

اپنی قابلیت اور تجربہ کی بدولت ملک کی اعلیٰ خدمات پر فائز تھے۔ ان کا دربار اور رزیڈنسی میں بڑا عمل دخل تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے تقریباً سب پروفیسر شمالی ہند سے بلائے گئے تھے لیکن ان کے اوپر پروفیسر عبدالرحمٰن خاں پرنسپلی کی خدمت پر فائز تھے اور دکھنی تحریک کے علمبردار تھے۔ ادارہ اس تحریک کا مرکز بن گیا اور ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو قائم کرکے گویا اس جماعت کے لئے نہ صرف کام کرنے کا بہانہ نکال لیا بلکہ اس تحریک کے لئے ایک مرکز بھی فراہم کر دیا۔

ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کی تنظیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس قلعہ کی اندرونی فصیل ان ساتھیوں اور نوجوانوں سے بنائی جائے جو ٹھیٹ دکھنی تھے۔ اور جامعہ عثمانیہ سے تعلیم پا کر نئے حوصلوں کے ساتھ نکل رہے تھے۔ زور صاحب نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ ایسی بزرگ ہستیاں بھی فراہم ہوں جن کی مولوی عبدالحق صاحب سے ان بن تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنے قول و فعل کی شدت کے سبب لوگوں کو بہت جلد مخالف بھی بنا لیتے تھے۔ زور صاحب نے ان مخالف افراد سے کام لیا اور ان سے ادارۂ ادبیات اردو کی دوسری فصیل تیار کی۔ اس ادارے کی تعمیر سے زور کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ دکھنی ذہنوں سے احساس کمتری مٹائیں اور ان میں خود اعتمادی پیدا کریں ۔ یہی ان کی خود شناسی کا زمانہ بھی ہے۔ اسی خود شناسی کے بل بوتے پر وہ اپنے کارناموں کے ایوان کھڑے کرنا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے خم خم کر دکھنی ادیبوں اور شاعروں کو منظر عام پر لانا شروع کیا۔ اس طرح وہ اپنی ذات میں اور اپنے ساتھیوں کے سبھوں میں خود اعتمادی کی شراب بھرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب یہ سبو تخلیق کی شراب سے چھلکنے لگے تو ان کو عام کرنے میں زور صاحب نے بڑی بے باکی اور جرأت سے کام لیا۔ اور ان کی نشر و اشاعت کے فن کو اس ہنرمندی سے انجام دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا لگایا ہوا یہ پودا ایک درخت کی صورت میں نمودار ہو گیا۔

اس کامیابی کے باوجود زور صاحب کی شخصیت اور تحریک خود اعتمادی مولوی عبدالحق صاحب کی سیادت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنا اثر اور نفوذ ضرور بڑھاتے رہے لیکن مقابلہ بہت سخت تھا۔ اس صورت حال کی وجہ سے ڈاکٹر زور نے ایک منزل پر اپنے ادارہ کے کاموں کی راہیں بدل دیں اور انجمن ترقی اردو سے کسی حد تک الگ کر لیں۔ یعنے تحقیقی کام کا آغاز کر دیا اور خاص طور پر دکھنی ادب کی تحقیق پر توجہ مرکوز کر لی۔ اس طرح انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کو ایک تحقیقی ادارہ بنا کر اس کی انفرادیت کو متوازن کی صورت بھی پیدا کر دی۔ جب انجمن ترقی اردو کو اردو ہندی کے جھگڑے میں الجھنا پڑا اور انجمن کا دفتر دلی منتقل کیا گیا تو ادارۂ ادبیات اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی لیکن مولوی صاحب کا اثر باقی رہا اور انجمن ترقی اردو کا کام برابر جاری رہا۔ ڈاکٹر رضی الدین انجمن ترقی اردو کے معتمد بنائے گئے جو ڈاکٹر زور کے مدمقابل تھے۔ اس نوبت پر ڈاکٹر زور نے اس بات کی مخالفت کی تھی کہ انجمن کا دفتر دلی منتقل کیا جائے۔

مولوی عبدالحق صاحب کو ان حالات میں کل ہند سطح پر معرکہ آرائی کرنی تھی۔ کہنے کو تو مولوی عبدالحق دلی منتقل ہو گئے تھے لیکن اُن کے حلیف و مددگار بڑی تعداد میں حیدرآباد میں موجود تھے اور انجمن ترقی اردو کی قیادت کھونے کے لئے تیار نہ تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زور صاحب اس تبدیلی کے بعد بھی اپنی عملداری کی توسیع نہ کر سکے۔ چنانچہ حیدرآباد کی اردو دنیا دو عملداریوں میں بٹ گئی تھی۔ اس کشمکش حیات میں وہ کبھو کبھار بقائے باہم اصول پر اتر آتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے

حدود کو تسلیم بھی کرنے لگے تھے۔ بلکہ ایک دوسرے کی تقریبوں میں شریک بھی ہونے لگے تھے۔ جب اعظم یار جنگ ناظم تعلیمات ہوئے انجمن ترقی اردو کی درسی کتابوں کی جگہ نئی کتابیں مرتب ہوئیں، تو اس میں ان دونوں سلطنتوں کے فرمانرواؤں نے برابر کا حصہ لیا۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ بری یا بھلی ایک تبدیلی ضرور ہوئی اور اس طرح ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے اثر و نفوذ کو ایک اور سمت میں آگے کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر زور کی تصانیف کا بھی اتفاق سے یہ دوسرا دور تھا۔ ابتدائی تنقیدی مقالوں کے بعد ڈاکٹر زور اب اردو زبان، ادب اور تنقید کے نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھا رہے تھے۔ جب ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا تو ان کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے کی غرض سے بہت جلد دکھنی ادب کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ انھوں نے اس دور میں دکھن کے بیشمار شاعروں کے انتخابات شائع کئے۔ اس عہد کی ادبی کاوشوں کی سب سے زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص موضوع کی طرف رخ پلٹ گئیں۔ اور وہ تاریخ و تمدن گولکنڈے کا موضوع تھا۔ اس سے پہلے بھی ڈاکٹر زور نے گولکنڈہ کے افسانے لکھے تھے اور اس طرح گویا نیم تاریخی افسانوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ جو دکھنی قومیت کے جذبات اُبھارنے میں بھی کام آسکتا تھا۔ ان افسانوں کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زور صاحب نے دکھنی قومیت کے جذبات ان میں بڑی کامیابی سے سمو دیے ہیں۔ دکھنی قومیت کے جن تصورات کو ان ادبی کاوشوں میں پیش کیا ہے۔ یہ بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس کے اظہار کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

اسی دور میں ڈاکٹر زور صاحب کے سر سالار جنگ سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ زور صاحب نے سالار جنگ کو ترغیب دی کہ دکھنی مخطوطات کو شائع کرنے کا انتظام کریں۔ چنانچہ نواب صاحب کی سرپرستی سے ایک نیا ادارہ دکھنی مخطوطات کی اشاعت کے لئے قائم ہو گیا۔ اور اس ادارے سے مختلف مخطوطات شائع بھی ہوئے۔ ڈاکٹر زور یہ خوب جانتے تھے کہ سالار جنگ کے یہاں دکھنی مخطوطات کا اچھا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اور جب تک اُن کی دلجوئی نہ کی جائے کام نہ بنے گا۔ نواب سالار جنگ بھی صاحب ذوق انسان تھے۔ اہل و نقل کو خوب پہچانتے تھے مگر اُن کا سواد علم کم تھا۔ جو لوگ ان کے ملازم اور کارندے تھے اُن سے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے زور صاحب نے اپنے شرکائے کار کو اس کام کی پہل کر دی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے محمد قلی قطب شاہ کے دیوان پر ایک مقالہ اردو میں شائع کیا تھا۔ مصنف نے مجھے اس خصوص میں ایک خط میں لکھا تھا۔ "میں پہلا شخص ہوں جس نے دنیا کو محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے روشناس کیا اور اس پر مقالہ لکھا۔ مگر محمد قلی کی یاد منانے والوں نے اس ضمن میں کہیں میرا ذکر نہیں کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اسلئے مجھے اس کی مطلق شکایت بھی نہیں ہے۔ ان حضرات کو ابھی تک محمد قلی قطب شاہ کا اصل کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ان کا مستند کلیات جس پر اس کے جانشین قطب شاہ کی مہر اور دستخط اور اس کا منظوم دیباچہ اور مفصل بادشاہوں کی مہریں تھیں اب غائب ہے۔" یہ سچ ہے کہ اس کام کی ابتدا اور اس مولوی عبدالحق صاحب نے کی تھی لیکن اس کام کی تکمیل ڈاکٹر زور کے ہاتھوں ہوئی۔ وہ عمر بھر اسی کام کو کرتے رہے۔

میں جس زمانہ میں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا ڈاکٹر زور قلی قطب شاہ کے کلیات کی اشاعت میں منہمک تھے۔

اس کے فوری بعد انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کی زندگی پر ایک مبسوط کتاب لکھی اور اس کے چند روز بعد اس کے وزیر اعظم (پیشوا) میر مومن کے حیات و حالات پر دوسری کتاب شائع کی اس دوران میں اکثر ان سے قطب شاہی بادشاہوں ان کے کارناموں اور حالات پر میری گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ وہ تاریخ ہند پر وسیع انداز پر غور نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف قطب شاہی تاریخ میں کھوئے گئے تھے۔ وہ اس تاریخ کے اتنے دلدادہ تھے کہ قطب شاہوں کی تباہی کی شاہی ذمہ داری مغلوں کے سر تھوپتے اور جب کبھی اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ان کے احساسات اور ان کے دلی لگاؤ کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یورپ کے زمانہ قیام میں انھوں نے قطب شاہیوں کے متعلق بہت کچھ مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ وہ کلیات کے مرتب ہو جانے کے بعد "حیات قلی" کو بڑی برق رفتاری سے لکھتے جاتے تھے جو لوگ ان کے کاموں سے واقف نہیں ہیں ان کو اس بات کا گمان ہو سکتا ہے کہ وہ تحقیق اور تفتیش میں زیادہ محنت نہیں کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان کا ماخذ چند تاریخی مخطوطات تھے۔ وہ مورخ نہیں تھے بلکہ ادیب تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات صرف اس کی شاعری سے اخذ کئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر روز مسودے ایک ناسی کاغذ میں لپیٹے ہوئے لاتے اور کالج سے واپسی پر دار الطبع میں کاتب کے حوالے کرتے۔ جو کاپیاں لکھی جاتی تھیں وہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ چلتے چلتے موٹر میں باتیں بھی کرتے اور کاپیوں پر نظر بھی دوڑاتے جاتے۔ پنسل سے تصحیح بھی کرتے تھے۔ ادھر ادھر کی لکیریں کھینچتے اور گھر پہنچتے پہنچتے کام پورا کرتے تھے۔ اور جو کام باقی رہ جاتا اس کو شام کی نشست میں پورا کر لیتے تھے۔ ان کا سب کام اسی ڈھنگ سے سرانجام پاتا تھا۔

وہ گولکنڈہ کے آثار قدیمہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ ان کی تلاش و جستجو میں اپنی زندگی کا ایک حصہ صرف کر چکے تھے۔ جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے ڈاکٹر زور کو اس کی بابت بہت سی دلچسپ معلومات حاصل تھیں۔ ان معلومات میں تاریخی، نیم تاریخی اور افسانوی سب واقعات شامل تھے۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی شخص کسی بادشاہ یا کسی تاریخی واقعہ یا شخصیت کے بارے میں کچھ جانتا ہے تو اس سے ملنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالتے تھے۔ خاندانی روایات جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں ان کو بھی محفوظ کر لیتے۔ گولکنڈہ پر جو کچھ لکھا ہے اس میں تاریخ، روایت، ادب اور افسانے کو اس طرح سمویا ہے کہ گویا حقیقت اور افسانے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ انھوں نے گولکنڈہ سے متعلق جو افسانے لکھے ہیں ان سب میں یہی عناصر شامل ہیں۔ اور ان ہی عناصر سے انھوں نے دکھنی قومیت کا خمیر تیار کیا تھا۔

ڈاکٹر زور نے گولکنڈہ پر اس قدر محویت اور انہماک سے کام کیا تھا کہ لوگ ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں خوش فہمی یا بد گمانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ خود بھی اس سے لطف لیتے تھے۔ زور نہ ہوتے تو یقیناً گولکنڈہ پر اس انہماک اور دل دہی سے کام کرنے والا مشکل سے ملتا۔ البتہ ڈاکٹر زور کے کاموں کا تقاضہ یہ تھا کہ اگر وہ گہرائی میں جاتے تو وسعت کھو بیٹھتے اور اگر وسعت کا دامن تھامتے تو گہرائی کھو بیٹھتے۔ لیکن جو کچھ انھوں نے کیا وہ غنیمت اور بے مثال ہے اور آئندہ کام کرنے والوں کے لئے تادیر رہنمائی کا کام دیگا۔

اس دور میں ڈاکٹر زور کے ہم شمار ساتھی زندہ تھے۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جن کو مسابقت کے میدان میں

شکست کھانی پڑی تھی۔ وہ شکست کھا کر خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن زور صاحب کے بارے میں غلط باتیں پھیلاتے تھے۔ غیر تو خیر غیر تھے لیکن ان کے ساتھی اور دوست بھی ان پر پھبتیاں کستے تھے۔ ان کے کاموں پر اعتراض کرتے تھے اور اپنی تنقید اور تنقیص سے ان کے احساسات مجروح کرتے تھے۔ زور صاحب پر ان باتوں کا اثر ضرور ہوتا تھا۔ لیکن یہ مخالفتیں رفتہ رفتہ ہٹتی گئیں اور وہ بالآخر ایک بزرگ ہستی کی حیثیت سے حیدرآباد کے آسمان ادب پر جگمگانے لگے۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ ان کے قوا میں اضمحلال آچکا تھا۔

یورپ سے آنے کے بعد ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کا ابتدائی تقرر شعبہ اردو میں ریڈر کی پر ہوا تھا۔ مولانا وحید الدین کے بعد مولوی عبدالحق صاحب شعبہ اردو کی صدارت پر فائز ہوئے۔ مولوی صاحب کی موجودگی میں زور صاحب یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ ان کو صدارت کا منصب ملتا۔ مولوی عبدالحق اس قید سے آزاد ہو کر اردو ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے صدارت شعبہ سے سبکدوشی اختیار کی لیکن اس کے بعد اس منصب کے ایک اور دعویدار پیدا ہو گئے۔ وہ سجاد صاحب تھے۔ آخر الذکر زور صاحب کے مقابلہ میں زیادہ عرصہ سے ملازم تھے۔ لیکن ان کا ابتدائی تقرر لکچراری پر ہوا تھا۔ جب زور صاحب یورپ سے واپس آئے تو ان کو ریڈر کا درجہ دیا گیا۔ اس لئے گریڈ کے اعتبار سے زور صاحب سینیر قرار پاتے تھے لیکن سجاد صاحب کی موجودگی میں ان کو عہدہ صدارت نہیں مل سکا۔ بالآخر صدارت کی کرسی ان دونوں میں تقسیم ہو گئی۔ زور صاحب صدارت پر اس وقت فائز ہوئے جب سجاد صاحب وظیفہ پر علیحدہ ہو گئے۔ ان دونوں میں بھی شدید اختلافات تھے کیونکہ طبائع مختلف تھے۔ اس شعبہ میں عبدالقیوم خاں باقی مرحوم بھی تھے۔ چونکہ یہ اپنے طرز ادا اور مزاج کے اعتبار سے منفرد واقع ہوئے تھے اس لئے وہ بھی زور صاحب کے ہم کار نہ بن سکے یہ صحیح معنوں میں آرٹسٹ تھے لیکن آرٹسٹ کی طرح بے انتہا بے عمل اور لاابالی انسان تھے۔

(۵)

ڈاکٹر زور کی زندگی کا تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب سر اکبر حیدری نے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ اور ادارہ کی سرپرستی اور مالی اعانت کی۔ اس وقت تک ادارہ کو جو مالی امداد ملتی تھی وہ قابل لحاظ تھی سر اکبر نے اس امداد کو بہت بڑھا دیا۔ اور خود ذاتی طور پر ان کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ جب مالیہ کا انتظام ہوا تو ادارہ کے کاموں کو وسعت دینے کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ ادارہ کے ذریعہ اردو کا تحفظ کا سارے ملک میں ایک جال سا بچھا دیا۔ حمید الدین شاہد اور میں نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ گرمی، بارش کی پروا کئے بغیر چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں پہنچکر ادارہ کی شاخیں قائم کیں۔ شبینہ مدارس میں تعلیم بالغاں کا انتظام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک سارے ملک میں پھیل گئی۔ جلسہ تقسیم اسناد ہوا تو کامیاب امیدواروں کو خود سر اکبر اور اعظم جاہ نے اپنے ہاتھوں سے اسناد تقسیم کئے۔ میں نے تمام ملک کے حالات کا جائزہ لے کر تعلیم بالغاں پر ایک مبسوط رپورٹ لکھی تاکہ ادارہ آئندہ اپنا کام ان ہی خطوط پر زیادہ بہتر اور منظم طریقے سے چلا سکے۔ اسی دور میں اردو اخبار ٹیکلو پیڈیا کی تحریک بھی ہوئی اور بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا گیا۔ اصناف کی شاخوں کی ایک

خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں کام کرنے والوں میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے بلکہ اکثر دیہاتوں میں تو اردو کی خدمت کرنے والوں میں ہندو ہی پیش پیش تھے۔ ڈاکٹر زور کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ ان کو مشورہ دیتے تھے اور جب وہ مشورے کو مفید اور حسب حال پاتے تو مشورہ دینے والے کے سر ہو جاتے تھے۔ وہ سوچنے اور عمل کرنے میں زیادہ وقفہ گوارا نہیں کرتے تھے۔ ادھر بات زبان سے نکلی اُدھر انھوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ یہ سچ ہے اُن کی اس تیز رفتاری کی وجہ سے کام میں بہت سی کوتاہیاں رہ جاتی تھیں۔ لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ دکھنیوں کی روایتی کاہلی کو مٹانے اور توڑنے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے۔ جب ادارہ ادبیات اردو کی داغ بیل ڈالی تو اپنے ساتھ ایک ایسی جماعت تیار کر لی اور نئے نئے کاموں کی سبیلیں پیدا کیں۔ ادارہ کے تمام کاموں میں زور صاحب کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آخری زمانہ میں یہ ضرور ہوا کہ ادارہ کی مرکزی جماعت کمزور ہو گئی اور چند ایسے ناخوشگوار حالات پیدا ہو گئے کہ سرور جیسے آورز ور صاحب میں ٹھن گئی۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور میں نے اس بات کی کوشش کی کہ یہ اختلافات ختم ہو جائیں۔ ان کی شدت میں کچھ کمی ضرور ہوئی لیکن وہ بے عیب دوستی۔ جو برسوں سے قائم تھی پھر ابھر نہ سکی۔

ادارہ کو اپنی ترقی کی آخری منزل پر پہنچے ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ملک میں سیاسی انقلاب آیا۔ اسی انقلاب کے دوران میں ڈاکٹر زور صاحب پر ایک سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا تھا۔ اور جب میں ۱۹۵۳ء میں یورپ سے واپس آیا تو مجھے بہت جلد یہ محسوس ہوا کہ زور صاحب اپنی دلی پژمردگی اور مایوسی کو اپنے قہقہوں میں دبا رہے ہیں۔ وہ خود یہ نہیں جانتے تھے کہ ادارے کا انجام کیا ہوگا۔ میں ایک دن شام اُن کے ہاں پہنچا۔ وہ اپنے باغ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اُن کے چہرے سے کرب و اضطراب کی حالت نمایاں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ زور صاحب کسی خاص واقعہ سے متاثر ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے ادارے کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ادارے کی اس چھوٹی سی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں اُن کے عمر بھر کی محنت کا سرمایہ تھا کہنے لگے "کیا معلوم میری ساری عمر کی محنت کے اس ذخیرہ کا کیا انجام ہوگا"۔ میں نے کہا زور صاحب آپ پر نئے حالات کا زیادہ اثر معلوم ہوتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں سارے حیدرآباد پر مایوسی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا جب یہ حالت ہو تو کیوں نہ ایسی تقریبیں رچائی جائیں جس کی گھما گھمی میں آپ اپنی دلی پژمردگی کو بہلا سکیں اور اس طرح آپ کی ہمت کو سہارا مل جائے۔ چنانچہ میرے کہنے کے بعد ادارہ ادبیات اردو نے مختلف تقریبیں ترتیب دیں۔ اردو کانفرنسوں اور کانگرسوں کا انعقاد ہوا۔ ہندوستان کے مشہور اور نامور ادیب بلائے گئے زینت ساجدہ کے اہتمام میں "شام غزل" جیسی سنہری تقریب نے ماضی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ تقریبیں ایسی کامیاب ہوئیں کہ کم از کم وقتی طور پر مایوسی اور حسرت کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہو گیا۔ زور صاحب کی خود اعتمادی پھر تازہ ہو گئی۔ اسی سلسلہ میں ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی اور امجد صاحب کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبیں منعقد ہوئیں۔ اس طرح انقلابی زمانے کے جدید معماران اقتدار کو ادارے کی سرگرمیوں سے واقف کرانے کا موقع مل گیا۔ ڈاکٹر زور کے امجد صاحب سے بہت دیرینہ مراسم تھے اور وہ ایک دوسرے سے بہت محبت رکھتے تھے۔ زور، امجد کو اُن کی زندگی میں علیہ الرحمہ لکھتے تھے۔

ایک صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو مسکرا کر کہنے لگے جناب یہ ہم دونوں کے راز و نیاز کی باتیں ہیں۔

جب آندھرا پردیش بن چکا تو زوریوں محسوس کرنے لگے گویا کہ گولکنڈہ کے بادشاہوں کی کھوئی ہوئی سلطنت انھیں مل گئی۔ وہ قبل از وقت کسی باضابطہ منصوبہ کے بنانے کے عادی نہ تھے۔ اس لئے انھوں نے تلنگانہ و آندھرا پردیش کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ لیکن جب آندھرا پردیش بن چکا تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا قطب شاہی زمانہ لوٹ کر آیا ہے۔ تقریبیں منانے کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چل چکا تھا اور کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ اس وقت ایک نئی تقریب کی تجویز ہوئی اور یہ سوچا کہ کیوں نہ محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہر سال منانے کی روایت قائم کی جائے تاکہ اس زمانہ کی مشترکہ تہذیب کی یاد تازہ ہو۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ یاد آجائے کہ وہ خلوص و محبت کے ایسے مضبوط رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں کہ زمانہ حال کے حوادث ان رشتوں کو توڑ نہیں سکتے۔ مختلف بیٹھکوں میں محمد قلی قطب شاہ کی اس سالانہ یادگار کو منانے کے منصوبے طے ہوئے اور یہ قرار پایا کہ محمد قلی قطب شاہ کی سواری گولکنڈہ سے چار مینار تک جس تزک و احتشام اور لوازمات شاہی کے ساتھ آیا کرتی تھی اسی شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ ایک جلوس چار مینار سے اس کی گنبد تک لیجایا جائے۔ اس کے لئے ہاتھی گھوڑے، لاؤ لشکر، سپاہی چوبدار نیزے بھالے، ڈھال تلوار، ہودہ عماری، پالکی ہوادار، ماہی مراتب، زر بفت لباس، عطر و گل عود و لوبان غرض وہ سارے لوازمات جو اس سواری کی زیب و زینت اور شان و شوکت کے لئے ضروری تھے فراہم کئے گئے۔ یہ جلوس جدید حیدرآباد کی تاریخ کا نیا واقعہ تھا اس نے از سر نو لوگوں کے مردہ دلوں میں زندگی کی تازگی اور حرارت پیدا کی۔ نئی امنگیں بیدار ہوئیں۔ حوصلے اور امیدیں جاگیں۔ ہزاروں آدمی جوق در جوق اس جلوس میں شریک ہوئے۔ کئی دن تک ان تقریبوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں یوم قلی قطب شاہ کی مالیاتی کمیٹی کا معتمد تھا۔ کم سے کم عرصہ میں ایک ایسا مالیہ فراہم کرنا جو ایسی شاندار تقاریب کے اخراجات کا کفیل ہو سکے بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن مسلسل کوششوں اور جستجو نے اس کو ممکن بنا دیا۔

اب انہماک گولکنڈے کے نتائج دیکھئے ڈاکٹر زور گولکنڈہ کی تاریخ میں کھو گئے تھے۔ ان کا استغراق اور انہماک اس قدر شدید تھا کہ مستقبل کو دیکھنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ وہ تاریخ کی ان بھول بھلیوں اور دلفریبیوں کے ایسے دلدادہ تھے کہ مستقبل تو کیا حال کی مصیبتوں اور مایوسیوں کو بھلانے لگے۔ میں ان تقریبوں سے صرف اتنا کام لینا چاہتا تھا کہ تاریخ کا تسلسل مل جائے اور بدلے ہوئے حالات میں ایسی روایات کو جو کھو دی گئی تھی تازہ کریں تاکہ دلوں کی پژمردگی تازگی سے بدل جائے۔ اور ہم اس تازگی اور حرارت کے سہارے زندگی کا نیا سامان فراہم کر سکیں۔ لیکن یہ تجویز زور صاحب کی افتاد طبع کے موزوں نہ تھی اور یہی وہ نکتہ تھا جہاں سے ہم دونوں کا اختلاف اور زیادہ شدید ہو گیا۔

انہی دنوں چار مینار کے اطراف ادبیات اردو کی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے حکومت نے پچیس ہزار کی رقم اس غرض سے منظور کی تھی اور شرط یہ لگا دی تھی کہ اگر زمین مل جائے تو یہ رقم تعمیر کیلئے دیجائیگی ایک عرصہ سے زمین کا مسئلہ بحث میں پڑا ہوا تھا۔ میں اس زمانہ میں حیدرآباد پریما مور تھا۔ میں نے اس مقام کی

نشان دہی کی جہاں اب نیشنل تھیٹر اور بندر بھارتی بن چکا ہے۔ اُس سے لگی ہوئی زمین بھی خالی پڑی تھی۔ زور صاحب کو اس کا حمل وقوع تو بہت پسند آیا لیکن اس کی خریدی کے لئے سرمایہ کی فراہمی ناممکن نظر آئی۔ میں کہتا تھا کہ آپ ارادہ کر لیجئے تو مالیہ خود بخود فراہم ہو جائے گا لیکن ان حالات میں وہ اس اقدام کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک دو مہینے اسی بحث و تکرار میں گزر گئے۔ آخر زور صاحب نے طبعی حقیقت پسندی کے زیر اثر یہی مناسب جانا کہ اپنے احاطہ مکان کا ایک قطعہ بطور عطیہ دے دیں یا دوسرے الفاظ میں کہ اپنی بیگم صاحبہ سے عطیہ دلوا دیں۔ پھر کیا تھا تعمیر کے کام کا سلسلہ شروع ہوا اور دو چار سال میں ایک اچھی عمارت کھڑی ہو گئی۔ اُس کے نقشہ اور طرز تعمیر سے بھی مجھے اختلاف تھا۔ ڈاکٹر زور اُس کے طرز تعمیر سے دکن کی تاریخ کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ میں کہتا تھا جناب یہ داستان پارینہ ہے۔ کب تک آپ اس کو سینے سے لگائے رکھیں گے۔ کیوں اس مصیبت کو آپ آئندہ نسلوں کے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسی نئی طرز کی عمارت بنا ڈالئے کہ ایوان اردو اور اردو گولکنڈہ طرز تعمیر میں بند نہ ہو جائیں۔ زور صاحب کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ گولکنڈہ کے اثر سے باہر نکل آئیں اور نئے تعمیراتی نقاضوں کو محسوس کریں بہت مشکل کام تھا۔ ان کے دل و دماغ پر گولکنڈہ کی تہذیب اور دکھنی اثر چھائے ہوئے تھے۔ بہرحال ایک مرکز کا بن جانا غنیمت تھا۔ زور صاحب میرے استدلال کو محسوس کرتے تھے لیکن اُن کا دل اس کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔

(۶)

ان تقریبوں کے ساتھ ڈاکٹر زور کی زندگی کا جو تقاضا دور بھی اُبھر رہا تھا۔ اس دور میں وہ ایک بزرگ قوم کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ مٹ مٹا گئے تھے جو ان پر پھبتیاں کس کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ بات بھی محسوس ہونے لگی تھی کہ عمر بھر کی کوششوں کے باوجود وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اردو کی علمداری میں اُن کی مطلق العنانی قائم نہ ہو سکی۔ مولوی عبدالحق صاحب افتاں و خیزاں ملک چھوڑ چکے تھے۔ لیکن ان کے کام کو آگے بڑھانے والے اصحاب یہاں موجود تھے۔ اردو کا ایک اور مرکز بھی یہاں موجود تھا۔ اردو ہال کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس کھلی کھلی کو دیکھ کر اور میرے مسلسل اصرار پر دونوں اداروں کی سرگرمیوں کے راستے کسی قدر بدل دئے کیونکہ دونوں کے انضمام کا خطرہ تھا۔ ادارہ ادبیات اردو کو تحقیق اور تلاش علم کے لئے مختص کر دیا اور زور صاحب نے اس طرح ادارہ ادبیات اردو اور انجمن ترقی اردو یا اردو ہال سے ٹکراؤ کے بجائے ربط و تعاون کی ایک نئی صورت نکال لی۔ اُن کی زندگی کا یہ چوتھا دور ان کے اس دلی اعتراف پر ختم ہوتا ہے کہ اردو کی خدمت اداروں میں ان دونوں اداروں کی بقائے باہم ناگزیر تھی اور اُن کی وہ آرزوئیں و تمنائیں کہ دکھن کی ادبی دیرینہ کھیتیوں کا کھویا ہوا اقتدار پھر سے مل جائے تشنہ و ناکام رہ گئیں۔ وہ حقیقت پسند بھی واقع ہوئے تھے۔ اُن کی ذات میں غریب و امنظر اب کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اردو کے تعلق سے وہ مایوس سے ہو گئے تھے۔ اور اپنی بعض تحریروں میں وہ بے چینی و بے کلی کا اظہار کرتے تھے۔ جسے میں اپنے استدلالی اور تاریخی استخراج سے اُن کے خیال کی نفی کرتا تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ جب

وہ سا ہینتہ اکیڈیمی کے ممبر بنائے گئے اور اس طرح ان کا دلی آنا جانا عام ہوا تو گویا ان کی زندگی کے پانچویں دور کی ابتدا ہوی وہ دلی کیا گئے ترک وطن کی صورتیں پیدا کرنے لگے۔

جب میں نے اخباروں میں یہ پڑھا کہ کشمیر کے وزیر اعظم حیدر آباد بلائے جا رہے ہیں تو میرے دل نے گواہی دی کہ یہ دستی ایک نیا رنگ لا کر رہے گی۔ چند ہی مہینوں میں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ اخباروں میں اطلاع چھپی کہ ڈاکٹر زور کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی صدارت پر فائز کئے گئے ہیں وہ بہت جلد کشمیر کا قصد رکھتے ہیں۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ جانے کیا بات ہوئی کہ میرے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ ڈاکٹر زور کا کشمیر جانا راس نہ آئے گا۔ میں نے فوراً ٹیلیفون ملایا اور کہا کہ زور صاحب آپ کے کشمیر جانے کی خبر شائع ہوی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کشمیر جا کر کیا پائیں گے۔ زور صاحب پروفیسر تو آپ پہلے سے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ آپ کو کیا ملے گا۔ آپ یہاں جو کام کر سکتے ہیں اس کے مواقع کشمیر میں حاصل نہ ہو سکیں گے میں یہ کہتا جاتا اور زور صاحب حسب عادت تاویلیں کرتے جاتے۔ کہنے لگے کشمیر میں اردو کا بہت کچھ کام کرنا ہے۔ اس لئے میرا کشمیر جانا ضروری ہے ۔ میں ان کی اس تاویل اور استدلال کے محرکات کو سمجھ گیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا۔ جب زور صاحب نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ان کے دل میں کوئی خدشہ پیدا کرنا مناسب نہیں۔ پھر میں نے گفتگو کی بحث بدل دی۔ میں نے کہا اچھا ہے آپ کشمیر جائیے۔ ہم آپ کے طفیل میں کشمیر کی سیر کو آئیں گے۔ اس لئے ڈاکٹر زور نے شکایت کی کہ آپ حیدر آباد ہی میں نہیں ملتے تو کشمیر آ کر کیا ملیں گے۔ اس عرصہ میں ہم ایک دوسرے سے بہت کم مل رہے تھے۔ اُن کو میرے نہ ملنے کا قلق تھا اور مجھے دلی رنج۔ لیکن ہم اپنی اپنی افتاد طبع کے دھارے بہہ رہے تھے۔ کبھی کبھار شادی بیاہ کی تقریبوں، سرکاری دعوتوں میں جہاں ہم دونوں مدعو ہوتے مل لیتے تھے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں ہماری گفتگو اردو کے مسائل پر ہونے لگی۔ کہنے لگے جی چاہتا ہے کہ آپ سے باتیں کروں آپ دنیا سے کچھ الگ ہی سوچتے ہیں۔ شاید آپ کی باتیں صحیح ہوں۔ ویسے تو آپ میرے ہاں آتے نہیں لیکن کسی دن میں آپ کو کھانے پر بلاؤں گا اور آپ اسے ٹال نہ سکیں گے۔ کچھ آپ کی سنوں گا کچھ اپنی سناؤں گا۔

زور صاحب کے کشمیر جانے کی غلط افواہ باتیں گرم ہوئیں۔ ایک تو ان کو یہ خیال ہوا کہ وہاں جا معاتی اور سرکاری زبان اردو ہے۔ اور وہاں اردو کی وسعت اور ترقی کے بیش بہا موقعے ہاتھ آ سکیں گے۔ وہ دکھن اور کشمیر کا رشتہ بھی جوڑنا چاہتے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کشمیر پہنچکر انھوں نے ان روایتوں کو جو سرزمین دکھن میں قائم کر چکے تھے زندہ کیا۔ وہ کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے شاہکاروں کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی تو یہ کام ان سے زیادہ بہتر کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ اب حسن اتفاق سے یہ امید یں اُن کے قدیم رفیق کار پروفیسر سروری کے دامن سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ زور کے کشمیر جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ دکھن سے دل برداشتہ سے ہو گئے تھے۔ ایک تو وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ دکھن کی اردو دنیا آخری زمانہ میں بھی دو عملداریوں میں منقسم تھی۔ دوسرے اُن کے بیشمار ساتھی اور دوست اُن سے ٹوٹ گئے تھے۔ پھر اردو کے تعلق سے اُن کے دل میں خدشے پیدا ہو چکے تھے۔ وہ اس درجہ حقیقت پسند تھے کہ کسی طرح ان مایوسیوں پر غالب نہ آ سکتے تھے۔ چنانچہ جب حیدر آباد میں یونیورسٹی کے قیام کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھا کہ وہ اردو کے شعبہ کو سنبھالنے کے لئے آمادہ ہیں۔ میں نے آسوقت بھی

اس تجویز کی مخالفت کی تو کہنے لگے ہماری بیگم صاحب کو اس طرف کا تعلق ہے۔ اب ہمارا یہاں دھرا ہی کیا ہے۔

ان باتوں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مایوسی اور ناامیدی نے گھر کر لیا تھا۔ وہ مخالفتوں کو سہنے اور برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس دلی مایوسی کو بھی وہ برداشت کر گئے اور شاید ہی کسی اور کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ زور صاحب کو یہ خیالات اندر سے گھن لگا رہے تھے۔ ان کے قویٰ میں اضمحلال آ چکا تھا۔ وہ تمام صورتیں جو ان کی زندگی کو بڑھاتیں اور ان میں آب و تاب پیدا کر سکتیں ان سے چھوٹ رہی تھیں۔ ایک آدھ حجامے واقعہ نے بھی ان کے دل درد کو بہت بڑھا دیا تھا۔ سچ پوچھئے تو زور دکھنی قومیت اور اردو کے شہید ہوئے۔ ان کا نام تاریخ ان کی اس شہادت کے سہارے زندہ رہ گیا۔

(۷)

ڈاکٹر زور آخری عمر میں تصوف کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ یوں تو یہ خود بھی مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے والد بزرگوار واعظ حافظ اور صوفی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ لیکن زور صاحب ابتدائی عمر سے اس مشرب سے نا آشنا تھے۔ یوں انھوں نے سلوک کی کوئی باضابطہ منزل تو طے نہیں کی تھی۔ لیکن کچھ خاندانی روایتوں اور کچھ اس بہانے سے اپنے والد کی جانشینی اپنے فرزند کے سپرد کر دی اور اس طرف زیادہ مائل ہو گئے۔ مائل کیا ہوئے اس میں بھی غلو کیا۔ اپنے والد کی خانقاہ بنوائی۔ عرس کروایا۔ پیری مریدی کے سلسلے کو جاری کیا اور رود موسیٰ کے کنارے اپنے والد کی خانقاہ میں اپنے لئے بھی ایک جگہ محفوظ کر دی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ وہ کسی اور ملک میں سپرد خاک ہونے والے ہیں۔

زور صاحب کو تصوف کے ساتھ علم نجوم کا بھی چسکا پڑ گیا تھا۔ ایک صاحب جو علم نجوم اور رمل سے خوب واقف ہیں ان کے ہاں ہر روز آتے تھے۔ میرا تو یہ گمان بھی ہے کہ وہ ہر روز کا پنچانگ نکلواتے تھے۔ جو احباب ان کے ہاں آتے جاتے ان کو بھی اس کا چسکا لگاتے۔ افسوس کہ بعض پیشین گوئیاں جو زور صاحب کو بتائی گئیں پوری نہ ہوئیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا احساس بھی تلخ ہو گیا تھا۔

زور عمر بھر اس کوشش میں لگے رہے کہ کچھ نئی نوجوانوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ اس کوشش میں انھوں نے سخت سی لفظیں جھیلیں۔ شدید مصائب کا مقابلہ کیا۔ لیکن اپنے کام سے منہ نہیں۔ البتہ آخری عمر میں ان کو یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ عمر بھر دو جس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے وہ بے حقیقت ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ ملک کا انقلاب سارے فرق کو مٹا چکا تھا اور زندگی کی وہ قدریں جو کسی زمانہ میں اہمیت رکھتی تھیں بے وقعت اور بے معنی ہو گئی تھیں۔

زور صاحب میں محبت اور نفرت کے جذبات کے جلے موجود تھے۔ وہ محبت کرتے تو بے حساب اور نفرت کرتے تو بے پناہ۔ وہ دور اندیش بھی تھے لیکن ان کے جذبات ان کی دور اندیشی پر غالب آ جاتے تھے۔ وہ آزاد مزاج انسان تھے۔ لیکن ان کے کاموں کے منصب نے ان کی آزاد روی پر قید و بند کی مہر لگا دی تھی۔ وہ اگر اردو کے پروفیسر نہ بنتے اور ان کو ترقی اور شہرت کا چسکا نہ پڑتا اور وہ تعلق قرین جاتے۔ عاشقی اور عاشقوں کا جی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لیکن روایت پرستی نے ان کے ان لطیف جذبات کو بھی دبا دیا تھا۔

حسن پرست تھے اور اچھی صورت دیکھ کر مچل جاتے تھے۔ تعریف میں بے تکان تھے۔ وہ اچھے دوست تھے اور دوستی کو خوب نبھاتے تھے۔ اُن کو کام لینا اور کام نکالنا بھی خوب آتا تھا۔ دوسروں کے کاموں کا اعتراف بھی فراخ دلی سے کرتے تھے۔ جب اردو مخطوطات کی پہلی جلد چھپ کر آگئی تو میں نے دیکھا کہ دیباچہ میں سلیش کے اور میرے کاموں کا خاطر خواہ اعتراف تھا۔ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ جو لوگ اُن کے ساتھ کاموں میں شریک ہوں اُن کا فراخ دلی سے نام لیا جائے۔ لیکن اگر کسی سے ان کی کسی بات پر ٹھن جاتی تو اُس کو اس طرح مٹا دیتے کہ گویا وہ اس کو جانتے ہی نہ تھے۔ اُن کی طبیعت میں احتیاط بھی تھی۔ ذہین اور طباع لوگوں سے چوکنے سے رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ کام کرنے والوں کی فہرست بڑی طویل ہے جامعہ عثمانیہ کا کوئی نوجوان ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے اُن کے ساتھ شریک نہ رہا ہو۔ لیکن حمید الدین شاہد جیسا وفادار انھیں کوئی نہ ملا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ حمید الدین شاہد ترک وطن کر رہے ہیں تو مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میں نے پوچھا جی حضرت یہ آپ کے یار وفادار ہیں نہیں سمجھتا تھا کہ اس آسانی سے آپ کو داغ دے جائیں گے۔ زور صاحب کی زبان سے نکلا۔ میں نے ہمیشہ اپنے اللہ پر توکل کیا ہے، کیا حمید الدین کے جانے سے میرے کام رک جائیں گے۔ میں نے اس جملہ میں جو انا کی تلخی محسوس کی۔ پھر خود ہی کہنے لگے اُن کی یہی اب انھیں یہاں رہنے نہ دیگی انھیں روکنا لاحاصل ہے۔ یہ زور صاحب کی حقیقت پسندی تھی۔ زور صاحب بلا کے حقیقت پسند تھے۔ ایک دن میں نے کہا آپ اب ساہتیہ اکیڈیمی کے ممبر بن چکے ہیں۔ ایک طرح آپ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو چلی ہے۔ قاضی عبد الغفار نہیں رہے۔ کیوں نہ آپ انجمن ترقی اردو کو سنبھالیں اور اس کام کو آگے بڑھائیں۔ کہنے لگے۔ وہاں آل احمد سرور اور دوسرے لوگ موجود ہیں۔ میری کوشش کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ زندگی کے ہر مسئلہ پر وہ اسی نقطہ نظر سے سوچتے تھے۔

زور صاحب کے سوچنے کے سانچے در اصل چند شخصی نمونوں کے گرد گھومتے تھے۔ اعظم یار جنگ اور پروفیسر حسین علی خاں کے وہ بڑے گرویدہ تھے۔ بہت بڑی حد تک اُن کی زندگی پر اُن کے اثرات غالب تھے۔ وہ اُن نمونوں پر اپنی زندگی ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں پرانے نمونے کام نہیں دیتے۔ احسانمندی اور وفاداری کے جذبات ان کو اس طرز فکر سے آزاد ہونے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب پروفیسری سے چار گھاٹ کالج کی پرنسپلی پر آئے تو ان کے ذہن میں دراصل سٹی کالج والے اعظم صاحب کی پرنسپلی اور ان کی ترقی کے نمونے جگمگا رہے تھے وہ اس کی پیروی کرتے تھے لیکن افسوس کہ وہ حالات بدل چکے تھے۔

زور صاحب چاہتے تھے کہ میں محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کو انگریزی میں منتقل کروں یا اس کی اساس پر کوئی انگریزی کتاب لکھوں۔ ہم دونوں نے یہ بھی طے کیا تھا کہ حیدرآباد کے علم و ادب کی تاریخ پر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کے معیار پر ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ وہ ادبی مواد فراہم کرتے اور میں سماجی معاشی اور سیاسی محرکات کا تجزیہ کرتا۔ اور وہ اس کو اردو میں لکھتے اور میں انگریزی میں لکھتا۔ افسوس کہ یہ دونوں کام اُن کی زندگی میں نہ ہو سکے۔ ہم دونوں کی طبیعت کی افتاد ہی جداگانہ تھی۔ یہ ہماری شراکت کا حزنیہ ہے لیکن بہر حال یہ دونوں کام کرنے کے ہیں۔ میں نے تاریخ ادبیات دکھن پر بہت کچھ مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ جانے یہ کام کب پورا ہو۔ ڈاکٹر زور نے داستان ادب حیدرآباد لکھ کر یہ کمی بہت بڑی حد تک پوری کر لی ہے۔ اور آئندہ کے کاموں کی بنیاد یں رکھی ہیں۔

زور صاحب کسی کی سفارش میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے۔ ان سے سفارش کروانے کا چند اصحاب نے خوب فن سیکھا تھا۔ اور وہ اس فن دانی کے شکار ہو جاتے تھے اور خود ہی کہتے تھے۔ بہر حال مقصود یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کام نکل جائیں۔

کیوں نہ ہو وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور محسنوں کے کام آتے بھی تھے اور ان سے کام لیتے بھی تھے۔

زور صاحب کے اسلوب بیان سے ان کا کردار جھلکتا ہے۔ اور اس سے ان کے کردار و شخصیت کے ارتقاء کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں سادگی ہے لیکن وہ اپنے مفہوم کو بڑی کامیابی سے ادا کرتے ہیں۔ البتہ ان کا اسلوب بیان ان کی زندگی کے چوتھے اور پانچویں دور میں ظاہر ہوا۔ قلی قطب شاہ کی شاعری کے مطالعہ نے ان کے بعض سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کیا اور اظہار بیان کا ان کو ایک نیا انداز ملا۔ انھوں نے اپنی تحریر میں قدیم دکھنی اردو کے بیشمار دلکش اور پر اثر الفاظ کو پھر سے برتنا شروع کیا اور یہ انداز بیان حیات قلی کی زندگی کے لئے بہت ہی موزوں ثابت ہوا۔ کانفرنسوں کے خطبوں میں بھی ان کا انداز بیان نئے طرز میں نکھر رہا تھا۔ وہ آزادانہ طریقہ سے اپنے خیالات کو ظاہر کرنے لگے تھے۔ وہ اپنی عادت کے خلاف اردو کے مسائل اور مشکلات پر بے باکی سے اپنی رائے کو ظاہر کرنے لگے تھے۔ ان تمام باتوں نے ان کے کردار میں ایک نئی تاب و توانائی پیدا کر دی تھی۔ وہ ایک بڑی کمی جو مدتوں سے محسوس ہوتی تھی پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور زور بہت باز و رانداز میں نمایاں ہو رہے تھے۔

زور صاحب شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی میں نظمیں اور غزلیں کہی تھیں لیکن جب پروفیسر بنے اور انکو تحقیقات کا چسکا لگا تو وہ شاعری کو بھول گئے۔ کشمیر کے رنگ و گل نے پھر ان میں شاعرانہ جذبات کو ابھارا۔ انھوں نے دو چار غزلیں کہیں۔ جب میں نے اُن کی یہ غزلیں پڑھیں تو مجھے خیال ہوا کہ ان کی شاعری کی عمر گزر چکی تھی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے احساس تلخی اور زندگی کی بے تاب تمناؤں کو شعر کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی ان غزلوں میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جس سے ان کی موت کی پیشین گوئی ہوتی ہے۔ میں ان اشعار کو پڑھ کر آنے والے حادثہ کے خیال سے سہم سا جاتا تھا۔ اور ان دنوں میں اس خیال کو اپنے ذہن سے نکالنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن ہوا وہی جس کا مجھے خدشہ تھا اور اس خدا کے بندے نے خود اپنے اشعار میں ظاہر کر دیا تھا۔ زور اوصاف، نیکیوں اور چند کمزوریوں کا پتلا تھا۔ اور ان ہی خصوصیتوں نے اس کے کردار کو بہت دلچسپ بھی بنا دیا تھا۔ اس نے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں دکھنیت، گولکنڈہ اور ادارۂ ادبیات اردو کی نذر کر دیں۔ جب یکایک خبر بجلی کی طرح اردو کے چاہنے والوں کے دلوں پر گری کہ دکھنی قومیت و ادب کا یہ فدائی کشمیر کی وادی میں آخری نیند سو گیا تو سارا ملک ایک ماتم کدہ بن گیا۔

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت

استاد محترم

بعض انسان زندگی، قوت اور حرکت کا ایسا ابلتا چشمہ ہوتے ہیں کہ موت کا تصور ان کے ساتھ جڑ ہی نہیں سکتا۔ خیال ہی نہیں آتا کہ ایسے انسان موت سے زیر ہو سکتے ہیں۔ یکجا مٹ سکتے ہیں۔ زندگی قوت اور حرکت کا ایسا ہی ابلتا چشمہ استاد محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی تھے۔ ان کی زندگی میں یہ خیال بھولے سے بھی نہ آیا کہ ایک روز وہ بھی مر جائیں گے۔ یکایک ایک روز اخبار میں ان کی موت کی خبر نظر سے گزری تو جو کچھ دیکھا اس پر دھوکے کا گمان ہوا۔ لیکن بار بار اس خبر کو پڑھنے کے بعد دھوکے میں رہنے کی گنجائش نہ رہی۔ پھر یاد آیا کہ انسان زندگی، حرکت اور قوت کا چاہے کتنا ہی زبردست سرچشمہ کیوں نہ ہو آخر فانی ہے۔ بڑے سے بڑے پیغمبر، بڑے سے بڑے ولی، بڑے سے بڑے عالم کل کے بڑے سے بڑے باجبروت ملک اور ایمپائر آج کے اونچے سے اونچے فاتحا اور فقاند سب ہی اسی راستے سے گزرے۔ موت سے کسی کو بھی رستگاری نہیں کسی کو بھی معافی اور چھٹی نہیں ـــ کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

کئی دنوں تک استاد محترم کی غیر متوقع اور اچانک موت نے مجھے گم سم رکھا۔ میرے ذہن میں مولانا محمد علی پر لکھے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لازوال شاہکار مضمون کی آخری سطریں گھومتی رہیں۔ معلوم نہیں موت نے زور کو کس طرح زیر کیا ہوگا۔ اس زور آزمائی میں خود موت پر کیا بیت رہی ہوگی!

اسکول کی جماعتوں سے پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام سنتا چلا آرہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کی بات ہے، میں حیدرآباد کے سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس سال اس کالج نے اپنے شہرۂ آفاق پرنسپل جناب سید محمد اعظم صاحب کی سرپرستی اور استاد محترم پروفیسر سید محمد صاحب مدظلہ کی سعی و کوشش سے بڑے شاندار پیمانے پر "جشن ولی" منایا تھا۔ ڈاکٹر زور کو میں نے پہلی بار اسی جشن ولی میں دیکھا۔ ان کے بارعب چہرے، ان کے ڈیل ڈول، ان کی پاٹ دار آواز اور ان کے بالوں کی جھومتی تراش یہ سب چیزیں میرے لئے بہت مرعوب کن رہیں۔ وہ مجھے بیک وقت فلسفی، شاعر، عالم اور پروفیسر نظر آئے۔ ان کی شخصیت واقعی مرعوب کن تھی۔ اور اکثر حضرات میری طرح پہلی ہی ملاقات میں ان سے متاثر اور مرعوب ہو جاتے تھے۔

بعد ۱۹۳۷ء میں میں نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور بی۔ اے میں اردو مضمون اختیاری لیا تو دو سال تک مجھے ڈاکٹر زور کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔ ان دو سالوں میں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے ان کو پڑھاتے دیکھا۔ میں نے ان کو لکھتے پڑھتے دیکھا۔ میں نے انھیں انگاتار کام کرتے دیکھا۔ اسی کام کرنے کی

لگن نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مجھ میں بھی دنوں کام کرنے کی ایک امنگ تھی۔ ایک ولولہ تھا۔ ایک جوش تھا۔ استاد محترم جس کسی طالب علم میں ایسا جوش، ایسا ولولہ اور ایسی امنگ دیکھتے، اس کی پیٹھ ٹھونکتے، اس کا دل بڑھاتے، اس کی قدر کرتے اور تحریر سے تقریر سے اس کی ہمت افزائی کرتے۔ طالب علمی کے اس دور میں انھوں نے جس جس طرح میری ہمت افزائی کی اور جس جس انداز سے میرا دل بڑھایا، اسے یاد کرتا ہوں تو آج بھی دل مسرور ہوتا ہے اور اپنے اولیں محسنوں میں سے اس ایک محسن کے لئے دل سے دعائے خیر نکلتی ہے۔ پھر دل بڑھانے اور قدر کرنے کا یہ انداز وہ مجھ سے مرتے دم تک برتتے رہے۔ بیس طویل سالوں میں وہ جس محبت، جس شفقت، اور جس مہربانی سے پیش آتے رہے، اس کا نقش میرے دل سے کبھی محو نہ ہوسکے گا۔ وہ مجھ جیسے کم سواد، ہیچ مداں اور کج مج بیاں کے بہت بڑے قدرداں رہے۔

ظاہر بینوں کو تو شاید یہی نظر آتا ہوگا کہ استاد محترم ڈاکٹر زور کے کارنامے یہ ہیں کہ انھوں نے درجنوں کتابیں تصنیف کر ڈالیں، بے حساب مضامین اور مقالے لکھ ڈالے، اردو کا وقیع ادارہ "ادارہ ادبیات اردو" کے نام سے قائم کر ڈالا اور اس ادارے کے لئے ایک نہایت خوب صورت اور شاندار عمارت "ایوان اردو" کے نام سے بنوا ڈالی۔ بے شک یہ کارنامے ہیں اور زبردست کارنامے ہیں۔ ان کے نام کو کوشہرت عام اور بقائے دوام کی خلعت بخشنے والے ہیں۔ لیکن استاد محترم کے ان سب کارناموں سے بھی بڑھ کر ایک کارنامے کی طرف کم ہی لوگوں کی نظر جاتی ہے اور وہ ہے دکن اور خاص طور پر مرحوم ریاست حیدرآباد دکن میں لکھنے والوں کی ایک اچھی خاصی ٹیم کا تیار کر دینا ہے۔ اس ٹیم میں آج کتنے ہی ایسے شاعر ہیں، ادیب ہیں، محقق اور عالم ہیں جن کا نام اب اردو دنیا میں جانا پہچانا ہی نہیں مانا ہوا نام ہے۔ دور حاضر کے حیدرآبادی شاعروں، ادیبوں محققوں اور عالموں میں شاید ہی کوئی شاعر، ادیب، عالم اور محقق ایسا ہوگا جس کی ہمت افزائی، تربیت یا کسی نہ کسی درجے میں رہنمائی استاد محترم نے نہ فرمائی ہو۔

دکنی عام طور پر طبعاً منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ اپنا آپ پر و پگنڈا کرنا تو انھیں آتا ہی نہیں۔ ان کی تہذیب اور ان کی شائستگی آپ اپنا ڈھول پیٹنے کی قائل نہیں۔ اگر وہ کسی علم میں طاق ہوں یا کسی فن میں انھیں درجۂ کمال حاصل ہو تو اپنی کم گوئی کی وجہ سے وہ اس کے سو دوجوں میں سے ایک درجے کا بھی اشتہار نہیں دے سکتے۔ اس خطۂ ملک میں بڑے سے بڑے بےمثال، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے ادیب اور بڑے سے بڑے صاحبان فن پیدا ہوئے، لیکن اپنی اسی صفت کی وجہ سے ایک محدود حلقے کے سوا ان کے کمال فن کو کسی نے نہ جانا۔ انھیں وہ ہندوستان گیر شہرت حاصل نہ ہوسکی جو شمال کے بعض دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعروں، عالموں اور ادیبوں کو حاصل ہوتی رہی۔ استاد محترم ان اولیں دکنیوں میں ہیں جنھوں نے محض اپنے وقیع کام ---------- کو سلیقے سے پیش کرنے کی وجہ سے شمال پر بھی اپنا سکہ چلایا اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک بنے۔ ایک مستند ادیب، ایک بڑے محقق اور اردو زبان کے ایک عالم کی حیثیت سے ہر جگہ ان کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا گیا۔ وہ اس زور سے اٹھے اور اس قوت کے ساتھ آگے بڑھے کہ آخر کار انھیں ادیبوں اور عالموں کی صف اول میں جگہ دینی ہی پڑی۔ اتنا ہی نہیں، وہ

تنہا نہیں اٹھے، اکیلے آگے نہیں بڑھے اپنے ساتھ اپنے رفیقوں اور اپنے شاگردوں کو لے کر اٹھے۔ انھیں اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھے۔ ان کے ساتھ اٹھنے اور ان کے ساتھ آگے بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بہتوں کو عالموں، ادیبوں اور قلم کاروں کی اگلی صف میں نہ سہی صف دوم میں تو بہر حال جگہ مل ہی گئی۔ دکن میں پیدا ہونے کے باوجود استاد محترم کا یہ حال رہا۔ اگر کہیں قدرت انھیں شمال میں اور خاص کر پنجاب میں پیدا کرتی تو خدا جانے روم و شام سے بڑھ کر ان کا ڈنکا کہاں کہاں بجتا!

۱۸۸۴ء میں مرحوم ریاست حیدرآباد نے فارسی کی جگہ اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔ پھر اس ریاست کے زبردست وزیر اعظم نواب سر سالار جنگ اول نے ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے شمال کے قابل ترین افراد کی خدمات حاصل کرنے کی مہم شروع کی۔ پھر تو شمال سے یہاں آ کر قسمت آزمانے والوں کا تانتا ہی بندھ گیا۔ ان میں سے اکثر حضرات اپنے آپ کو "اہل زبان" مان کر بڑے تبختر کے ساتھ دکنیوں کی اردو کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگلے وقتوں کے یہ بزرگ اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ سے بالکل نابلد تھے۔ ان بے چاروں کو اسکی اصلا خبر تھی کہ اردو ادب کی اصل و لادت گاہ شمال نہیں دکن ہے۔ اس بے خبری نے ان کو ایک طرح کے احساس برتری کا شکار بنا رکھا تھا۔ ادھر خود اہل دکن اس حقیقت کو فراموش کر کے ان "اہل زبان" حضرات کے آگے مدتوں احساس کمتری میں مبتلا رہے۔

۱۹۱۹ء میں اردو کی پہلی اور اس وقت تک آخری اردو جامعہ، جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس جامعہ سے اردو میں تعلیم پا کر نکلنے والے سپوتوں نے سب سے پہلے اس احساس کمتری کے خلاف جہاد شروع کیا۔ ان مجاہدوں کے سردار استاد محترم تھے۔ اس جہاد کے ایک محاذ کے طور پر انھوں نے اردو ادب کے اولیں دور یعنی دکنی ادب پر تحقیقاتی کام کو، جو ابھی عالم طفولیت ہی میں تھا بہت آگے بڑھایا۔ اس وقت تک اس دور کے زبردست ادیبوں اور شاعروں کے نام سے تک کوئی واقف نہ تھا۔ اور اردو ادب کا آغاز اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات کے نزدیک ولی اورنگ آبادی سے ہوتا تھا۔ عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی اور استاد محترم کی مساعی جمیلہ سے اردو ادب کا درخشاں دور بڑی حد تک سامنے آ گیا۔ استاد محترم کو یوں تو دکنی دور کے پورے ادب ہی سے گہری دلچسپی تھی، لیکن شاید وطن کی مناسبت سے گولکنڈے کے ادبی کارناموں سے انھیں خصوصی لگاؤ رہا۔ اس طرح استاد محترم کی سعی و کوشش سے دکن کے کتنے ہی شعرا اور ادیبوں کے کارنامے منظر عام پر آئے۔ شہر حیدرآباد کے عاشق مزاج بانی، پانچویں قطب شاہی فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ پر تو استاد محترم نے ایک ضخیم کتاب ہی لکھ ڈالی اور اس کے اس سے بھی زیادہ ضخیم کلیات کو بڑے اہتمام کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ ہر سال اس کے یوم وفات کو حیدرآباد کی ایک شاندار سماجی تقریب بنا دیا اور آج استاد محترم کے طفیل ہی سے یہ بات اردو ادب کے ایک معمولی طالب علم کو بھی معلوم ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور کوئی نہیں، گولکنڈے کا یہی قطب شاہی فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے۔

دکنیوں کے احساس کمتری اور "اہل زبان" حضرات کے احساس برتری کے خلاف جہاد کا دوسرا محاذ استاد محترم نے

تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اردو لکھنے کے میدان میں دل بڑھا کر اور ہمت افزائی کر کے دکھلا۔ انھوں نے خود ہی مضمون یا مقالے اور کتاب پر کتاب لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی تصنیف و تالیف پر کمر بستہ کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے طالب علموں اور شاگردوں کی طرف توجہ کی۔ اور اُن سے بھی مختلف موضوعات پر اردو میں مضامین، مقالے اور کتابیں لکھوانے لگے۔ اپنے شاگردوں کا وہ کس کس طرح دل بڑھاتے تھے اور کس کس طرح ان کی ہمت بندھاتے تھے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں اپنے مضمون کے ٹیوٹوریل کے طور پر بی۔ اے میں کم سے کم چھ مضامین سال بھر میں لکھ کر پیش کرنا ضروری تھا۔ متعلقہ استاد کی اس تصدیق کے بغیر کہ ٹیوٹوریل کے مضامین کی تکمیل کر لی گئی ہے امتحان میں شرکت ممکن نہ تھی۔ میرے بی۔ اے کے دونوں میں مضمون اردو کا ٹیوٹوریل استاد محترم سے متعلق تھا۔ مضامین کی وہ بیاض آج بھی میں نے بڑے جتن سے اٹھا رکھی ہے جس کے ہر مضمون کے آخر میں دس میں سے نو نمبر دیتے ہوئے استاد محترم نے "خوب۔ بہت خوب۔ قابل اشاعت" لکھ کر اپنے دستخط ثبت فرمائے ہیں۔ آج ان مضامین کو دیکھتا ہوں تو ان میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن میری یہ بیاض استاد محترم کے اس طرز عمل کی ایک تسلیمی دستاویز ہے کہ وہ اپنے کسی بھی شاگرد میں لکھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت دیکھتے تو کس طرح اس کی ہمت افزائی کرتے اور اس کی اس صلاحیت کو پروان چڑھانے کے کیا کیا جتن کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے ہمت افزائی اور دل بڑھانے کا یہ انداز اکیلے مجھ ہی سے استاد محترم نے نہ برتا ہوگا۔ مجھ جیسے اور بھی بہت سے طالب علم ہوں گے جن کا دل بڑھانے کے لئے انھوں نے ایسا ہی فراخ دلانہ طرز عمل اختیار کیا ہوگا۔

اپنے ساتھیوں اور اپنے شاگردوں کی تحریری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور ان کے عملی اظہار کے لئے انھوں نے "ادارۂ ادبیات اردو" جیسا وقیع ادارہ قائم کیا جس کے وہ عمر بھر معتمد رہے۔ "ادارۂ ادبیات اردو" اور "ڈاکٹر زور" حقیقت میں ہم معنی الفاظ ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر زور کے بغیر ادارہ ادبیات اُردو کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اس ادارے کے ترجمان کی حیثیت سے انھوں نے ایک ادبی ماہنامہ "سب رس" بھی اپنی نگرانی میں جاری کیا۔ اس رسالے میں لکھ لکھ کر کتنے ہی دکنی ادیب اور شاعر اردو دنیا سے متعارف ہوئے۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے کتنے ہی نوخیز دکنی مصنفوں کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کر کے عملی دنیا سے ان کو متعارف کرایا۔

جن مخصوص حالات میں ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا اور جن تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ماہنامہ سب رس جاری ہوا ان سے ناواقف حضرات کو میں نے کہیں یہ بھی کہتے سنا ہے کہ ادارہ ادبیات اردو سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ کچھ ایسی معیاری نہیں ہیں اور ماہنامہ سب رس کا معیار ایسا کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے لیکن یہ تنقید بڑی حد تک ناروا ہے۔ جو ادارہ اصل میں نوشق مصنفوں اور نوخیز لکھنے والوں کی ہمت افزائی کیلئے عالم وجود میں آیا ہو۔ اس کی ابتدائی مطبوعات کچھ ایسی وقیع نہ ہوں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس ادارے نے اپنا بنیادی مقصد پورا کیا اور بتدریج اس نے ایسی ایسی کتابیں شائع کیں جن کی اشاعت پر اردو کا کوئی بھی ادارہ فخر کر سکتا ہے۔ یہی حال ماہنامہ سب رس کا ہے۔ استاد محترم نے قصداً اس کا معیار اتنا اونچا نہ رکھا کہ اردو دنیا کے ایک مخصوص حلقے تک

اس کی پذیرائی ہو اور عام اردو پڑھنے والے اس سے استفادہ کر سکیں۔ میرے کانوں میں آج تک استاد محترم کے الفاظ گونجتے ہیں کہ "میں چاہتا ہوں کہ سب رس اتنا مقبول ہو اور اس کے پڑھنے والے اتنے ہوں کہ معمولی پڑھا لکھا پان والا بھی اسے شوق سے پڑھے اور اس کے ہاتھوں میں یہ رسالہ نظر آئے۔" سب رس "شمع" یا اس کی ہمدل چیپیاں رکھنے والا رسالہ تو نہیں بنا، لیکن اس میں اصلا شک نہیں کہ اردو کے صفحات میں نکھر نکھر کر بہت سے مقالہ نگاروں، افسانہ نویسوں اور نظم گویوں نے مقالہ نگاری، افسانہ نویسی اور نظم گوئی کا سلیقہ سیکھا۔ اس طرح ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے ترجمان سب رس نے دکنی ادیبوں، عالموں اور شاعروں کا ایک دلکش چمن کھلانے میں بظاہر دکھائی نہ دینے والی کھاد کا کام دے کر نہایت اہم حصہ ادا کیا ہے۔

استاد محترم کو اپنے دکنی ہونے پر فخر تھا۔ انھیں دکن کے مہتاز تمدن کی عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ اس تمدن کے مظاہر میں اجنتہ کی نقاشی، ایلورا کی سنگ تراشی، بیجاپور، گولکنڈے اور بیدر کی تعمیر کاری، چالوکیہ راجاؤں سے لے کر شاہان آصفیہ کی علم و ہنر پروری، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اردو نثر سے لے کر جامعہ عثمانیہ کی مہتم بالشان علمی خدمات سب ہی کو وہ شمار کرتے تھے۔ اپنے ہم عصر دکنیوں کو وہ اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ اپنے اسلاف کے کتنے عظیم الشان ورثے کے امین ہیں۔ ان کی سراپا یہی کوشش رہی کہ اہل دکن اس ورثے کی عظمت سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ ایسے ہی شاندار کارنامے وہ خود بھی انجام دے جائیں۔

استاد محترم کی زندگی میں غالباً سب سے بڑا حزنیہ جو پیش آیا وہ ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدرآباد پر پولیس ایکشن کا دل دوز واقعہ ہے۔ اس قیامت صغرا کے اور مضمرات کے ساتھ سب سے بڑا المناک حادثہ ایک ہند وستانی زبان کی اولیں جامعہ کا خاتمہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ جس نے اردو کو اپنا ذریعہ تعلیم قرار دے کر تیس بتیس سال تک نہایت اونچے درجے تک کی تعلیم کا نہایت کامیاب تجربہ کیا تھا، اسی جامعہ میں یہ زبان حرف غلط کی طرح مٹ دی گئی۔ غضب خدا کا یہ صدمہ اردو کو بدیسیوں کے ظالم ہاتھوں نہیں اپنے ہی دیس کے غیر یاں ہاتھوں سہنا پڑا۔ استاد محترم کی خدمت میں مجھے بیس بائیس سال تک نیاز حاصل رہا۔ اس دوران میں بس ان ہی دنوں میں نے انھیں مضمحل، مغموم اور ایک حد تک مایوس دیکھا۔ انھیں ان دنوں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کی عمر بھر کی کمائی لوٹ لی ہو۔ ان کے عمر بھر کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ میں پھر عرض کروں گا استاد محترم زندگی، قوت اور حرکت کا ایک آباد چشمہ تھے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے اس چشمہ کے جوش و خروش میں کچھ کمی آگئی تھی۔ لیکن یہ کیفیت عارضی رہی۔ بدلے ہوئے حالات سے دل شکستہ ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی جگہ انھوں نے ایک باہمت سپاہی کی طرح پھر ایک بار کمر ہمت کس لی، اور پھر ایک تازہ ولولے اور ایک نئے جوش کے ساتھ وہ اپنی زندگی بھر کے مشن کو پورا کرنے میں منہمک ہو گئے۔ اسی دور میں اپنی ان تھک محنت سے انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو کی شاندار اور خوب صورت عمارت "ایوان اردو" بنوائی جس کی تعمیر میں ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ صرف ہوئے۔ مایوسی اور اضمحلال کے دور میں استاد محترم وہ کارنامے انجام دے گئے جو اوروں سے تازہ امنگوں اور ولولوں کے دنوں میں بھی انجام نہ پا سکے۔

دکن میں اردو کی شاندار خدمات انجام دینے کے بعد استاد محترم نے ملک کے انتہائی شمال میں ایسی ہی شاندار خدمات

انجام دینے کے عزم و ارادے کے ساتھ کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھا۔ کشمیر کی حکومت اور خاص طور پر اس کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد صاحب کے فیاضانہ اور ہمدردانہ سلوک کی بنیادوں پر استاد محترم ایسے ہی شاندار انجام کا آغاز کر چکے تھے کہ قضا کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے اور اہل کشمیر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ استاد محترم ایک ایسی سرزمین میں جو اپنی زرخیزی کے لئے عالم میں ضرب المثل ہے، اُردو کی محبت کا تخم بو گئے ہیں۔ انشاء اللہ ایک سید زادے کی یہ محنت رائگاں نہ جائے گی۔ اس کے مبارک ہاتھوں کا لگایا ہوا یہ پودا ایک دن بڑا گھنا درخت بنے گا اور اس کے سایے میں مستقبل کے کشمیری ادیب، شاعر اور ادب نواز پروان چڑھیں گے۔ اس سرزمین میں ایک غریب الدیار خادم اردو، عاشق اردو اور مخدوم اردو کا مزار اہل کشمیر کے دلوں میں اردو کے تعلق سے آتش شوق کو بھڑکاتا ہی رہے گا۔

ہم دکنیوں کے لئے استاد محترم روشنی کا ایک بہت بڑا مینار تھے۔ وہ ہمارے گوہر شب چراغ تھے۔ وہ ہمارے سب سے بڑے ادبی رہنما اور ہمدرد سب سے بڑا سہارا تھے۔ کوئی علمی کام ہوتا، کسی مجلس آرائی کی بات ہوتی، کوئی ادبی مسئلہ سامنے آتا، کسی کتاب کی طباعت اور اشاعت کی اسکیم ہوتی تو اس سلسلہ کی تمام دشواریوں اور الجھنوں میں ذہن سب سے پہلے استاد محترم ہی کی طرف جاتا اور ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا کہ یقیناً وہ ان تمام دشواریوں اور الجھنوں کا بہترین حل تلاش کر دیں گے۔ اردو کے اس دور ابتلا میں قدرت نے روشنی کا یہ مینار، یہ گوہر شب چراغ بھی ہم سے چھین لیا۔ شاید اس لئے چھین لیا کہ ہم اور بھی چوکنے اور چوکس ہو کر کام کریں، اتفاق و اتحاد سے کام لیں۔ جو کام وہ تمام چھوڑ گئے ہیں ان کو پایہ تکمیل کو پہنچائیں۔ اس منزل کی طرف گامزن رہیں جس کی وہ نشان دہی کر گئے ہیں۔ بس یہی ایک صورت اردو کے اس مرد توانا اور بطل عظیم کی روح کو شاد کرنے اور اسکے احسانوں کی سپاس گزاری کی مہم ہم دکنیوں کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی موت کا خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں بے اختیار ایک عرب شاعر کے لکھے ہوئے مرثیے کے شعر گھومنے لگتے ہیں۔ کہتا ہے:—

تیرے مرنے سے پہلے میں کبھی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایک زبردست
پہاڑ بھی زیر زمیں ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ مجھے دفن کر چکے تو
مجھے معلوم ہوا کہ ہاں، یہ لحیم بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی نگل سکتی ہے!

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (امریکہ سے)

ڈاکٹر زور ——— چند تاثرات

زندگی اگر نعمت ہے تو موت بھی نعمت سے کم نہیں، کیونکہ زندگی کا بھرم اگر کسی چیز سے قائم ہے تو وہ موت ہی ہے امیدوں کے چراغ جلائے ہی بجھانے کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن موت سے شکوہ یوں کیا جاتا ہے کہ کم بخت وقت بے وقت آتی ہے ڈاکٹر زور کا انتقال بھی ایک ایسا ہی صدمہ ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اردو کا یہ بے لوث خدمت گذار، دکنی ادب و تہذیب کا یہ عاشق صادق اور سعی و عمل کا یہ آتش فشاں اس قدر جلد خاموش ہو جائے گا۔ کئی دنوں تک مجھے ان کی موت کا یقین نہ آیا۔ ان کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ، پان چباتے ہوئے ہونٹ، کشادہ پیشانی، دل کی گہرائیوں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اور لہک لہک کے باتیں کرنے کا انداز جب بھی یاد آتا ہے، ان کی جدائی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ ان سے آخری ملاقات انتقال سے چار ہی روز پہلے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کو پالم پر ہوئی تھی، جب وہ بمبئی سے کشمیر واپس جا رہے تھے۔ جہاز کے روانہ ہونے میں کچھ دیر تھی۔ میں نے کہا:

اب اجازت دیجئے۔ پالم سے دہلی یونیورسٹی بس سے دو تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ جتنی دیر میں آپ سری نگر پہنچیں گے، میں یونیورسٹی پہنچوں گا۔"

کہنے لگے: "خوب! کیا آدھا گھنٹہ بھی آپ ساتھ نہیں رہیں گے۔ پھر کچھ دیر رک کر بولے:- ابھی تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ سری نگر کب آ رہے ہیں"؟

"کینٹ کو پہنچ رہا ہوں"

"کہاں ٹھیریں گے۔ اب کے بھی میرے ہاں نہیں ٹھیریں گے کیا"؟

ان کی گفتگو کا ایک خاص انداز یہ تھا کہ جملے کے آخری حصے کو کھینچ کے بولتے تھے، جس سے لہجے میں ترنم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی میں نے جواب دیا:

حضور، آپ 'دلی' ہیں، مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں پھر کوئی بد دعا نہ کر بیٹھیں"۔

اس پر انھوں نے قہقہہ لگایا اور پچھلی باتوں کو یاد کر کے ہنسنے لگے۔ ہوا یوں کہ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں شرکت کے لئے سری نگر پہنچا۔ زور صاحب کا اصرار تھا کہ میرے ہاں رہئے۔ لیکن ایک تو میں اکیلا نہیں تھا، دوسرے مجھے یہ احساس تھا کہ تلسی باغ کا مکان رفعت منزل تو بن نہیں سکتا، چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ زور صاحب کی مہمان نوازی کا جائز یا ناجائز فائدہ فی الحال نہ اٹھایا جائے۔ سوء اتفاق کہ میں بیمار پڑ گیا۔ انھیں معلوم ہوا تو موٹر میں بیٹھ کر فوراً ٹورسٹ سنٹر آئے اور نہایت مشفقانہ انداز میں بولے

یہ میرے ہاں نہ ٹھیرنے کا نتیجہ ہے، میں نے کہا نہیں تھا کہ تمسی باغ ہر طرح آرام سے رہیں گے۔"
چنانچہ اب کی بار میں نے زور صاحب کو یقین دلایا کہ میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واپس ہی نہ آسکوں۔ ڈاکٹر کو میری ایک عزیزہ کی شادی یاد تھی۔ اس پر کچھ سخت لہجے میں بولے:
"تو کیا ایک ہی دن رہیں گے؟"
"جی ہاں"
"یہ نہیں ہو سکتا کچھ پہلے کیوں نہیں آتے۔ صرف یونیورسٹی ہی کا کام نہیں، کچھ اور بھی پروگرام رکھیے۔ گلرگ نہیں دیکھیں گے کیا؟"
میں نے کہا: "۳۴ تک کلاس ہیں، ۲۵ کو آسکتا ہوں۔"
کہنے لگے: "بہت خوب، میاں جب سفر کیا جائے تو کچھ رکنا بھی چاہیے۔" لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کی مہلت عمر ختم ہو چکی ہے، اور وہ خود ہی رکنا پسند نہ کریں گے!
ڈاکٹر زور ایک اچھے انسان اور ایک اچھے ادیب تھے۔ ان کے ساتھ سابقہ دکنی ادب کا ایک روشن باب ختم ہو گیا۔ افسوس ایسے لوگ "خاک کے پردے" سے روز روز باہر نہیں آتے:

گلے پر فرشتہ کہ یہ بصد بہار و گر

موجودہ دور میں اردو والوں کے نزدیک دکن کے بغیر زور اور زور کے بغیر دکن دونوں ادھوری سچائیاں ہیں۔ اردو دان کا ادھر جھکاؤ تھا۔ ان کی ایک ایک سانس اردو کے لئے وقف تھی اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی کی خدمت میں کھپا دی۔ اگر پچھلے تیس سال کی دکن کی سماجی اور علمی زندگی کی آئینے مرتب کی جائے تو زور مرحوم کے بندیے کی آنچ قدم قدم پر محسوس کی جا سکے گی۔ اٹھتے بیٹھتے ہوتے جاگتے انھیں اگر کسی چیز کا خیال تھا تو اردو کا۔ مقصد سے ایسی وابستگی کم ہی لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ویسے اعتراض کرنے والوں کی زبان کس نے روکی ہے۔ اعتراض تو اقرار کی آبرو ہے (ہاں انسان ہم سب ہیں اور فرشتہ ہم میں کوئی نہیں) اور اگر کسی کو دعویٰ اپنے فرشتہ ہونے کا ہے تو پھر اس کے لئے فخر و ناز کا محل نہیں، کیونکہ انسان ہونے کی سعادت تو اسے حاصل ہی نہیں۔ یہ بات تو انسان ہی کے حصے میں آئی ہے کہ وہ "مجموعہ اضداد" ہے۔ بھلائی اور برائی کا، نجوبی و خامی کا اور زور اور کمزوری کا بڑے سے بڑے ادیب و مصنف کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو وہ بھی "سماجی جانور" کی سطح پر یا توالی منفعت کے لئے کام کرتا ہوا ملے گا یا جاہ و منصب کے لئے؛ اور اگر کسی نے بڑا تیر مارا اور مصلحتوں کے دروازے بند بھی کر لئے تو یا وہ اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں سے لیتا ہوا ملے گا، یا تعریف و تحسین اور شہرت کی زلف گرہ گیر سے کھیلتا ہوا دکھائی دے گا۔ انھیں کمزوریوں میں بشریت کی شان ہے۔ لیکن انسانی کوتاہیوں کے "باوصف" اگر کوئی علمی سطح پر قدیم و جدید جواہر پاروں کی بازیافت کرے اور تاریخ زبان و جدید کی کڑیاں ملانے میں مدد دے یا خدمت زبان کی سطح پر زبان کی نشر و اشاعت کے دائرے کو وسیع کرے اور زبان سے محبت کے جذبے کو عام کرے، تو اس کے وجود کو اس کی زبان کے لئے قابل فخر قرار دینا ہی پڑے گا۔ ڈاکٹر زور کے کارناموں کی بنیادی نوعیت یہی ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں قلم سنبھالا تھا۔ حیدرآباد میں شاعروں کی کمی نہ اس وقت تھی۔ اب ہے۔ لیکن سنجیدہ علمی و ادبی کام کرنے والے اس وقت کتنے تھے اور آج کتنے ہیں؟ اس فرق کو جان لینا ہی زور صاحب کی خدمات کا اعتراف کرنا ہے۔ یہ تعداد اب بھی زیادہ نہیں اور شاید کبھی زیادہ نہ ہو سکے۔ قحط الرجال کا ماتم ہر دور میں رہا ہے اور فطرت کی [illegible] کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ بھی ہے کہ

علم کے مقابلے میں جہالت کا دائرہ ہمیشہ وسیع تر ہی رکھا گیا ہے۔ پھر بھی اس میں کلام نہیں کہ حیدرآباد کی ادبی زندگی میں پچھلی سو صدی میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ حیدرآباد کے موجودہ لکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد (بشمول شعراء کے) زور صاحب کی تربیت یافتہ ہے۔ جو ان کے تربیت یافتہ نہیں، وہ بھی زور صاحب کی تصانیف یا ان کی شخصیت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر رہے ہیں؛

آہ کس انداز سے گذرا بیاباں سے کہ تیر
جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

دکنیات پر باقاعدہ کام کی ابتدا تیسری دہائی کے شروع میں مولوی عبدالحق کی تحریروں سے ہوئی تھی، اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ کام بُرا بھلا دکنیوں ہی سے انجام پائے گا۔ محی الدین اس وقت بی اے میں وحیدالدین سلیم سے درس لیا کرتے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئی دریافتوں کے نقش ان کے حساس ذہن نے نہایت تیزی سے قبول کرنا شروع کر دیئے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد چند ہی برسوں میں دکنی سرائے کا بڑا حصہ انھیں کی اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے شائع ہوا، شروع ہو گیا۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ زور صاحب کے نام سے ان کا تخلص زیادہ مشہور ہے۔ یہ بات تو شاید ان کا کوئی ہم عمر ہی بتا سکے گا کہ بچپن میں انھیں کس محرومی کا شدید احساس رہا، لیکن اتنا ظاہر ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ شمالی ہندوستان والوں سے اپنے زمانے کے دکنیوں کا مقابلہ کرتے ہوں گے تو انھیں دکنیوں کی کوتاہ قلمی یا کاہلی بری طرح کھٹکتی ہوگی۔ چنانچہ اس کا ردِ عمل طالب علمی ہی کے زمانے میں جوش نمو کی صورت میں ظاہر ہوا، اور روح تنقید کے مصنف کی حیثیت سے وہ ادبی افق پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے زبردست خود اعتمادی سے کام لیا اور تصنیف و تالیف میں اس طرح جُٹ گئے کہ کتاب پر کتاب شائع ہوتی چلی گئی۔ ان کی تحریروں سے ان کے ذوقِ عمل کی دھن اور اردو سے بے انتہا محبت کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ شمالی ہندوستان والوں کے فطری احساس برتری کی بنا پر اردو کی ادبی تاریخ میں اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں دکن کے کارناموں کو اس کا جائز مقام دلانا ایک انسان کا کام نہیں، اس کے لئے ایک جماعت کی، ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ جرأت رندانہ سے آگے بڑھے۔ انھوں نے ادارے بنائے، انجمنوں کی بنیاد ڈالی، شبینہ مدرسے قائم کئے، روساء کے سامنے گڑگڑائے، دوستوں سے مدد لی، شاگردوں کو پکڑا، خود لکھا، دوسروں سے لکھوایا۔ غرض جو بھی بن گیا، وہ اسے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کرتے گئے۔ زور صاحب کی ایک خوبی یا خامی یہ تھی کہ ہر شخص کو جوہر قابل سمجھ لیتے۔ خوبی اس لئے کہ اس سے اردو کا پرچم لہراتے رہنے میں مدد ملی اور خامی اس لئے کہ وہ اپنی قوتوں کو مجتمع نہ کر سکے۔ انھیں جہاں امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر آتی، ریجھ جاتے، ہر چنگاری کو شعلہ بنا دینے کی فکر کرتے۔ ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات اس کی بہترین مثال ہیں۔ میں نے ان سے ایک بار معلوم کرنا چاہا کہ آپ نے اپنی معیار کی ترازو کو اتنا ڈھیلا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کہنے لگے ——— ہیرے نگریزوں ہی سے تو ملتے ہیں۔ لیکن شاید انھوں نے اس بات کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا کہ ہر نگریزہ ہیرا نہیں ہوتا۔

زور صاحب کا خیال تھا کہ اہل دکن نااہل نہیں، کاہل ہیں۔ جب کسی کو نصیحت کرتے، کہتے:

درختِ کاہلی کمتر آورد بار

ان کے حلقۂ ارادت میں آنے کی شرط یہی تھی کہ انسان پہلے ہی قدم پر مجنوں ہو جائے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل سے ان کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ایک بار کہا تھا:

"بیوقوف صاحب! کوئی قلم اٹھاتے ہی نوبل پرائز ہولڈر نہیں بن جاتا۔ برسوں قلم گھسنا پڑتا ہے،

تب کہیں ایک معیار پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات ہم دکھنیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ لکھیں گے تو موکے کی کتاب لکھیں گے، ورنہ نہیں لکھیں گے۔ نتیجتہً اسی طرح گمنام مرجاتے ہیں۔"

جب خلوص و محبت اور نیک نیتی سے وہ لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے، وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے، اور ہاتم اسی بات کا ہے کہ اب ایسے استاد کہاں پیدا ہوں گے!

زور صاحب کا سلسلہ نسب حضرت سید شاہ علی سانگڑے سلطان سے ملتا ہے۔ صوفیانہ روایتیں انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ سینۂ بے کینہ رکھتے تھے اور رواداری اور اخلاص و اخوت کا پیکر تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اس اصول کو ایمان بنا لیتے ہیں:

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دہلی اور اتر پردیش کے مقابلے میں دکن کی سماجی زندگی باہمی یگانگت اور تہذیبی اشتراک کی بہتر مثال پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر زور دکن کی ان اتحاد پسندانہ روایتوں کے رمز شناس تھے اور ان کے فروغ کے لئے دل و جان سے کوشاں رہتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ سے ان کی نسبت شخصی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے وطن سے، مقامی معاشرت سے اور مشترکہ تہذیبی سرمائے سے انھیں گہری محبت تھی۔ بڑے صاف گو "کھرے تل" قسم کے انسان تھے، جو دل میں ہوتا تھا، بے باکی سے زبان پر لے آتے تھے۔ میں نے انھیں دوسروں کی نجی باتیں کرتے اور چٹکیاں لیتے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ لیکن مذہب یا عقیدے کی بنا پر انھوں نے کبھی کسی پر چوٹ نہیں کی۔ وہ سرے سے دل میں ایسا کوئی چور رکھتے ہی نہ تھے۔ آئندہ کا نقاد جب ان کی ادبی اور تاریخی تحریروں کو موجودہ زمانے کی تحریکوں کے پس منظر میں دیکھے گا تو محسوس کرے گا کہ سماجی تعلقات کو خوشگوار بنائے رکھنے میں بھی ان کی خدمات لائقِ رشک رہی ہیں۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کی زندگی میں کیا انقلاب آیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے زور صاحب نے کہا تھا:

"تقسیم ہند اور انقلاب حیدرآباد کے بعد اردو والوں کی ضروریات اور حالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور میدان بدل گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر از سرِ نو جد و جہد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ طوفان اور ہنگامہ آرائی کے آثار نمایاں ہیں، کام کرنے کا یہی تو اصل وقت ہے۔"

اس کے بعد اردو پر کیا کچھ گزری اور مشترکہ تہذیبی عناصر پر کیا کچھ گزر سکتی تھی، اس کا تصور مشکل نہیں۔ آزادی کے بعد پورا ہندوستان احیا پرستی کا شکار ہے اور فرقہ واریت، صوبائیت اور لسانی تعصب جگہ جگہ اپنی انتہا پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ حیدرآباد کی سماجی زندگی خود کو ان زہریلی ہواؤں کے اثر سے محفوظ رکھنے میں ایک حد تک کامیاب رہی ہے۔ ایک حد تک کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ کلیتہً تو ہندوستان کا کوئی گوشہ ان اثرات سے بری نہیں۔ حیدرآباد میں بھی بھاگ نگر کی بحث اس کی ادنیٰ سی مثال ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجموعی طور پر حیدرآباد کے عوام کو آج بھی اپنے اس مشترکہ ماضی کا احساس ہے جس نے مذہب و ملت کی بنا پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیا تھا بلکہ سماجی رابطوں کی بدولت سب کو قومیت کے ایک ہی رشتے میں پرو دیا تھا۔ ماضی کے اس قابلِ فخر سرمائے سے لوگوں کو روشناس کرانے اور قدیم دور کی صلح روایتوں کو حال کے تقاضوں کی روشنی میں پرکھنے کے کام میں یوں تو کئی حضرات کی کوششیں شامل رہی ہیں، لیکن جو شخص ان کاموں میں سب سے پیش پیش رہا، وہ ڈاکٹر زور ہی تھے۔ آزادی سے پہلے انھیں طعنے دیئے جاتے تھے کہ وہ سلاطینِ آصفیہ سے منہ موڑ کر قطب شاہی کی مدح گستری کر رہے ہیں۔ آزادی کے بعد بعض کوتاہ بیں انھیں حیدرآباد کی اسلامی تاریخ کا پرستار سمجھتے تھے۔ لیکن انھوں نے ہمت

نہیں ہاری اور وہی کرتے رہے جسے انھوں نے ضروری خیال کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبیں منعقد کیں، جلسے کرائے، جلیسیں نکالے، نمائشیں کرائیں، مقالے پڑھوائے، مضمون چھپائے، کتبے لگوائے یا روشنی کے انتظام کئے، تو یہ سب چھوٹی باتیں ہوں گی۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ انھوں نے قدیم کلچر کی انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا اور قطب شاہی تمدن کے اصلی روپ کو اس خوبی سے پیش کیا کہ پورا آندھرا اپنی اس مشترکہ میراث پر فخر کرنے لگا۔ تاریخ کے ایک نازک موڑ پر ڈاکٹر زور کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

زور صاحب خوش وضع اور خوش مزاج انسان تھے۔ زود رنج بھی تھے۔ میں نے انھیں بہت جلد بگڑتے اور منتے دیکھا ہے۔ اکثر ان کا غصہ خلوص کا رنگ لئے ہوتا تھا۔ جہاں رنجیدہ ہوئے، بول اٹھے اور دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو بات بات پر خفا ہوتے رہتے ہیں۔ اور دل میں گرہ لگا لیتے ہیں۔ ان سے میرے تعلقات کی ابتدا خط و کتابت کے ذریعے ہوئی، اور سو اتفاق کہ وہ پہلے ہی خط پر بگڑ بیٹھے۔ میں نے ان سے دکن کے ایک مورخ سے متعلق کچھ معلوم کیا تھا۔ انھوں نے نہایت محبت سے دو تین صفحوں کا خط لکھا اور تمام ضروری معلومات فراہم کر دی۔ میں بوجہ شکریہ کا خط لکھ سکا نہ رسید سے مطلع کر سکا۔ تین چار مہینے کے بعد دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی تو پہلا سوال طنزاً انھوں نے یوں داغا:

"اچھا تو آپ ہی نے وہ خط لکھا تھا"

میں نے اقرار کیا۔ وہ دم بھر ایک صوفے پر جا کے بیٹھ گئے۔ پاندان کھولا، گلوری منہ میں رکھی، انگلیوں کو تھپلی پر مسلا اور اس کے بعد جو انھوں نے نوجوانوں کی بدتمیزی، آداب سے ناواقفیت اور بے پروائی پر وعظ دینا شروع کیا تو مجھے سر جھکائے سنتے ہی بنی۔ لیکن

مجھے کیا برا تھا "سننا" اگر ایک بار ہوتا!

دوسرا واقعہ اس سے بھی سخت گزرا۔ چند ماہ بعد زور صاحب کا پھر دہلی آنا ہوا: میں نے سوچا چلو اپنے گناہ بخشوا لیں۔ جگن ناتھ آزاد، حسن نعیم اور میں زور صاحب کے ساتھ پارلیمنٹ اسٹریٹ سے نکل کر کناٹ پلیس آئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کافی ہاؤس میں نشست رہی۔ اس کے بعد زور صاحب نے گھر کے لئے کچھ سامان اور بچوں کے لئے ٹکٹوں اور چیک دار کاغذ کے دو رول خریدے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ زور صاحب کو یونیورسٹی واپس پہنچنا تھا۔ قرار پایا کہ زور صاحب حاجی ٹیکسی پر روپیہ کیوں برباد کریں، اس وقت بس آسانی سے مل جائے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کی انتظار کے بعد ہم تینوں نے بڑے اہتمام سے زور صاحب کو بس میں سوار کیا اور ان کا سامان بھی احتیاط سے ان کے ساتھ کر دیا۔ جگن ناتھ آزاد اور حسن نعیم کی تو خیریت رہی، یونیورسٹی میں دوسرے دن میری زور صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اور میری جو شامت آئی، تو مزاج پرسی کے بعد پوچھ بیٹھا:

"کل رات واپس پہنچنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟"

اس پر بڑے سخت لہجے میں بولے: "آپ سب نااہل ہیں، بالکل نکمے! میرے بار بار منع کرنے پر بھی آپ لوگوں نے مجھے بس میں بٹھا دیا۔ یونیورسٹی کا ہے کو ہے، جنگل ہے۔ مجھے کیا معلوم مکان کہاں ہے۔ رات کے بارہ بجے تک ڈھونڈھتا پھرا۔ ایک ٹھور رک کر پھر چلے۔ اوپچولی کے لئے جو سامان خریدا تھا، وہ بھی کہیں رہ گیا۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔"

بعد میں یہ معلوم ہو کر مجھے افسوس ہوا کہ زور صاحب فوارہ آن بان سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ بھوا خوری کو نکلتے تو بھی موٹر پر۔ شہری بس سے سفر کرنے کا شاید پہلا اتفاق تھا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچ لیا کہ اب زور صاحب سے ملاقات تو کیا ہوگی۔ لیکن چند ہی مہینوں کے بعد ان کا خط ملا کہ فلاں تاریخ کو آرہا ہوں اور حیدرآباد ہاؤس میں ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو آخری دم تک ان کی وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ جب بھی آتے، ضرور اطلاع کرتے اور زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزرتا۔ وزارت کے کاموں اور ادارے کی مصروفیتوں سے لے کر دہلی کے گرد و غبار اور جن پتہ کی جلوہ سامانیوں تک ہر موضوع پر گفتگو ہوتی، اور نہایت بے تکلف۔

ان کے اکثر ملنے والوں نے لکھا ہے کہ زور صاحب چاء خوب پلاتے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو تو بھی چاء پلاتے ہیں۔ پاندان ساتھ رکھتے ہیں، لیکن پان خود کھاتے ہیں، دوسروں کو نہیں کھلاتے۔ بلکوں سے پائی تو نہیں اٹھاتے، لیکن خرچ کی کڑی نگرانی ضرور کرتے ہیں۔ اگر یہ سب سچ ہے تو بھی دہلی میں ان کا رویہ نسبتاً مختلف تھا۔ یہاں وہ پان دوسروں کو بھی پیش کرتے تھے۔ کھانا یا تو کسی دوست کے ہاں ہوتا، تھا یا میرے ساتھ کھایا کرتے تھے۔ میں ٹھیرا بے گھر بے در آدمی، کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ گھر لے جاکے ان کی ضیافت کا اہتمام کروں۔ ان کی نوابی کے پیش نظر میں ہمیشہ اپنے ہاں "بوریا" نہ ہونے ہی کے احساس سے مغلوب رہا۔ کھانا موتی محل، کناٹ پلیس یا جامع مسجد پر کھاتے تھے۔ بارہا میں نے یا میرے دوستوں نے بل ادا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ خود ہی دام ادا کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ یہی علم دوسرے اخراجات کا تھا۔ کسی پر بوجھ نہ بنتے، بلکہ فیاضانہ خرچ کرتے تھے۔

سال میں چار پانچ بار ان کا دہلی آنا ہوتا رہتا تھا۔ فراش خانے سے پان ضرور خریدتے۔ بل ہاراں میں سلیم شاہی جوتے دیکھتے، کباب نہیں جامع مسجد کے پسند تھے۔ بچوں کے لئے مٹھائی اور معمولی قاعدے کناٹ پلیس سے لیتے اور اگر فرصت ہوتی تو اردو بازار میں کتابیں بھی دیکھتے۔ میں نے بارہا محسوس کیا، دہلی کے سفر سے انھیں ایک طرح کی جذباتی آسودگی حاصل ہوتی تھی، سفر انھیں پسند تھا۔ ایک دن حیدرآباد کو واپس جاتے ہوئے نئی دہلی اسٹیشن پر بیگم چغتائی سے ملاقات ہوگئی، بولیں: "جب بھی آپ سے ملنا ہوتا ہے، اسٹیشن پر۔ حیدرآباد پہنچ بھی جاتے ہیں، یا راستے ہی سے لوٹ آتے ہیں۔"

دہلی کی بے تکلف صحبتوں میں نہایت شگفتہ رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر کی نفسیاتی گھٹن کے لئے دہلی کا قیام SAFETY VALVE کا کام دیتا ہوگا۔ وہ جی کھول کر ہنستے اور مذاق کرتے تھے۔ نئی دہلی میں ایک خاندان سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ اس خاندان کے ایک شخص کا اکثر تذکرہ رہتا۔ جب آتے فون پر اطلاع کرتے اور کسی نہ کسی طرح ملنے کا وقت نکال ہی لیتے۔ کبھی کبھار تھکنے کی نوبت بھی آجاتی۔ ان کی سیرت و صورت کا ذکر اشاروں اشاروں میں کیا کرتے تھے۔ ایک دن دہلی کے دوستوں نے اصرار کیا۔ کہ حضرت، آخر یہ کیا پردہ داری ہے:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

یا تو انھیں کسی موقعے سے یہاں بلائیے یا پھر ہم خود وہاں چلے جائیں گے۔ کہنے لگے: اچھا اگر آپ اتنے ہی بے چین ہیں، تو وہ آج ہمیں اسٹیشن پر پہنچ جائیں گی، اذنِ عام ہے۔ شام کو اسٹیشن پر بہت دیر انتظار رہا۔ کسی نے آنا تھا نہ کوئی آیا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو زور صاحب فاتحانہ انداز سے ہاتھ ہلاتے ہوئے، اور غالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے سوار ہوگئے:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

کبھی کبھی ان سے لندن کا تذکرہ بھی رہتا۔ جس زمانے میں زور صاحب لندن میں تھے، اردو کے دو تین اور ادیب بھی وہیں تھے۔ قریب کے ایک ہوٹل میں ایک غیر ملکی شہزادی بھی بہ سلسلۂ تعلیم مقیم تھیں۔ ان کے حسن و جوانی اور غمزہ و ادا کا بڑا شہرہ تھا۔ زور صاحب کے ایک دوست

کسی اخبار سے اس کی تصویر کاٹ لائے اور گھنٹوں اسے سامنے رکھ کر آہیں بھرا کرتے۔ بالآخر زور صاحب اور ان کے ایک ساتھی نے اس ملکہ حسن کی طرف سے ایک جعلی خط ان مجنونِ ثانی کو لکھا کہ میاں تم عاشقِ صادق ہو، کیوں ناحق مجھے ترساتے ہو، فلاں دن فلاں جگہ آکر ملو۔ مقررہ وقت پر زور صاحب اور ان کے ساتھی بھی چھپتے چھپاتے وہاں پہنچے، دیکھا تو بہترین لباس پہنے، عطر مجموعہ اگائے:

دیوار سے لگے وہ تصویر سے کھڑے ہیں
اور اگر کوئی ہندوستانی متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے!

ابھی چند برس کی بات ہے کہ زور صاحب کے ایک دوست یورپ گئے۔ وہاں سے انھوں نے بلاؤز کے ایک خاص حیدرآبادی کپڑے کی فرمائش کی۔ زور صاحب نے کپڑا بھجوا دیا۔ چند سال بعد جب دہلی میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی، تو بغل گیر ہوتے ہوئے چھوٹتے ہی ان سے پوچھا:

"کیوں صاحب! وہ کپڑا آپ کی معشوقہ کو پسند آیا تھا کیا"؟

زور صاحب باتیں ٹھیٹ دکنی رنگ میں کیا کرتے تھے۔ ایک بار ادارے کے کام سے ایک ایسے صاحب کے ہاں جانا ہوا جن کا شمار عمائدینِ علی گڈھ میں ہوتا ہے۔ ان کی سلیقہ شعار اور باوقار بیگم بھی فروکش تھیں۔ اتفاق سے ان کی دخترِ نیک اختر بھی اس زمانے میں سے وانزا ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں، تشریف لے آئیں۔ چاء پر ساتھ رہا۔ جب ہم دونوں باہر آئے تو زور صاحب نے کہا:

"بھئی، اولاد اور والدین میں کیا کیسا فرق دیکھا ہے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ یہاں ماں بیٹی کی بہ نسبت نوجوان نظر آتی ہے اور بیٹی ماں کی بہ نسبت بوڑھی!"

زور صاحب باغ و بہار انسان تھے۔ باتیں کرنے پر آتے تو محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ نہ بیجا طور پر کسی سے مرعوب ہوتے نہ مرعوب کرنے کی کوشش کرتے۔ تکبر، غرور اور خود پسندی انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ "انا ولا غیری" قسم کے لوگوں میں نہ تھے، ہر کسی سے برابر کا سلوک کر کے خوش ہوتے۔ پھولوں میں پھول اور کانٹوں میں کانٹا بن جاتے تھے۔

ان کے تصنیفی و تالیفی کام کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایسی بھرپور زندگی کیسے بسر کر لیتے تھے۔ حیدرآباد کی سوشل زندگی میں ان کا ایک خاص مقام تھا، جلسے جلوس، مشاعرے، عرس، تقریبیں، دعوتیں، ملاقاتیں، کمیٹیاں، کمیشن، ہر کام کے لئے ان کے پاس وقت تھا، اس پر بھی ان کی تصنیفی رفتار میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ان کے حیدرآباد کے دوستوں میں مشہور تھا کہ ان کی تازہ کتاب کسی نے پڑھی ہے کسی نے نہیں، کہ خبر ملتی ہے کہ ان کی ایک اور تصنیف طباعت کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ زور صاحب جب سو کر اٹھتے ہیں تو صبح تکیے کے نیچے سے نئی کتاب نکلتی ہے۔ زود نویسی اور بسیار نویسی نے انہیں تک کو نقصان پہنچایا، تو زور صاحب اس کے منفی اثرات سے کیسے بچ سکتے تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس سے چار گنا تعداد ان کے متفرق مضامین کی ہے۔ ان کی نگارشات کے موضوعات کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تنقید و تحقیق اور انشاء و افسانے سے لے کر صوبیات، دسانیات اور تذکرہ نگاری و تاریخ نویسی ہر چیز ان کی زد میں تھی۔ ان کی بعض تصانیف کو اوّلیات کا درجہ حاصل ہے اور بعض کو قبولِ عام کی سند بھی ملی۔ روحِ تنقید، ہندوستانی دسانیات، سیر گولکنڈہ اور اردو کے اسالیبِ بیان کے چار چار پانچ پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ یوں تو انھوں نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا، لیکن ان کے اصل کام کو بآسانی دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دکنیات اور دسانیات، دکنیات میں انھوں نے کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ۔ دیوانِ ولی اور دکنی ادب کی تاریخ ان کی ایسی تصانیف اور تالیفات ہیں جن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چونکہ انھوں نے یہ کام ایک نفسیاتی جوش اور ولولے سے شروع کیا تھا، کہیں کہیں علمی معروضیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اس کی مثالیں اردو شہ پارے پر محمود شیرانی کے اس تبصرے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو اورینٹیل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس کے باوجود نورؔ صاحب دکنیات کے امام تھے۔ اور اس سے متعلق انھوں نے ایسے بیش بہا مواد کا ڈھیر لگا دیا جس کی تاریخی و ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ لسانیات سے متعلق انھوں نے جتنا بھی کام کیا وہ زمانۂ لبید کی یادگار ہے۔ ہندوستانی صوتیات اور ہندوستانی لسانیات لندن اور پیرس میں لکھی گئیں، اور اردو کے اسالیب بیان کا بیشتر حصہ بھی وہیں مکمل ہوا۔ اول الذکر دو کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کا سہرا ابتدائے شباب کی لگن اور انہماک کے سر باندھیے یا یورپ و یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم کے گراں مایہ وسائل جو ایسے ملک جیسے بے مثل اساتذہ کی تربیت کے بہر حال یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ نورؔ صاحب کی ان کتابوں کا تحقیقی پایہ بلند ہے۔ یہ اردو میں لسانیات کی پہلی باقاعدہ کتابیں ہیں۔ اور تیس پینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی ان کی افادیت میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ آج بھی لسانیات پر کام کرنے والا کوئی بھی شخص ان کارناموں کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈاکٹر زورؔ نے یہ کام اس وقت کیا جب اردو کو عام طور پر بر صغیر کی بیٹی سمجھا جاتا تھا۔ زورؔ صاحب اور پروفیسر محمود شیرانی نے تقریباً ایک ساتھ تقابلی لسانیات کی راہ دکھائی اور اردو کی ابتدا کے بارے میں پنجابی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقی ژرف نگاہی اور وسعت مطالعہ اپنی جگہ خوب ہیں لیکن اردو کا رشتہ اب بھرنش اور پراکرتوں کے ذریعے سنسکرت سے ملانے اور ہند آریائی زبان کے ساڑھے تین ہزار سال کی تدریجی تاریخ سے اردو والوں کو روشناس کرانے کی سعادت ڈاکٹر زورؔ ہی کے حصے میں آئی۔ زمانہ نہایت تیزی سے بدل رہا ہے اور تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں۔ اردو کی ابتدا سے متعلق بھی تحقیق ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی ہے۔ گو ابھی تک ماہرین کسی نتیجے پر نہیں پہنچے لیکن اس میں شک نہیں کہ دکنی کی تشکیل کے سلسلے میں خطۂ پنجاب کی ابتدائی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تقابلی اور تاریخی لسانیات میں تو ہم پھر بھی کچھ نہ کچھ آگے بڑھے ہیں لیکن صوتیات میں ہنوز روز اول کا سا معاملہ ہے۔ تھوڑا بہت کام ہوا ہے اور کچھ ہو بھی رہا ہے، لیکن بنوط انداز میں ہم ابھی "ہندوستانی صوتیات" سے بہتر کتاب پیش نہیں کر سکے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں آج بھی اس سے کتاب حوالہ کا کام لیا جاتا ہے اور سنیتی کمار چیٹرجی جیسے ماہرین لسانیات اس سے استفادے کا اقرار کرتے ہیں۔

زورؔ صاحب اس لحاظ سے "تحفۂ روزگار" شخصیت کے مالک تھے کہ تصنیفی صلاحیت کے ساتھ ساتھ وہ بے پناہ تنظیمی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی اور اپنے لئے کام کا ایسا خاکہ بنا لیا جس میں وہ تمام عمر رنگ بھرتے رہے۔ یہ زورؔ صاحب کی بے لوث کوشش اور گہری لگن ہی کا نتیجہ ہے کہ تیس پینتیس سال کی قلیل مدت کے اندر اندر ادارے کے کتب خانے میں ۲۵ ہزار کتابیں اور ۵ ہزار مخطوطات جمع ہو چکے ہیں۔ دستاویزات، شجروں، چربوں، سکوں، فرامین، کتبوں، مہروں، وصلیوں، سندوں اور تصویروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ اردو ادب اور اردو والوں کی ثقافتی اور سماجی زندگی سے متعلق یہ اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ آج اس کی بدولت ادارۂ ادبیات کا شمار ہندوستان کے اہم ترین تحقیقی مرکزوں میں ہوتا ہے۔ ادارے کا ماہنامہ سب رس ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا تھا، ان پچیس سالوں میں ایک آدھ بار بند ہوا، لیکن ابھی تک جاری ہے، اور اب اردو کے اہم ترین ادبیوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو سے ہر سال اوسطاً دس کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں یعنی تیس سالوں میں تقریباً تین سو کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ مخطوطات و مطبوعات کے تذکروں کی بھی سات جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے زورؔ صاحب نے اپنی ساری توجہ، انھیں توضیحی تذکروں

معذول کر چکی تھی۔ ساہتیہ اکادمی سے جس کے وہ رکن بھی تھے، اس کام کے لئے مالی امداد مل رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ کم از کم بیس جلدوں میں ختم ہوگا۔ اردو کے مخطوطات ہندوستان کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بعض کتب خانوں میں بھی اہم ذخیرے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی توضیحی فہرستیں شائع نہیں کی گئیں، ان سے استفادے کا دائرہ محدود ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں علمی کاموں کے سلسلے میں سب سے پہلے توضیحی فہرستوں ہی پر توجہ کی جاتی ہے، تحقیق میں ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ زور صاحب نے ان فہرستوں کے ذریعے نہ صرف اردو کے بعض غیر معروف مخطوطات کا تعارف کرایا بلکہ ادارے سے استفادے کے امکانات کو بھی وسیع کر دیا۔ اردو میں ان توضیحی فہرستوں کی حیثیت بنیادی کتب حوالہ کی ہے۔ افسوس ہے یہ کام ادھورا ہی رہا۔ کشمیر کی پروفیسری سے اس میں تعطل پیدا ہوا تو موت نے اس نخلِ آرزو کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی۔

"ایوانِ اردو" کی تعمیر کو بھی زور صاحب کے کارناموں میں شمار کرنا چاہئے۔ اردو کے کاموں میں اپنوں کی بے التفاتی اور "غیروں" کی بے گانگی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر اماضہ حالات! جب عمارت کے لئے زمین حاصل کرنے کی سب کوششیں ناکام ہو گئیں تو بیگم زور نے آگے بڑھ کر یہ مشکل آسان کر دی۔ جس زمانے میں زور صاحب سے میرے تعلقات شروع ہوئے۔ تو نواب زین یار جنگ کے قائم کردہ فنڈ سے ایوانِ اردو کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا، لیکن رقم بہت جلد ختم ہو جانے سے عمارت ادھوری پڑی تھی۔ زور صاحب دہلی آئے تو ان کی بیقراری اور بے چینی دیکھنے کے لائق ہوتی۔ ارباب اقتدار کے دروازوں پر حاضری دینے ہی میں صبح سے شام ہو جاتی، کبھی کبھی تو دوپہر کا کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ کہا کرتے تھے ——— "میرا تعلق تصوف، عرفان کے خاندان سے ہے اور میں کبھی ناامید نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑے ہی نامواقف حالات میں ادارہ قائم کیا تھا تو اب کیسے جی چھوڑ دوں۔" ہندوستان میں ایسے کام کس قدر مشکل ہیں، اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس طرح کے کاموں سے واسطہ پڑا ہے۔ سیاست کی دنیا میں آج کچھ ہے تو کل کچھ اور۔ کبھی سر اکبر حیدری اور مرزا اسمٰعیل نے سرپرستی کی تو کبھی سالار جنگ اور صدر المہام فینانس غلام محمد نے۔ غرض ایک کے بعد ایک کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا، لیکن ڈاکٹر زور نے ہمت نہیں ہاری، گویا:

بہر یک گل منت صد خار می باید کشید

بالآخر مولانا آزاد، بخشی غلام محمد، گوپال ریڈی اور ہمایوں کبیر کی مدد سے وہ عمارت مکمل ہو ہی گئی جس کے ایک ایک پتھر سے ڈاکٹر زور کے صبر و استقلال اور عزم و ارادے کا درس لیا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۹ء میں انھوں نے ادارے ہی کی عمارت میں عارضی طور پر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس ادارے کے مقاصد نسبتاً زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ اس کی علمی سرگرمیوں میں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت، ہندی، مراٹھی اور تیلگو کو بھی شامل کرنے کی تجویز ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے چیرمن ہیں اور نواب مہدی نواز جنگ مجلس انتظامیہ کے صدر۔ ترجمان القرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تیلگو میں کیا جا رہا ہے۔ صحیفہ یادگار آزاد، اردو، ہندی اور تیلگو تین زبانوں میں مرتب ہو رہا ہے۔ دکنی زبان کی گرامر من سمجھاون، ثناء ترجمہ، فلسفۂ رادھا کرشنن اور بعض دوسرے اہم موضوعات پر کام جاری ہے۔ اشرام چندر اور کتاب الاتذکرہ شائع ہو چکی ہیں۔ کام کی اٹھان حوصلہ افزا ہے کہ آگے چل کر یہ انسٹی ٹیوٹ ہندوستانی زبانوں کے باہمی میل جول میں اہم حصہ لے گا۔

بخشی غلام محمد جب ایوان اردو کا افتتاح کرنے کے لئے حیدرآباد آئے تھے تو شاید اسی وقت انھوں نے ڈاکٹر زور کو کشمیر یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دی تھی۔ زور صاحب کی ملازمت کا آخری سال تھا۔ ایک مدت تک وہ اس شش و پنج میں رہے کہ سری نگر جائیں یا نہ جائیں۔ حیدرآباد سے انھیں لگاؤ تھا تو سری نگر میں خدمت زبان کے لئے امکانات تھے۔ بہرحال جذبۂ خدمت ان کی ذاتی محبت پر غالب آیا اور ۱۹۶۰ء میں

ریٹائر ہونے کے بعد فروری ۱۹۶۱ء میں وہ سری نگر چلے گئے۔ اپنے اس فیصلے کے حق میں زور صاحب جو دلائل لاتے تھے ان کا تذکرہ انھوں نے مکتوب کا فلمی کی یاد میں لکھے گئے مضمون میں کیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور سری نگر کی ادبی فضاؤں میں جلد ہی انھوں نے حرکت کے نئے آثار پیدا کر دیئے۔ آئندہ کام کے خاکے بنائے، تقریریں کیں، مضمون لکھے، لوگوں کو ابھارا اور نئے ادیبوں کی ہمت افزائی کی۔ دو قومی کتابیں ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ ادب کشمیر میں بھی شائع کیں۔ کشمیر لاکھ جنت نظیر سہی لیکن حیدر آباد تو نہیں۔ زور صاحب اس زمانے میں ہمیشہ فکر مند اور نا آسودہ نظر آئے۔ جب بھی ملے، از راہ مذاق انھوں نے یہ ضرور کہا:

"آپ بھی تو میری جلا وطنی کے حق میں تھے۔ اب تو خوش ہیں نا؟"

اس میں شک نہیں کہ کشمیر میں محنت و کوشش میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور انھیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن محرومِ اصل یہی تھی اور کشمیر نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ یونیورسٹی میں اردو لیکچرر کی ایک جگہ خالی ہوئی۔ سیاست کے عرش علی سے حکم نازل ہوا کہ فلاں شخص کا تقرر کیا جائے۔ زور صاحب نے صاف کہہ دیا یہ نہیں ہو سکتا۔ چند ہی روز بعد معلوم ہوا کہ انھیں صاحب کا اتخاذ ہو گیا اور زور صاحب کو اگرچہ شعبہ اردو فارسی کے صدر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے، رائٹر پوزیشن میں بلایا تک نہیں گیا۔ انھیں ریاستی سیاست سے اختلاف ہو سکتا تھا، لیکن ان کی اصل شکایت کشمیر کے موسم سے تھی، جو "مرغ سوختہ" کے حق میں مفید ہو تو ہو، اسّی سال کے اس شخص کے حق میں مضر ثابت ہوا جس کی زندگی کا بیشتر حصہ حیدر آباد کی معتدل آب و ہوا میں بسر ہوا تھا۔ بار بار کہا کرتے تھے ——— لندن کی سردی بھی دیکھی ہے اور پیرس کی بھی۔ لیکن ایسی سردی کہیں نہ دیکھی تھی۔ یہ جگہ چاروں طرف سے بند ہے اور جب ایک بار سردی در آتی ہے تو پھر جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔ فروری ۱۹۶۲ء میں سرائی چٹھیاں حیدر آباد گذارنے کے بعد جب وہ بارہ سری نگر پہنچے تو لکھا: لیجئے اس کر خوش ہو جائیے، دوبارہ برف دان میں بند ہو گیا ہوں۔"

یہی وہ زمانہ تھا جب انھیں اپنا مجموعۂ مضامین شائع کرنے کا خیال آیا۔ حیدر آباد سے آتے جاتے ہوئے قیام زیادہ تر نائب وزیر احمد محی الدین بھی کے ہاں رہا کرتا تھا۔ کہنے لگے، کشمیر میں تذکرۂ مخطوطات کا کام تو جاری رہ نہیں سکتا، ادھر ادھر کے کچھ مضامین جمع ہو گئے ہیں۔ ارادہ ہے کہ ایک مجموعہ شائع کر دیا جائے لیکن اس شرط پر کہ اس کی کتابت آپ دہلی میں کرائیں، جو بات دہلی کی کتابت و طباعت میں ہے وہ اور کہیں نہیں آ سکتی۔ میں نے حامی بھر لی۔ امید تھی کہ چھ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کام نمٹ جائے گا۔ لیکن کئی مہینے گذر گئے اور کام ابتدائی حالت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بعد میں انھوں نے مضامین کے انتخاب اور ترتیب کا فیصلہ بھی مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے کئی مضمون الگ کر دیئے، کچھ نئے حاصل کئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، زور صاحب کا تقاضا بھی شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ یہ بات مقدر ہو چکی ہے کہ مجموعہ ان کے انتقال کے بعد ہی ان کے باقیات کے طور پر شائع کیا جائے۔

گرمیوں کے زمانے میں زور صاحب سے ایک اور ملاقات بھی احمد محی الدین صاحب ہی کے ہاں ہوئی۔ شریف احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ شاید جولائی کا مہینہ تھا اور صبح کا وقت۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ خوب پانی پڑ رہا تھا۔ مہمان خانے میں زور صاحب کے ایک لکھنوی عزیز بھی تشریف فرما تھے۔ کسی زمانے میں نیشنلسٹ رہے تھے لیکن بعد میں تاجرانہ اغراض سے دھاکے منتقل ہو چکے تھے۔ چائے کا دور چلتا رہا۔ علم کو ضرور وہ جاہِ انسانی میں خیال کرتے تھے۔ خود تو شاعر نہیں تھے لیکن شعر کا اتنا عمدہ ذوق تھا کہ بات بات میں شعر پڑھتے تھے اور ایک سے ایک لاجواب۔ معلوم ہوتا تھا اساتذہ کے پورے پورے دیوان چاٹ گئے ہیں۔ جھوم جھوم کے کہتے تھے جیسے شعر سے علاقہ نہیں، وہ انسان ہی نہیں، یہ سعادت تو اشرف المخلوقات ہی کے حصے میں آئی ہے: بہت دیر تک ٹھک ٹھک کے شعر سناتے رہے اور بات

باتیں پیدا کر کے سماں باندھتے رہے۔ اس کے بعد زور صاحب نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی۔ کہنے لگے یہ چند شعر سفر ہی میں ہوئے ہیں۔ اجل شعر گوئی کا پرانا ذوق کبھی کبھی تازہ ہو جاتا ہے:

ہم اپنی گریۂ سوز دروں سے چیخ اٹھے — خوشا کہ مستیٔ فیض جنوں سے چیخ اٹھے
بہ نازِ طبعِ بلند و بہ زعمِ کم نگہی — زمانہ سازیٔ دنیائے دوں سے چیخ اٹھے
ذرا سی بات سے سارے جہاں پہ حوم ہوئی — چو کم سوادیٔ صبر و سکوں سے چیخ اٹھے
بہ پاسِ خاطرِ جاناں خموش بیٹھے تھے — مگر خرابیٔ بازیٔ خوں سے چیخ اٹھے

کہاں ہے وعدۂ پرویز و جلوۂ شیریں
عجب نہیں جو دلِ بے ستوں سے چیخ اٹھے

دو ڈھائی گھنٹے تک یہ لطف صحبت جاری رہا۔ اس کے بعد ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ ملازم نے کمرے میں تین بستر لگا دیئے تھے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے قہقہہ لگایا اور پان بناتے ہوئے کہنے لگے: اس نے شاید سوچا ہوگا کہ آپ بھی میرے ساتھ ہیں اور یہیں ٹھیریں گے۔ چند لمحے توقف کے بعد بولے: کفن پور کا طریقہ تو آپ نے نہ دیکھا ہوگا۔ پیر و مرید کا معاملہ تھا۔ پیر مُردوں کے کفن اتارنے میں ماہر تھا۔ کچھ پڑھتا مُردہ قبر سے نکل آتا اور کفن اتار کے دے دیتا۔ بڑی کوشش سے مرید نے بھی یہ ترکیب معلوم کر لی۔ کچھ دنوں بعد پیر کا انتقال ہو گیا۔ مرید قبرستان پہنچا، منتر پڑھا، مُردہ اٹھ کھڑا ہوا اور مرید کفن لے کر چلنے لگا۔ مردہ بھی پیچھے ہو لیا۔ وہ گھبرایا۔ سوچا مُردے کو واپس قبر میں داخل کرنے کی ترکیب تو سیکھی ہی نہیں، استاد سے پوچھنا چاہیے۔ چنانچہ استاد کی قبر پر آ کے وہی منتر پڑھا۔ استاد نے بھی قبر سے نکل کر اپنا کفن اتار دیا۔ اب وہ دوسرا منتر پوچھتا ہے تو مردہ بولتا ہی نہیں۔ غرض گھبرا کے بھاگا۔ پہلے ایک سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی، اب دو پیچھے ہو لئے۔ یک نہ شد دو شد۔ یہاں حالت اس سے بھی بُری ہے یعنی یک نہ شد سہ شد!

اس کے دو ماہ بعد پھر زور صاحب سے آخری ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کشمیر سے جی بھر گیا ہے۔ بچوں کے امتحانات کا منتظر ہوں۔ ڈسمبر میں ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ علی جواد صاحب زیدی کشمیر سے دامن چھڑانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ خواجہ غلام السیدین نے بھی استعفیٰ داخل کر دیا ہے، بس اب میری باری ہے۔ اس ملاقات کے پانچویں روز یعنی ۲۵ ستمبر کو مجھے سری نگر پہنچنا تھا۔ اسی روز صبح اطلاع ملی کہ دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے ڈاکٹر زور کا انتقال ہو گیا:

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شامِ اپنی سحر کر گیا

پہلے تو اس خبر کا یقین ہی نہ آیا۔ لیکن جب دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق ہو گئی تو سارا دن میں اس انتظار میں رہا کہ شاید لاش حیدر آباد لے جانے کے لئے دہلی لائی جائے۔ اس دن موسم سخت خراب تھا۔ نہ ادھر سے جہاز گیا نہ اُدھر سے آیا۔ دوسرے دن بھی یہی حالت رہی اور شام تک معلوم ہو گیا کہ انھیں وہیں سری نگر کے قبرستان خانیار شریف میں دفن کر دیا گیا۔ اس خبر سے اور بھی رنج ہوا۔ میں نے ریزرویشن منسوخ کرا دی، میرے لئے اب وہاں کیا رکھا تھا:

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

حیدرآباد کے دیوانوں میں محمد قلی کے بعد زور صاحب کا نام سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں بندۂ عشق تھے۔ محمد قلی نے جائز مستی سے محبت کی تو زور صاحب نے اس محبت کی یادگار سے محبت کی اور دونوں کو حیاتِ نو بخشی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ عجلت ان کی فطرت و طبع بن گئی تھی۔ تصنیفی کام میں بھی وہ جلدی کرتے تھے اور مرنے میں بھی انھوں نے جلدی کی۔ اچھے تن و توش کے انسان تھے۔ اس پر کھلا ہوا رنگ۔ بظاہر ان کی صحت پر اس عمر میں بھی رشک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن صحت نے چونکہ زندگی بھر خوب ساتھ دیا تھا، وہ اس کی طرف سے کچھ بے پروا سے ہو گئے تھے۔ اندر ہی اندر گھن لگنا شروع ہوا۔ ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ لیکن انھوں نے نہ تو کسی سے ذکر کیا نہ علاج ہی کیا۔ احتیاط اور پرہیز کی تو ہر شکر سے بھی پرہیز نہیں تھا۔ "شوقِ عناں گسیختہ" نے کبھی آرام کی مہلت نہ دی۔ بالآخر کام کی زیادتی رنگ لائی۔ ۱۹ ستمبر کو دہلی سے سری نگر واپس جاتے ہوئے انھیں وائی کاؤنٹ جہاز نہیں مل سکا، ڈکوٹے میں سوار ہو گئے۔ اس تیز رفتار ذریعہ سے تحفظ کا پورا انتظام نہیں ہوتا۔ ممکن ہے دل وہیں سے متاثر ہوا ہو۔ تین دن کے بعد رات کو شدید درد اٹھا۔ حالت قابو میں نہ رہی تو ہارفیا کا انجکشن دیا گیا۔ یہ گویا موت کی آمد کا اعلان تھا۔ جب جب ہوش میں آتے، کہتے "اب حیدرآباد چلیں گے" گویا

قید میں تھی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بہرحال ڈاکٹروں کی امکانی کوششوں کے باوجود دوسری رات تک وہ ابدی نیند سو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک تو بے وقت موت، اوپر سے وطن سے دور، اس پر اس المیے کی انتہا یہ ہے کہ لاش بھی حیدرآباد نہ لائی جا سکی۔ خاندانی قبرستان میں انھوں نے ایک شاندار گنبد دار خانقاہ تعمیر کرائی تھی، یہاں ہر سال ان کے والد کا عرس منایا جاتا تھا۔ زور صاحب بھی اسی قبرستان میں دفن ہونے کے آرزومند رہے لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ جس شہر کی خدمت میں انھوں نے پوری زندگی کھپا دی اور جس کے ایک ایک ذرّے کی وہ عمر بھر پرستش کرتے رہے۔ مگر اس کی خاک سے بھی ہزاروں میل دور رہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایک وسیع النظر نقاد، محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ہمارے ادب میں بلند مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو زبان کی خدمت جس وسیع پیمانہ پر کی اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ بالیقین اردو کے بعد اگر کسی ایسے شخص کا نام لیا جائے کہ جس نے عملی اور علمی دونوں محاذوں پر اردو زبان کے لئے معرکہ آرائی کی ہے تو بلاشبہہ ڈاکٹر زور ہی کا نام زبان پر آئے گا۔ انھوں نے اپنی متعدد تصانیف اور "ادارۂ ادبیات اردو" (دکن) کی صورت میں اردو دنیا کو بہت کچھ دیا۔ اس لئے اردو زبان کے ساتھ ڈاکٹر زور کا نام بھی زندہ رہے گا۔

——— (ہم قلم کراچی۔ اکتوبر نومبر ۱۹۶۲ء) ———

ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر زور مرحوم

زور صاحب کی "ذات" "ایک انجمن" تھی۔ وہ صرف ایک محقق، ماہر لسانیات، شاعر اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ ان میں غیر معمولی عملی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ علم اور عمل کا ایسا حیرت انگیز امتزاج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اُن کی تمام علمی اور عملی صلاحیتوں سے قطع نظر، دکھنی ادبیات کے تعلق سے لوگ انھیں یاد رکھیں گے۔ زور صاحب دکنی تہذیب، دکنی زبان اور دکنی ادب کے سب سے بڑے رسیا تھے۔ دکن کی ثقافت اور زبان و ادب کی انھوں نے والہانہ پرستش کی، اس کی روایات کے گن گائے اور اس انجمن کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی۔ اُردو سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور انھوں نے اس محبت کا حق ادا کر دیا۔ ایوان اردو زور صاحب کے لئے سنگ و خشت کی ایک خوب صورت عمارت ہی نہیں تھی، ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے تخیل کا رنگ محل، ان کی مشقتوں اور آرزوؤں کی جادو نگری اور ان کا "شہر آرزو" تھا۔ جب تک ادارۂ ادبیات اردو کی ایک کتاب اور ایوان اردو کی ایک اینٹ بھی باقی رہے گی، لوگوں کے دلوں سے زور صاحب کی یاد محو نہ ہو سکے گی۔ ادارے اور انسٹیٹوٹ کے کاروبار ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، سفر اور حضر میں ان کے خیال سے غافل ہونا زور صاحب کے لئے ناممکن تھا۔ ڈاکٹر زور کے بعض احباب ان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک رات یکایک طوفانی بارش شروع ہو گئی، زور صاحب چونک کر اٹھ بیٹھے، سب سے پہلے انھیں ایوان اردو کے دارالمطالعے کا خیال آیا (اس میں جالی لگی ہوئی ہے اور یہاں میزوں پر ہندو پاکستان کے تمام معیاری رسالے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں) اکثر زور سے ہوا چلے یا زیادہ بارش ہو تو پانی اندر بھی آجاتا ہے۔ اس خیال سے زور صاحب بے چین ہو گئے کہ کہیں تمام رسالے بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے کمرے کا سوئچ آن کیا لیکن روشنی ندارد تھی کیونکہ فیوز جل گیا تھا۔ بہ دقت تمام مکان کے کسی گوشے سے قندیل اٹھا لائے، اسے روشن کیا۔ اور بھیگتے ہوئے ایوان اردو پہنچے۔ چوکیدار کو بیدار کیا اور دونوں نے مل کر تمام رسالے محفوظ مقام پر پہنچا دیے اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ اس مشقت میں رات کا کتنا حصہ گزر گیا۔

زور صاحب نے نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے باہر نکالا۔ کتنے حسن کاروں کے ساتھ انصاف کیا، کتنے شاعروں کو تاج پہنائے، کتنے ادیبوں کو ان کا حق دلایا اور کتنی بھولی بسری یادوں کو صفحۂ قرطاس پر ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا۔ دکن کے ایک ایک ذرے سے انھیں پیار تھا۔ وہ اس سرزمین کی معمولی سی معمولی روایت کا بھی احترام کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کے سب ہی قدیم شاعروں اور ادیبوں کے فنی اکتسابات منظر عام پر آجائیں اور اس مقصد کی لگن میں انھوں نے تاریخ ادب اُردو کے ایک بڑے خلا کو پُر کر دیا۔ انھوں نے سختیاں جھیلتے اور راستے کی

صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اورنگ آباد، بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور حیدرآباد کے سینکڑوں مواضعات کا سفر کیا اور بہت سے بہرے جوش و خاشاک کے انبار میں دب گئے تھے ڈھونڈ نکالے۔ ایک سچے محقق کی طرح وہ تحقیق کے کسی گوشے کو ادھورا چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ شاعر کے حالات زندگی اور اس کے ادبی کارناموں کی تلاش کے علاوہ وہ انکی ابدی خوابگاہوں کو بھی ڈھونڈ نکالتے۔ ان پر روشنی کا انتظام کرواتے، لوح مزار نصب کرائی جاتی اور وہ ان کی تعمیر و ترمیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ دکن کے ایک شاعر فیض کے مزار کے متعلق انھوں نے مجھے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا تھا وہ کہتے تھے کہ میں نے بڑی تلاش اور تحقیق کے بعد لال دروازے کے اس گورستان کا پتہ چلایا جہاں فیض مدفون ہیں یہاں ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ قبریں انتہائی شکستہ حالت میں تھیں اور ہر طرف مٹی کے ڈھیر اور کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یہاں دریافت کرنے پر لوگوں نے فیض کی قبر کی نشان دہی کی۔ زور صاحب کہتے تھے یہ قبر دوسری قبروں کے مقابلے میں بہت صاف اور گرد و غبار سے پاک تھی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں فیض کے مزار کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔ غرض میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایت کرنے کے بعد گھر واپس آ گیا۔ مجھے بار بار یہی فکر ستاتی تھی۔ میں نے فیض کا دیوان اٹھا لیا، اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے دیوان کھولا۔ اب جو پہلے صفحے پر نظر کی تو یہ شعر لکھا تھا ؎

موجۂ بادِ بہارِ رحمستانِ بہشت
مشہدِ فیض پہ جاروب کشی کرتا ہے

اور اس شعر کو پڑھ کر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

جن لوگوں نے قدیم ادب پر تحقیقی کام کیا ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ قدیم دکنی مخطوطات کا پڑھنا اور سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ جن اسکالرز نے سالہا سال تک دکنی ادب پر کام کیا وہ بھی ان مخطوطات کے مطالعے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ کاغذ کی کہنگی، زبان کی اجنبیت اور خط کی قدامت اور خرابی کے باعث جگہ جگہ ناطقہ سر بگریباں ہو جاتا ہے۔ بعض کاتبوں کو مرکزوں اور شوشوں سے بغض ہوتا ہے، بعض کاتب کاغذ سے قلم اٹھانا جانتے ہی نہیں، جب صفحہ ختم ہوتا ہے اسی وقت وہ قلم اٹھاتے ہیں۔ اکثر نسخوں میں حروف ایک دوسرے میں اتنے گتھے ہوئے اور ایک لفظ دوسرے لفظ سے اتنا پیوستہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ دونوں سرا رئیے ایک پیراگراف یا ایک بند بھی پڑھا نہیں جا سکتا۔ زور صاحب میں مخطوطات کو پڑھنے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت تھی اور وہ نئے حاصل کئے ہوئے مخطوطے کو پہلی بار اس روانی، بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ پڑھ ڈالتے، جیسے ہم اخبار یا کوئی رسالہ پڑھتے ہیں۔ تقریباً چالیس سال سے انھیں دکنی مخطوطات پڑھنے کی مشق تھی۔ زور صاحب کہا کرتے تھے کہ زمانۂ طالب علمی میں ان کا پروگرام یہ ہوتا تھا کہ وہ اور پروفیسر سید محمد روزانہ شام میں حیدرآباد کی مختلف لائبریریوں میں بیٹھ کر مخطوطات کا مطالعہ کرتے تھے یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔

ایک دفعہ نواب عنایت جنگ بہادر نے ان کے پاس "من سمجھاون" کا ایک مخطوطہ بطور تحفہ روانہ کیا۔ اس مخطوطے کو آئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میں زور صاحب کے یہاں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا۔ ہماری

لائبریری کے لئے آج ایک بڑا نایاب اور کارآمد مخطوطہ آیا ہے اگر آپ اسے ایڈٹ کریں تو ایک اچھا کام ہو جائے گا۔"
اس کے بعد زور صاحب نے پہلے بند سے نظم سنانی شروع کی اور اس روانی سے دس پندرہ منٹ تک "من سمجھاون" سناتے رہے گویا وہ سلیس زبان میں خوش خط لکھی ہوئی کوئی کہانی پڑھ رہے ہوں۔ کمرے میں جو حضرات بیٹھے ہوئے تھے وہ دنگ رہ گئے۔

میں ایک عرصے تک اس موضوع پر کام کرتی رہی اور اس کے دوسرے نسخوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا لیکن ایک لفظ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کسی مخطوطے میں یہ لفظ حسرت، کسی میں جنتر اور کسی میں حیرت لکھا ہوا ملا اور ان الفاظ سے مصرعے کا مفہوم زیادہ میل نہیں کھاتا تھا۔ میں نے زور صاحب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا "یہ لفظ نہ تو حیرت ہے اور نہ جنتر اور حیرت بلکہ یہ تو دکنی لفظ "جترب" ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی عجیب و غریب بات کہی کہنے لگے "اس مخطوطے کا کاتب بوڑھا اور سن رسیدہ شخص معلوم ہوتا ہے" میں نے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیسے جانا" زور صاحب نے جواب دیا۔ بوڑھے کاتب اپنے ضعف اور رعشے کی وجہ سے اکثر شوشے بڑھا دیتے ہیں اور یہ کہ قلم کو نیچے اوپر حرکت دینے کی زحمت سے بچنے کے لئے اکثر لفظ میں جتنے نقطے ہوتے ہیں وہ صرف نیچے لگا دیتے ہیں۔ بعد میں یہ غور کر کے مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ اس مخطوطے میں اکثر و بیشتر جگہ ایسا ہی کیا گیا تھا۔ زور صاحب کا اندازہ صد فی صد صحیح تھا۔

دکنی ادب گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انھیں اس سے غیر معمولی محبت تھی اور وہ اس کی کسی کمزوری یا کوتاہی کو تسلیم کرنے کے لئے بڑی مشکل سے تیار ہوتے تھے۔ ان کا حافظہ بھی اس غضب کا تھا کہ انھیں وجہی۔ نصرتی۔ غواصی اور خاص طور پر محمد قلی قطب شاہ کے بلامبالغہ سینکڑوں شعر یاد تھے۔ شعر بہت سے لوگوں کو حفظ ہوتے ہیں لیکن نثر کے مسلسل کئی پیراگراف مخطوطات کے نمبر اور ان کی الماریاں یاد رکھنا غیر معمولی حافظہ رکھنے والوں ہی کا کام ہے۔ ایک دفعہ مجھے "گیان سروپ" کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی اور میں نے زور صاحب سے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے کہا اوپر کے برآمدے میں جو گاڈرج کی نئی الماریاں رکھی گئی ہیں ان میں کی آخری الماری کے تیسرے خانے میں سیدھے ہاتھ کی طرف یہ مخطوطہ ملے گا۔ دوسرے دن میں نے "گیان سروپ" اسی مقام سے نکالی جس کا پتہ زور صاحب نے بتایا تھا۔

علمی اور ادبی معاملات میں زور صاحب کے خیالات اپنے بعض احباب کے تصورات سے ہم آہنگ نہیں تھے، اور تصورات کے اس اختلاف نے ذرا گہرا رنگ بھی اختیار کر لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ زور صاحب جب ان حضرات کا ذکر کرتے تو ان کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو جاتا اور ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہو کر یکی زندگی کے حوالوں کا بھی احاطہ کر لیتا۔ لیکن زور صاحب نے اپنے قلم یا عمل سے کبھی کسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اور یہ بات ان کی عظمت کی شاہد ہے۔ انسان کی چھوٹی چھوٹی اور غیر مضرت رساں کمزوریوں میں بشریت کی شان نظر آتی ہے۔ آدمی کی حقیقی عظمت اس میں نہیں کہ وہ اوتاروں کی صف میں جا کھڑا ہو، انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ بشریت کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے بھی انسانیت کی سطح سے نیچے نہ آئے۔

زور صاحب کے طرز تکلم کا ایک خاص پہلو بھی ذکر کے قابل ہے۔ جن احباب اور خاص طور پر شاگردوں اور نیاز مندوں سے ان کی خاص راہ و رسم ہوئی اور جن پر زور صاحب کی جتنی زیادہ شفقت و مہربانی ہوتی وہ اُن سے اتنی ہی زیادہ

بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے۔ اپنے خلوص کے اظہار کا ان کے یہاں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اس شخص کی غلطی یا کبھی کبھی اپنی کسی غلط فہمی پر اس کی اچھی طرح تنبیہ کرتے تھے اور اگر وہ شخص ان کی باتوں کا بُرا مان لیتا تو انھیں دکھ ہوتا کہ ان کے خلوص کی قدر نہیں کی گئی اور ان کے شفقت کے جذبے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ یہ خلوص اور شفقت و نوازش کا پہلو ان کی حرکات و سکنات اور ان کی گفتگو میں ہر وقت نمایاں رہتا۔ اب خیال آتا ہے کہ ایسی میٹھی ڈانٹ کون سنائے گا ؎

تلخی اٹھائی موت کی چکھ کے خاک سب انکو چاٹ گئی
جن کی باتیں میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں (ظفر)

زور صاحب بڑے کشادہ قلب اور وسیع النظر شخص تھے۔ وہ صحیح معنی میں ایک "موحد" تھے جن کا کیش "ترک رسوم" تھا۔ تمام مذاہب کے پیروان کی نظر میں برابر تھے۔ یہ وسعتِ نظری اور روشن خیالی شاید انھیں اپنے مشائخ خاندان سے بھی ورثے میں ملی تھی کیونکہ صوفی کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے ؎

کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کی
آخرش دونوں کا سنگم ہو گیا (سراج اورنگ آبادی)

زور صاحب کے پیام تعزیت میں حیدر آباد کی ایک سربرآوردہ سیاسی شخصیت نے صحیح کہا تھا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ منا کر زور صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی تھی۔ زور صاحب ہر مذہب کی تقریبوں میں شریک ہوتے اور ان سے دلچسپی لیتے تھے۔ جو لوگ مذہب کی حقیقی روح کو پالیتے ہیں ان کے دل میں تنگ نظری اور تعصب کے جذبات کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور ان کا دل دوستی اور خلوص کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے ؎

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

زور صاحب کی شخصیت بڑی بارعب، متین اور پروقار تھی۔ اعلیٰ سماجی حیثیت اور سیاسی اقتدار رکھنے والے لوگ بھی ان سے برابر کی سطح پر ملتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں بڑی گونج اور آواز میں ایک خاص طرح کی گرج تھی۔ جو شخص ان سے ایک بار بھی مل لیتا وہ ان سے متاثر و مرعوب ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایوان اردو میں مشاعرہ تھا۔ ہال میں تیس چالیس لوگ جمع ہو چکے تھے ابھی شاعروں کی آمد میں دیر تھی۔ زور صاحب حسبِ تعیین کے عقبی دروازے سے داخل ہوئے اور اپنے مخصوص انداز میں اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔ نیچے بیٹھے ہوئے ایک بذلہ سنج نے برجستہ اپنے ساتھی سے کہا "اُدھر کیا دیکھتے ہو اِدھر دیکھو اسٹیج پر شیر اردو ٹہل رہا ہے۔"

زور صاحب بڑے محنتی، بڑے مخلص، بڑے صاحب نظر اور جوہر شناس آدمی تھے۔ ان کی خوبیاں یاد آتی ہیں تو موت سے یہ شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

سید محمد مورخ بیدری

ڈاکٹر زور مرحوم

(یہ مضمون انجمن ترقی اردو بورڈ مجسٹیک روڈ کراچی کے دفتر میں ۱۹ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ڈاکٹر زور مرحوم کے تعزیتی جلسے کے موقع پر جو سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صدیقی کے زیر صدارت ہوا تھا سنایا گیا تھا۔)

بقول حضرت حافظ علیہ الرحمۃ ؎ ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کے خاندانی حالات، علمی خدمات اور زبان اردو سے متعلق مرحوم کے ناقابل فراموش کارنامے تقلیدی حکمرانوں سے بے لوث محبت سے متعلق مرحوم نے جو شاہکار چھوڑے ہیں ان کو صراحت کے ساتھ لکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت چاہئے اور کافی محنت کا کام ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بڑی قابلیت اور استعداد والا ہی یہ کام انجام دے سکتا ہے مجھ جیسا بے بضاعت علم ڈاکٹر زور مرحوم کے کارناموں کو چند الفاظ میں محیط نہیں کر سکتا۔ چونکہ میں مرحوم کے معتقدین میں سے ہوں لہذا میں اپنا فرض سمجھ کر مختصر طور پر کچھ واقعات پیش کرتا ہوں:—

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد دکن کے محلہ شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ دکن کے مشہور تاریخی شہر قندھار شریف کے رفاعی اور قادری خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت سالار مسعود غازی سلطان مشکل آسان قدس سرہٗ معتقدین کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ دعوت اسلام کرتے ہوئے تغلقی دور میں دکن وارد ہوئے اور قندھار دکن میں آپ نے سکونت اختیار کی۔ سیکڑوں سال سے قندھار دکن میں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ حضرت کی اولاد کا سلسلہ دکن اور بیرون دکن میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے والد بزرگوار ابوالبرکات حافظ سید شاہ غلام محمد صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک باخدا۔ پاک باز۔ نیک دل اور صاحب تصرف صوفی تھے۔ وعظ و نصیحت اور عملی طریقوں سے مسلمانوں کے خیالات کو درست کرنے میں آپ نے اپنی عمر صرف کر دی۔ اس سلسلہ میں میرے سابقہ وطن شہر محبوب آباد بیدر دکن کا آپ نے کئی بار دورہ فرمایا تھا اور بیدر کے چھوٹے بڑے محلوں میں مہینوں آپ کا وعظ ہوتا رہتا جس میں میں خود بھی کئی مرتبہ . . . . . شریک رہا ہوں۔ دوران وعظ میں لفظ بابا آپ کا تکیہ کلام تھا اور عوام میں آپ بابا ل کے نام سے مشہور ہوئے۔ پیری مریدی کے تعلق سے آپ کے کئی معتقدین آج بھی بیدر شریف میں موجود ہیں۔ غرض حضرت ابوالبرکات حافظ سید شاہ غلام محمد صاحب قادری زندہ مشکل آسان ثانی کا شمار حیدرآباد دکن میں دور عثمانیہ کے ان بزرگان دین میں ہوتا ہے جو نسل اور علم دونوں اعتبار سے کامل شمار ہوتے ہیں۔ ایسے معرفت میں ڈوبے ہوئے پدر بزرگوار کے آغوش میں ڈاکٹر زور مرحوم کی ابتدائی مذہبی تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ دور حیدرآباد دکن کے سررشتہ امور مذہبی کے وزیر اعلیٰ آصف ساوس آصف سابع کے استاد و آتالیق مولانا حافظ محمد وقار اللہ خاں صاحب المخاطب نواب فضیلت جنگ بہادر مرحوم کی ہمشیر حضرت بشیر النساء بیگم صاحبہ مرحومہ کے دامن ماموری میں نشو و نما پائی تھی۔

ڈاکٹر زور مرحوم کے پرنانا حیدرآباد دکن کے فرمانروا نظام آباد میں بودھن کے خطیب تھے اپنے وقت کے مشہور عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ حیدرآباد کے امرا عظام میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے نانا منشی محمد وقار الدین صاحب بھی عالم فاضل ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے تذکرہ مخطوطات جلد چہارم میں آپ کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

اس علمی ماحول میں ڈاکٹر سید محی الدین زور مرحوم نے عقل اور سمجھ فہم و فراست کے میدان میں قدم رکھتے ہی خطہ دکن اور دکھنی زبان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انتہائی غور و فکر، تلاش و جستجو کے بعد اس کے تعلق سے ہمیشہ رنگا رنگ کے پیچیدہ مسئلوں کا حل مرحوم کے پیش نظر رہا۔ دکن، یہاں، اردو زبان۔ دکھنی مصنفین، مولفین، شعرا و صوفیائے کرام کی سیکڑوں سال کی پرانی پوسیدہ۔ کرم خوردہ۔ آپ پیشیدہ، سوختہ تصنیفات و تالیفات اور بلند پایہ بزرگوں کے خیالات اور ان کی زندگی کے راز سربستہ کو کھولنے کی مرحوم نے جو انتہائی کوششیں کیں ان کو اپنی تقریروں، تحریروں، تصنیفوں اور تذکروں غرض کسی نہ کسی صورت میں دنیا والوں کے سامنے پیش کرکے اپنی روشن خیالی کا جو ثبوت دیا ہے وہ مرحوم کا ناقابل فراموش شہ کار ہے جس سے اردو کے ادیب بے خبر نہیں ہیں۔ حیدرآباد اور لندن میں آپ کی طالب علمانہ زندگی بھی ایک شاہی زندگی رہی ہے میں یہ تفصیلات بھی ضرور تحریر میں لاتا مگر طوالت مضمون کے خیال سے اس کو ترک کرتا ہوں میرے پیش رو واجب الاحترام مقررین نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ البتہ مختصر طور پر عرض کروں گا کہ ڈاکٹر زور مرحوم کی شادی حیدرآباد دکن کے ممتاز اور رفیع الشان امیری خاندان میں نواب رفعت یار جنگ ثانی کی صاحبزادی محترمہ تہنیت النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب صاحب ۱۳۱۹ھ میں بیدر کے اول تعلقدار تھے آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد کا وطن عربستان تھا۔ ان میں لطف اللہ محمود اہل و عیال کے ساتھ ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان آئے۔ دہلی میں حکومت اغتشار کی جگہ ان وقت کی طرف سے ناگور کی قضا آپ کو عطا ہوئی۔ اسی سلسلہ کے حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ ہندوستان و پاکستان کے مشہور اولیائے کرام سے ہیں۔ حضرت الحاج تہنیت النسا بیگم صاحبہ کے جد اعلیٰ مولانا عبدالعزیز یمنی دکن کے اکثر مقامات کی سیر کرتے ہوئے بہمنی زمانہ کے دارالسلطنت شہر بیدر میں چند روز قیام فرما ہوئے تھے اس کے بعد صوبہ بیدر کے ضلع اندور حال نظام آباد میں اقامت گزیں ہوئے۔ غرض ڈاکٹر زور مرحوم کی رفیقہ حیات بھی خاندانی عظمت و تقدس ورثہ میں پایا ہے۔ بلاشبہ ہم یہ عرض کریں گے کہ ڈاکٹر زور مرحوم کو خاندان جدی و مادری سے ہی نہیں بلکہ مرحوم کی رفیقۂ حیات الحاج محترمہ تہنیت النسا بیگم کی طرف سے بھی سنہرے ادبی ذوق کی ورثہ میں لازوال دولت ملی تھی۔ ڈاکٹر تقدس جس ماحول میں نشو و نما پائی وہ ایک خاص اسلامی تہذیب و تمدن کا ماحول تھا۔ آپ کے دل و دماغ پر اسلامی تعلیم کا گہرا اثر تھا۔ تین سال مغربی دنیا میں گذارے لیکن ان میں مغربیت نہیں آئی۔ آپ کی شان دار شخصیت، مردانہ حسن اور جامہ زیبی حیدرآباد کی تہذیب و شائستگی کی واضح مثال تھی۔ آپ کا انداز نگاہ، علمی دنیا میں ایک تاریخی، ادبی اور سنجیدہ حیثیت رکھتا ہے۔

غرض ہندو پاکستان کے ادیب، مورخ اور محقق جن کے نام زبان اردو سے وابستہ ہیں۔ ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کا نام ادبی، تاریخی اور تحقیقی دنیا میں ہمیشہ درخشاں و تاباں رہے گا۔ دکن کی علمی اہمیت کو جس دیدہ دلیری و منہ زوری سے زور مجسم بن کر زور نے عوام کے سامنے پیش کیا اس کے بارے میں لکھنے والے کا قلم لکھتے لکھتے تھک جائے گا۔ لیکن زور مرحوم کی داستان علم ختم نہ ہوگی میرے قدیم کرم فرما ڈاکٹر زور کی اچانک اور بے وقت داغی مفارقت سے زبان اردو اور حیدرآباد دکن کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے اور میرے دل و دماغ پر جو صدمہ ہوا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ لیکن سب کے لئے یہ دن مقرر ہے۔ صبر و سکون سے کام لیتا ہوا اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قاضی عیاذ انصاری

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے ادبی ملاقات

تمہیدی نوٹ حیدرآباد میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے آپ ملاقات کو جائیے تو بیت آباد ریلوے اسٹیشن سے طیران گاہ جاتے ہوئے سوماجی گوڑہ کی پرسکون آبادی میں لب سڑک آپ کو نئی وضع کی ایک خوب صورت عمارت ایوان اردو کی نظر آئے گی۔ ادارۂ ادبیات اردو کا شاندار کتب خانہ ـــ اردو کے ماضی و حال اور مستقبل کا سارا ادب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مخطوطات کے اعلیٰ نمونوں۔ کتابوں۔ کتبوں اور نقشوں کا بے بہا خزانہ آپ کو اس ہال کے اطراف ملے گا۔ ایوان اردو۔ ادارہ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور۔ دراصل ایک ہی شخصیت کے یہ تین مختلف روپ ہیں۔ ایوان سے ملحق ہنیت منزل آپ کی جائے قیام ہے۔ یہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک تخت بچھا ہے۔ ضروری کاغذات اور کتابوں کے انبار میں سفید تن زیب کا کرتہ اور چوڑی مہری کا پاجامہ پہنے مسکراتے ڈاکٹر زور سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ سامنے پاندان رکھا ہوا۔ بار بار پان بناتے ہوں۔ خود کھاتے ہوں اور آپ کو کھلاتے ہوں تو آئے گا آپ کو ڈاکٹر زور سے باتیں کرنا ہے۔

سوال نمبر (۱) ہاں ڈاکٹر صاحب! آپ نے اپنی زندگی روح تنقید سے شروع کی اور شاعری سے زیادہ آپ کا تخلص مشہور ہے۔ شاعری۔ افسانہ نگاری اور تنقید جیسے تخلیقی کاموں کو چھوڑ کر آپ نے تحقیق جیسے خشک اور سنگلاخ زمین کی آبیاری میں اپنی زندگی گزار دی ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ ہم نے آرٹ کے ایک زبردست خلاق کو کھو کر یہ سب کچھ پایا ہو جو ہمارے سامنے ہے۔

جواب نمبر (۱) عیاذ صاحب! میں نے اسکول کے زمانے ہی سے شاعری شروع کر دی تھی جو کالج کے زمانے میں بھی جاری رہی۔ اس وقت حیدرآباد شعر و سخن کا مرکز تھا اور پورے ہندوستان کے اچھے اچھے شاعر مثلاً نظم طباطبائی۔ جوشش بلیخ آبادی۔ فانی بدایونی۔ صدق جائسی۔ ماہر القادری۔ نظام شاہ لبیب۔ جلیل مانک پوری۔ کیفی۔ عزیز۔ صفی۔ امجد۔ علی اختر اور ان کے والد باغ وغیرہ یہاں موجود تھے اور کثرت سے مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ حیدرآباد کے گلی کوچوں میں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص شاعر بن سکتا ہے۔ لیکن ادیب۔ نقاد اور محقق بننا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ ہمارے کالج کے استاد وحید الدین سلیم ہمیشہ اردو کی جدید ضرورتوں کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ اسی لیے میں نے بھی عام راستے سے ہٹ کر نئے کام کرنے اور اپنی مادر جامعہ کا نام روشن کرنے کی خاطر شاعری کی جگہ نثر اور اس میں بھی تنقید و تحقیق کی طرف بطور خاص توجہ کی۔ یوں تو کہنے کو میں نے افسانے بھی لکھے ہیں جن کے دو مجموعے "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" چھپ چکے ہیں۔ اسی طرح میرا کلام بھی اتنا موجود ہے کہ ایک اچھا خاصا دیوان چھپ سکتا ہے۔ مگر دوسرے کاموں کے مقابلے میں اس کو میں

اہم نہیں سمجھتا۔

سوال نمبر (۲) جامعہ عثمانیہ کے آپ ایک مایۂ ناز فرزند ہیں۔ اس کی تعمیر و ترقی کو آپ نے محسوس شکل میں دیکھا ہے۔ پہلی منزل کی پرانی عمارت سے وہ یکایک آج کے آرٹس کالج کی حسین و عظیم عمارت میں منتقل ہوگئی۔ ذرا تکلیف کیجئے۔ میں اس فردوس گوش کہانی کے سُننے کا مہیا رکھتا ہوں۔

جواب نمبر (۲) ہم جب کالج میں پڑھتے تھے تو جامعہ عثمانیہ کی مختلف جماعتیں توپ کے سانچے کے ان متعدد چھوٹے بڑے مکانوں میں ہوا کرتی تھیں جن میں سے اکثر اب بڑی بڑی دوکانوں اور اسٹیٹ بنک کی عالی شان عمارت کی شکل میں منتقل ہو چکی ہیں۔

جامعہ کے اساتذہ اور دارالترجمہ کے ارکان اس محلے کے اطراف مختلف مکانوں میں قیام پذیر تھے۔ مولانا وحیدالدین سلیم۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ مولوی عبدالمجید۔ الیاس برنی۔ مولوی عنایت اللہ۔ جمیل الرحمٰن۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مسٹر اسپیٹ۔ مسٹر ولنکر اور ڈاکٹر لطیف وغیرہ سے ان کی قیام گاہوں پر آسانی سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اور اوقات تعلیم کے بعد ہم اور ہمارے اکثر ساتھی اپنے اپنے اساتذہ کے یہاں شام تک حاضر رہا کرتے۔

جامعہ سے سر اکبر حیدری کی گہری دلچسپی مولوی عبدالحق کی کوششیں۔ ناظم تعلیمات سر راس مسعود کے لطیفے اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے علم و فضل کے قصّے اور جامعہ کے لیے اپنی ایک عمارت بنانے اور اس کے محل وقوع کے بارے میں نئی نئی خبریں سُننے میں آتیں۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کو علمی و ادبی کاموں کے نئے نئے خاکے بتاتے اور بعض نیاز مند قسم کے شاگردوں سے جو اندرون شہر مقیم تھے اپنی اپنی پسند اور ضرورت کی اشیا طلب کیا کرتے تھے۔ اور شہر کی علمی و ادبی چہل پہل اور سماجی مصروفیتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ مخلصانہ فضا اسی روز ختم ہوگئی۔ جس روز کہ کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ آرٹس کالج کی حسین و عظیم عمارت میں منتقل ہوگیا۔ اس کے بعد سے جامعہ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا اور اب تو بقول تیسرا دور چل رہا ہے۔

سوال نمبر (۳) جدید حیدرآباد کی ذہنی تعمیر میں بے شک جامعہ عثمانیہ کا بڑا حصّہ ہے۔ لیکن میں تو آپ کو بھی حیدرآباد کی ذہنی تعمیر کا ایک بڑا معمار سمجھتا ہوں۔ زمانہ آپ کا بڑا سازگار رہا۔ اس دَور کے اپنے کچھ ہم عصروں کا ذکر کرنا مناسب تصور فرمائیں گے آپ؟

جواب نمبر (۳) چونکہ جامعہ کے اساتذہ مختلف مقامات مثلاً پنجاب۔ دہلی۔ لکھنو۔ بہار۔ مدراس اور بنگال سے آئے تھے اس لیے حیدرآبادی طلبا میں ان کے میل جول سے وسعت نظر پیدا ہونے لگی اور سوچنے سمجھنے اور بات کرنے کے نئے سانچے ملنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت حیدرآباد کی نوجوان نسلوں کی جس خوبی سے ذہنی تعمیر ہوئی تھی اور جس قدر جلد حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا بدلی ہے اس کا موجودہ نسلیں اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ میں خود بھی اسی فضا کا آفریدہ و پروردہ ہوں اور میری اور میرے ساتھیوں کی یہ کوشش رہی کہ یہ فضا حیدرآباد کی گلی گلی کو متاثر کرے اور یہاں کے رہنے بسنے والوں میں وہ خود اعتمادی پیدا ہو سکے جس کی بنا پر وہ کل ہند نوعیت کے شاعر۔ افسانہ نگار۔ نقاد اور محقق بن سکیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر مقبول علی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ حسن الدین۔ ڈاکٹر سید حسین۔ ڈاکٹر ولی الدین۔

ضیاء الدین انصاری اور اکبر وفاقانی وہ ابتدائی ترز نداں جامعہ ہیں جنھوں نے اس کام میں اپنی اپنی حد تک بہت جد وجہد کی۔ کالج سے باہر نواب عالی رفاعی۔ نواب عنایت جنگ بہادر۔ مولوی خورشید علی مرحوم۔ مولوی سید محمد اعظم۔ صفی اورنگ آبادی۔ سالار جنگ مرحوم۔ اور عزیز یار جنگ مرحوم میرے وہ مشفق احباب تھے۔ جنھوں نے میری اس تعمیر کاری میں بڑی مدد کی۔ اور میرے ماحول کو سازگار بنایا۔

سوال نمبر (۴) معاف کیجئے۔ ایک بات میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے۔ اگر وہ صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ قدامت پسندی میں جو تضاد ہے اس میں آپ کی حیثیت میں پوری طرح متعین نہیں کر سکا اور لطف یہ ہے کہ ہر دو دبستانِ خیال آپ کو اپنے ضمیر کی آواز سمجھتے رہے ہیں۔ ذرا کچھ تفصیل طلب ہے یہ بات۔ کیا کوئی نیا تصور آپ نے اپنی آستین میں چھپا رکھا ہے جس کا سہارا لے کر آپ اس تضاد سے بچ نکلتے ہیں۔

جواب نمبر (۴) یہ مسئلہ اتنا نازک نہیں ہے۔ میری نظر میں ہر زمانے میں یہ دونوں گروہ موجود رہے ہیں۔ موجودہ ترقی پسندی اگرچہ سیاست سے زیادہ متاثر ہے مگر ہر دور میں بعض شاعروں نے اپنے زمانے کی سیاست اس سرکار دربار کے رجحان کو اپنے کلام میں پیش نظر رکھا ہے۔ بلکہ بادشاہوں اور صاحبانِ اقتدار اور خاص خاص مذہب و مسلک کی جا و بے جا مدح سرائی اور پروپگنڈا بھی کیا ہے مگر ایسے شاعروں اور ان کی شاعری کی آج جو قدر و قیمت ہے وہ معلوم۔

جو شعرا آج کل کمیونزم کے نظریوں کے مطابق نظمیں لکھ رہے ہیں ان کو میں انہی خاص خاص قدیم شعرا کی صف میں شمار کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ان کی قدر ان کے موضوع سے زیادہ ان کے کلام کی عمدہ خصوصیات اور شعر و سخن کے اصلی معیار کے مطابق ہوگی اور آئندہ باقی رہے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کی وجہ سے اردو میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ اور ایسا تنوع پیدا ہو رہا ہے جس پر زندگی اور شگفتگی کا انحصار ہے۔ غرض شاید میں اپنے خاندانی یا موروثی مزاج کے مطابق دونوں میں خوبیاں دیکھتا ہوں۔ رواداری اور مرنج و مرنجان طرز زندگی میرے حصے میں آئی ہے غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں پیرس میں دو سال بہت ہی اعلیٰ پایہ کے کمیونسٹ احباب کے ساتھ رہا ہوں اور اب بھی سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند ادیبوں کا شمار میرے مخصوص دوستوں میں ہے۔

میں تمام کی قدر و قیمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ کس گروہ یا کس مذہب و مسلک کے ادیب و شاعر کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمر ہے۔ اگر آپ اس کو کوئی نیا تصور سمجھتے ہیں جس کو میں نے اپنی آستین میں چھپا رکھا ہے تو اور بات ہے مگر میری نظر میں تو یہ ایک بہت ہی پرانا نسخہ ہے اور صدیوں کا آزمایا ہوا۔

سوال نمبر (۵) آپ کی زندگی میں "سب رس" اور ادارہ ادبیات اردو ایسے گھل مل گئے ہیں کہ بقول شخصے آپ کی شخصیت اب خود ایک ادارہ بن گئی ہے۔ آپ کی کامیابیاں اور کامرانیاں مسلّم۔ میں جانتا ہوں زندگی کے ہر مرحلے پر آپ کامیاب اور سرخرو ہی میں آپ کی فتح ہوئی۔ ایسے حالات میں زندگی کا فلسفہ کچھ رجائی سا بن جاتا ہے۔ اردو کو اب سرفروشی کی ضرورت ہے۔ وہ چنگاری جسے ہم روکتے ہیں کہیں راکھ کے تلے تو نہیں دب گئی ہے۔ آپ اپنی زندگی میں اب کچھ ٹھہراؤ تو نہیں محسوس کرتے۔ میرا مطلب ہے مستقبل قریب کا۔ زور اب کیا سوچ رہا ہے۔

جواب نمبر (۵) ادارہ ادبیاتِ اردو اور اس کی عمارت "ایوان اردو" میرے ابتدائی خوابوں کی تعبیر ہے۔ لیکن تقسیم اور انقلاب

حیدر آباد کے بعد اُردو والوں کی ضروریات اور حالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور میدان بدل گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر از سرِ نو جد و جہد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

میں اپنی زندگی میں ٹھیراؤ کیوں کر محسوس کر سکتا ہوں جبکہ طوفان اور ہنگامہ آرائی کے آثار نمایاں ہیں۔ کام کرنے کا تو یہی اصل وقت ہے۔ مگر اہلِ اُردو کی خستہ حالی دیکھ کر بعض اوقات شُبہ ہونے لگتا ہے کہ اب پہلی جیسی فتح مندی نصیب بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا تعلق تصوّف و عرفان کے خاندان سے ہے اور میں کبھی نا امید نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑے ہی ناموافق ماحول میں ادارہ قایم کیا تھا۔ اور ہر مخالفت اور اختلاف سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ میں اس وقت زیادہ کام کرتا ہوں جب کسی کی ذات اور کوششوں کو سدِّ راہ پاتا ہوں۔ مگر اب مجھے کوئی مخالف نظر نہیں آتا۔ اس لیے اندیشہ ہے تو یہی ہے کہ کہیں یہ چنگاری تعریف و تحسین کی راکھ میں نہ دب جائے۔

سوال نمبر (۶) آپ کو اپنی تصانیف میں سے کون سی سب سے زیادہ عزیز ہے؟

جواب نمبر (۶) مجھے اپنی کتابوں میں سیر گولکنڈہ اور داستانِ ادب حیدر آباد زیادہ پسند ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ کبھی فرصت ملے تو موخرالذکر داستان کو اور شرح و بسط سے بیان کروں۔

سوال نمبر (۷) دن رات کے اوقات میں لکھنے پڑھنے کو کس قدر دخل حاصل رہا؟

جواب نمبر (۷) دن رات میں لکھنے پڑھنے کے سوا کسی اور معاملے کو کبھی دخل ہی نہیں رہا اور اس کے لیے میں اپنی بیوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے سارے گھر بلکہ کاروبار سے مجھے آج تک بے نیاز رکھا ہے نہ صرف یہی بلکہ میرے علمی و ادبی کاموں میں بھی انھوں نے میرا دُور دُور تک ہاتھ بٹایا ہے۔

سوال نمبر (۸) اپنی ادبی مصروفیات کے ساتھ حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی سماجی زندگی کا آپ نے کس طرح ساتھ دیا ہوگا؟

جواب نمبر (۸) حیدر آباد کی سماجی زندگی کے صرف اسی پہلو میں مجھے دلچسپی نظر آئی جو میری ادبی مصروفیات کا معاون ہو سکتا تھا اور اسی لیے میں دعوتوں اور تقریبوں میں بہت ہی کم شریک ہوتا رہا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے بہت سے احباب اور اعزا کو مایوس بلکہ ناخوش کیا مگر ان سبھوں نے میرے ادبی کاموں اور مصروفیتوں کے پیشِ نظر غالباً مجھے معاف بھی کر دیا۔ اس معاملے میں مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کہ باہمہ اور بے ہمہ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ میں برت سکا اور خاموشی کے ساتھ وہ بُرا یا بھلا کر سکا جس کے آپ معترف نظر آتے ہیں۔

سوال نمبر (۹) کیا پُرانے شاہی دور کے مقابلے میں ہندوستان کی جمہوری زندگی آپ کے لیے پوری طرح سازگار ہے۔ اور ہے تو آپ کی آئندہ کیا توقعات ہیں؟

جواب نمبر (۹) پُرانے شاہی دَور کو میں نے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا نہ اس دَور کی خصوصیات میرے اپنے لیے مفید ہو سکیں۔ جمہوری زندگی ظاہر ہے کہ زیادہ خوش گوار ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں جمہوری ہو۔ ہمارا ملک ابھی تک ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اور افراتفری اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اُردو کے لیے ابھی سازگار فضا پیدا نہیں ہوئی ہے اور جو کچھ حالات موجود ہیں ان سے اہلِ اُردو فائدہ اُٹھانے کے

موقف میں ابھی نہیں آئے ہیں۔

سوال نمبر (۱۰) اُردو کے مستقبل کے متعلق تو مجھے معلوم ہے کہ آپ کچھ زیادہ مایوس نہیں ہیں لیکن حیدرآباد کو اُردو کے تعلق سے جو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کے تسلسل کو آپ قایم رکھ سکیں گے یا نہیں؟

جواب نمبر (۱۰) اُردو کا مستقبل ابھی تک مایوس کن نہیں ہے۔ حیدرآباد کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ اب بھی باقی ہے۔ مگر یہ تسلسل قایم رہ سکے گا یا نہیں۔ اس کے بارے میں صحیح رائے قایم کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ جب تک قدیم نسل کے افراد موجود ہیں کوشش کرتے رہیں گے۔ جدید نسل اس کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ ابھی نقش اُبھر رہے ہیں مگر ناتمام ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے جس خونِ جگر کی ضرورت ہے وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بہا ہی نہیں اور اگر بہ بھی رہا ہے تو دوسری اقتصادی اور سماجی ضرورتوں کی تکمیں ہی کے لیے کافی نہیں ہو رہا ہے۔

"سید محی الدین قادری زورؔ عرف عام تھا۔ لیکن ہم لوگ انھیں زورؔ صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ حال ہی میں واصلِ جنت ہونے والی یہ پُرخلوص شخصیت جنت نظیر کشمیر کی سرزمین میں انتقال فرما گئی۔ ان کے اوصاف کو کہاں تک گنایا جائے، اُن کی علمی خدمات کو کہاں تک بیان کیا جائے اور ان کے شخصی محاسن کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ آواز میں وقار، صورت میں ایک وجاہت اور سیرت میں ایک دلکشی لیے ہوئے زورؔ صاحب جس محفل میں جاتے اس پر چھا جاتے۔ بڑے صاحبِ علم انسان تھے۔ ۱۹۲۲ء سے اب تک اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی تحقیق و تنقید کا معیار بعض اہلِ نظر کی نظر میں مستند نہیں تھا لیکن ان کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہم انھیں اُردو کا ایک بہت بڑا محسن سمجھتے ہیں۔

وہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے بانیوں میں سے تھے یہ حقیقت ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور زورؔ صاحب دو علحدہ چیزیں نہیں تھیں۔ ادارہ اگر جسم تھا تو زورؔ صاحب جان۔ اس ادارے کا مفید کام اور حیدرآباد میں ایوانِ اُردو کی تعمیر دو ایسے کارنامے ہیں جن سے ان کا نام محسنانِ اُردو کی صفِ اول میں لکھا جائے گا۔

زورؔ صاحب نہایت مخلص، صاف باطن اور بے باک انسان تھے۔ انھیں کسی کی بُرائی کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ درس و تدریس کے سلسلے میں ان سے متعلق ہوئے یہ ہمیشہ اُن کی ترقی درجات کے خواہاں رہے۔ وہ حیدرآباد کی ثقافتی زندگی کی جان تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی علمی سرگرمیوں کی ایک زمانے میں رُوحِ رواں رہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی سلور جوبلی منائی، امجد حیدرآبادی کی جوبلی کا جشن منعقد کیا اور اب ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ مناتے تھے۔ افسوس یہ عظیم شخصیت ہم میں موجود نہیں ع

اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پہ تیر کون"

(ماہنامہ آجکل دہلی۔ نومبر ۱۹۶۲ء)

احمد جمال پاشا

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

(قلمی چہروں کے زیر ترتیب مجموعے "آئینے" کی ایک جھلک)

اُن کی آمد کی خوشبو پاتے ہی پہچان گیا، مگر ڈرتے ڈرتے اطلاع کرائی اس کی ایک معقول وجہ یہ بھی تھی کہ اس زبردست شخصیت سے ملنے آیا تھا جس کی علمیت اور قابلیت کی یورپ کے علمی و ادبی حلقوں میں دھوم تھی جو جامعہ عثمانیہ میں پرنسپل، پروفیسر اور کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر، ساہتیہ اکیڈمی کے مشیر خصوصی، مجلۂ عثمانیہ، سب رس اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے بانی، روحِ تنقید، اردو شہ پارے، ہندستانی لسانیات اور ہندستانی صوتیات جیسی گرانقدر تصنیفات کے علاوہ کئی سو کتب و رسائل کے خالق، صوتیات، لسانیات، تنقید، تحقیق، مضمون نگاری افسانہ نگاری اور شاعری پر بیک وقت قادر، اس کے بعد بھی اتنا عظیم ادیب اگر صحت میں مجنوں گورکھپوری اور وقار عظیم، مزاج میں چکبستی اور ابوالکلام آزاد سے بہت آگے نہ ہو تب بھی اس میں کیا شک ہے کہ ان کے سر کے بال غائب ہوں گے، دوسروں کو نظر انداز کرنے والی یہ عینک چڑھائے ساتویں آسمان پر بیٹھے کھٹا کھٹ سقراط اور بقراط کی روحیں قبض کر رہے ہوں گے، دیکھتے ہی عالمی ادب کا سارا بخار مجھ پر اتار دیں گے کیا عجب کہ سرے سے ملنے ہی سے انکار کر دیں ابھی یہ سب الٹا سیدھا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک طلبی ہو گئی۔

آئینہ الکرسی پڑھتا ہوا داخل ہوا، ایک نہایت خوش پوشاک، خوش اندام، خوش شکل و خوش مزاج سے صاحب سے بزرگ جو ہر گز اتنے بزرگ نہیں معلوم ہوتے جتنا کہ ان کو ہونا چاہیئے تھا اور جو مشرقی ادب اور تہذیب کے جامے میں مارے اخلاق کے بچھے جا رہے تھے لپک کر مجھ سے بغل گیر ہوئے میں نے اپنا تعارف کرانا چاہا تو بولے "آپ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، ملاقات کا مجھے بھی اشتیاق تھا" بخیر و عافیت کے تبادلے کے بعد پوچھا

"آپ کے لئے کیا منگائیں چائے یا کافی؟" میں نے عرض کیا۔

"دونوں" ——— بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

پان کھانے اور کھلانے کے شغلے کے ساتھ ساتھ مختلف خشک و تر موضوعات پر انتہائی دلچسپ گفتگو کرتے رہے۔ ان کی ذہانت، برجستگی، علم و اخلاق سے میں بے حد متاثر ہوا۔

دوسرے دن ایک ادبی نشست میں پھر ملاقات ہو گئی، اس وقت زور صاحب نہایت ہی اعلیٰ وجہ کے سوٹ میں بالکل انگریز معلوم ہو رہے تھے، مگر اس لباسِ مغربی کے باوجود پہلے سے بھی زیادہ گرمجوشی، تپاک، اخلاق اور انکساری سے ملے۔

یہ زور صاحب سے میری آخری ملاقات تھی، آج زور صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کے کارنامے اور یادیں میرے دل میں اسی طرح تازہ ہے ان کی باتوں میں جو پھولوں کی خوشبو تھی اس کی مہک سے آج بھی دماغ اسی طرح معطر ہے۔

یوسف ناظم

ڈاکٹر زور صاحب

ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کا جب بھی خیال آتا ہے تو آج سے ۲۳ سال پہلے کے زور صاحب نظروں میں گھوم جاتے ہیں۔ ضخیم جسم، دبیز چہرہ، لمبے بال، چوخانہ کی دھیلی ڈھالی شیروانی، شیروانی کے جیبوں میں پان کے بیڑے۔

یہ تھے زور صاحب مرحوم جو جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے ایک چیمبر میں اردو کے درس دیا کرتے تھے۔ بی۔ اے کی حد تک تو اساتذہ کو کلاس روم میں آ کر لکچر دینا پڑتا تھا لیکن ام۔ اے کے طالب علم اساتذہ کے چیمبر ہی میں ام۔ اے کی ڈگری حاصل کر لیتے تھے۔ اُس زمانہ میں اردو کے طالب علموں پر اردو ادب سے دلچسپی یا رغبت لازمی نہ تھی، صرف کسی ایک استاد سے وابستگی ضروری تھی کیونکہ اس عہد زریں میں شعبۂ اردو اور دارالمؤلفین خارجہ کا دفتر تھا۔ یہ بات غالباً کہنے کی نہیں ہے اس لئے اسے یہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ ام۔ اے کرنے کا زمانہ واقعی بڑے مزے کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ عمر بھر ام۔ اے ہی کرتے رہئے۔ ام۔ اے کرنے کے دو بڑے فائدے جو ہمیں نظر آئے یہ تھے کہ اس میں تو طالب علم کا وقت ضائع ہوتا ہے اور نہ اُستاد کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ طالب علم غیب سے ام۔ اے ہو جایا کرتا ہے۔ ہم جب ام۔ اے کر رہے تھے تو دو اور ساتھی بھی یہی شوق پورا کر رہے تھے۔ ایک تھے محمد علی نیّر اور دوسرے تھے خواجہ حمید الدین شاہد۔ ہم تینوں مقالہ لکھا کرتے اور ام۔ اے کی ڈگری پر نشانہ لگایا کرتے۔ ڈاکٹر زور ہمیں اردو نثر کے درس دیا کرتے تھے۔ بی۔ اے کی جماعتوں میں ڈاکٹر زور سے اتنا قرب حاصل نہ ہوا تھا جتنا کہ بعد میں ہوا۔ ایک کمرہ میں تین طالب علم اور ایک استاد۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری نشستیں بھی مقرر ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر زور صاحب کی داہنی سمت محمد علی نیّر، مجلہ عثمانیہ کے مسودے لے کر بیٹھتے تھے تو مرحوم کی بائیں سمت حمید الدین شاہد سب رس کا پلندہ سنبھال کر متمکن ہوا کرتے تھے۔ میں عام طور پر زور صاحب کے بالمقابل بیٹھا کرتا تھا۔ میں غریب نہ مدیر نہ معاون مدیر۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب مجھ سے بڑے خفا رہا کرتے تھے۔ میں کرتا بھی تو کیا۔ اُس زمانہ میں جملہ دو ہی پرچے تو تھے ایک پر سورج کی کرنیں بکھری ہوئی تھیں تو دوسرے پر شہد کی چاشنی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم مجبوراً مجھ سے ٹیوٹوریل لکھوایا کرتے اور اس دوران میں مجلہ اور سب رس پر غازہ اور پاؤڈر چڑھتا رہتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور نہایت غیر محسوس طریقہ پر درس دیا کرتے تھے۔ ایک طالب علم اُن کی عظمت اور بڑائی کا اندازہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اردو ادب اور اردو زبان کے خدمت گزاروں میں اُن کی حیثیت کو متعین کرنا کسی طالب علم کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام ایک ان دیکھی طاقت کرتی ہے جسے زمانہ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی حیثیت زمانہ ہی متعین کرے گا۔ اگر میں اُنہیں حیدر آباد کا مولوی عبدالحق کہوں تو قطعی مبالغہ نہ ہوگا۔ دکھنی زبان اور محمد قلی قطب شاہ

سے ڈاکٹر زور کی محبت اور عقیدت کو بہتوں نے عصبیت پر محمول کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر زور دامن بچا لیتے تو دکھنی ادب کا بڑا خسارہ عدم کی گود میں سویا پڑا رہتا۔ دکھنی ادب کے محقق کی حیثیت سے زور مرحوم اس کے تنہا وارث ہیں۔ یہ ایسی سنگلاخ زمین تھی جس پر چلنا ہر کسی کا کام نہ تھا۔ ہم نے تو بہتوں کو دیکھا ہے کہ وہ قلی قطب شاہ کا ایک شعر بھی ٹھیک سے پڑھ نہیں سکتے تھے۔ خود ہمارا بھی انہی لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے شعر کو وزن کے ساتھ پڑھنے میں خود قاری کا بیلنس آؤٹ ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ زور صاحب نے اس باب میں تحقیق و جستجو کا بڑا اٹھایا اور وہ کما حقہ اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ کوئی اور دبلا پتلا آدمی ہوتا تو چیں بول جاتا۔ ہمالیہ پہاڑ پر چڑھنے اور دکھنی ادب پر قلم اٹھانے میں کوئی خاص فرق نہیں۔ قلی قطب شاہ کا دیوان شائع کر کے زور صاحب نے درحقیقت ایک شکر محل کھڑا کر دیا۔ اگر بودھن کی شکر فیکٹری ریاست حیدرآباد میں قائم نہ ہوتی تب بھی حیدرآباد کی شیرینی اور مٹھاس میں کمی واقع نہ ہوتی۔ قلی قطب شاہ کے نام کے ساتھ اب ڈاکٹر زور کا نام پیوست ہو کر رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کی خدمت میں اپنی عمر صرف کی وہ ابتدائے عمر ہی سے اس راہ پر بھٹک گئے تھے ورنہ حیدرآباد کی سرزمین پر عرق ریزی اور محنت کا کام کرنے والوں کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہیں۔ ڈاکٹر زور کو اپنے گھر کی طرف سے مرشد بننے کا حق تھا تو سسرال کے تعلق سے نواب بننے کا۔ لیکن پتہ نہیں زور صاحب کیسے اردو کی خدمت گزار بن گئے اور عشق کی طرح خدمت گزاری کا رستہ بھی بڑا پُر پیچ اور خار دار ہے۔ اس راہ پر آدمی ایک مرتبہ بھٹک جائے تو اس کا بخیر و خوبی واپس آنا ممکن نہیں۔ سب رس، اور ادارہ ادبیات اردو، ان کی دو ایسی یادگاریں ہیں جن کی موجودگی میں ان کی مزید کوئی یادگار قائم کرنا عبث ہے۔ اگر یہی یادگاریں آن بان اور کروفر کے ساتھ باقی رہیں تو کہا جائیگا لوگ زور صاحب کو بھولے نہیں۔

ادارہ ادبیات اردو تو کئی ادیبوں اور شاعروں کا میٹرنٹی وارڈ ہے۔ زور صاحب نے حیدرآباد میں لکھنے پڑھنے والوں کی ایک منظم جمعیت کھڑی کر دی۔ یہ سب کچھ نہایت غیر محسوس طریقہ پر ہوا ہے اور بہت کم لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ روشنی کی کرن انہیں کہاں سے نصیب ہوئی۔ ادارہ ادبیات اردو جنوبی ہند میں اس وقت اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے اور جب یہ قایم کیا گیا ہوگا تو شائد خود زور صاحب کو اندازہ نہ ہوگا کہ یہ آگے چل کر انجمن اور مکتبۂ جامعہ کی حیثیت کا ادارہ بن جائے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر زور صاحب کوئی پلان رکھنے والے آدمی تھے وہ تو بس یونہی کوئی کام شروع کر دیا کرتے تھے اور پھر اقبال مندی خود اس کی دیکھ بھال کر لیتی۔ ورنہ ہم نے تو کئی سوچے سمجھے منصوبوں پر پانی پھرتے دیکھا ہے۔ "سب رس" کی زندگی بھی آپ اپنی نظیر ہے۔ یہ بوڑھا ہوتا ہے اور پھر جوان ہو جاتا ہے۔ یہ پیرانہ سالی اور یہ عہد شباب، ایسا معلوم ہوتا ہے پنڈت بدن موہن مالویہ کا کایا کلپ کروا کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں تو واقعی شکر کرتا ہوں کہ اس کا وہ زرد رنگ کا ملگجا اور کھردرا سرورق اس پر سے اتار کر صدقے کر دیا گیا۔ پیلے پیلے کاغذ پر سیاہ حروف میں "سب رس" کے الفاظ دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ یہ کسی پیچے کا سرورق ہے یا کڑاہی میں جلا ہوا بھجیا۔ وہ پیلا کاغذ یوں سمجھئے اس کا صدقہ گیا اور اب اس پر کوئی آفت نہ آئے گی۔

زور صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت ان دو یادگاروں کے پس منظر میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہے گی۔

ڈاکٹر زور مرحوم کچھ نہیں تو پینتیس چالیس کتابوں کے مصنف ہوں گے۔ تحقیق اور تنقید کے موضوع پر اتنی ساری کتابیں جس کی ملکیت ہوں اُسے اور کیا چاہیئے۔ ہم نے تو بہتوں کو صرف ایک کتاب چھپ جانے پر قص کرتے دیکھا ہے۔ ہمارا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے علاوہ اور بھی لوگوں کو دیکھا ہے جنھوں نے شاید پینتیس چالیس کتابیں پڑھی بھی نہ ہوں۔ زور صاحب کو صرف کتابیں لکھنے کا شوق نہیں تھا وہ دوسروں کی کتابیں بھی بڑے شوق سے چھاپتے۔ اس لئے بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ ادارۂ ادبیات اُردو والے کتابیں چھاپ کر ان کا ڈھیر لگانا خوب جانتے ہیں۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب کو تجارت سے کیا تعلق۔ کتابیں کس طرح بیچی جاتی ہیں اور اُن کا بھاؤ کیا ہونا چاہیئے زور صاحب کو اس سے شاید سروکار نہ تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ زور صاحب کا اخیر زمانہ بہت جلد آ گیا' حیدرآباد سے دوری ان کے اخیر زمانہ کو قریب کھینچ لائی ورنہ اصولاً آدمی کو اس وقت وفات پانا چاہیئے جب وہ تھک جائے اور زور صاحب ابھی کہاں تھکے تھے۔ اُن میں تو کام کرنے کی اب بھی توانائی تھی یہ سب اُن کے تخلص کی برکت تھی کہ اخیر تک وہ جوان تھے' اور جواں قسمت تھے۔ اور زندہ دلی تو جیسے ان کا پیشہ تھا۔

اُن کے ایک۔ دوست ڈاکٹر مدنی نے دکنی کو اپنی تحقیق سے ولی گجراتی بنا دیا۔ اور ڈاکٹر زور اُن سے لڑ بیٹھے یہ لڑائی ہمیں بے حد پسند آئی یوں بھی ہم شر پسند واقع ہوئے ہیں دو آدمی لڑتے ہوں تو ہمیں بڑا لطف آتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی لڑائی اخیر تک جاری رہی اور وہ جب بھی بمبئی جاتے انتتاماً ڈاکٹر مدنی کے مہمان ہوا کرتے۔ انتقال سے ایک ہفتہ پہلے بھی وہ بمبئی میں ڈاکٹر مدنی کے مہمان تھے۔

ڈاکٹر زور بڑی لاابالی طبیعت کے آدمی تھے۔ انہوں نے مرنے کا بھی کوئی پلان نہیں بنایا تھا وہ تو یوں ہی کا شکار ہو گئے۔ ڈاکٹر زور کی موت ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ کشمیر کی سرسبز و شاداب وادی میں بھی آدمی مر سکتا ہے۔

قدرت کے کاروبار اور اُس کے نظم و نسق سے ہمیں مطلق دلچسپی نہیں ہے ورنہ ہم کو یہ کہنے میں قطعی باک نہ ہوتا کہ اگر ڈاکٹر زور چند دن اور زندہ رہتے تو قدرت کا کیا بگڑ جاتا۔ پھر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ آدمی مر کر بھی تو زندہ رہ سکتا ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین
(الہ آباد)

ڈاکٹر زور مرحوم — چند تاثرات

مجھے ڈاکٹر زور مرحوم کے قریب رہنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ ملاقاتیں کئی بار ہوئیں لیکن سب مختصر اور سرسری تھیں۔ ایسی نہیں تھیں جن میں ہم اُن کے دل کے اندر جھانک سکتے۔ اس لئے مرحوم کے متعلق میری معلومات کتابی ہیں یا پھر وہ جو مشترک دوستوں کے تاثرات کی شکل میں مجھ تک پہنچی ہیں۔ ان تاثرات میں خوبیاں اور خامیاں دونوں شامل ہیں لیکن چونکہ مجھے براہ راست اُن کا تجربہ نہیں ہے اس لئے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انتقال سے پہلے ایک "سخن گسترانہ" بات پر مرحوم مجھ سے ناراض ہو گئے اور اس کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا۔ لیکن جب میں نے اپنے خیال کی وضاحت کی تو انھوں نے ایک محبت آمیز خط لکھا۔ اتفاق سے وہ خط میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے، اس کے بعض حصے یہ ہیں:۔

آپ کا مکرمت نامہ مورخہ ۱۹ جولائی ملا اور دلی خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی شرافتِ نفس اور حسن اخلاق سے مجھے گرویدہ بنا لیا اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی بنا پر اور اسی توقع پر وہ خط لکھا تھا ورنہ

کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

یہ خط ۲۷ جولائی کو سری نگر سے لکھا گیا تھا اور میرے نام اُن کا آخری خط تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ خط لکھے بھی نہیں تھے، اس لئے کبھی بے تکلف خط کتابت کی نوبت نہیں آئی۔

مجھے یہ اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے زور صاحب کی پہلی تحریر کب اور کون سی پڑھی لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔ اے کا طالب علم تھا تو اُن کی کتابوں سے واقف ہو چکا تھا۔ رموزِ تنقید۔ تنقیدی مقالات اردو کے اسالیب بیان، مطالعہ میں آ چکے تھے اور جب ایم۔ اے میں پہنچا تو ہندوستانی لسانیات اور اردو شہ پارے سے بھی فیض یاب ہوا۔ جہاں تک یاد آتا ہے ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی اکیڈمی کے ایک جلسے میں انھیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا لیکن ملاقات نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تصانیف جلد جلد شائع ہو رہی تھیں اور میں کسی نہ کسی طرح انھیں پڑھ بھی لیا کرتا تھا اگرچہ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں بعض تنقیدی مسائل اور ادبی تصورات میں اُن سے متفق نہ تھا۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ اُن کے احترام میں کوئی کمی کرتا تھا یا اُن کے نقطۂ نظر کے خلاف کچھ کہتا یا لکھتا تھا، نہیں بلکہ خاص طرح کے ادبی خیالات رکھنے کی وجہ سے میں اُن سے اتفاق نہ کر سکتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں مجھے پہلی مرتبہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سال وہاں ترقی پسند مصنفین کی ایک بہت بڑی

کانفرنس ہو رہی تھی اور میں بھی ایک سیشن کی صدارت کرنے کے لئے وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسی کانفرنس میں پہلی دفعہ ڈاکٹر زور سے متعارف ہوا۔ "ادارہ ادبیات اردو" دیکھنے گیا اور کچھ وقت مرحوم کے ساتھ دکن کی علمی خدمات اور قلمی نوادر پر گفتگو کرنے میں صرف ہوا۔ مرحوم کانفرنس کے کئی جلسوں میں تشریف لائے لیکن کارکنوں سے گھل مل نہ سکے۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اُن کی عدم دلچسپی کا اصل سبب اختلاف نگاہ تھا جس پر ریاست کی اُس جاگیردارانہ فضا نے اور جلا کر دی تھی جس سے وہ بہت قریب تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس فضا سے انھوں نے وہ فائدہ بھی اٹھایا جو اردو زبان و ادب کی ترقی کے کام آیا۔

اس کے بعد مرحوم سے کئی بار حیدرآباد میں اور کئی بار دہلی میں ملاقاتیں ہوئیں لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہم ایک دوسرے کے بہت قریب نہ آسکے۔ کبھی بھولے بھٹکے کوئی خط یا کوئی کتاب اِدھر سے اُدھر ہو جاتی تھی۔ آخری ملاقات اگست ۱۹۶۱ء میں الہ آباد میں ہوئی۔ میں الہ آباد یونیورسٹی کی اردو کی پروفیسری کا امیدوار تھا اور مرحوم منتخب کمیٹی میں ماہر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ کسی وجہ سے اُن کا خیال تھا کہ میں اس جگہ کے لئے موزوں نہیں ہوں۔ چنانچہ انھوں نے میری مخالفت کی۔ باہر نکل کر ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ بھائی بعض وجوہ سے میں نے آپ کی مخالفت کی ہے میں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آپ نے کچھ سوچ ہی کر کی ہوگی اور ہر شخص ہر دوسرے شخص کو پسند بھی کیسے کر سکتا ہے، کہنے لگے نہیں پسند کی بات نہیں تھی۔ کچھ لوگ اور آگئے اور بات ختم ہو گئی۔ الہ آباد میں میرا تقرر ہو گیا اور مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس بات سے خوش ہوئے یا رنجیدہ۔ جون ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے رسالہ اردوئے معلی کا لسانیات نمبر نکلا جس میں مرحوم زور صاحب کا بھی ایک مضمون تھا۔ یہ مضمون اس سے پہلے بھی ایک دوسرے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ میں نے وہ مضمون جب پھر اسی شکل میں دیکھا تو مجھے بعض باتوں کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ اس میں میرا ذکر بھی تھا۔ میں نے ایک مختصر سا نوٹ اس کے متعلق ہماری زبان علی گڈھ میں شائع کرا دیا۔ یہ بات زور صاحب مرحوم کو پسند نہیں آئی اور انھوں مجھے ایک خط لکھا جس میں کسی بات کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میں (زور صاحب) نے جو آپ کے تقرر کے سلسلہ میں مخالفت کی تھی اُسی سے آپ مجھ سے ناخوش ہیں اور یہ مضمون اسی کا نتیجہ ہے۔ مجھے خط پڑھ کر بہت رنج ہوا اور میں نے موصوف کو ایک طویل خط لکھ کر یقین دلایا کہ یہ محض ایک علمی مسئلہ ہے اس کا کوئی تعلق آپ کی ذات سے نہیں۔ اُس خط میں میں نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کو سراہا تھا اور اپنی جانب سے یقین دلایا تھا کہ میرے دل میں اُن کی طرف سے کوئی کدورت نہیں ہے۔ اوپر جس خط کا ایک اقتباس دیا گیا ہے وہی خط جواب میں آیا، افسوس کہ وہ آخری خط تھا جس کے دو مہینے کے اندر زور صاحب وہاں چلے گئے جہاں اب کسی قسم کے خط یا خیال کی رسائی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک بار اس سے پہلے بھی ولی کے دکنی یا گجراتی ہونے کے سلسلہ میں انھیں مجھ سے شکایت پیدا ہو گئی تھی کیونکہ میں نے ایک جگہ یہ لکھ دیا تھا کہ ولی دکن کا ہو یا گجرات کا اس کی شاعری سارے ہندوستان کی ہے اور اب تو اُس کا اورنگ آبادی ہونا اچھا خاصا مشکوک ہے۔ بہرحال ممکن ہے وہ زود رنج رہے ہوں اور اختلاف برداشت نہ کرتے رہے ہوں لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا وہ باتیں اُن کے ساتھ چلی گئیں جو چیز زندہ ہے وہ اُن کی خدمات ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ادارہ ادبیات اردو میں، سب رس میں، اردو کے امتحانات کی تنظیم میں، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں، دکنی مخطوطات

شائع کرنے کی تحریک ہیں اپنے شاگردوں کے جوشِ خدمت میں اور اپنی چار درجن سے زیادہ کتابوں میں زندہ ہیں۔

ڈاکٹر زور نے افسانے لکھے، لسانیات پر تحقیق کی، تنقیدی مضامین لکھے، دکنی ادب کی تحقیق میں عمر کا بڑا حصہ لگایا، علمی اور تاریخی کتابیں تیار کیں، دواوین مرتب کئے، حواشی لکھے، انتخابات شائع کئے، شعر کہے، بیانات دئے۔ کانفرنسوں میں شرکت کی، یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم اور معیار کی فکر کی، ادارے قائم کئے، خود کام کیا اور دوسروں کے اندر اس کی لگن پیدا کی۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کا دسواں حصہ بھی بہت سے ادیبوں کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو بھی اُن کی ادبی اور علمی خدمات انھیں زندہ رکھتیں۔

جب انھوں نے اپنی کتاب روحِ تنقید شائع کی اُس وقت اُن کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ تھی، اس وقت تک اردو تنقید پر مغربی تنقید کا اثر پڑ چکا تھا اور اس کا تذکرہ بھی آتا رہتا تھا لیکن انھوں نے مغربی ادیبوں کے بہت سے وہ اقوال اور خیالات یکجا کر دئے جن کی مدد سے تنقیدی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اب ان میں سے اکثر خیالات عام ہو کر تنقیدی ادب کا جزو بن چکے ہیں لیکن اس وقت یہ کام اہم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہ طالب علم تھے اور یہ کوشش طالبعلمانہ تھی لیکن اُس وقت بھی اُن کی محنت اور سوجھ بوجھ نے ایک ضروری کام انجام دیا تھا۔ تنقیدی مقالات اور تین شاعر کے مضامین جو جلد جلد تھوڑی ہی مدت میں لکھے گئے، یکساں پائے کے نہیں ہیں لیکن ان میں سے بعض مضامین پہلی دفعہ ایک نئے تنقیدی اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے اسلوب میں کوئی جاذبیت نہ تھی لیکن اُن کا ذہن رسا تھا اور اپنے خیالات کو ایک مرتب انداز میں اس طرح پیش کرتے تھے کہ مضامین کی افادیت بڑھ جاتی ——— یہی حال اردو کے اسالیبِ بیان کا ہے جن میں اچھے، یاد رکھنے کے قابل اور چونکانے والے جملے نہیں آتے لیکن مفید اور ضروری باتیں بہت سی سامنے آجاتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اُن کے افسانے افسانوی ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکیں گے لیکن دکن کی تاریخ کے بعض گوشے اُن سے ضرور منور ہو جاتے ہیں۔ غالباً اُن کا مقصد بھی یہی تھا کہ افسانوں کے پیرایہ میں ان کی طرف متوجہ کرنا آسان ہوگا۔ اسی طرح دکن کی تاریخ سے لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوگی اور اس کا تہذیبی حسن نمایاں ہوگا۔ سیر گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے، اس حیثیت سے بہت اہم ہیں۔

اردو میں لسانیاتی مسائل پر جو تھوڑا بہت مواد جمع ہو گیا تھا، اُس کی بنیاد پر پروفیسر محمود شیرانی نے ایک گراں بہا کام کیا تھا لیکن باقاعدہ لسانیات کی تعلیم حاصل کر کے اردو کے آغاز، اس کی تشکیل اور توسیع پر غور کرنے کا سہرا ڈاکٹر زور ہی کے سر ہے۔ ہندوستانی لسانیات اور صوتیات پر اُن کے مقالوں نے لسانیاتی مطالعہ کی راہیں اردو میں بھی روشن کر دیں۔ گو انھوں نے بعد میں اس سلسلہ کو جاری نہیں رکھا جس سے اردو کا دامن اور وسیع ہوتا لیکن اُن کی وجہ سے لسانیاتی تعلیم کی طرف طلبا ضرور متوجہ ہوتے رہے۔ انھوں نے لسانیات کی ابتدائی تاریخ، اصول اور مسائل کے متعلق بہت مختصر اور سرسری اشارے کئے ہیں، آریائی زبانوں کے ارتقا کی داستان بھی اجمالاً بیان کی ہے لیکن دکنی زبان کی تشکیل اور صوتیاتی ہیئت کے بارے میں بعض بڑی گراں قدر باتیں کہی ہیں۔ اس وقت جب کہ دکنی اردو کو دکنی ہندی بنانے کی جدوجہد اچھی طرح جڑ پکڑ چکی ہے، اُن کی تحقیقات کو اچھی طرح سمجھنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر زور کا سب سے گراں بہا کام دکنی ادب اور تاریخ کو علمی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہر دلعزیز بنانا ہے۔ گو اس سلسلہ میں اُن کے پیشرو بھی تھے لیکن انھوں نے منظم طور سے اسی کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ اُردو شہ پارے، کلیات محمد قلی قطب شاہ حیات محمد قلی قطب شاہ، حیات میر مومن، داستانِ ادب حیدرآباد، حیدرآباد فرخندہ بنیاد، دکنی اردو ادب اس سلسلے کے بہت اہم کام ہیں۔ اگر ان میں عہد شماری میں اردو کی ترقی، مرقع سخن، فیض سخن، متاع سخن، کیف سخن، معانی سخن وغیرہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس کا وزن اور بڑھ جاتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں حیدرآباد، اُس کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اُس کے اثر سے وجود میں آنے والی تہذیب سے والہانہ عشق تھا، اس عشق میں وہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ زبان و ادب کے ارتقا میں شاہی سرپرستی کے علاوہ بہت سے اور عناصر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ تاہم انھوں نے اُس عہد کے مختلف پہلوؤں کو بار بار اس طرح پیش کیا ہے کہ مطالعہ کرنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت غیر معمولی اور بے حد پرکشش تھی، تاریخ نے اُس میں وہ بہت سی خصوصیات جمع کر دی تھیں جو شکل سے یکجا ہوتی ہیں، اُس کی ذات دکنی تہذیب کی ارتقا پذیر قدروں کی علامت بن گئی تھی پھر بھی ڈاکٹر زور کو اُس عام زندگی کو بھی پیش نگاہ رکھنا چاہئے تھا، سلطان جس کا زائیدہ تھا۔ اسی طرح دکن کے دوسرے شعراء اور ادیب بھی جن کا ذکر انھوں نے اکثر کیا ہے، اپنے سماجی پس منظر سے الگ ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان باتوں کے باوجود ان کے تحقیقی اور تنقیدی کام ناقابل فراموش ہیں۔

ڈاکٹر زور کام جلد کرتے تھے، زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے وہ ضروری اجزا کے یکجا کر دینے کو اہمیت دیتے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کتابوں کا مواد فراہم کرتے جاتے تھے اور اس طرح کئی کتابیں ایک ساتھ ترتیب پا جاتی تھیں۔ حیات قلی قطب شاہ کے لئے مواد فراہم کرتے ہوئے انھیں بڑی آسانی سے میر محمد مومن استرابادی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی گئیں اور حیات سلطان کا کام ختم کر کے انھوں نے حیاتِ میر مومن مرتب کر ڈالی۔ یوں ہی حیدرآباد کی تاریخ کے لئے مواد یکجا کرتے ہوئے انھیں ادبِ حیدرآباد کی داستان مرتب کر لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس طرح اُن کے تصنیفی کاموں میں تیز رفتاری آجاتی تھی اگرچہ معیار کو نقصان پہنچ جاتا تھا۔

ڈاکٹر زور مرحوم تنہا ایک ادارہ تھے، اُردو کے بہت بڑے مخدوم اور خادم تھے، ادیب اور نقاد تھے، مورخ تھے، بہت اچھے معلم تھے، غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اُن میں بہت سے مختلف النوع کام کرنے والوں کی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں جن سے نئی نسل کو واقف کرانا ضروری ہے۔ یہ کام اُن اداروں اور رسالوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے جن کی آبیاری میں اُن کا لہو شامل ہے۔

پروفیسر محمد خاں
(میسور)

اُردو کا فدائے دکن ادیب

پروفیسر سید محی الدین قادری زور دکن میں اردو کے ادیب تھے، ان کی صحیح حیثیت کو سمجھنے کے لئے ایک پس منظر کی ضرورت ہے، میں اسی کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا اسی میں دعوت فکر ہے۔

تینتیس ۳۳ برس پہلے پروفیسر آغا محمد عباس شوستری نے جامعہ میسور میں مجھے "اردو و فارسی خشتی" کے طور پر مامور کیا، اس زمانہ میں بمصداق ع تکلف برطرف تھا، ایک انداز جنوں وہ بھی، میرے ذہن میں یہ بات جم گئی تھی کہ اردو زبان بس وہی ہے جو دبستان دہلی و لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں میں محفوظ ہے اور دکھن میں اردو کا کامیاب مقلد وہی ہے جو ان دبستانوں کے اختلافوں سے بخوبی واقف ہو کر کسی ایک دبستان کی تقلید کرے لیکن اتنی احتیاط رکھے کہ یہ دونوں دبستان خلط ملط نہ ہو جائیں مثلاً "میری معلومات اچھی ہے" میں معلومات کو واحد مونث استعمال کرنا دہلی کی تقلید اور "میرے معلومات اچھے ہیں" میں معلومات کو جمع مذکر استعمال کرنا لکھنؤ کی تقلید ہے اور ان دونوں کو گڈمڈ کر کے "میری معلومات اچھی ہیں" لکھنا واضعداری کے خلاف ہے، چنانچہ میں دبستان دہلی کی تقلید کرنے لگا اس تقلید پر سید انشا کا یہ قول ایک اور تازیانہ ہوا:—

"شاہ جہاں آباد کی زبان وہ ہے جو درباری اور مصاحب پیشہ قابل اشخاص، خوبصورت معشوقوں، مسلمان اہل حرفہ، شہروں اور امرا کے شاگرد پیشہ ملازموں حتی کہ ان کے خاکروبوں کی زبانی ہے۔"

(دریائے لطافت ترجمہ کیفی صفحہ ۱۲۱)

چنانچہ مذکور تقلید میں وہ شدت ہوئی کہ میں دلی کے ہر کس و ناکس کی تحریروں کو پورے اعتماد اور اطمینان سے پڑھتا تھا کہ اس سے اردو سنور تی ہے لیکن دکن کے بہترین ادیبوں کی تحریریں پڑھنے سے خوف کھاتا تھا کہ نہیں معلوم یہ کہاں چوک جائیں گے اور کہاں میری نقالی میں نقص آجائے گا اور میر کا یہ قول ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا کہ "خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔" اب سوچتا ہوں تو اس میں قصور میرا نہیں تھا کیونکہ دکن کے ادیبوں اور شاعروں نے تقریباً ڈیڑھ صدی سے ہندستانیوں کی تقلید میں اپنی انفرادیت تفصیلی طور پر کھو دی تھی، انھوں نے اپنی زبان، اپنے اجتہاد، اپنی آزادی اپنے وقار سب کو تج دیا تھا، دلی سے لکھنؤ کا جو فاصلہ ہے اس سے تگنا فاصلہ دلی سے دکن میں اردو کے مرکزوں گلبرگے، بیجاپور اور گولکنڈے کا ہے، لیکن دلی اور لکھنؤ کے ماحول میں جو لفظ پہلے مذکر تھے اب مؤنث اور جو مونث تھے اب مذکر بولے جاتے ہیں اور چند الفاظ کو ایک ہی شہر میں مذکر اور مونث دونوں طرح اور بعض الفاظ کو ایک شہر میں مذکر اور دوسرے شہر میں مونث اور واحد مونث کی جمع کو جمع مذکر

بولتے ہیں اور متعدی فعلوں کے ساتھ 'نے' کا استعمال کرتے ہیں اور نہیں بھی کرتے اور بعض لازم افعال کے ساتھ 'نے' ضرور استعمال کرتے ہیں اور بعض متعدی فعلوں کے ساتھ 'نے' نہیں لاتے اور ایک ہی چیز کے لیے ایک جگہ ایک نام اور دوسری جگہ دوسرا نام بولتے ہیں۔ کوئی غیر اردو داں اردو سیکھنا چاہے تو اردو میں ایسی بے شمار بے ربطیوں' بے جوڑیوں بلکہ صاحب آب حیات کے الفاظ میں سینہ زوریوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی' پھر بھی ان کا تحفظ ان دلستانوں کو جان سے زیادہ عزیز ہے یہ دبستان ان اختلافوں کو اپنے اجتہاد' اپنی آزادی اور اپنے وقار کا سرمایہ سمجھتے ہیں' ان باقاعدہ بے قاعدگیوں کو دور کر کے اردو کی صرف و نحو اور لغات میں حتی الامکان یکسانی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی پُرخلوص اور بے لاگ کوششیں اجتماعی طور پر آج تک نہیں ہوئیں اور کسی فرد نے یہ خدمت انجام دینی چاہی تو اس کو اَدھر قرار دے دیا' یہ عیب چھوٹے بڑے پیمانے پر ہر زبان میں پائے جاتے ہیں بلکہ زبانوں کی خصوصیات بن گئے ہیں' اس لئے کسی زبان میں دس عیب اس قسم کے پہلے سے ہیں تو دس اور سہی اس سے زبان کی مقبولیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فکر' چاہے مذکر ہو چاہے مونث اگر صحیح ہے تو کام کی ہے ورنہ بے کار اور فضول۔

گھاس کا لفظ پورے دکن میں مذکر اور شمال میں مونث ہے' نہ شمال کے پاس گھاس کے مونث ہونے کی دلیل ہے نہ دکن کے پاس اس کے مذکر ہونے کی۔ اور کبھی دلی نے لکھنؤ سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے نزدیک 'گیند' مذکر اور مونث دونوں اور 'مالا' صرف مذکر کیوں ہے جیسے کوئی بھلا آدمی اپنے پڑوسی کے رہنے سہنے' کھانے پینے کے طور طریقوں پر اعتراض نہیں کرتا کہ اس نے فلاں رنگ اور فلاں قسم کا لباس کیوں پہنا ہے یا وہ کسی خاص قسم کا کھانا کیوں کھاتا ہے یا اس کے یہاں سالن میں املی کی کھٹائی اور ناریل کیوں پڑتا ہے۔

جامعۂ میسور میں عبدالقادر صروری اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے غالباً ۱۹۴۵ء میں انٹرمیڈیٹ کالج بنگلور میں اردو کی اجاعتوں کے معائنہ کے لئے آئے' میں اردو پڑھا رہا تھا کسی شعر میں گھاس کا لفظ آیا تھا' میں نے شعری تشریح میں گھاس کو مونث استعمال کیا۔ گھنٹہ ختم ہو گیا اور طلبہ چلے گئے' تو سروری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ گھاس مذکر ہے یا مونث' میں نے کہا دلی اور لکھنؤ میں مونث ہے۔ کالج کے کتب خانہ سے فرہنگ آصفیہ منگوا کے دیکھیں' پھر حیرت سے پوچھا کہ میری زبان پر یہ لفظ مذکر کیوں ہے میں نے کہا اس میں حیرت کی کیا بات ہے جو لفظ جس طرح آپ اپنے ماحول میں سنتے آئے ہیں ویسا ہی کہتے ہیں' میں بھی کالس کے باہر اس کو مذکر ہی کہتا۔ کہا کہ چڑجی نے ٹھیک کہا ہے کہ بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے اختلاف کو مٹا دینا چاہئے۔ عرض کیا بلکہ جانداروں کی تذکیر و تانیث کو بھی فارسی والوں کی طرح مٹا دینا چاہئے۔ لیکن اس مشورے کو شمال نہیں مانے گا اور آپ گھاس کو مذکر استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ کوئی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ کم از کم اردو کے ماحول سے گھاس مفقود ہو جائے تو آسانی ہوگی۔

یہ واقعہ دکن کے ادیبوں اور شاعروں کی توجہ چاہتا ہے' سروری صاحب دکن میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے چالیس برس کی پختہ عمر میں گھاس کو مذکر استعمال کرتے ہیں' اس لئے نہیں کہ وہ اردو میں کوئی ترمیم کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے ہیں وہاں کے لاکھوں اردو بولنے والے گھاس کو مذکر بولتے ہیں لیکن وہ دلی اور لکھنؤ کے اس قدر دیانت دار شائق ہیں کہ گھاس کو مذکر کہہ کر جھینپ جاتے ہیں اور تاویلیں کرتے ہیں۔ مذکور موقع پر ان کا ذہن اس طرف منتقل ہی نہ ہو سکا کہ وہ کیوں گھاس کو مذکر استعمال نہ کریں اور جیسا دلی اور لکھنؤ والے آپس کے اختلافوں کو جن کی بنیاد صرف شوق اختلاف پر ہے

عزت کی نظر سے دیکھتے اور ان کی بحالی کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً نور الحسن نیر دبستان لکھنو کے نمائندہ ہونے کے باوجود نور اللغات میں لکھتے ہیں کہ "فاتحہ" لکھنو میں مذکر دہلی میں مونث۔ اور اسی طرح انھوں نے کہیں بھی ان اختلافوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ دیانت داری سے انھیں محفوظ کر دیا ہے۔ ایسا ہی دکن میں گھاس کے مذکر، گھوڑے کے زین کے مونث اور رسالے کی لونگ کے مذکر ہونے کا ذکر اور دکنی میں جمع بنانے کے قاعدوں مثلاً ع غنیاں کے بھیجیاں کو کھاتے شتاب۔ میں غنیم اور بھیجے کی جمعوں کا ذکر ہونا چاہئے تھا، وعلیٰ ہذا القیاس۔ لغات اور قواعد نویسوں نے پورے دکن کا اتنا بھی لحاظ نہیں رکھا جتنا کہ دلی یا لکھنو کے شہروں کا۔ دلی میں کوئی "میں نے مصوری سیکھی ہے" کی جگہ "میں مصوری سیکھا ہوں" کہے تو کوئی عیب نہیں اور دکن میں کوئی "میں نے کتاب پڑھی ہے" کی جگہ "میں کتاب پڑھا ہوں" کہے تو کوئی عیب نہیں کیونکہ دلی میں بھی یوں کہنا عیب نہیں، لیکن کوئی دکنی کہے کہ "میں روٹی کھایا ہوں" تو بالکل غلط کیونکہ دلی میں ایسا نہیں کہتے حالانکہ دلی کے ہاں "میں کتاب پڑھا ہوں" صحیح ہونے کی روایت کے سوا کوئی عقلی یا قیاسی دلیل ہے اور نہ "میں روٹی کھایا ہوں" کے غلط ہونے کی۔ اگر اردو کی کوئی ترکیب جو دلی میں کہی جاتی ہے مستثنیٰ ہے اور اسی لئے سند ہے تو جو ترکیب پورے دکن میں استعمال ہوتی ہے وہ کیوں مستثنیٰ اور سند نہیں ہو سکتی اور اس کا مذکور قواعد کی کتابوں میں کیوں نہیں ہوتا کہ دکن میں "نے" علامت فاعل کا استعمال نہیں ہوتا لیکن اس سے مطلب کی ادائی میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اس قسم کا مطالبہ نہ کبھی دکن نے کیا اور نہ دلی اور لکھنو کا ذہن کبھی اس طرف گیا کہ ایسا مطالبہ ہو سکتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ شمال جس دکنی کو اردو کہتا ہے اس کی کوئی بات معتبر نہیں تو صرف شمال کی اپنی زبان ہے، دکنیاں در گور و دکنی در کتاب۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی نائک کمپنی شمال سے دکن کو آتی ہے اور اس کے اداکار اپنی اداکاریاں دکھاتے ہیں تو پورا دکن اس کو تسلیم کر لیتا ہے کہ نائک وہی ہیں جن کی کمپنیاں شمال سے آتی ہیں اور اداکاری وہی ہے جو شمال کے اداکار جانتے ہیں، دکن کے نائک نہ نائک ہیں اور نہ یہاں کی اداکاری، اداکاری اور حد یہ کہ جب دکن شمال کو مخاطب کرتا ہے تو اس کا اسلوب وہی ہوتا ہے جو شمال کا ہے اور اگر اس سوانگ میں کہیں دکنی کے اسالیب کی جھلک آجاتی ہے اور شمال اپنی ناواقفیت کی بنا پر دکن کو ٹوک دیتا ہے تو دکن پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے، دکن کو نہ یہ پوچھنے کی جرأت ہوتی ہے، آپ کیوں ہمارے اسلوب سے ناواقف ہیں جب کہ آپ کو اپنے آپ کے اختلاف فوک زبان یاد اور نہ شمال کو کبھی اس روادادی کا خیال آیا کہ دکن کے اسالیب کو قواعد اور لغات میں احترام کے ساتھ جگہ دی جائے، شمال نے یہ ایک یکطرفہ رشتہ باندھا اور اس بھنور میں دکن ایسا گھرا کہ خود دکنی اپنے ادیبوں اور شاعروں کی صلاحیتوں کو کسنے کے لئے شمال کی کسوٹی کے محتاج ہو گئے اور دکن کی اپنے آپ کو جانچنے پرکھنے کی صلاحیتیں اور استعدادیں ایسی مفلوج ہوئیں کہ اگر شمال اپنے کرم سے ہمیں یہ کہتا ہے کہ تم شاعر اور ادیب ہو تو ہمیں باور آتا ہے کہ ہم شاعر اور ادیب ہیں اور اگر شمال بے اعتنائی سے کہہ دیتا ہے کہ تم ہیچ ہو تو پھر ہمیں باور ہو جاتا ہے کہ ہم ہیچ ہیں، شمال کی وہی ہستیاں دکن کی داد دیتی ہیں جو اردو زبان کی حقیقی عاشق ہیں وہ بمصداق ع من انداز قدت را می شناسم۔ اپنے معشوق کو کیا شمال اور کیا دکن دونوں جگہ پہچان لیتی ہیں، اردو کے یہ پروانے "چراغ حرم و دیر" میں فرق نہیں جانتے۔ انھیں ابدال کی بدولت دکن شمال کی اردو پر جان دیتا ہے، ورنہ شمال کے عام اردو والوں کے دکن سے سلوک کی مکمل تصویر مرزا غالب کے اس شعر میں نظر آتی ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۔۔۔ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

پروفیسر سید محی الدین قادری زور دکن میں اسی ماحول میں پیدا ہوئے تھے لیکن فطرت نے ان میں خود اعتمادی کے احساس اور اس کے اعلان کی فراواں نعمت ودیعت کی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ شمالی ہند کے لوگ اگرچہ اردو کے اہل زبان ہیں لیکن ان میں تو بالکل گنتی کے چند ہی لوگ ہیں، ان میں سے اکثر کی نظر خود انھیں کے بنائے ہوئے قاعدوں اور اصولوں پر نہیں ہوتی اور جیسے انسان پیدائشی طور پر بست یا بلند قامت اور سفید یا سیاہ فام ہوتا ہے ویسے کوئی اہل زبان پیدائشی طور پر زباں داں نہیں ہوتا اور جو زبان تحصیلی اور اکتسابی طور پر آتی ہے اس کی تحصیل کے لئے ہندوستانی ہونے کی کوئی قید نہیں، دنیا کے کسی خطے کا باشندہ بھی اردو کا زباں داں ہو سکتا ہے اور خصوصاً دکن میں جو اردو کا گہوارہ ہے ایک دکنی اردو کا زباں داں یقیناً ہو سکتا ہے اور ایک زندہ زبان میں جو ترمیمیں اور اضافے ہوتے ہیں ان میں اس زبان کے سب بولنے والوں کا مساوی حصہ رہتا ہے اس لئے اس دھوکے میں رہنا کہ کوئی دکنی اردو کا پروفیسر نہیں ہو سکتا۔ یہ عہدہ کوئی ہندوستانی ہی سنبھال سکتا ہے حیرت انگیز ہے۔ اس زمانے میں شمال حیدر آباد پر چھایا ہوا تھا۔ اگر پروفیسر زور کہتے کہ اردو کے سوا دنیا کی کسی بھی زبان میں وہ کسی بھی ہندوستانی کے برابر سوچ سکتے اور درست نتائج پر پہنچ سکتے اور انھیں قلمبند کر سکتے ہیں تو شمال ان سے تعرض نہ کرتا، دنیائے اردو میں ان کا بہت بڑا جرم یہ تھا کہ انھیں اردو میں شمال کی برابری کا دعویٰ تھا۔ پروفیسر زور کی اس آزادی پر قدیم عادت کے تحت شمال کو حیرت اور اس سے بڑھ کر حیرت بلکہ ہیبت دکن کو ہوئی، اس کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کا کوئی سپوت کسی ہندوستانی کے برابر اردو کا زباں داں ہو سکتا ہے۔ آج بھی شاید ایسے دکنی جن کی رائے دکن میں اردو کی ترویج اور ترقی کے اسباب فراہم کرنے میں ضروری سمجھی جاتی ہے لیکن جن کا ایمان ہے کہ کسی دکنی کو اردو میں مہارت حاصل نہیں ہو سکتی مفقود نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکنیوں نے پروفیسر زور کو اردو داں کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں دی اور پروفیسر زور کو اپنے عزم میں تنہائی محسوس ہونے لگی۔ انجمن ترقی اردو کل ہند کا دفتر حیدر آباد میں تھا اور دکنی اپنی پرانی عادت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ دکن میں اردو کی خدمت وہی ادارہ کر سکتا ہے جس پر شمال کی چھاپ ہو، پروفیسر زور نے حیدر آباد میں "ادارۂ ادبیات اردو" کا دفتر اپنے گھر میں قائم کر کے اردو کی خدمت میں اپنی آزادی کا مزید ثبوت دیا۔ اس پر دکنیوں کی وہی کیفیت ہوئی جو کانگرس کے انگریزی حکومت سے ٹکراؤ کے زمانے میں اکثر ہندوستانیوں کی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کا ہٹانا محال ہے، فضول کشمکش میں ہم کیوں اپنا غلامانہ عیش و آرام بھی برباد کر لیں بلکہ پروفیسر زور کو اردو کے معاملے میں شمال کے حاکمانہ اور دکن کے محکومانہ خوشگوار اور پر امن تعلقات میں رخنہ سمجھا۔

جیسا کہ پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں میں اپنے ماحول کا شکار تھا اس لئے اردو میں شمال کا مقلد اور اس تقلید سے آزادی میں اپنی تباہی کا قائل تھا، میں اس نتیجے پر پہنچا لگ اور پہنچا یا گیا زیادہ تھا کیونکہ دکن میں جو بھی اردو دیکھتا تھا اس کی داد دکن میں اسی وقت ملتی تھی جب کہ شمال کا کوئی ادیب اس کی داد دیتا تھا، دکن کی داد صرف آواز بازگشت ہوتی تھی، آج بھی دکن کے اردو دانوں کو تھوڑی بہت جو شہرت حاصل ہے وہ شمال کی مرہون منت ہے اور اس کے اظہار میں کوئی بے شرمی نہیں ہے اور دکن کے اس مزمن احساس کمتری سے شمال اچھی طرح واقف ہے اور وہ کوئی ایسی غلطی نہیں کرتا جس سے دکن میں اپنی اولیت اور سخن رجال و ہم رجال کی قسم کا احساس جاگ اٹھے اور اپنے آپ کو صحیح سالم اور تنومند سمجھنے لگے اور اس میں یہ اعتماد پیدا ہو جائے کہ اسے اب کسی طبیب کی نگرانی کی ضرورت نہیں رہی یہاں تک کہ کوئی دکن کا اردو داں کسی دکن کے اردو داں کی

داد دیتا ہے تو اس کی داد معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ پروفیسر زور کو اپنے ماحول میں یہ مقام پانے کا عزم تھا کہ دکن اردو داں ہے اور اس کی اردو دانی پر دکنیوں کو یقین ہونا چاہئے اس عزم میں آپ کو جن بے پایاں مشکلوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں دکن کے اردو دانوں کی مذکور مشکلوں کا تجربہ ہے۔

۱۹۴۲ء میں جامعہ میسور میں عبدالقادر سروری اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اگرچہ وہ اردو کے ایم۔اے اور صاحب تصانیف تھے لیکن اُس زمانے میں ریاست میسور کے اردو داں ان سے متاثر نہ ہو سکے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں، ایک یہ کہ سروری صاحب باشندے دکن کے تھے اور یہ خیال کہ دکنی اردو کا پروفیسر نہیں ہو سکتا دکن میں راسخ تھا اور شاید آج بھی ہے۔ دوسری یہ کہ سروری صاحب اس زمانے میں جیسی اردو بولتے اور لکھتے تھے اس سے ریاست میسور کے شاعر اور ادیب جو اردو کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے مطمئن نہیں ہوئے۔ تیسری یہ کہ اس زمانے میں شمال کے چوٹی کے ادیبوں خصوصاً پروفیسر کلیم الدین احمد نے سروری صاحب کی تصانیف پر سخت تنقیدیں کی تھیں۔ چوتھی یہ کہ خود میسوریوں نے ان پر سخت تنقیدیں کیں جو کئی اخباروں خصوصاً زمیندار لاہور میں بکثرت شائع ہوئیں اور کسی دکنی کی تنقید اگر شمال کے اخباروں میں شائع ہو جائے تو گویا اس تنقید پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ شاید اسی لئے شمال کے اخبار کسی دکنی کی کسی دکنی پر تنقید تو شائع کر دیتے ہیں لیکن کسی ہندوستانی پر دکنی کی تنقید شایع نہیں کرتے، ان کی نظر میں زبان کے تحفظ سے شخص کا تحفظ اہم ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ جامعہ میسور کے طلبہ جن اساتذہ کی مقبولیت اور اثر سے بی۔اے میں اردو کو اختیاری زبان کے طور پر پڑھنے لگے تھے اور پھر اردو آنرز کی جماعتوں کا اجرا ہوا تھا اور اسی بنا پر جامعہ میں پہلی بار اردو کے پروفیسر کا تقرر ہوا تھا ان اساتذہ کو سروری صاحب نے مہاراجا کالج سے ہٹا دیا۔ غرض سروری صاحب کی پروفیسری میں ایسے پیچ پڑے کہ تقرر کے دو برس بعد ان کا جامعہ میں متعلق ہونا نہایت سے سوا مشتبہ تھا، ایسے وقت میں جب کہ بحالی کی کوئی امید نہیں تھی اور سروری صاحب کو صرف عہدے از غیب بروں آید و کار بگمند کا آسرا رہ گیا تھا۔ پروفیسر زور رحمت کا فرشتہ بن کر میسور پہنچے اور جامعہ کے ارباب اور میسور اور بنگلور کے با اثر اور معتبر مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں۔ آپ کے خلوص، آپ کی مقبولیت و جاہت اور خاندانی شرافت نے میسور میں سروری صاحب کے بارے میں رائے بدل دی پروفیسر زور کی اس مورثی کرامت نے میسوریوں کو قائل کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں سروری صاحب اگر خود ہو کر حیدرآباد نہ جاتے اور وہاں سے اپنا استعفیٰ نہ بھیج دیتے تو وہ آج حکومت میسور کے پنشن خوار ہوتے۔ پروفیسر زور نے سروری صاحب کی حیدرآباد میں بھی دستگیری کی اور چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر کے سروری صاحب کے لئے جامعہ عثمانیہ میں اردو کی کرسی خالی کر دی، یہ واقعہ اس امر کا شاہد عادل ہے کہ پروفیسر زور کے نزدیک ایک دکنی اور اس کی اردو دانی کی کس قدر اہمیت تھی۔ اللہ تعالیٰ ہر دکنی ادیب اور شاعر کو پروفیسر زور کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے ہم مشرب دکنیوں کی عزت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ خیال پھیلانا ہرگز میرا مقصد نہیں کہ دکنیوں کو دبستان دلی و لکھنؤ کے اتباع سے آزاد ہو کر دکنی میں جو دکن کی زندہ زبان ہے تحریر اور تقریر کو رواج دینا چاہئے۔ ہم اردو کی تحصیل میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ اب پیچھے ہٹنا خودداری کے خلاف اور نمایاں بزدلی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سلاطین بہمنیہ اور ابراہیم عادل شاہ اول ثانی نے شاہی دفتر میں دکنی کو رواج دیا تھا، اور ظاہر ہے کہ جب کوئی زبان سرکاری زبان بن جاتی ہے تو اس کے سرمایے میں

کتنا اضافہ ہوتا ہے اور آج ہندی کو سرکاری زبان بنانے کے لئے کس قدر اہتمام اور جتن ہو رہے ہیں' دکنی بھی یقیناً ان مرحلوں سے گزری تھی تو سرکاری زبان رہی تھی' کیسی نے دکنی کا اس نقطۂ نظر سے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا' اور شمال میں کبھی سرکاری زبان نہیں تھی' پھر بھی آج وہ زبان پورے ہندوستان میں مقبول ہے اور اس میں علوم و فنون کا قابل رشک ذخیرہ ہے۔

دکنی اپنے بے مثال ایثار سے کام نہ لیتے اور اپنے بزرگوں کی عزیز زبان کو ترک کرنے اور شمال کی اردو کو اپنانے نہ لگتے تو آج دکنی بھی دستور ہند میں پندرھویں زبان ہوتی اور اپنے شاندار ماضی کی بنیادوں پر ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی ہندوستان کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کی ہم پلہ ہوتی لیکن دکنی ہندوستان بھر میں اردو کی ہم آہنگی اور یکسانی کی خاطر دکنی زبان سے گریز کرنے بلکہ اس سے اپنے تعلق سے شرمانے لگے اور اپنی خاص خاص مجلسوں اور اپنے گھروں میں دکنی بول لینے پر اکتفا کیا۔ دکن کے اس عظیم تاریخی ایثار اور کسر نفسی کی شمال نے مدتوں قدر نہیں پہچانی اور دکن کو اسی مغالطے میں رکھا کہ تمھاری کوئی بات معتبر نہیں ہم جو بولتے اور لکھتے ہیں وہی بولو اور لکھو' دکنیوں نے محنت شاقہ سے سب وار خالی دئے' یہی تو آخری وار کیا کہ تمھارا لہجہ درست نہیں! لیکن شکر ہے کہ شمال کو اپنی بے اعتدائیوں کا احساس ہونے لگا ہے اور آج جو لغات لکھی جاتی ہیں ان میں پہلی بار دکنی الفاظ اور محاورے جگہ پا رہے ہیں اور ان کا تحفظ ہو رہا ہے' اور شمال میں قدیم اردو کے تتبع میں شعر کہے جا رہے ہیں۔ آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے دبستان اپنے اختلافوں کو مٹا کر اپنے ہی ہاتھوں ایک ایسی ہندوستان گیر اردو کی بنیاد رکھیں جس میں شمالی ہند' دکن اور جنوبی ہند کی عام اور شائع خصوصیات اکٹھی ہو گئی ہوں تاکہ کمتری و برتری کے احساسات باقی نہ رہیں۔ آج شمال کو اس کی بھی ضرورت ہے کہ دکن کھٹا۔ ڈنڈا۔ سلیمان خطیب اور اسی قبیل کے مقبول شاعروں کی زبان اور خیالات کا سنجیدگی اور ذمہ داری سے مطالعہ کر کے جدید اردو اور جدید دکنی میں جو خلیج ہے اس کو پاٹنے کی سعی کرے' شمال کے اردو دانوں نے جنوب کی تالیف قلب سے غفلت کی تو اردو کی ہندوستان گیر صلاحیت کو ضرور نقصان پہنچیگا۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ ما ہنامہ "سب رس" دکن میں "ادارۂ ادبیات اردو" کا ترجمان ہے۔ اس کی ترقی اور حفاظت میں ادارے کا ہاتھ بٹانا دکنیوں کا فرض ہے' اسی کے ذریعے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شمال کی شاگردی میں دکن اردو دانی کی کن منزلوں پر پہنچا ہے' اللّٰھم زد فزد۔ فقط

سید محمد اکبر وفا قاقی

ڈاکٹر زور کی شخصیت

گولکنڈہ دنیا کے بہترین اور درخشاں ترین ہیروں کا معدن رہا ہے۔ لیکن مدت ہوئی کہ وہاں یہ نایاب جواہر ناپید ہو گئے۔ سرزمین دکن کے ہیروں کی پیداوار بھی ولی و سراج کے بعد ذہنی غلامی کی وجہ سے معدوم تھی۔ مدتوں کے بعد پھر اس سرزمین میں قلب و دماغ کی تراشیدگی کا انتظام ہوا جس کا نام جامعہ عثمانیہ رکھا گیا۔ اسی جامعہ عثمانیہ کے درخشندہ ہیروں میں سے ایک سید محی الدین قادری زور تھے۔ میں بھی چونکہ اسی جامعہ عثمانیہ کا ایک ذرۂ ناچیز رہا ہوں اس لئے اپنی قدر مضمر سمجھ کر ہر درخشاں عثمانیہ کی شخصیت سے وابستہ کرنے میں اپنی قدر کا اضافہ کرتا ہوں۔

زور میرے ہم جماعت تھے۔ اور انھوں نے ابتدا ہی سے اردو فارسی ادب اپنے مضامین قرار دئے تھے۔ میں تاریخ کا طالب علم تھا۔ اس لئے صرف انگریزی کی مشترکہ جماعت کے سوائے دوسری جماعتوں میں ان کا شریک نہیں رہا۔ لیکن بہ حیثیت ہم جماعت اُن سے قربت رہی اور چونکہ وہ "مسرت منزل" کے مقیم طالب علم تھے اس لئے دارالاقامہ میں ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ابتدائی زمانہ ہی سے یہ بات صاف تھی کہ زور اپنے تخلص کی طرح ایک طاقتور شخصیت ہیں، ایک سنجیدہ۔ محنتی با اخلاق اور وضعدار طالب علم کی حیثیت۔ ان کے ہم عصر ان کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے۔ زور کے اساتذہ جن میں بالخصوص وحید الدین سلیم ان کے ادبی رجحانات اور حوصلوں کے بڑھانے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو جیسے پُرخلوص صاحب علم اساتذہ ملے شاید ہی کسی جامعہ کو نصیب ہوئے ہوں۔

زور اپنی قدرتی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زمانہ طالب علمی میں دو چیزوں کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ محض ذہانت و طباعی سے انسان ترقی نہیں کرتا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ انتہائی محنت و عرق ریزی کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ زور کی طالب علمی کے زمانہ میں اس کے قریبی دوست مفقود تھے۔ البتہ ان کی وضعداری خوش اخلاقی کی وجہ سے دو شخص ان کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ اگر زور کے طالب علمی کے زمانہ کی کوئی ڈائری مل سکتی تو اس سے آنے والی نسل کو بڑا فائدہ پہنچتا کہ زور اپنی عملی زندگی سے کس طرح عملی مثال قائم کرتے ہیں۔

میں نے زور کے ساتھ ہی بی۔ اے کا میاب کیا یہ شاید ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ زور اردو میں جامعہ میں اول آئے اور اس طرح ایم۔ اے میں تعلیم پانے لگے۔ میں نے اپنے ایک دوست معین الدین قریشی کے مشورہ پر "وکیل یا جج" بننے کے لئے ایل ایل بی میں شرکت مناسب سمجھی۔ چنانچہ ایل ایل بی کی خاطر میں "نظامت منزل"

دارالاقامہ میں شریک ہوگیا اور اس طرح زور کا دوبارہ ساتھ ہوگیا۔ یہ زمانہ زور صاحب کے ادبی زندگی کے آغاز کا تھا اور ہندوستان کے اکثر ادبی پرچوں میں ان کے مضامین شائع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ خاص طور پر نگار میں ان کے تنقیدی مضامین برابر آیا کرتے تھے۔ زور اس تیزی سے مضامین لکھ رہے تھے کہ ایک مرتبہ معین الدین قریشی نے اس سے متعلق یہ کہا تھا کہ زور اپنے مضامین رات کو سوچتے ہیں اور صبح کو تکیہ کے نیچے سے مسودات برآمد کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں میرا تعلق انجمن اتحاد سے ہوگیا تھا جس کے صدر معین الدین قریشی تھے اور جہاں مجلہ عثمانیہ کی اشاعت کی تحریک پیش ہوئی تھی۔

مولوی عبدالرحمن خاں صاحب پرنسپل تھے اور ہمارے دوسرے اساتذہ کے ساتھ ان کا خیال تھا کہ ابھی جامعہ کے طلباء میں وہ استطاعت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ ان کو مجلہ عثمانیہ کی ذمہ داری سونپی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی پروفیسر کو مدیر بنایا جائے اور اس کے تحت جامعہ کے ایک دو طالب علموں کی تربیت کی جائے۔

انجمن اتحاد اس کی مخالف تھی اور اس پر مصر تھی کہ اب چونکہ جامعہ کے طلباء اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور اس کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس لئے ان کو ادارت کا موقع دیا جائے۔ اس درمیان میں کسی وجہ سے مولوی وحیدالدین سلیم نے مجلہ کی ادارت قبول کرنے سے تحریری انکار کردیا اور مولوی عبدالرحمن خاں نے انجمن کو ادارت کے لئے نام روانہ کرنے کی ہدایت کی۔

انجمن اتحاد میں قریشی صاحب جیسا ادیب موجود تھا جن کے لاجواب اسلوب تحریر اور ادبی ذوق کے تمام لوگ مداح تھے انجمن نے ان کا نام ادارت کے لئے تجویز کیا۔ لیکن معین الدین قریشی نے بہ حیثیت صدر یہ تحریک پیش کی کہ دو مدیر ہوں اور دونوں کی حیثیت برابر ہو۔ جس کے لئے انھوں نے پہلا نام سید محی الدین قادری زور کا اور دوسرا اپنا پیش کیا۔ اس طرح مجلہ عثمانیہ کے اولیں مدیر یہ دو حضرات قرار پائے۔ چونکہ میں مجلہ سے بہت قریب تھا۔ اس لئے مجھے زور صاحب سے اور زیادہ واقفیت کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ زور ایم اے کے امتحان کی تیاری کررہے تھے اور یورپ کے وظیفہ کے لئے بھی کوشاں تھے۔ اسی زمانہ میں زور کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ دن رات مجلہ کے لئے اور دوسرے رسائل کے لئے مضامین لکھتے۔ ایم۔ اے کی تیاری کرتے اور ساتھ ہی وظیفہ کی کوشش میں لگے رہتے۔ ان کے اوقات بالکل تقسیم شدہ تھے۔ اور ایک سانس بھی وہ ضائع کرنا جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ زور صاحب اس قدر کام اتنی قلیل مدت میں اس طرح انجام دیتے ہیں۔ زور صاحب یورپ گئے اور وہاں نمایاں کامیابی حاصل کرکے واپس ہوئے۔ پھر جامعہ عثمانیہ میں استاد بنائے گئے۔ مسلسل ادبی اور علمی کاموں میں مشغول ہوگئے۔

زور کی ادبی زندگی تو سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے جتنی عمر پائی اسے کتنے سلیقے، کفایت اور قابلیت سے استعمال کیا۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ زور کے ان انتھک مساعی کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما تھا۔

میں جامعہ میں اس لئے نمایاں تھا کہ پڑھنے سے زیادہ کھیل کے میدان۔ ڈرامہ و تفریح اور وہ سرے غیر علمی مشاغل میں مجھے بڑی شہرت حاصل تھی۔ میں ایم۔ اے کرنے علیگڈھ گیا اور ایک سال بعد واپس آگیا۔ اس زمانہ میں زور صاحب اور ڈاکٹر سیادت علی خاں صاحب کی نگرانی میں یوم کلیہ جامعہ عثمانیہ کے لئے ایک ڈرامہ پیش ہورہا تھا جس کے مصنف سال دوم کے طالب علم عزیز احمد تھے۔ جو بعد میں بڑے ناول نگار ثابت ہوئے اور اب انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ مجھے

اس ڈرامہ کی ہدایت کاری کے فرایض سپرد ہوئے۔ اس ڈرامہ میں مخدوم محی الدین، شکور بیگ (وکیل مدنگل)، جمیل احمد، اشرف، رفعت، ظفر الحسن اور بہت سے طالب علموں نے حصہ لیا۔

اس ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے ولیعہد بہادر نواب اعظم جاہ تشریف لائے۔ شاہ پرستی تو ہماری بیماری تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اتنی بڑی شخصیت کے سامنے اس ڈرامہ کو کون پیش کرے گا۔ اور کس کو تقریر کا اعزاز حاصل ہوگا۔ مولوی عبدالرحمن خاں نے ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سید عبداللہ سے کہا کہ تم دونوں میں سے کوئی اس فرض کو انجام دے ڈاکٹر زور نے کہا۔ نہیں، چونکہ سید محمد اکبر وفا قانی نے اس ڈرامہ کی ہدایت کاری کی ہے اس لئے وہی اس فریضہ کو انجام دیں گے۔ سیادت علی خاں نے کہا اکبر وفا قانی کچھ عجیب آدمی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ایک تقریر لکھ کر انھیں دے دی جائے۔ لیکن میں نے لکھی ہوئی تقریر پڑھنے سے انکار کیا۔ زور نے میری تائید کی۔ جس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا آپ اپنی تقریر میں یہ کہہ دیجئے "یہ طالب علمانہ کوشش ہے۔ اسے اسی نظر سے دیکھا جائے اور ہماری کمزوریوں کو معاف کیا جائے۔" اس پر زور نے کہا "دنیا میں سب سے بڑی کمزوری کمزوری کا اعتراف ہے۔ مجھے اکبر پر پورا بھروسہ ہے۔ اور اکبر یہ کہہ دیں کہ ہم نے اردو زبان کا یہ ڈرامہ بہترین اصول پیش کیا ہے۔ چنانچہ میں نے ایسی ہی تقریر کی اور ڈرامہ کامیاب رہا۔

اس واقعہ کے بیان سے یہ مقصد ہے کہ اس سے زور کی ہمہ گیر شخصیت نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ جو لوگ حیدرآباد کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کن مغلوں کے تصرف تک آزاد تھا اور وہاں کے ادیب اردو زبان کے بانی ہونے کی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ نصرتی، غواصی، سعدی، شاہ راجو، ہاشمی اور لاتعداد شعرا و ادیبوں کا نام لیا جاسکتا ہے جن کے قلب و دماغ پر کوئی غلامانہ پابندی نہیں تھی۔ مغلوں نے فارسی زبان سلطنت کی جو آصف جاہی دور میں بھی جاری رہی، یہاں تک کہ سالار جنگ ثانی نواب لائق علیخاں نے فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان قرار دیا یوں تو دکنی صلاحیتوں کے ابھرنے کا زمانہ مغلوں کی یورش ہی سے ختم ہوگیا تھا لیکن دفتری زبان کی تبدیلی کے واقعہ نے دکنی ذہنیت پر کاری ضرب لگائی۔ دکنی زبان تو قطب شاہ کی زبان تھی جو لکھی اور بولی جاتی تھی۔ اور اردو زبان جس کی ابتدائی شکل دکنی زبان ہے شمالی ہند میں ترقی پا چکی تھی۔ دفتری زبان کی تبدیلی نے حیدرآباد کے نظم و نسق کو لکھنؤ و دہلی کی زبان جاننے والوں کے ہاتھ میں منتقل کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جاگیردار طبقہ میں صلاحیتیں باقی نہ رہی تھیں اور دکنی زبان میں دفتری کام کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ شمالی ہند کی زبان کو اختیار کرنا اور اسے دفتر کے لئے استعمال کرنا ایک مدت کا متقاضی تھا۔ یہی وہ دور تھا جس میں ہم پیدا ہوئے یا خود زور پیدا ہوئے۔ ہماری حیثیت سیاسی یتیموں کی حیثیت بن گئی اور ہمارے بزرگ اسی سیاسی تبدیلی کی وجہ سے احساس کمتری کے شکار ہوگئے تھے۔

یہ جامعہ عثمانیہ کی برکت تھی کہ وہاں کے طالب علم اس احساس کمتری کے بندھن کو توڑنے کے قابل بنے۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ انگریزوں کے اقتدار نے اسی طرح انگریزی حاکم بنا دیا تھا جس طرح خارجی مغلوں کے زمانہ میں رہی اور اردو میں جامعہ کے قیام نے حکومت کے بااقتدار طبقہ کی اکثریت کو اس کا مخالف کر دیا۔ اور جو اس کے موافق تھے وہ مصلحت وقت سمجھ کر یا شبہ کی نظر سے اس کی بادل ناخواستہ تائید کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک صدر المہام نے اپنی تقریر میں کہا جامعہ عثمانیہ کیا ہے صرف ایک گاجر بوٹی ہے۔ ایک دوسرے بااقتدار نے کہا یہاں کے گریجویٹ

میڈان جاپان ہیں۔ اس سے اس مضحکہ خیز سلوک کا اندازہ ہو سکتا ہے جو جامعہ کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس کا ردعمل طلبا پر نہایت شدید پڑا چنانچہ وہ خود کو اہل ثابت کرنے کے درپے ہو گئے۔ اساتذہ اکثر اردو کے شیدا تھے وہ چاہتے تھے کہ اپنے طلبا کے ذریعہ یہ ثابت کر دیں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں سے اردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حیدر آباد جہاں اسد اللہ نے حفظان صحت پر پچاس صفحہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ "جان کی دشمن مکھی" تحریر کر کے ادبی انعام حاصل کیا۔ اور خورشید علی جو بعد میں "ناظم دفتر دیوانی وما ل" ہوئے، اسی قسم کا چھوٹا سا رسالہ "گوبھلے" کی زندگی پر لکھ کر ادیب کہلائے۔ ان کتابوں کی اشاعت کا زمانہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے کچھ پہلے کا ہے لیکن جیسے ہی جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل میدان میں آئے تو انھوں نے اس پوری مرعوب ذہنیت کا خاتمہ کر دیا۔

مجلہ عثمانیہ رسائل اردو کے مقابل آیا۔ اور زور کی کتابیں شائع ہوتے ہی ادب و تنقید کے صفحہ اول میں شمار کیجانے لگیں۔

جامعہ عثمانیہ کے طلبا نے مختلف مضامین کے ہر فن پر معیاری کتابیں لکھیں اور نام حاصل کیا۔

یہ خصوصی بات ہے کہ پروفیسر زور کا تذکرہ جامعہ عثمانیہ کی تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہم نے جامعہ عثمانیہ کا ذکر ضروری سمجھا۔

اپنے ساتھیوں میں میں خود زور سے بڑھ کر کسی کو عملی آدمی نہیں سمجھتا۔ انھوں نے خود کام کیا اور دوسروں کو کام کرنے کا اہل بنایا۔

اور اپنی زندگی ہی میں انھوں نے دکن میں "ادارہ ادبیات اردو" اور "ایوان اردو" قائم کیا تاکہ اس کے کام کو قیام و دوام حاصل رہے۔

زور خود داری، خود اعتمادی اور مسلسل محنت کا مجسمہ تھے

پروفیسر سید محمد

شاہ گنج سے ایوانِ اُردو تک

حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والے ہر دور اور ہر عہد میں گزرے ہیں۔ یہاں کے اکثر و بیشتر مصنفین اور شعرا نے ناموافق حالات اور ناقدردانی و کس مپرسی کے باوجود خلوص دل سے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس زبان کی خدمت کی ہے لیکن پچھلے پچاس برس کے عرصے میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ انھوں نے انتہائی ناموافق حالات اور مخالف فضا میں شاہ گنج کے قدیم اور پس افتادہ محلے سے اردو ادب کی خدمت کا آغاز کیا۔ اور اپنی مسلسل اور متقل کوشش سے نہ صرف "ادارۂ ادبیات اردو" کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا بلکہ خیریت آباد کے پُر فضا مقام پر "ایوان اردو" کی رفیع الشان عمارت تعمیر کر کے اس کو ہزاروں بیش قیمت مخطوطات، مطبوعات، دکن کی تاریخ تہذیب و تمدن کے نوادرات اور ادبی آثار کا ایسا قابل دید مخزن بنا دیا کہ آج ہندوستان بھر کے محققین اُردو اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور نہ صرف اردو کے پروفیسر، ادیب، نقاد اور محقق زبان و ادب ہی تھے بلکہ وہ بلاشبہ اردو کے ایک بڑے محسن اور ادیبوں کے سرپرست بھی تھے۔ انھوں نے ہر ادبی تحریک کے ساتھ دل سے تعاون کیا اور بیسیوں کو ادیب بنا دیا۔ ان کی ذات روشنی کا ایک ایسا اونچا مینار تھی جس کی روشنی سے نزدیک اور دور کے سب ہی ادیب مستفید ہو رہے تھے۔ بڑی مخلص طبیعت اور بے لوث خدمات کی وجہ سے وہ ایک ایسا مرکز بن گئے تھے جس کی طرف ہر ادیب اور ہر شاعر کھنچا چلا آتا تھا۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے تو وہ میکار واں تھے جن کی خوبے دل نوازی نے ہر کہ و مہ کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ترقی اور رفعت کی منازل پر فائز ہو کر خود ہی ان سے استفادہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ کشادہ دلی اور وسیع نظری سے دوسرے ادیبوں اور شاعروں اور خاص کر نوجوانوں کے جوہروں کو پرکھ کر ان کو بھی آگے بڑھانے کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ یہی چیز تھی جس نے ان کو اپنے تمام ساتھیوں اور ہمسروں میں ممتاز درجہ عطا کیا اور کیا دوست اور کیا دشمن سب ان کے خلوص کے قائل ہو گئے۔

زور صاحب کا خاندانی تعلق حیدرآباد کے مشہور طبقۂ معاش داران و اہل خدمات شرعیہ سے تھا۔ ان کی برادری میں علم و ادب کا خاصا چرچا تھا۔ ان کی برادری کے کئی افراد تصنیف و تالیف کا مشغلہ رکھتے تھے۔ ان کے والد بھی شاعر تھے اور اپنے زمانے کی ادبی دلچسپیوں میں برابر شریک رہتے تھے۔ زور صاحب اسکول کی زندگی میں مفید الانام اور سٹی ہائی اسکول میں میرے ہم مکتب تھے۔ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں تو کوئی بات ایسی نمایاں نہیں معلوم ہوئی جو ان کی آئندہ ادبی زندگی کی نشان زد کرنے والی ہو، البتہ کالج کی زندگی کے آغاز سے ہی ان میں ایک نمایاں فرق محسوس ہونے لگا۔

وہ مجھ سے ایک سال پہلے ہی کالج میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے اسکول میں باقاعدہ تعلیم پاتے ہوئے خانگی طور پر میٹرک کا امتحان دیا اور یہ امتحان پاس کر کے انٹرمیڈیٹ میں شریک ہو گئے۔ دوسرے سال جب میں نے ایچ۔ ایس سی کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لیا تو اُن سے اسکول کی ملاقات کی تجدید ہوئی اور ہم دونوں پھر ہم مکتب ہو گئے۔ انہی دنوں انھوں نے زور تخلص اختیار کیا جو ان کے والد مرحوم کے استاد کا تخلص تھا اور والد نے ہی تبرکاً اپنے بیٹے کے لئے تخلص پسند کیا پروفیسر وحید الدین سلیم کے فیض تعلیم نے ان میں بہت جلد ایسا ستھرا ادبی ذوق پیدا کر دیا کہ جب چار سال پڑھنے کے بعد وہ گریجویٹ ہو گئے تو انھوں نے بڑی سلیقہ مندی سے ادبی تنقید پر اپنی پہلی کتاب "روح تنقید" پیش کی جس کا تمام مواد انگریزی اور اردو کے پروفیسروں یعنے پروفیسر اسپیٹ، پروفیسر حسین علی خاں اور پروفیسر سلیم کے لکچروں اور ان کی متعلقہ ہوئی کتابوں سے حاصل کیا گیا تھا یہ جامعہ عثمانیہ کی پہلی ادبی پیش کش تھی۔ اس کا نام "روح تنقید" خود پروفیسر سلیم نے تجویز کیا تھا۔ اُن کی اس ابتدائی ادبی کاوش کا ملا جلا اخیر مقدم کیا گیا۔ بعض انصاف پسند اور علم دوست جیسے میر الرحمن خاں شروانی، پروفیسر محمود شیرانی، سر اس مسعود، عظمت اللہ خاں وغیرہ نے حوصلہ افزا رائیں لکھیں تو بعض تنگ نظر ادیبوں نے اس کی مخالفت شروع کی۔ ارباب جامعہ نے زور صاحب کی اعلیٰ قابلیت اور اردو ادب سے مناسبت کے مدنظر انھیں پورپین اسکالرشپ دے کر مزید تحقیقی کام کرنے جامعہ لندن میں داخلہ دلایا اور یہ طے کیا کہ یہی وحید الدین سلیم کے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ان کے جانشیں اردو کے پروفیسر مقرر کئے جائیں۔

زور صاحب نے تین سال یورپ میں تعلیم پائی۔ انھوں نے وہاں نہ صرف قدیم اردو پر پہلی بار ترقیاتی کام کیا اور عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے مخطوطات پر جو یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ تھے ایک بسیط نظر ڈال کر "اردو شہ پارے" مرتب کی بلکہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں اردو کے جو اہم تذکرے اور شعرا کے کلام کے مجموعے تھے، ان میں سے بہت سے بڑی محنت سے نقل کئے۔ نیز اردو کی لسانیات کا مطالعہ کر کے پیرس کے مشہور ماہر لسانیات جولس بلاک کے زیر نگرانی اس کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ جب وہ اپنی تعلیم ختم کر کے واپس ہوئے تو جامعہ عثمانیہ کا سا بقہ ماحول جہاں تک شعبۂ اردو کا تعلق تھا، بدل گیا تھا۔ بعض حضرات نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ اردو پڑھنے والے بھی عجب احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ وہ اپنی اچھی ادبی صلاحیتوں کے باوجود قلم اٹھاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ زور صاحب نے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت استاد قدم رکھتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ہونہار طلبا میں لکھنے کا جذبہ شدت کے ساتھ پیدا کیا۔ ان کی کوشش سے بہت جلد شعبۂ اردو کے طلبا میں سخن نگاری اور شعر و شاعری کا ایسا ذوق پیدا ہو گیا کہ اب ہر محفل اور مجلس میں ان کی صلاحیتوں کو سراہا جانے لگا۔ دو تین سال کے اندر زور صاحب نے ملک کے ہونہار ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کے اعتراف، ان کی نشر و اشاعت اور اردو ادب میں قدیم و کلاسیکی سرمایے کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کی طرف سے سب سے پہلے مخدوم اور میر حسن کی مثنوی کو تصنیف "ہوش کے ناخن" "ماہی و ڈرا مخدوم کی دوسری کتاب "لیگور" اور ان کی شاعری" اور میر حسن کی کتاب "مرد ڈس ورتھ" اور اس کی شاعری" میکش کا مجموعہ کلام "گریہ و تبسم" وغیرہ پیش کی گئیں تو جہاں ادب کے بعض بھیکے داروں نے ناک بھوں چڑھائی اور ان نو واردان کو چربوب کا مذاق اڑانا شروع کیا وہیں بعض مخلص سرپرستوں نے ان کی قدر افزائی کی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد مرحوم نے حوصلہ افزا

مکتوب کے ساتھ گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا۔ اس طرح ایک اور مخلص ادب دوست سجاد مرزا صاحب نے بلا طلب و درخواست کے ایک سو روپے بھیج کر بڑا حوصلہ افزا خط لکھا۔ مخالفتوں کے طوفان میں اتنی سی حوصلہ افزائی اور چند مخلص احباب کی ہمت افزائی نے زور صاحب کے حوصلے بلند کر دیے اور انھوں نے عزم بالجزم کے ساتھ اپنی ساعی کو تیز سے تیز تر کر دیا۔

قطب شاہی دور کے شاعروں کے مخطوطات کی تلاش گولکنڈہ اور اس کے قرب و جوار میں قطب شاہی آثار کی جستجو اور اس عہد کی روایات کی فراہمی کا ایک مستقل پروگرام بنایا گیا اور اس سلسلے میں گولکنڈے کی تاریخ "قدیم تاریخی اسناد" کتبوں کے چربوں اور کئی نامعلوم شاعروں کے دواوین اور مثنویات کے بیش بہا مواد سے اردو دنیا کو واقف کرایا گیا۔ ولی کے عہد سے لیکر عہد حاضر تک دکن کے نمائندہ شعرا کے منتخب کلام سے روشناس کرانے کے لئے مرقع سخن کے نام سے تین جلدیں اور کئی انتخابات شائع کئے گئے۔ تقریباً پانچ ہزار مخطوطات جمع کر کے تذکرۂ مخطوطات کی پانچ جلدیں مرتب و شایع کی گئیں جس سے ادبی تحقیقات کے سلسلے میں محققین کو بڑی سہولت حاصل ہوئی۔ اردو میں انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کی ایک جامع اسکیم بنائی گئی اور نمونتاً جو کتابچہ شایع کیا گیا اس سے اسکیم کی اہمیت و افادیت ظاہر ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے حیدرآباد کے سیاسی حالات کی تبدیلی نے اس اسکیم کو آگے بڑھنے سے روک دیا ورنہ یہ بھی ایک یادگار کارنامہ ثابت ہوتا۔

"نام نیک رفتگاں" کی یاد تازہ کرنے کے سلسلے میں زور صاحب کے کاموں کی ایک آخری کڑی "یوم محمد قلی" ہے جس کو وہ ہر سال بڑے اہتمام سے منایا کرتے تھے۔ یہ ایک ادبی مذاکرہ، ایک تقریبی میلہ اور قومی یک جہتی و جذباتی ہم آہنگی کی ایک ایسی تقریب تھی جس سے خاص و عام میں نہ صرف ایک ادبی بیداری ہی پیدا ہوئی بلکہ ماضی کی عظمت رفتہ کی یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کی ترقی کے احساسات بھی بیدار ہونے لگے۔ آج ایوان اردو اپنی خوب صورت عمارت ہی نہیں بلکہ اپنے قیمتی ذخیرۂ علم و فن اور بیش بہا نوادرات تہذیب و تمدن کی وجہ سے حیدرآباد کی ایک قومی یادگار اور ارباب ادب کے لئے ایک ایسا مرکز ہے جس کی سیر اور جس سے استفادہ ہر اردو ادب کیلئے از بس ضروری ہے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ الدین قادری زور مرحوم اُن محسنین اُردو میں سے تھے جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو بیش بہا جواہر پاروں سے مزین کیا۔ آپ انشا پرداز بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، ناقد بھی تھے اور شاعر بھی۔ آپ نے متعدد کتابیں مختلف موضوعات پر تصنیف کیں جن میں سے اکثر شائع ہو کر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ آپ ہی کی کوششوں سے حیدرآباد دکن میں ۱۹۳۷ء میں "ادارۂ ادبیات اردو" قائم ہوا، جو اردو کے فروغ دینے میں برابر کوشاں رہا ہے۔ اس ادارہ نے سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور ایک وقیع ماہنامہ "سب رس" نکال رہا ہے، افسوس کہ آج اردو ایسے بلند پایہ ادیب کی سرپرستی سے محروم ہو گئی حیف صد حیف۔

(ساہتی جام جم" لکھنؤ پاکستان۔ جلد ۲۔ شمارہ ۱۹۶۲ء)

احمد الدین احمد

آسمانِ اُردو ادب کا ایک اور سیّارہ

خاورِ ادب سے طلوع ہُوا، اُبھرا، اُبھر کر چمکا، اور سیّارہ بن کر جگمگاتا رہا۔ مگر قسمت میں شہابِ ثاقب کا رُوپ دھارن کرنا تھا، اس لیے آسمانِ اَدب سے ٹوٹا اور ٹوٹ کر ایک آن مِٹ کِرن چھوڑ گیا:۔

دُنیا عجیب مرحلۂ بے ثبات ہے
ہر ذی حیات کو یہاں آخر ممات ہے

جناب سیّد محی الدین قادری زورؔ مرحوم میرے حقیقی دوست تھے۔ اِن کے والدِ مرحوم سے میرے چچازاد بھائی جناب تمیز الدین احمد صاحب وکیل مرحوم ساکن پٹن، ضلع ورنگ آباد کو بڑی عقیدت تھی۔ وہ گاہے ماہے تشریف لاتے تھے اور مرحوم بھائی صاحب کے پاس ہی قیام فرماتے تھے۔ میرا بچپن تھا۔ مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ گو آج اس دیرینہ مدّت کو پچاس سال سے زائد عرصہ بیت گیا۔ میں اس وقت دس گیارہ میں تھا۔

طبیعت لاکھ مانوسِ قفس ہے ایک مدّت سے
مگر پھر بھی چمن کی یاد اکثر آہی جاتی ہے

مجھے وہ دِل چسپ مناظر اب تک یاد ہیں۔ وہ سادہ سادہ زندگی، معصومانہ بندگی، اخوت، محبت، خلوص و اخلاص سب کے سب بے لوث، تصنّع اور بناوٹ سے مُعرّا تھے۔ آج یہ چیزیں قلبِ انسانی سے ایسی غائب ہوگئی ہیں، جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ کوئی اَن ہونی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ "ہر کمال را زوال" کی پابند ہیں۔

میں نے زورؔ مرحوم کو بچپن میں نہیں دیکھا، نہ وہ کبھی اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ بلدہ سے پٹن تشریف لائے۔ جب میں ۱۹۲۱ء میں اقامت خانہ مسرت منزل میں قیام پذیر ہوا تو زورؔ صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات ہوئی۔ گورا گورا آفتابی چہرہ، ہلکے ہلکے گلابی رخسار، گداز جسم، ہلکی ہلکی سیاہی مائل مونچھیں، سر پر رومی ٹوپی، سفید سلک کی شیروانی زیبِ تن کئے۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تنہا تھا۔ سلام ہوا، مصافحہ کیا۔ اس کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ رسمی باتوں کے بعد فرمایا کہ آپ کے مضامین کیا ہیں۔ میں نے کہا۔ "تاریخ، اسلامیات، معاشیات اور سیاسیات۔ پھر خود ہی فرمایا کہ "میں نے السنہ لی ہیں۔ مجھے ان سے بے حد دِل چسپی ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہو جاتے تو بہت اچھا تھا۔ مجھے اُردو زبان کے شوق نے مجبور کیا کہ آپ سے ضرور ملوں۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ آپ کی اُردو زبان بڑی پیاری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مادری زبان ہوتی ہی پیاری ہے جو ایک متمدن ماں کی پیاری آغوش سے ورثہ میں ملتی ہے۔ سیکھنے سے نہیں آتی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم حیدرآبادیوں کی زبان بڑی خراب ہے۔

رفتہ رفتہ سدھر جائے گی۔ ابھی تو داغ بیل پڑی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اورنگ آباد کا ذکر چھڑا تو فرمایا کہ میرے والد صاحب بھی اورنگ آباد اور پٹن جایا کرتے تھے۔ پٹن میں خاص کر وکیل صاحب کے پاس ٹھیرا کرتے تھے۔ اس پر مجھے اپنا بچپن یاد آگیا۔ میں نے جب تفصیل بتائی تو بے حد مسرور ہوئے۔ فرمایا کہ پھر تو آپ کے ہمارے تعلقات پہلے ہی سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ انشاء اللہ حاضر خدمت ہوتا رہوں گا۔ میں بھی اس طرح زور صاحب سے قریب تر ہوتا گیا۔

زور صاحب حقیقت میں پاک باز، پارسا، بے حد بلند کردار، سادہ مزاج اور خوش گفتار تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں، جب تک میں ان کے ساتھ رہا اُن کو کبھی متفکر، اُداس اور غمگین نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہنس مکھ دیکھا۔ ان کا وہ ہنس مکھ اور بھولا بھولا چہرہ اب تک مجھے یاد ہے۔ جب آپ آتے، ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے اور کہتے بھیا! آپ کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، اس لیے آپ کے آرام اور مطالعے میں مخل ہوتا ہوں۔ آپ کو میرا آنا بار گراں تو محسوس نہیں ہوتا۔ میں عرض کرتا۔ زور صاحب! آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ جیسے بے لوث محبت کے دیوتاؤں سے ملاقات اور دو گھڑی مل بیٹھنے کے وقفے کو میں خدا کی اُن انمول نعمتوں اور رحمتوں میں سے ایک بیش بہا نعمت سمجھتا ہوں۔ یہ درس ہم نے اپنی ماں کے آغوش سے پایا ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو کسی کے آنے کو زحمت تصور کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی کسی روز نہ آئے تو ہم اسے اپنی بدبختی پر محمول کرتے ہیں۔ آپ کے آنے سے مجھے کوئی نہ کوئی درس مل جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے میرے خاندان کو آپ کے خاندان سے جو گہری عقیدت ہے۔ میرے ذہن کے تو کسی بھی گوشے میں یہ احساس ہی موجود نہ تھا کہ ایسے بھی لوگ دُنیا میں موجود ہیں کیونکہ ہم ایسے ماحول سے واقف ہی نہ تھے۔ زور صاحب نے متاثر ہو کر فرمایا بھیا! جب آپ کے پاس آتا ہوں تو آپ کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں عرض کرتا کہ مجھے بھی آپ سے بہت کچھ حاصل ہوتا رہتا ہے اس لیے میں بھی آپ کی آمد کو باعث رحمت سمجھتا ہوں۔

الغرض ایک مدت کے بعد تو یہ حالت ہوئی کہ زور صاحب کے بہت سے ملاقاتی اور دوست احباب میرے پاس آنے لگے۔ اب تو میرے کمرے نے لندن کے "بٹن کافی" کی صورت اختیار کر لی تھی۔ روزانہ کسی نہ کسی عنوان پر بحث ہوتی تھی۔ کھل کر خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی تھیں مگر وہ حد ادب سے گرنے نہ پاتی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے اقامت خانے کے ملازمین بھی بڑے مودب اور مہذب بن گئے۔ ان کے آپس کا مذاق اور دل لگی بھی ادب کی حد میں ہستی تھی۔ میں نے تو اس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا مگر زور صاحب نے اسے محسوس کیا کیونکہ وہ بہت باریک بیں تھے۔ ذرا ذرا سی چیزوں پر نظر رکھتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے۔ احمد بھیا! ذرا ان ملازموں کو تو دیکھو کیسا شستہ مذاق کر رہے ہیں۔ ہماری صحبتوں کا بھی ان پر کتنا نایاب اثر ہوا ہے اور کیوں نہ ہو بھیا! دیکھو نا! ریڈیم جس کان یا مٹی سے نکلتی ہے اس کو بھی اپنے نور سے منور کر دیتی ہے۔ بھلا! ہم تو انسان یعنی اشرف المخلوقات ٹھیرے۔ ہم کو ریڈیم سے زیادہ اپنے ماحول کو متاثر کرنا چاہیے ایسا نورانی کہ حقیقی نور کا دھوکا ہو۔ میں نے عرض کیا۔ زور صاحب! آپ بہت حساس ہیں۔ بہت ہی اعلیٰ و ارفع تخیلات سے مرصع ہیں۔ خدا آپ کی دعا قبول کرے اور آپ بھی اسم بامسمیٰ ثابت ہوں۔ آمین ثم آمین۔

کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ "پوت کے پاؤں پالنے میں"۔ زور صاحب نے مادر علمی کے پالنے میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" تھے۔ مجھے ان کی رفاقت سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ دُھندلی کرن ضرور ایک نہ ایک روز جگمگا اُٹھے گی، اور اپنے نور سے ایک عالم کو ریڈیم کی طرح ضرور منور کرے گی۔ گو وہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں، مگر اُن کی اَن تھک کاوشوں کا پنجور، ذہنی صلاحیتوں کا ثمر، بے پناہ اُمنگوں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر، علمی اور ادبی تحقیقاتوں کے اُبلتے

ہوئے سوتے، وہ ادبی کان کے اَن مول سنگ ریزے اور جواہرات، جو انھوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے برآمد کئے ہیں وہ سب ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ان کا مطمحِ نظر جامعاتی زندگی میں زور صاحب نے جب میری تحریرات کو بغور دیکھنا شروع کیا تو نہایت متاثر ہوئے۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ بھیّا! ان کو شائع کیوں نہیں کرتے۔ کب تک دبائے رکھو گے۔ کسی رسالے میں بھیج دو۔ عرض کیا زور صاحب! میں شہرت کا خواہاں نہیں۔ اور ابھی تو میں طفلِ مکتب ہوں۔ میں کیا اور میری تحریر کیا! اس پر انھوں نے فرمایا کہ بات قطعی غلط ہے۔ میرا تو مطمحِ نظر یہ ہے کہ ادبی کاوشوں کو ضرور منظرِ عام پر آنا چاہئے۔ ان پر قید و بند کی مصیبت نازل کرنا ایک قسم کا گناہ ہے۔ میں تو کم از کم ایسا نہیں کر سکتا اور نہ کروں گا۔ میں تو ہر اس چیز کو کھود کر نکالوں گا جو قابلِ اشاعت ہو اور اس کو ساری دُنیا کے سامنے پیش کروں گا۔

اس واقعہ کے بعد ایک عرصہ گزر گیا۔ میں اپنی تحریرات اور مضامین مُقفّل رکھتا تھا۔ ایک روز زور صاحب بڑے زور سے کمرے میں آدھمکے اور زور دار سلام کے بعد مُسکراتے ہوئے میز کے پاس آگئے۔ ایک رسالہ میز پر رکھا اور فرمایا بھیا! رسالہ کیسا ہے۔ عرض کیا بہت اچھا اور خوشنما ہے۔ فرمایا۔ ذرا دیکھو نا! کیا پیارا نام ہے! عرض کیا بے شک بہت پیارا نام ہے۔ "غنچہ"! پھر فرمایا۔ ذرا اندر تو دیکھو پہلے صفحے پر نظر ڈالی تو میرے مضمون کا عنوان تھا اور اس کے نیچے میرا نام چھپا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معمّہ ہے۔ یہ تو مقفل ہے، چھپا کیسے۔ میں نے زور صاحب پر نظر ڈالی تو جھٹ کہنیوں تک ہاتھ جوڑ کر فرمایا کہ۔ مجھے معاف کیجے تو بتاتا ہوں۔ فرمایا کہ میں نے چوری کی اپنے مطمحِ نظر کے تحت۔ قفل کھول کر یہ مضمون نکالا اور شائع کرا دیا۔ اب آپ وہ سزا دیں جو چور کی ہے۔ میں بجائے خفا ہونے کے مُسکرا دیا اور کہا۔ زور صاحب اتنی عجلت کی ضرورت نہ تھی۔ خیر اب آپ کی مرضی۔ پھر تو وہ مضامین لے جاتے تھے اور مجھے اطلاع دیئے بغیر رسالوں میں چھپوا دیتے تھے۔ غرض کہ ان کا یہ کردار حقیقت میں قابلِ تعریف تھا۔

مخصوص کردار زور صاحب بچپن ہی سے صلح کل واقع ہوئے تھے۔ لڑائی ہو یا کشمکش، شکر رنجی ہو یا نفاق، اپنوں میں ہو یا غیروں میں، دوستوں میں ہو یا ملنساروں میں، وہ ان سب کو کبھی برداشت نہ کرتے تھے۔ ان کو میں نے کبھی کسی پر خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ جب دیکھا تو پیار محبت سے بات کرتے ہی دیکھا۔ خواہ وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو۔ دوستوں میں ذرا بھی اَن بن ہو گئی تو فوراً ملاپ کرا دیتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دُنیا دو روزہ ہے۔ چند روز گزارنے ہیں تو ہنس کھیل کر کیوں نہ گزاریں اور ہنستے کھیلتے قادرِ مطلق سے کیوں نہ جا ملیں تاکہ ہمارے بعد دُنیا ہمارا ذکرِ خیر کرتی رہے۔ یہی زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے۔

اب میں پروفیسر عبدالمجید ملک کی مشہور نظم "ہم لوگ" کے دو شعر درج کر کے ختم کرتا ہوں۔ تھوڑی سی ترمیم اور معانی کے ساتھ۔

"ادیب"

لکھتے ہیں شہ رگ سے تواریخ ادب کی — اور فتح مبیں ہوتی جدھر جاتے ہیں یہ لوگ
تاروں پہ فضاؤں پہ سمندر پہ کمندیں — سب تابع و مسجود جدھر جاتے ہیں یہ لوگ

حبیب ابراہیم

ڈاکٹر زور حیدرآباد سے کشمیر تک

ڈاکٹر زور پر جب کبھی بھی قلم اٹھانا چاہا تو یہ خیال آیا کہ ان پر لکھوں تو کیا لکھوں۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ ڈاکٹر زور جیسی شخصیت کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ہاں سچ تو ہے۔ لیکن ان کے پرستاروں نے ان کی زندگی ہی میں ان کی زندگی کے ہر رخ کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ کسی نے خاندانی حالات بیان کئے تو کسی نے ابتدائی مدرسہ سے لندن میں اعلیٰ تعلیم کا حال بیان کر دیا۔ کسی اور نے ان کی تصانیف و تالیفات پر روشنی ڈالی، تو کسی نے ان کی انتظامی صلاحیتوں کو سراہا یا، اور کسی نے ان کی اردو کی خدمات کے ترانے گائے۔ اور جب کسی کو کچھ نہ سوجھا تو انکی شخصیت کا پیکر صفحۂ قرطاس پر کھینچ کر رکھ دیا۔ ان کے چاہنے والوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ وہ بات کس انداز سے کرتے ہیں، چلتے کیسا ہیں۔ کس قسم کے کپڑے پہنتے ہیں اور کونسا لباس ان پر جچتا ہے۔ شاگردوں اور دوستوں کی محفلوں میں کیسے رونق محفل بنے رہتے ہیں، مہمان نوازی کا کیا حال ہے۔ کوئی ملاقاتی آئے تو اسے چائے ضرور پلوائیں گے اور خود وقفہ وقفہ سے پان کھاتے جائیں گے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ سرسری نظر رکھنے والا ایک طالب علم ان کی زندگی کا کونسا نیا پہلو اپنے لئے ڈھونڈ نکالے ——— تو پھر میں کیوں نہ یہ کروں کہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر مختصراً کہہ دوں ———

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو حیدرآبادی روایتی تہذیب و شائستہ زندگی اور مذہبی پیشوائی میں اپنی ایک مثال رکھتا ہے۔ وہ دکن کے ایک صوفی حافظ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعم رفاعی القادری کے صاحبزادے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب دکن کے مشہور صوفی اور ولی سید شاہ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان ؒ قندھاری سے ملتا ہے۔ حافظ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعم نہ صرف مذہبی پیشوا تھے بلکہ اپنے وقت کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اس طرح ڈاکٹر زور مذہبی اور ساتھ ساتھ ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ اس پر انکی خداداد صلاحیت و ذہانت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ علمی مراحل اعلیٰ کامیابی کے ساتھ طے کئے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کا امتحان درجہ اول سے کامیاب کیا۔ اور اپنے مضامین انتخاباری اردو و فارسی میں غیر معمولی امتیاز حاصل کیا، جسکی بنا پر وہ سرکاری وظیفہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن روانہ ہوئے۔ وہاں ڈاکٹر زور نے آریائی زبانوں کے تقابلی مطالعہ اور اردو پر تحقیقاتی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مدت معینہ تین سال کی بجائے دو سال میں حاصل کر لی۔ وہاں سے پیرس گئے اور صوتیاتی تحقیق کے ادارے میں "تجرباتی صوتیات" پر کام کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے اور جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔

ڈاکٹر زور زمانہ طالب علمی سے اپنی زندگی کے آخر لمحہ تک تصنیف و تالیف کے کاموں میں منہمک رہے۔ اردو ادب کی دنیا ایسی صنف ہے جو ان سے چھوٹی ہے۔ وہ ایک ادیب، ناقد، محقق، مورخ، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ ڈاکٹر زور سے اگر کوئی یہ سوال کرتا کہ آپ کی تصانیف کی جملہ تعداد کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ صحیح تعداد نہ بتلا سکتے۔ چنانچہ ایک دن میں نے یہی پوچھا تو فرمانے لگے "میرا کام لکھنا ہے اور بس، تعداد کسے یاد ہے۔" ایک لمحہ توقف کے بعد پھر کہا "دیکھو وہاں میری نئی کتاب کا پروف رکھا ہوا ہے، شروع کے صفحات پر میری تصانیف و تالیفات کی فہرست فن وار دی گئی ہے، اسے گن لو۔" میں نے اسے گنا، لیکن وہ بھی مکمل نہ تھی۔ ہاں ان کی مشہور کتابوں کے نام یاد ہیں جو درج ذیل ہیں:—

"روح تنقید۔ تنقیدی مقالات۔ روح غالب۔ اردو شہ پارے۔ اردو کے اسالیب بیان۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ داستان ادب حیدر آباد۔ حیات میر مومن۔ فرخندہ بنیاد۔ حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ سرگزشت غالب۔ سرگزشت حاتم۔ گارساں دتاسی۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ دیوان زادہ حاتم۔ مرقع سخن جلد اول و دوم۔ متاع سخن۔ کیف سخن۔ بادۂ سخن۔ فیض سخن۔ رمز سخن۔ مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ مشاد اقبال۔ مارشاد نامہ۔ ابراہیم نامہ۔ سیر گولکنڈہ۔ طلسم تقدیر۔ اور گولکنڈے کے ہیرے۔"

ڈاکٹر زور نے تصنیف و تالیف کے علاوہ اردو ادب کی خدمات کے لئے "ادارۂ ادبیات اردو" کی بنیاد ڈالی۔ اور اس ادارہ سے اردو کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن کام کیا۔ ناخواندہ بالغان اور بچوں کے لئے اردو کے پڑھائی گھر اور مختلف مدارج کے امتحانات کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہ نفس نفیس ان انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔ یہ تحریک اتنی عام ہوئی کہ ریاست حیدر آباد کے کونے کونے میں اردو کے امتحانات منعقد ہوئے۔ ڈاکٹر زور نہ صرف خود لکھتے تھے بلکہ دوسروں میں بھی لکھنے کا شوق پیدا کرتے تھے۔ انھوں نے بے شمار ادیبوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ وہ لوگ جو قلم پکڑنا بھی نہیں جانتے تھے ان کی بدولت لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے اور صاحب کتاب یا دیوان کہلائے۔ ڈاکٹر زور جب کیمبرج تشریف لائے تو یہاں بھی نوجوانوں اور طالب علموں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا، اور ہمت افزائی کے لئے ان کی تحقیقات کی اشاعت کا ادارۂ ادبیات اردو سے انتظام کیا۔

ڈاکٹر زور کی ایک کمزوری دکن سے محبت تھی۔ وہ اس والہانہ محبت میں اتنے گرفتار تھے کہ وہ ہمیشہ دکھنی تہذیب اور دکھنی اردو ادب کے علاوہ کسی پر قلم نہ اٹھاتے۔ یہاں تک کہ بات کرتے تو دکھنی لہجہ میں ڈوبی ہوئی۔ ان کی اس محبت کا اگر کسی کو تاج محل دیکھنا ہو تو وہ "دیوان اردو" دیکھے جو دکھنی تہذیب و تمدن کا ایک میوزیم ہے۔ اور جس کے ہر زاویہ میں دکھنی تہذیب و تمدن کی ان گنت کہانیاں کروٹیں لے رہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو نے دلی اور لکھنؤ میں جنم لیا۔ لیکن حیدر آباد کے گہوارے میں پروان چڑھ کر کاخ جوانی میں قدم رکھا۔ غالباً یہی وہ بات تھی کہ ڈاکٹر عبدالحق سے ان کی نہیں بنتی تھی۔

ڈاکٹر زور، سرزمین دکن کا وہ کوہ نور ہے جس نے اپنے مادر وطن کو دنیائے اردو ادب میں ایک اونچا مقام دیا۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ حیدر آباد کا ہے

ڈاکٹر زور کو دکھن اور دکھنی ادیبوں اور شاعروں سے اتنا پیار تھا کہ وہ دکھن کی بھولی بسری کہانیوں کو زندہ کرتے تھے۔ اگر انھیں کوئی یہ بتاتا کہ فلاں قبرستان میں فلاں شاعر کی قبر ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کے سر ہی ہو جاتے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک قبر دیکھ نہ آتے۔ اگر قبر شکستہ حالت میں ہوتی تو اسے درست کرواتے اور ایک کتبہ لگواتے۔

ڈاکٹر زور کو قلعہ گولکنڈہ اور سلاطین قطب شاہیہ کی تاریخ سے بہت پیار تھا۔ قطب شاہی دور اور قلعہ گولکنڈہ کی گویا وہ ایک انسائیکلو پیڈیا تھے۔ قطب شاہی دور کا ہر واقعہ ان کی نوک زبان پر تھا اور اس طرح سناتے تھے جیسے وہ ان کے مصاحب رہے ہوں۔ انھیں قطب شاہی عمارتوں کے متعلق اتنی معلومات تھیں کہ وہ ان کے طرز تعمیر سے یہ بتاتے کہ کس بادشاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ حیدرآباد کے تقریباً بہت سارے علم قطب شاہی بادشاہوں نے شروع کئے ہیں اور وہ علم کو دیکھتے ہی کہہ دیتے کہ فلاں بادشاہ نے فلاں منت کی تھی اور منت برآنے پر یہ علم ایستادہ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر زور دکن کی زندہ تاریخ تھے۔

جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر دکھنی تہذیب و تمدن کا یہ دلدادہ اور حیدرآباد کا شیدائی اپنے وطن سے بہت دور کشمیر چلا آیا ـــــ وہ کونسی کشش تھی جس نے ان کی دکھنی تہذیب و تمدن سے والہانہ محبت پر غلبہ پا لیا ـــــ اردو کی ترقی و ترویج کی خواہش کے سوا کیا ہو سکتی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کشمیر آنے کے چند دن پہلے ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تھا کہ دکن چھوڑتا آپ کیسے گوارا کر رہے ہیں۔ تو کہا کہ شاید خدا مجھ سے کشمیر میں اردو کی خدمت لینا چاہتا ہے۔ اور اسی لگن میں وہ وطن سے نکل پڑے۔ کسے معلوم تھا کہ زور کو غربت راس نہ آئے گی اور وطن بھی چھوٹ جائے گا۔

ان ہی تمناؤں سے لبریز وہ وادی بے نظیر، کشمیر جنت نظیر آئے۔ لیکن ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ۱۹۶۲ء کا ستمگر مہینہ آن پہنچا۔ ستمبر کا تیئیسواں (۲۳) دن ان کی صحت مند زندگی کا آخری دن تھا۔ اور وہ دن بھر مصروف رہے احباب سے ملاقات کی۔ رات میں کھانے کے بعد ½ ۱۰ بجے تک اپنے چھوٹے لڑکے کو پڑھاتے رہے اور پھر سو گئے ـــــ رات کو کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگے آواز سنکر بیگم صاحبہ بیدار ہو گئیں ان سے کہا بیگم صاحبہ میرے دل اور بائیں ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ سہم کر رہ گئیں۔ اتنی دیر میں ان کے بڑے لڑکے سید تقی الدین صاحب قادری نیند سے بیدار ہوئے اور دوڑے ہوئے ڈاکٹر کے ہاں پہنچے۔ علاج ہوتا رہا۔ دن بھر دل کا درد زوروں پر رہا۔ شہر کے مشہور ڈاکٹروں نے متفقہ علاج شروع کیا لیکن مشیت ایزدی کے آگے کچھ نہ چل سکی۔ ۲۴ اور ۲۵ ستمبر کی درمیانی رات میں ساڑھے سات اور ۸ بجے کے درمیان ڈاکٹر زور سبھوں کو داغ مفارقت دے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

جہاں بانو نقوی

ڈاکٹر زورؔ مرحوم

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ میں تو اس موضوع پر کچھ لکھنے کو ٹال رہی تھی۔ مگر اس طرح پہلو بچانے بھی کون دیتا ہے۔ دل کٹتا ہے ڈاکٹر صاحب پر کچھ کہنے سُننے کو۔ مجھے تو اب بھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ زندہ ہیں۔ اور وہ کشمیر سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے کشمیر طیاروں میں گھوم رہے ہیں۔ آجا رہے ہیں۔ جیسے گھر آنگن کی بات ہو۔ مگر نہیں۔ وہ تو اب ہمیشہ کے لیے چُپ ہوگئے ہیں۔ گویا اب اُردو سے انھیں کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ اس روٹھے ہوئے معشوق سے وہی خفا ہوگئے۔ زخم تمنا کہاں تک کھاتے۔ کوئی حد بھی تھی آخر۔ صرف وعدے ہی وعدے۔ وفا جن کی مشکل ہو۔ انسان ہونے کے ناطے اپنے چھوٹے چھلے سینے میں بھی ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے۔ اُردو پر آئے دن کے ظلم وستم سہتے سہتے ایک ایسا بھی دن آیا کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی اُمنگیں بھی سوگئیں۔ وہ بھی چُپ ہوگئے۔ دل نے بھی ہمت ہار دی۔ انا للہ۔

مولوی عبدالحق مرحوم کے لہجے سے ہی ایسا لگتا ہے کہ اُردو کے مستقبل پر ماضی کی دُھند چھائی چلی جارہی ہے۔ مولوی صاحب تو اُردو کو کس میرسی کے عالم میں چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چل دیئے۔ اور وہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔ علامہ راشد الخیری اور مولوی نذیر احمد کا سارا خاندان اپنے عصمت وساقی کی خیر مناتے ہوئے پاکستان منتقل ہوگیا۔ حمید الدین شاہد بھی سوچ رہے کہ اگر یہاں رہوں تو بار بار اُردو کے جلسوں میں اس زبان کی خوبصورتی، دلکشی، نکھار اور تیکھے پن کی خواہ مخواہ بھی گواہی دینی ہوگی۔ وہ حضرت بھی اس زبان کی ناؤ کو منجدھار میں ڈولتا ڈگمگاتا چھوڑ کر ساحل کا سہارا لے چکے۔ نیازؔ صاحب کی بے نیازی بھی حد سے گزری کہ نصف سے زائد عمر عشق بتاں کا دم بھرنے کے بعد جی بھر گیا۔ اور اب مسلمان ہونے کی سوجھی۔ چلو میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا۔ اور ان سے پہلے جوشؔ بھی دیارِ ہند سے رُوٹھ کر ارضِ پاک میں مقیم ہوگئے ——— اور یوں بس پاسباں ملتے رہے کعبہ کو صنم خانہ سے ——— زورؔ نے یہ سب کچھ دیکھا۔ بڑے ٹھنڈے دل سے۔ غور کرتے رہے۔ سوچتے رہے۔ اور پھر خیال آیا کہ نہیں ——— ع عاشقاں آپ جلے اپنا دل آرام بھلا ——— مصیبت کے وقت ہی ساتھ دینا کمال ہے۔ ہمدردی کا تو یہی موقع ومحل ہے ؎

دل ناکام سہی، پھر بھی تو اپنا دل ہے
یہی ناکام بُرے وقت میں کام آتا ہے

ان کے نام میں زندگی اور تخلص میں طاقت تھی۔ وہ اس طاقت کے سہارے اُردو کو بھی طاقتور بنانا چاہتے تھے۔ اس کو زندہ رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ منصوبے بناتے۔ کام کرتے۔ کام کرواتے۔ کام سے جی چرانے والوں کو ڈانٹ بھی رہے ہیں۔ جھنجھلا بھی

ہو رہے ہیں۔ طنز بھی کر رہے ہیں۔ ایسا طنز جس کو سُن کر اپنے لاجوں آپ مرنے کی نوبت آئے ——— مگر اب یہ سارا طیش، غصہ، اظہار خفگی کہاں گیا۔ ایسے چپ چپاتے، بیٹھے بیٹھے چل پڑے کہ گویا جنت سے کسی اردو جلسہ کی صدارت کا بلاوا آیا ہو۔ اور جانا ناگزیر ہو گیا ہو۔ اب ان کی بلا سے، ان کو کیا کہ ان کے بعد ان کے پس ماندوں پہ کیا گزری۔ بچوں کو یتیمی دے گئے۔ اُردو کمزور ہو گئی۔ ایک ایک کا مُنہ تکنے لگی۔ اور یکم زور پر جو قیامت ٹوٹی اس کے اظہار کے لیے تو قلم سرنگوں ہے۔ کشمیر جنت نظیر کے خوبصورت مناظر بھی ان کو کاٹ کھانے کو آ رہے ہوں گے ——— اُداسیاں ہی اُداسیاں ؎

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ، دوم خاک گور

ڈاکٹر صاحب کو تو دونوں ہی لے گئے ——— آب و دانہ بھی اور خاک گور بھی ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

زور ایک ادارہ تھے۔ ایک جامعہ۔ ایک لائبریری ——— ہر لفظ ان کے لیے موزوں بیٹھتا ہے۔ اپنے چھوٹے سے کتب خانے کو ایک ادارہ کی شکل دی۔ اور پھر وہ ایوانِ اُردو بن گیا ——— دُنیا کے کونے کونے سے ریسرچ سکالر یہاں آ آ کر اپنی علمی و ادبی پیاس بجھانے لگے۔ جو چیز کہیں نہ ملی ——— وہ یہاں مل گئی ——— ڈاکٹر صاحب عمر بھر ادارہ کی علمی و ادبی وسعتوں کو پھیلاتے رہے۔ بڑھاتے رہے ——— ادھر ادارہ نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے۔ ایک ہی بات ہے۔ اور پھر ادارے سے بات سب رس تک پہنچی ———

خیر اُردو غریب کو رہنے دیجئے۔ اس کے حال زار پر ترس کھانے والے اب بھی گنتی کے رہ گئے ہیں۔ زور اس کا سارا طنطنہ اور دبدبہ لے گئے ——— مگر پھر بھی یہ لشٹم پشٹم لڑ پڑ کر زندہ رہے گی۔ مرے گی نہیں ——— زبان اور ایسی ہر دل عزیز اور زندہ زبان۔ سخت جان ہونے پر بھی اس میں اتنی لچک ہے کہ مُڑ جائے گی مگر ٹوٹے گی نہیں۔

زور مرحوم بڑے عزم اور حوصلے کے آدمی تھے۔ وہ اپنی زبان کی طاقت سے اپنے شاگردوں کو بلند حوصلگی دیتے۔ اچھے کارکن ہی نہیں۔ بہت اچھے کارفرما بھی تھے۔ کام کرنے کی جتنی صلاحیت، کام لینے کی بھی خوب مہارت۔ بڑی سختی سے کام کرواتے ——— ان کو قریب سے جس نے دیکھا وہی انھیں سمجھ سکا۔ ان کی مصروفیات میں کتنا تنوع تھا۔ ایک انار سَو بیماروں کا معالج بن گیا تھا۔ ادھر ایک کالج کے پرنسپل بھی ہیں۔ اُدھر زنانہ کالج میں اُردو ایم۔ اے کی طالبات کو لکچر دینے بھی آ رہے ہیں۔ پھر ادارے کے بیسیوں کام۔ ان سے بھی بے تعلق نہیں۔ آدارہ تو ان کی شہ رگ سے بھی قریب تھا۔ دعوتیں ہو رہی ہیں۔ مشاعرے، ادبی جلسے۔ کسی مہمان کی آمد پر عصرانہ۔ جہاں ہر مہمان سے بطورِ خاص پوچھتے پھریں گے۔ "ارے آپ تو کچھ بھی نہیں کھا رہے۔ بس باتوں سے پیٹ بھرتے آئے ہیں۔" اور پھر دیکھتے دیکھتے سینی بھر لوازمات آپ کے سامنے ہوں گے۔ اصرار ہوگا۔ جیسے کچھ لکھوانے پر جبر ہوتا تھا ویسے کھلانے پر بھی مُصر ہو جاتے۔

لباس دیکھو تو درویشوں کا سا۔ اور انھیں درویشوں جیسے صاف گو اور صاف باطن بھی۔ لگی لپٹی نہیں رکھیں گے۔ جو مُنہ میں آگیا کہہ دیا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں جس سے دل دُکھے۔ حساس بالکل نہیں لگتے تھے۔ مگر حساس دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے۔ ابھی قہقہہ سُنائی دیا کہ دیکھتے دیکھتے ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

طالبِ علموں کی جان کے ساتھ ساتھ پان بھی بہ کثرت کھاتے ——— جان کھانا اس لیے لکھ رہی ہوں کہ ان کے پاس ایم۔ اے

ابتدائی کا سال بڑا کٹھن گزرا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم دل لگا کر نہیں پڑھتے۔ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ انھیں ہم سے غلط فہمی اور ہمیں اپنی حد تک یہ خوش فہمی کہ سب کچھ جی جان سے سُن رہے ہیں۔ "کچھ سمجھ میں آیا میں جو کہہ رہا ہوں؟" ـــــ اور کلاس سے آواز آئی۔

"بالکل ڈاکٹر صاحب ـــــ آپ کو ہم سے آخر یہ بدگمانی کیوں ہے کہ ہم کلاس میں حاضر رہ کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں ـــــ"

"میں کہہ رہا ہوں مطالعہ کو وسیع کیجئے۔ پڑھئے۔ خوب پڑھئے۔ پڑھنے کے بعد ہی طالب علم لکھنے کا اہل ہوتا ہے" ـــــ مگر ان کو کیا خبر کہ یہ نامراد نصابی کتب سے ہٹ کر ہمارا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ اور دوسرے سال جب انھوں نے دیکھا کہ پڑھتے وڑھتے تو خاک نہیں مگر امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب ذرا ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ ویسے ہم غائے تو نہ تھے۔ لیکن جی چاہتا تھا ان کی ڈانٹ سُننے کو۔

اِن کی بیسیوں کتابوں میں سے مجھے سیرِ گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے بہت پسند ہیں۔

اِن کے نہ جانے ہماری طرح کتنے ڈھیر سارے طالب علم ہوں گے جو ہندو و بیرونِ ہند میں بکھرے ہوئے ہوں۔ اور اس "استادگر" کے کتنے ہی شاگرد آج اُستاد بن گئے۔ اور بس یونہی چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے۔ ہر جلتا ہوا چراغ یہی سمجھے گا کہ یہ تو میری اپنی ہی روشنی ہے۔ کسی شمع نے اسے جل جل کر، پگھل پگھل کر جلایا ہی کب تھا۔ اور اس طرح اپنے اُستاد کو سب ہی بھول جاتے ہیں۔ کون بھلا کس کو یاد رکھے۔ بھلا استاد بھی کوئی یاد رکھنے کی مخلوق ہے۔ بقول ظ۔ انصاری "کندھوں پر چڑھ کر بیٹا کہتا ہے میں باپ سے بڑا ہوں۔ بیٹا یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے قد میں باپ کا قد بھی شریک ہے" ـــــ اور شاید ایسے موقعوں کے لیے نارسس پرتاپ گڑھی کہہ گئے ہیں ؎

بٹھا کے دوش پہ جن کو نکالا پستی سے
پہنچ کے عرش پہ وہ لوگ ہم کو بھول گئے

اور بھئی یہ جانے والے اکثر بس ایسے ہی کسی چور دروازے سے کھسک جاتے ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے سُنتے نہیں۔ اور ان کے پیچھے ایک خیال نغمہ بن کر فضاؤں میں گونجتا گنگناتا رہ جاتا ہے ؎

سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو
پر حیف کہ روبرو نہ سمجھے

بس رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر زورؔ کی موت دُنیائے ادب اردو کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ مدتوں اس نقصانِ عظیم کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اُردو کے استحکام و بقا کے لیے اتنے کام کئے ہیں ان کا نام امٹ ہو گیا ہے۔

ضیاالدین احمد برنی
کتابی دنیا کراچی

نظر حیدر آبادی

زور صاحب!

کیا زندگی کبھی مر سکتی ہے؟ ——— کیا جہد و عمل کے جلائے ہوئے چراغ کبھی فنا کے جھونکوں کی زد میں آ سکتے ہیں؟ ——— اگر جواب نفی میں ہے تو میں کیسے مان لوں کہ زور صاحب مر گئے، مجھے یقین ہے کہ اب بھی سورج کی پہلی کرن دبے پاؤں جب ادارۂ ادبیات اردو کی دلکش اور سادہ و پُر کار عمارت میں داخل ہوتی ہوگی تو ضرور زور صاحب کو مصروفِ عمل دیکھتی ہوگی!

بظاہر ساز کے تار ٹوٹ جاتے ہیں اور آواز خاموش ہو جاتی ہے لیکن اس کی گونج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فضاؤں میں محفوظ ہو جاتی ہے، پھر وہ آواز ایک قوم کے اجتماعی شعور کی آواز تھی، کس طرح خاموش ہو سکتی ہے۔ موت کا وار صرف جسموں پر چل سکتا ہے، زندگی اس کی زد میں کبھی نہیں آ سکتی۔ زور صاحب کی آنکھیں ضرور بند ہو گئی ہیں لیکن ان کی آواز کی شفقت آمیز گونج تو میں اب بھی یہاں سیکڑوں میل دور کراچی میں بیٹھا سن رہا ہوں!

"نظر ——— "سب رس" کے لیے کوئی تازہ چیز"

ڈاکٹر صاحب! تازہ چیز حاضر ہے، جو بیک وقت نوحۂ غم بھی ہے اور پیغامِ عمل بھی، اور اس "احساس پارے" کا مرکزی کردار خود آپ کی شخصیت ہے۔ کیا آپ اس کو "سب رس" میں شائع فرما دیں گے۔

نہیں میاں نہیں، کوئی کام کی چیز دو، میں نے کیا ہی کیا ہے جو میرے متعلق کچھ لکھا جائے"!

ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، یہ ڈھیروں تصانیف و تالیفات، یہ ادارے کا عظیم الشان کتب خانہ اور عمارت، یہ اردو زبان کی ترقی و بقا کے لیے شبانہ روز بے غرضانہ سعی و کاوش، یہ اردو کی ترویج و حفاظت کے سلسلے میں اردو امتحانات کا انعقاد، یہ دکن کے احساس کمتری میں مبتلا اہلِ قلم کی ہمت افزائیاں اور . . . . . .

"بس نظر بس، ایسی باتوں سے قوائے عمل مضمحل ہو جایا کرتے ہیں، کبھی کبھی وجد کا یہ مصرع پڑھ لیا کرو:

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ!"

سن لیا آپ نے، اگرچہ یہ عالمِ خیال کی باتیں تھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی عالمِ خیال کے مذکورۂ بالا جواب کا مکمل نمونہ تھی۔ آج جب کہ ان کا مادی جسم ان کی محبوب سرزمینِ دکن کی سوندھی مٹی میں نہیں بلکہ اس سے سیکڑوں میل دور کشمیر کی گلپوش وادیوں میں کہیں دفن ہے، مجھے یقین ہے کہ اب بھی سورج کی پہلی کرن دبے پاؤں جب ادارۂ ادبیاتِ اردو کی دلکش اور سادہ و پُر کار عمارت میں داخل ہوتی ہوگی تو ضرور زور صاحب کو مصروفِ عمل دیکھتی ہوگی!

دس بیس مہینوں کی نہیں بلکہ رُبع صدی، اُدھر کی بات ہے، سٹی کالج کے احاطے میں "یومِ ولی" کے موقع پر میں نے ڈاکٹر زور کو

ع مضمون بھیجنے کے بعد ۲۶ اگست کو نظر نے کراچی میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پہلی بار دیکھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُردو زبان کے ایک اور محسن مولوی عبدالحق کو بھی میں نے پہلی بار اسی جلسے میں دیکھا اور سُنا۔ اُس زمانے میں زورؔ صاحب کی شخصیت میں طلوعِ صبح کی نرم شعاعوں کی سی کیفیت تھی اور مولوی صاحب کی شخصیت و شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا!

زورؔ صاحب سے پہلی ملاقات کا شرف اُن کے ایک عزیز شاگرد خواجہ حمیدالدین شاہدؔ کے ادارۂ حمیدیہ کے ایک سالانہ مشاعرے کے موقع پر ہوا تھا۔ اس مشاعرے اور اس کے انتظام و اہتمام کی کیفیت میرے ذہن میں آج بھی اس لیے تازہ ہے کہ اسی مشاعرے میں پہلی بار میں مخدوم، وجدؔ اور میکشؔ مرحوم سے بھی ملا تھا۔ زورؔ صاحب ہی اس محفل کے صدر تھے اور ان کی دہنی جانب وجدؔ اور بائیں مخدوم بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک گوشے میں دبکا دبکایا سا بیٹھا تھا۔ میزبان نے زورؔ صاحب کو سگریٹ اور پان پیش کیے انھوں نے صرف پان کا بیڑا اٹھالیا اور چونکہ سگریٹ نہیں پیتے تھے اس لیے سگریٹ والی طشتری کو مخدوم کی طرف بڑھا دیا، مخدوم نے مخصوص حیدرآبادی سلام کیا اور اُستاد کے سامنے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا لیکن زورؔ صاحب نے مجبور کر کے انھیں سگریٹ دیا اور خود ہی جلا بھی دیا۔ کہنے سُننے کے لیے یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن یہ قدیم حیدرآباد کی تہذیب و شائستگی کی ایک عمدہ مثال بھی ہے!ـــــ زورؔ صاحب کو بہ حیثیت شاعر کے میں نے پہلی بار اسی محفل میں سُنا تھا۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے تھے اور بڑے ٹھاٹ سے پڑھتے تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر چلتے چلتے زورؔ صاحب نے مجھے دوبارہ ملنے کی تاکید فرمائی یہ میرے لیے بڑی ہمت افزائی کی بات تھی۔ کچھ عرصے بعد میں اپنے عزیز دوست محمد عمر مہاجر کے ساتھ جامعہ عثمانیہ گیا تاکہ زورؔ صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔ اس زمانے میں جامعہ کے کام عارضی عمارات میں انجام پاتے تھے اور آرٹس کالج کی موجودہ عظیم الشان عمارت کی بنیاد تعمیر ہو رہی تھی۔ یعنی وجدؔ کی زبان میں "ابھی نظم کہسار درہم برہم ہو رہا تھا اور قوم کے ایک خواب کو مجسم ہونے میں" ایک مدت دکا تھی!ـــــ زورؔ صاحب کے کمرے میں ایک چھوٹی سی محفل شاعرہ برپا ہو گئی، ایک نو وارد اور نوخیز شاعر کی ایسی پذیرائی کہیں کاہے کو ہوئی ہو گی۔ زورؔ صاحب کی ہمت افزائیوں کا ایک ایک نقش میرے دل میں آج بھی تازہ ہے۔ "سب رس" نیا نیا نکلا تھا اس کے لیے انھوں نے میری اُس زمانے کی تازہ نظم "تجدید شوق" طلب فرمائی اور بڑے اہتمام سے شائع بھی کر دی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، سب رس میں میرا کلام برابر شائع ہوتا رہا۔ کبھی کبھی "دیر حاضری" ضرور ہوئی لیکن غیر حاضری کا امکان نہ تھا، یہ سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن زورؔ صاحب اب کہاں!

ایک سردار اور ایک بزرگ غمگسار کا ذکر چھڑا تو ان گنت واقعات اپنی ساری جزئیات کے ساتھ سینما کی متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے آتے اور گزرتے چلے جاتے ہیں، ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا ہے، ہاتھوں پر اتنا قابو نہیں کہ ان سب کو قلم بند کر دوں۔ لیکن چند ایسے واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے مرحوم کے کردار کا ایک اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

یوں تو شہر حیدرآباد ہمیشہ سے علمی معرکوں اور ادبی ہنگاموں کا شہر رہا ہے لیکن ادارۂ ادبیاتِ اُردو یعنی دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر زورؔ کی منعقد کردہ اُردو کانگریس کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کانگریس ایک ایسے زمانے میں بلائی گئی تھی جب برصغیر کی تقسیم کے خاکے بننے لگے تھے۔ اور اُن میں صرف انسانیت کے خون سے رنگ بھرنا باقی تھا۔ ان حالات میں اس کانگریس کو طے کرنا تھا کہ مستقبل میں اُردو کے پراگندہ کارواں کو کن راہوں پر آگے بڑھایا جائے۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ برصغیر کے مشاہیر اس کانگریس میں شریک ہونے والے تھے، حیدرآباد کے ترقی پسند مصنفین نے سوچا کہ اُن کی اپنی تحریک کے تعارف کے لیے بھی اس سے اچھا موقع نہیں۔ کانگریس سے الگ کسی جلسے کا انعقاد غیر مناسب اور نامکمن تھا، اور اس کانگریس میں اس اجلاس کی اجازت

ملنا دشوار معلوم ہوتا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب حکومت کی نظروں میں ترقی پسندوں کی پوزیشن مشکوک تھی اور چاروں طرف سے اس تحریک پر طعن و تشنیع کی بوچھار ہو رہی تھی، حالات کے اس پس منظر میں حیدرآبادی ترقی پسندوں کے جیالے رہنما مخدوم اور انجمن کے پست قد لیکن بلند ہمت معتمد عابد علی خاں کے ساتھ کچھ احباب جھجکتے جھجکتے زور صاحب سے ملے، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انھوں نے بغیر کسی تذبذب کے اس اجلاس کے انعقاد کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی ترقی پسندوں کے مہمانوں کو بھی اُردو کانگریس کے مہمانوں کے ساتھ شیر باغ کے شاندار محل میں ٹھیرانے کے لیے بڑی خوشی سے راضی ہو گئے، یہی نہیں بلکہ اس موقع پر اپنی تحریک کے تعارف کے لیے رسالہ "سب رس" کا ایک خاص نمبر بھی شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ "سب رس" کے اس خاص شمارے کو اُس کے مدیران نے نہیں بلکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد عابد علی خاں نے مرتب کیا تھا اور اس کے اخراجات بھی ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے برداشت کئے تھے نوواردِ ترقی پسند مصنفین کے لیے مسرت و انبساط کا یہ موقع ظاہر ہے ڈاکٹر زور کی فراخ حوصلگی نے ہی فراہم کیا تھا، سچ ہے، "تنا ور درختوں کے گھنے سایوں کا سکوں ریز آغوش، نئے اور پرانے مسافر میں فرق نہیں کرتا!

اُردو کانگریس میں اپنی اس کامیابی سے ترقی پسند مصنفین کے حوصلے بلند ہو گئے اور اُس زمانے کے غیر یقینی حالات میں کم از کم حیدرآباد میں ان کی پوزیشن واضح اور مستحکم ہو گئی۔ ایک سال بعد مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین (شاخ اُردو) کی طرف سے حیدرآباد میں سالانہ اجلاس منعقد کرنے کے لیے لکھا گیا۔ اس مراسلے کے ملتے ہی حیدرآباد کے ترقی پسند مصنفین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، خوشی سے نہیں بلکہ اپنی تنگ دامانی اور کام کی وسعت کے خیال سے۔ روپئے کی فراہمی کا مرحلہ سب سے دشوار تھا، اُردو کانگریس تو زور صاحب کی شخصیت اور ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے کامیاب ہو گئی تھی اور اُس میں ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ایک ضمنی حیثیت رکھتا تھا۔ اب ساری ذمہ داری خود ترقی پسندوں کو اُٹھانی تھی، طویل بحث و گفتگو کے بعد اور ترقی پسندوں کے ایک بزرگ اور مخلص سرپرست قاضی عبدالغفار مرحوم کے مشورے پر اس سلسلے میں ڈاکٹر زور سے رجوع کیا گیا اور انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مدد کا وعدہ کیا اور اجلاس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت بھی قبول کر لی، اب کام آسان ہو گیا، ڈاکٹر زور کی طرف سے چندے کی اپیل شائع کی گئی جسے لے کر انجمن کے کارکن دیہات دیہات پھیل گئے اور تھوڑے ہی سے عرصے میں سیکڑوں نہیں ہزاروں روپئے چندہ جمع ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ بھی زور صاحب کے عملی تعاون کا کرشمہ تھا، اس واقعہ سے ترقی پسندوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ملک میں زور صاحب کی کتنی عزت تھی۔ ترقی پسندوں کے گروہ کو اُس زمانے کے حیدرآباد میں بڑا "خطرناک" سمجھا جاتا تھا اور اس تحریک میں کوئی ایسی شخصیت شامل نہیں تھی جسے ملک کے سارے طبقے پسند کرتے ہوں، ایسے حالات میں زور صاحب کی غیر سیاسی اور بے تعصب علمی شخصیت کا وجود کام آ گیا اور اتنی شاندار کانفرنس منعقد کی جا سکی۔ یہ واقعات میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے بیان کئے ہیں کہ زور صاحب نام کے شیدائی نہیں بلکہ کام کے دھنی تھے اور اس لگن کو جس میں اور جہاں دیکھتے، اُس سے تعاون کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے۔ اس میں حکومتِ وقت کی برہمی کی بھی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

پنڈت ونشی دھر ودیا النکار

ڈاکٹر زور، ایک دوست

عثمانیہ یونیورسٹی نے اُردو کے جتنے بڑے شاعر، ادیب اور اردو کے خدمت گزار پیدا کئے ہیں ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام بہت اونچا ہے۔ اور ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے انھیں اردو زبان کی خدمت کرنے کی دھن لگ گئی تھی۔ انھیں اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت کرنے کے لئے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق و مولانا وحیدالدین سلیم، جیسی اردو کی محظیم المرتبت ممتاز ہستیوں سے تحریک ملی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ لندن گئے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے شعبہ میں کام کرنا شروع کیا۔

ان کا دن رات یہی خیال رہتا تھا کہ وہ اردو زبان اور اردو ادب کی کچھ ایسی خدمت کر جائیں کہ اردو لوگوں میں زیادہ مقبول اور عام ہو۔ لوگوں کے دلوں میں اردو کی عزت بڑھے اور اردو ادب مالا مال ہو جائے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے پڑھے ہوئے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور انشا پردازوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ دکن کے اونچی سے اونچی ڈگریاں یافتہ لوگ بھی اردو کو اس طرح نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں جیسے کہ شمالی ہندوستان کے اردو داں لوگ۔

انھوں نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ انھوں نے اپنی اردو کی علمیت کا لوہا شمالی ہندوستان کے اردو کے ادیبوں کے دل پر بٹھا دیا اور اس طرح کی غلط فہمی کو ہمیشہ کے لئے دور کر دیا۔ زندگی کی آخری سانس تک اگر وہ کسی چیز کے بارے میں سوچتے تھے تو وہ اردو کے بارے میں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے نکلے ہوئے ان ڈگری یافتہ لوگوں میں جو حیدرآباد کے ہی رہنے والے تھے، اردو زبان کی جیسی خدمت ڈاکٹر زور نے کی، ویسی شاید ہی کوئی دوسرا شخص کر سکے گا۔ انھیں دکن سے بہت محبت تھی اگرچہ ان کی موت کشمیر میں ہوئی اور کشمیر کو جنت کہا جاتا ہے تو بھی اگر ان کا بس چلتا تو ان کی یہی خواہش تھی کہ وہ دکن کی سرزمین میں ہی سپرد خاک کئے جائیں اور اس کے لئے انھوں نے پہلے ہی سے اس کی تیاری کر لی تھی۔

میری ان کی سب سے پہلی ملاقات اورنگ آباد میں ہوئی۔ میں اس وقت اورنگ آباد میں لکچراری کا کام کرتا تھا۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد کی طرف سے مولانا حالی کا صد سالہ جشن منایا گیا تھا جس کی صدارت سر اکبر حیدری نے کی تھی۔ اور حیدرآباد سے بھی بہت سی ممتاز ہستیاں اس میں شریک ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر زور نے اس جلسے میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ مقالہ بڑی محنت اور بڑی سوجھ بوجھ سے لکھا گیا تھا اور میں نے بھی اس جلسے میں مولانا حالی پر ایک نظم پڑھی تھی۔ مجھ سے ڈاکٹر زور ملے تو کہنے لگے آپ کے مضمون اکثر انجمن ترقی اردو کے رسالے "اردو" میں پڑھتا ہوں۔ مضامین کو پڑھ کر مجھے تو کچھ ایسا اندازہ ہوا تھا کہ آپ ایک بوڑھے آدمی ہوں گے لیکن ماشاءاللہ آپ تو بالکل نوجوان ہیں۔ اس وقت میری عمر کوئی تیس سال

ہوگی۔ کچھ برسوں کے بعد میں حیدرآباد میں آ گیا۔ میرا تقرر سنسکرت اور ہندی کے شعبہ میں ہوا۔ میرا میل ملاپ ڈاکٹر زور سے بڑھا۔ یہ میل ملاپ آہستہ آہستہ دوستی کی شکل میں بدل گیا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ ان دنوں دکنی کی کچھ کتابوں کو ایڈٹ کر رہے تھے۔ دکنی میں چونکہ ہندی کے الفاظ بہت ہیں اس لئے ان دکنی میں آئے ہوئے ہندی کے الفاظ کے معنے جاننے کے لئے وہ اکثر ہر روز انٹرول کے وقت شعبہ سنسکرت اور ہندی میں آیا کرتے تھے۔ اور ان الفاظ کے معنی پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور وہ ان کے معنی لکھتے تھے۔ دکنی شعرا کی کتابوں کو کسی اسکالر نے شاید اس لئے ایڈٹ کیا ہو کہ وہ اردو کے پہلے اور قدیم شاعر تھے۔ لیکن ڈاکٹر زور کو دکن کے ان شاعروں سے خاص دلچسپی تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنا ایک گہرا تعلق محسوس کرتے تھے۔ وہ ان کی کتابوں کو صرف اس لئے ایڈٹ نہیں کرتے تھے کہ وہ اردو کے شاعر یا ادیب تھے بلکہ اس لئے کہ انھوں نے دکن کی سرزمین میں پیدا ہو کر ایسی عظیم الشان خدمت کی تھی۔ انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو سے دکن کے شاعروں کے کلام کو نہایت عمدہ طور پر شائع کیا۔

پولیس ایکشن کے بعد جو دکنی کو چھپانے کے لئے ہندی اور اردو دونوں میں کمیٹیاں بنیں، ان میں بھی انھوں نے بہت دلچسپی لی اور دکنی کے شاعروں کے کلام کو ہندی رسم الخط میں چھپانے میں بیحد تعاون کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی موت سے دکن کا ایک بہت بڑا عالم اس دنیا سے اٹھ گیا۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ دکن کے ان شاعروں کی ابھی گہری نظر سے مطالعہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے اردو اور ہندی کے عالموں کو مل کر ایک جگہ بیٹھ کر ہر پہلو پر سوچتے ہوئے کام کرنا چاہیے۔ وہ اس بارے میں میرے ساتھ مل کر کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس بات کی کوشش بھی کی تھی کہ وہ مجھے کشمیر یونیورسٹی میں بلا لیں لیکن واقعات کچھ ایسے ہوئے کہ میں وہاں نہ جا سکا اور ہم جو مل جل کر کام کرنا چاہتے تھے وہ ویسا ہی پڑا رہ گیا۔

حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر زور تمام ہندوستان کی اردو کی ایک عظیم ہستی بن گئے تھے۔ وہ اردو کی سب بڑی کمیٹیوں کے رکن تھے۔ آج بمبئی جاتے تھے تو کل علی گڑھ۔ کشمیر سے دہلی کے تو ان کے اکثر چکر لگتے رہتے تھے۔ کشمیر سے حیدرآباد بھی بہت دور پڑتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی آخری عمر میں اردو ادب کی جو خدمت کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے۔ ان کا بہت سارا وقت اردو کی ایسی ہی کمیٹیوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ سری نگر میں اردو کا وہ ماحول بھی نہیں تھا جو حیدرآباد میں تھا۔ وہاں کوئی ایسے اردو کے عالم نہیں تھے جن سے وہ اردو کے مسائل پر غور و خوض کر سکتے۔ مجھے ان کے ساتھ دلی سے جموں تک سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں جموں جب ان کے ساتھ پہنچا تو میں نے دیکھا تھا کہ وہ کس قدر تھک گئے تھے اور کافی دیر تک انھیں اس طرح لیٹے رہنا پڑا۔ کشمیر میں جا کر ان کے سامنے کچھ اور ہی طرح کے مسئلے پیش آتے تھے۔ ان مسئلوں کا ذکر یوں اور اس طرح کی کچھ اور چیزوں سے متعلق ہوتا تھا۔ کچھ سیاست سے ہوتا تھا۔ اور وہاں کے ماحول میں اردو کے لئے کام کرنے کا وہ میدان نہیں تھا جو کہ برسوں کی محنت کے بعد انھوں نے حیدرآباد میں ہموار کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ رنجیدہ سے رہتے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ میں خواہ مخواہ کشمیر آ گیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہاں کے کام کو چھوڑ کر حیدرآباد واپس چلا جاؤں۔ لوگ کشمیر اور سری نگر میں جا کر خوش ہوتے ہیں وہاں رہنا چاہتے ہیں لیکن ڈاکٹر زور کو حیدرآباد سے کچھ ایسی محبت تھی کہ وہ سری نگر سے حیدرآباد کو زیادہ چاہتے تھے۔ انھوں نے پانچ سال کی خدمت کا

معاہدہ کر لیا تھا اس خاطر انھیں وہیں رہنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اتنی جلدی موت ہونے میں ایک یہ وجہ تھی کہ ان کا دل وہاں خوش نہیں تھا۔

حیدرآباد میں آکر وہ جتنے مصروف رہتے تھے اور جتنا اردو کا کام کرتے تھے اتنا وہ وہاں نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں تو کام کچھ اس ڈھب کے ہوتے تھے کہ جن کا اردو کی علمی و تحقیقی خدمت سے بہت کم تعلق ہوتا تھا۔ ان کی اردو کے ادب کی مصروفیات حیدرآباد ہی میں مرکوز تھیں۔ ان کے یہاں سے چلے جانے سے یہ سب سرگرمیاں کچھ ٹھنڈی پڑ گئیں۔ اور اُدھر بھی سرگرمی پیدا ہونے کے کچھ خاص امکانات نہیں تھے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح اپنے ادارہ "ایوان اردو" میں ہندوستان کی ممتاز ہستیوں کو مدعو کرتے تھے اور اپنے ادارہ اور ایوان کے نہ صرف ایک ایک شعبے کو کس جوش و خروش اور شوق سے خود ساتھ رہ کر دکھایا کرتے تھے۔ وہ جس طرح سے ہر چیز کی تفصیل بیان کرتے تھے اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے ادارہ اور ایوان اردو کی ہر چیز سے کتنی محبت اور گہری دلچسپی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ہی نہیں شاید پاکستان میں بھی ایسا نایاب ذخیرہ نہیں ہوگا جیسا انھوں نے اپنے ادارہ اور ایوان اردو میں جمع کیا تھا۔

نہ جانے ان کے کیا کیا خواب تھے اور ان چیزوں کو دیکھ کر وہ کچھ خواب کی دنیا میں پہنچ جاتے تھے۔ پچھلے سال انھوں نے اپنے ایوان اردو میں اس زمانے کے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سردار پانیکر کو دعوت دی تھی۔ انھوں نے بڑے شوق سے اپنے ادارہ اور ایوان اردو کے تمام شعبوں اور اشیاء کو دکھلایا۔ دکھلانے کے بعد جب وہ چائے پر بیٹھے تو مسکرا کر کہنے لگے کہ ڈاکٹر زور صاحب! مجھے سچ مچ بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ آپ حیدرآباد چھوڑ کر کیسے سری نگر چلے گئے۔ آپ کی تمام دلچسپیاں سب یہیں جمع ہیں آپ چاہے جسم سے جہاں رہیں لیکن آپ کا دل تو یہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے حیدرآباد چھوڑ کر اپنے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو حیدرآباد چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔" ڈاکٹر زور اردو کی دنیا کے ہی نہیں حیدرآباد کی ایک ممتاز ہستی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں حیدرآباد اور اس کی سرزمین سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ اگر وہ چاہتے تو تقسیم کے بعد پاکستان چلے جاتے۔ وہ اردو کے اتنے بڑے اسکالر تھے کہ پاکستان میں ان کی بڑی عزت ہوتی جبکہ بہت سے لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ ان کے دماغ میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا کہ وہ حیدرآباد چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ انھوں نے اپنے ایوان اردو میں ملا وجہی کے ان اشعار کو دیوار پر کتبے کی صورت میں لگا رکھا ہے ؎

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں ۔۔۔ بنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ ۔۔۔ انگوٹھی کو حرمت نگینہ ہے لگ
دکن ملک کو دیس عجوبہ ساج ہے ۔۔۔ کہ سب ملک سر پور دکن تاج ہے
دکن ملک بھاوے تج خاصہ اہے ۔۔۔ تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

وہ جس کسی کو بھی اپنا ادارہ اور ایوان اردو دکھاتے تھے اسے یہ شعر بار بار پڑھ کر سناتے تھے۔ وہ ان اشعار کو اس طرح پڑھتے تھے کہ جیسے یہ اشعار انھوں نے خود لکھے ہوں۔ ان اشعار کو وہ اس طرح سناتے تھے کہ دکن کے لئے ان کی محبت اور لگاؤ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ ان کو یہاں کے لوگوں سے محبت تھی۔ حیدرآباد کی تہذیب اور تمدن سے محبت تھی۔ حیدرآباد کی روایات سے محبت تھی۔ اور

ان کو اس بات کی خواہش تھی کہ دنیا میں حیدرآباد کا بڑا نام ہو۔ وہ حیدرآباد میں اردو کی کوئی ایسی خدمت کر جائیں جس کا تعلق حیدرآباد سے ہی نہیں تمام دنیا سے قائم ہو جائے۔

میں نے ان میں ہندو مسلمان یا اس طرح کے بھید بھاؤ کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ وہ ہم سے ہمیشہ اس طرح ملا کرتے تھے جیسے ہم انکے گھر کے ہی ایک فرد ہوں۔ ان میں اردو ہندی کے جھگڑے کی بھی کوئی بات نہ تھی۔ وہ سب کے ساتھ مل جل کر کام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ادارہ میں بھی اس کا خیال رکھا اور وہاں بھی انھوں نے کچھ اس طرح کا فرق کبھی نہیں رکھا جس وقت وہ یونیورسٹی میں اردو شعبہ کے کچھ روز کے لئے صدر رہے تھے کچھ لوگوں نے ہندی کے لئے کچھ ایسا کام کرنے کی کوشش کی جس سے ہندی اور اردو میں جھگڑا پیدا ہونے کا امکان تھا لیکن انھوں نے اس کو دبا دیا اور ہندی کو اردو کے شعبہ میں ایسے ہی جاری رکھا جیسے وہ پہلے تھی۔ وہ ادب کی دنیا میں کسی طرح کے فرق اور امتیاز کے قائل نہیں تھے۔ وہ مل جل کر کام کرنا جانتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری دم تک وہ اسی پالیسی پر چلتے رہے۔ میں نے جب ان سے ہندی کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا رکن بننے کے لئے کہا اور ان سے گزارش کی کہ اس کے لئے وہ ۱۰۱ روپے کا عطیہ عنایت فرمائیں تو انھوں نے بخوشی فوراً ہی ۱۰۱ روپے کا چیک دے دیا۔ ہم انھیں اس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹرس میں رکھنا چاہتے تھے اور ہمیں امید تھی کہ ہم ان کے ساتھ مل کر کئی ہندی اور اردو کا بہت سا کام کر سکیں گے۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ آپ اپنے سب رس کو ہندی میں بھی نکالئے۔ چاہے زبان آپ وہی رکھئے جو آپ سب رس میں رکھتے ہیں لیکن اسکو دیوناگری کے رسم الخط میں بھی چھاپنا شروع کر دیجئے۔ اس سے آپ بدلے ہوئے حالات میں اردو زبان اور اس کے ادب کی بڑی خدمت کر سکیں گے اور ان لوگوں تک بھی اردو ادب کو پہنچا سکیں گے جو اردو کے رسم الخط سے واقف نہیں ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ سب باتیں ادھوری ہی رہ گئیں کسے معلوم تھا وہ اتنی جلدی دنیا کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

مجھے ڈاکٹر زور کی اکثر یاد آتی ہے۔ میں ان کے ساتھ جب بھی بیٹھتا تھا مجھے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ ان میں ایک قسم کی عظمت تھی۔ وہ دل کے صاف تھے۔ کئی دفعہ بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی کی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جسے کسی دوسرے کو کہنے میں تامل ہوتا۔ اس سے ان کے دل کی صفائی صاف گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ طبیعت کے سادے تھے لیکن چال چلن اور رہن سہن میں نواب تھے۔ وہ جہاں جاتے تھے اپنے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ ان میں ایسی آن بان تھی کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی کے پاس نہیں جاتے تھے۔ میں نے کشمیر میں دیکھا کہ وہاں کا چیف سکریٹری ان سے ملنے ان کے گھر پر آتا تھا۔ ان کی یہ آن بان ایسی تھی کہ جس کے لئے وہ کسی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس زندگی میں ڈاکٹر زور کے بہت سے دوستوں نے ان کے بارے میں بہت کچھ غلط سمجھا لیکن وہ کسی کو برا نہیں کہتے تھے ڈاکٹر زور پیار و محبت کے آدمی تھے۔ ان میں محبت اور مروت تھی۔ وہ حیدرآباد کے اس کلچر کا نمونہ تھے جس کو حیدرآباد نے صدیوں میں بنایا تھا۔ آج حیدرآباد بدلتا جا رہا ہے اور آنکھیں ڈاکٹر زور جیسی ہستیوں کی تلاش کرتی ہیں اور جب وہ دکھائی نہیں دیتیں تو وہ آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ کاش! ڈاکٹر زور ابھی اور زندہ رہتے۔ ان کے انتقال سے صرف اردو ادب کو ہی نہیں ہندوستان کی تمام زبانوں کو دھکہ لگا ہے۔ یہ ایسا دھکہ ہے کہ اس کی تلافی ہونا ناممکن ہے۔

احمد جلیس

حسب قاعدہ

چادر گھاٹ کالج میں داخلہ لئے مجھے چند ہی دن ہوئے تھے۔ معلوم ہوا ہمارے پرنسپل ڈاکٹر زور بھی ہیں اردو ادب کا ایک پیریڈ پڑھائیں گے۔

ہم سب مسرور تھے کہ ہم اتنے بڑے عالم سے استفادہ کریں گے لیکن مجھے رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کے سامنے ہماری قابلیتوں کا بھرم کھلے گا تو نہ جانے وہ کیا رائے قائم کریں گے؟

بات ابھی یہیں تک تھی کہ ایک دن پوری کلاس کو زور صاحب نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اسکول چھوڑ کر نئے نئے کالج میں آئے اور آتے ہی ایسے عالم و فاضل پرنسپل سے سابقہ پڑا۔ سب پر یہی گھبراہٹ طاری تھی کہ خدا جانے کس وقت منہ سے کیا اول فول نکل جائے خدا خدا کر کے ہم سب نہایت مودب بن کر کمرے میں داخل ہوئے۔

زور صاحب ایک ہی کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی شروانی پہنے، آنکھیں بند کئے، کرسی سے سر لگائے بیٹھے تھے۔ ہماری آہٹ سن کر کسی قدر آنکھیں نیم وا کیں اور پھر بولے:

— آیئے آیئے — اندر آیئے — آپ لوگاں میرے سے ڈرتے کیوں ہیں؟ اور پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہم خاموشی سے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے دل میں سوچا — یا اللہ یہ کیسے زور صاحب نکلے جو نہ تو آنکھیں کھولنے پر تیار ہیں اور نہ جن کی گفتگو سے ان کی لسانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اتنے میں کالج کا چپراسی آئیکو داخل ہوا جس سے زور صاحب بے تکلف تلنگی میں بات چیت کرنے لگے۔

تب میں نے محسوس کیا کہ یہ در اصل ان کی دکن پرستی اور دکن کی روایتی لسانی رواداری بول رہی تھی۔

ڈاکٹر زور ہمیں پروفیسر وحید الدین سلیم کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ "افاداتِ سلیم" پڑھاتے تھے اور ہفتہ میں دو دن مضمون نگاری ہوتی۔

ابتدائی چند پیریڈ صرف پروفیسر سلیم کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کے تذکرہ میں گزرے اور ان تذکروں کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ڈاکٹر عبدالحق اور سید سجاد مرحوم وغیرہ کے واقعات بھی سنایا کرتے۔ جامعہ عثمانیہ کے پرانے علمی اور ادبی ماحول کی عظیم الشان روایتیں سناتے سناتے اور اپنے استادوں کا ذکر کرتے وقت ان کی غلافی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک پیدا ہو جاتی اور وہ یوں خلاء میں گھورنے لگتے گویا پورا نقشہ ان کی آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ کلاس میں ہمیشہ کتاب مجھ سے پڑھواتے اور آنکھیں بند کئے غور سے سنتے رہتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اشارہ سے مجھے روک کر متن کی وضاحت کرتے جاتے۔

غرض تنقید جیسا خشک مضمون انھوں نے ہمیں ایسے دلچسپ انداز میں پڑھایا کہ احساس تک نہ ہوا کہ کتاب کب ختم ہو گئی؟

ذاتی طور پر مجھے یہ فائدہ ہوا کہ روز عبارت پڑھتے پڑھتے مختلف الفاظ کے صحیح تلفظ اور ان کے ماخذات معلوم ہوتے گئے۔ الفاظ کے مخارج پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ زور صاحب کی کلاس میں کسی لڑکے نے "قہقہے" کو "خنخنے" پڑھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب چونکے اور بار بار اس لڑکے سے وہی لفظ دہرایا اور لطف لیتے رہے۔ جب میں انھیں دیکھ کر مسکرایا تو فرمایا "ہمارے حیدر آباد میں لوگ کھٹا اور مرچ زیادہ کھاتے ہیں اس لئے ق کی صاف آواز ان کے حلق سے نکلتی ہی نہیں۔

میں نے عرض کیا۔ صاحب میں بھی تو خالص حیدر آبادی ہوں ——— اور پھر یہاں بہت سے لوگ قینچی کو خینچی کہیں گے لیکن خمیر کو قمیر ——— یعنی خ اور ق کا تلفظ تو ممکن ہے لیکن غلط جگہ پر۔

مجھے خوب یاد ہے میری اس مثال پر زور صاحب دیر تک ہنستے رہے۔ زور صاحب کے مقامی معاصرین اور بعض دیگر افراد ہمیشہ ان کی شخصیت پر ادب کے مختلف میدانوں میں جانب داری کا لیبل لگانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اپنی ذاتی گفتگو اور عملی میدان میں میں نے انھیں نہ صرف غیر جانب دار بلکہ ہر ایک کا ہمدرد پایا۔

زور صاحب ایک پیدائشی استاد تھے۔ ان کی شخصیت اور کردار میں ایسا جاہ و حشم اور رعب تھا کہ انھیں دیکھتے ہی احترام اور عقیدت سے خود بخود آنکھیں نیچی ہو جاتی تھیں۔ جہاں ان کی شخصیت میں صوفی منش والد کی تربیت کا تقدس شامل تھا وہیں ان کی اپنی علمیت کا وقار بھی ٹپکا پڑتا تھا۔ وہ ان یادگار زمانہ استادوں میں سے تھے جو طالب علموں کو پورے خلوص سے صرف اپنا علم ہی نہیں بخشتے بلکہ اپنی شخصیت، کردار اور اخلاق کے گہرے نقوش بھی ان کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی اپنی ساری زندگی ایک طالب علم کی مثالی زندگی تھی۔

کالج کا وسط ختم ہو کر خواہ کتنی ہی مدت کیوں نہ ہو جائے اپنے محبوب شاگردوں پر ان کی عنایتیں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ ہفتہ میں دو دن ہم سب ڈاکٹر صاحب کے دیئے ہوئے موضوع پر مضمون لکھ کر کلاس میں سناتے۔ نوجوانوں کی تحریروں پر ان کا عام تبصرہ یہ ہوتا کہ ہمارے نوجوان ادیب الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں سخت بے احتیاطی برتتے ہیں۔ پامال الفاظ کے استعمال اور ایک ہی لفظ کی بار بار تکرار سے انھیں چڑ تھی۔ ایک بار میں نے کہیں لکھ دیا تھا۔ "یہ پریس بہت اچھی تھی"۔ اس پر زور صاحب نے فرمایا۔ پریس مونث نہیں مذکر لکھئے"۔ میں نے اطمینان کے لئے پوچھا کہ صاحب۔ انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث کے لئے بھی اردو میں کوئی ضابطہ ہے۔؟

اس پر زور صاحب نے بتایا تھا کہ اس کے لئے کوئی قواعدی اصول تو نہیں لیکن رسمی اصول یہ ہے کہ غیر ملکی لفظ کے معنی کی جو جنس ہماری زبان میں ہوگی وہی برقرار رکھی جائے گی۔

جیسے پریس کو اردو میں مطبع کہتے ہیں جو مذکر ہے۔ لہٰذا پریس بھی مذکر کہا جائے گا۔

زور صاحب نے ایک معمولی سے فقرے پر توجہ دے کر ایسے دلنشیں انداز میں یہ کام کی باتیں سمجھائیں کہ میں پھر کبھی انھیں نہیں بھول سکا۔ ان کا پیریڈ جب ختم ہوتا اور ہم ان کے کمرے سے نکلتے تو واقعی دل کو ڈھارس سی ہوتی کہ ہم بہت کچھ سیکھ کر نکلے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی ذہانت خداداد تھی۔ پڑھاتے وقت کبھی ان کے سامنے کوئی کتاب نہ ہوتی۔ وہ صرف سنتے رہتے اور مضمون سے متعلق بے شمار تبصرے اور معلومات سناتے رہتے۔

۱۹۵۵ء میں چادر گھاٹ کالج کے رسالہ "فکر نو" کے لئے انھوں نے ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا اور شرط یہ رکھی کہ میں لکھتا جاؤں اور وہ بولتے جائیں گے۔ ابھی انھوں نے چند سطریں لکھوائی ہوں گی کہ چپراسی دفتری کاغذات اور فائلیں لے آیا۔ زور صاحب دستخط کرنے سے قبل فائلوں پر بھی نظر ڈالتے جاتے اور مضمون بھی لکھواتے رہے۔ اسی طرح درمیان میں طلباء اور ان کے یگانہ دوست احباب ملتے رہے جس سے مضمون کا تسلسل کئی کئی بار ٹوٹا لیکن زور صاحب اطمینان سے اسی طرح لکھواتے رہے۔ حوالے اور سنین انھیں ایسے ازبر تھے کہ کسی کتاب کی مدد کے بغیر انھوں نے تاریخی مثنوی "قصہ طالب و موہنی" پر ایک جامع مضمون لکھوا دیا۔

وہ طلباء کی صلاحیتوں کا اندازہ خوب لگا لیتے تھے۔ یوم قلی قطب شاہ کے جشن کے انتظامات کے لئے کئی طلباء زور صاحب کے سامنے اپنی خدمات پیش کرتے اور وہ ان کی صلاحیتوں کے مطابق فوری ان میں کام تقسیم کر دیتے۔ یوم قلی قطب شاہ کی تیاریوں میں طلباء سے لے کر وزراء تک سب مصروف ہوتے اور سب کا باہمی رابطہ ہوتے۔ زور صاحب! یوم قلی قطب شاہ کی تیاریوں کے سلسلے میں ان کے سب سے بڑے معاون نواب زین یار جنگ مرحوم تھے۔

نواب صاحب کی وفات پر ایوان اردو میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ زور صاحب نے اعلان کیا کہ سب سے پہلے میں نواب صاحب مرحوم کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کروں۔ اس فوری اعلان سے مجھ پر اچھی خاصی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اسلئے کہ زور صاحب نے جس توقع کے باعث مجھے حکم دیا ہے وہ پوری ہو سکے۔ جلسہ کے اختتام پر جب معمول انھوں نے نہایت شفقت سے پیٹھ تھپتھپائی لیکن اس دن وہ نواب زین یار جنگ کی یوں اچانک جدائی سے بے حد افسردہ تھے۔ زور صاحب نے ایک گہری سانس لے کر ابا سے کہا۔

"حیرت صاحب! میں قدرت کو غیر منصف تو نہیں کہتا لیکن کم از کم اسے ہر انسان کو اتنی مہلت تو دینی چاہئے کہ کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے ادھورے کاموں کی تکمیل اپنے ہاتھوں سے کر سکے"۔ پھر ذرا توقف سے بولے "مولانا عجب بات ہے کہ ہمارے خاندان کے بیشتر بزرگوں نے ۶۵ برس ہی کی عمر پائی۔ یوں تو مشیت ایزدی کے نظام میں کسی کو دخل نہیں لیکن مجھے بھی کچھ ایسا ہی یقین ہے کہ اس حساب سے میرے بھی اب یہاں چھ سات برس ہی باقی رہ گئے ہیں جس میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے"۔ ابا نے بڑی تسلی دی اور کہا ـــ "ماشاء اللہ آپ کے قویٰ بہت اچھے ہیں اور آپ ان مذموم عادتوں کے شکار بھی نہیں جو ہمارے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو لے ڈوبتی ہیں"۔ اس پر خوش دلی سے قہقہہ لگا کر پان منہ میں رکھا اور بولے:

ـــ "خدا آپ کی زبان مبارک کرے بہت سے حضرات میری صحت پر رشک کرتے ہیں اور واقعی یہ شروع سے میری پرہیزگاری کا نتیجہ ہے"۔

حاضرین میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ آنے والے سال ہی زور صاحب ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اپنے بچوں اور شاگردوں کے مستقبل کی انھیں ایک سی فکر تھی۔ کشمیر سے ابا کے نام جو بھی خط آتا اس میں میری مصروفیات کے بارے میں بطور خاص دلچسپی کا اظہار ہوتا۔ ۱۹۶۱ء میں جب میں "مجلہ عثمانیہ" کا ایڈیٹر منتخب ہوا تو رسالہ لے کر زور صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ ایوان اردو میں اس وقت سردار پانیکر مدعو تھے اور زور صاحب ان کے ساتھ بے حد مصروف تھے۔ میں نے سوچا کسی فرصت کے وقت مل لوں گا لیکن انھوں نے رسالہ میرے ہاتھ میں دیکھ لیا اور قریب آ کر بڑی گرمجوشی سے

گلے لگا کر کہا ۔ عجب آدمی ہو تم بھی اتنے دن بعد مجلہ لائے اور وہ بھی شاید واپس لے جانے کا ارادہ تھا جو مجھے بتایا تک نہیں "۔ میں سخت شرمندہ ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ کیسی عظیم شفقت ہے جس نے زبان کے ایک ادنیٰ ترین طالب علم کو ایک مسلم الثبوت محقق کی نظروں میں قابل التفات بنایا ہے ۔ ؟

دوسرے سال جب میں دوبارہ مجلہ عثمانیہ کا ایڈیٹر منتخب ہوا تو انھیں بڑی بے چینی سے رسالہ کا انتظار تھا لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ رسالہ کی طباعت کے آخری مرحلوں پر اس میں زور صاحب کی تعزیت بھی شامل کی جائے ۔ زور صاحب کے انتقال کے ہفتہ بھر بعد ہی مجلہ ان کے غم میں سوگوار اور اشکبار نکلا ۔ لیکن اس کا اصل قدرداں اب بہت دور جا چکا تھا ——— !

زور صاحب ایک ہمدرد اور شفیق پرنسپل تھے ۔ طلباء ان کے پاس جو بھی درخواستیں لے جاتے وہ ان پر اکثر "حسب قاعدہ" لکھ دیا کرتے ۔ طلباء کی ایسی درخواستیں عموماً تعلیمی وظیفوں اور مالی امداد سے متعلق ہوتیں اور زور صاحب اپنے ہاتھوں کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے ' وہ چاہتے تھے دفتر میں ان طلباء کے ساتھ حتی الامکان انصاف ہو ۔ اسی لئے "حسب قاعدہ" لکھ کر وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے اور طلباء بھی مایوس نہ ہوتے ۔

زور صاحب کا "حسب قاعدہ" چادر گھاٹ کالج میں آج تک مقبول ہے ۔

لیکن میں حیران ہوں کہ اصولوں کی پابند ایسی عظیم شخصیت جو عمر بھر "حسب قاعدہ" کی پابند رہی اس کے ساتھ قدرت نے اچانک ایسی بے قاعدگی کیونکر برتی ——— ؟ ۔

وہ ایک فرد نہیں ایک ادارہ ایک انجمن اور نظام تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں طالب علمی کی زندگی سے لے کر آخری دم تک ادب و ثقافت کی جو پرخلوص خدمت کی اور جس مستحکم بنیاد پر اپنے اداروں کی بنیادیں رکھیں وہ دوسروں کے لئے شمع ہدایت ہونا چاہئے ۔

میرے ان کے تعلقات ایک ربع صدی سے زیادہ تھے اور اکثر وہ اندھیری اگر غریب خانہ کو مطلع انوار بنا دیتے تھے ۔

اب ان کے اداروں کے ذمہ دار اصحاب کا یہ فرض ہے کہ وہ اس شمع کو جسے مرحوم نے اپنے خون جگر سے روشن کیا تھا تاباں و درخشاں رکھیں ۔

نجیب اشرف ندوی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ڈاکٹر زورؔ سے چار مُلاقاتیں

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ سے میری پہلی ملاقات نہایت غیر شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ ۱۹۶۱ء کے مارچ میں کثرتِ اولاد کی روک تھام کے سلسلے میں حیدر آباد دکن میں ایک کانفرنس ہوئی۔ میں بھی پنجاب کی جانب سے اُس میں شریک ہوا۔ جناب بھیم سین سچر اُن دنوں آندھرا پردیش کے گورنر تھے اور مجھے اُنھیں کے ہاں ٹھہرنے کا شرف حاصل ہوا۔ دہلی میں ڈاکٹر زورؔ کی قابلیت۔ ملنساری اور مہمان نوازی کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔ میرے عزیز دوست جگناتھ آزاد نے بھی اُن کی بہت تعریف کی تھی چنانچہ اُن سے ملنے کی خواہش قدرتی ہی نہیں بلکہ لازمی بات تھی۔ پہلی ہی فرصت میں مَیں نے اپنے بزرگ قبلہ حیرت بدایونی سے اشتیاقِ ملاقات کا اظہار کیا۔ چنانچہ حیرت صاحب مجھے اپنے ساتھ ایوانِ اُردو لے گئے۔ ڈاکٹر زورؔ کا دولت کدہ بھی بغل میں ہی تھا۔ میرے ذہن نے جو غائبانہ تصویر ڈاکٹر زورؔ کی کھینچ رکھی تھی وہ اس سے بالکل مختلف نکلے۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اتنی شہرت اور علم کے مالک مولانا نما بزرگ ہوں گے لیکن اُن کا شفاف چہرہ اور خندہ پیشانی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے کسی باوقار سُلجھے ہوئے رند سے ملاقات ہو رہی ہے۔ مزید ملاقاتوں اور صحبتوں نے ثابت کیا کہ وہ باوقار بھی تھے سُلجھے ہوئے بھی تھے اور ان اوصاف کے علاوہ اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے لیکن رِند نہ تھے۔ البتہ رِندوں سے نفرت بھی نہیں کرتے تھے۔ جوشؔ ملیح آبادی سے اُن کی گہری دوستی اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت تھی۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے اس طرح کھل مل گئے جیسے پُرانے دوست ہوں۔ اِدھر اُدھر کی چند رسمی باتوں کے بعد مجھے ایوانِ اُردو کے مختلف شعبوں میں لے گئے اور ایک ایک نادر تصنیف اور نسخے کی تواریخ بتائی۔ ایوانِ اُردو کو اُس کی موجودہ سرفرازی تک پہنچانے کے لیے کتنی محنت ڈاکٹر زورؔ نے کی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس زبان سے محبت ہے میں کبھی اُن نسخوں اور تصاویر کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ڈاکٹر زورؔ کے چہرے کی سمت۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی رند اپنے مہمانوں سے اپنی اولاد کا تعارف کرا رہا ہو اور تعارف کراتے کراتے نہایت بے تکلفی اور صاف گوئی سے ہر ایک کے معائب و محاسن کا ذکر بھی کر رہا ہو۔ ڈاکٹر زورؔ کا شفاف چہرہ بجا فخر کے ساتھ دمک رہا تھا اور اُن کی نورانی پیشانی اور مطمئن نگاہیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی تھیں کہ اُنھوں نے اُردو کی خاموش مگر ٹھوس خدمت کی ہے۔

میرا قیام حیدر آباد میں چار روز رہا اور ہر روز ڈاکٹر زورؔ سے ملاقات ہوتی رہی۔ اُنھوں نے ازراہِ مہمان نوازی ایک مخصوص نشست کا انتظام بھی میرے اعزاز میں کیا جہاں مجھے حیدر آباد کے شعرا اور ادب نواز حضرات سے ملنے کا موقعہ ملا۔ اس موقع پر جو تقریر ڈاکٹر زورؔ نے مجھ سے متعلق کی اُسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ مَیں کیا ہُوں میں جانتا ہوں لیکن اُنھوں نے

اس حد تک بڑھ چڑھ کر مجھے نوازا کہ مجھ میں شدّت سے احساس کمتری پیدا ہوا اور کسی حد تک ندامت بھی ہوئی کہ اُردو کے ایک بڑے محسن نے مجھ پر محض اس لیے کرم فرمایا کہ مجھے اُردو سے محبت ہے حالانکہ میں اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ ان چار ایام میں ان کی علمی و ادبی مصروفیتوں کے باوجود ڈاکٹر زورؔ نے سیر و سیاحت میں بھی میری رہنمائی کی۔ قبلہ حیرت بدایونی بھی ساتھ رہے۔ حیدر آباد کے مختلف مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کی روایات اور تواریخ سے ڈاکٹر زورؔ بخوبی واقف تھے جس سے سیر و سیاحت کے لطف میں اضافہ ہوا۔ قبلہ حیرت اور ڈاکٹر زورؔ مرحوم بہت بے تکلف دوست تھے۔ ان کے آپس میں طنزیہ و مزاحیہ جملے اور فقرہ بازی سے صحبت پُر بہار ہو جاتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پھول برس رہے ہوں۔ ڈاکٹر زورؔ کے مذاق میں پارسائیت تھی لیکن قبلہ حیرت تو بات بات میں پیر مغاں کے بھی کان کترتے تھے۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ قبلہ حیرت بدایونی پہلے ایسے پارسا ہیں جو رندوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن خود پینے سے کوسوں بھاگتے ہیں۔

کانفرنس کے ختم ہونے پر بادلِ ناخواستہ واپس لوٹنا پڑا۔ قبلہ حیرت اور ڈاکٹر زورؔ ہوائی اڈہ تک پہنچانے آئے اور دوبارہ حیدر آباد حاضر ہونے کا وعدہ حاصل کیا۔ میں نے گزارش کی کہ چونکہ مجھے فرائض منصبی کی طویل غیر حاضری کی اجازت نہیں دیتے اس لیے ایک برس میں ایک بار جب وہ حکم کر دیں گے حاضر ہو جایا کروں گا کیونکہ معلوم تھا کہ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

واپس سنگر و روٹ کر میں نے ڈاکٹر زورؔ کی خدمت میں ایک طویل عریضہ بھیجا جس میں اُنھیں ہدیہ تشکر پیش کرنے کے علاوہ سنگر و رتشریف لانے کی دعوت بھی دی۔ اُنھوں نے بشرطِ فرصت تشریف لانے کا وعدہ فرمایا۔

یہ نامہ و پیام کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ ڈاکٹر زورؔ کبھی کبھی مجھ سے اپنے ذاتی معاملات کے بارے میں بھی مشورہ طلب فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ سرکار کشمیر میں ملازمت حاصل کرنے سے پہلے دیگر بہی خواہوں کے علاوہ مجھ سے بھی رائے طلب کی میں نے کشمیر چلے جانے کے حق میں مشورہ دیا۔ میں محسوس کرتا تھا اور میں اس احساس میں غالباً ہزاروں لاکھوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ ایسے ذی علم و محقق زبان داں کی ضرورت مُلک کے گوشے گوشے کو ہے اور اگر وہ کشمیر پہنچ کر اُردو زبان کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کر سکیں تو سارے مُلک پر احسان ہوگا۔

ڈاکٹر زورؔ انکساری اور عجز کا مجسمہ تھے اور نام و نمود کی خواہش سے کوسوں دُور رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اُن سے دریافت کیا کہ آپ شعر کیوں نہیں کہتے۔ فرمانے لگے کہ وہ شعر اس لیے نہیں کہتے کہ وہ اپنے اشعار کو معیار سے کم سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اشعار کہیں تو بہت اچھے ہونے چاہئیں لیکن چونکہ اُنھیں اپنے اشعار میں خامیاں نظر آتی ہیں اس لیے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے برعکس میں ایسی مثالیں بھی پیش کرتا ہوں جہاں بعض حضرات نے اپنی اچھی بُری شاعری لوگوں پر محض اس بنا پر نازل کرنے کی کوشش کی ہے کہ دُنیا اُنھیں اُردو کا خدمت گزار تصوّر کرتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ زبان کی خدمت شاعری کے علاوہ اور طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے چنانچہ ایوانِ اُردو اُن کے اس دعوے کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔

اُن کی وفات سے چند روز پہلے مجھے سری نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے جاتے ہی اپنے ایک دوست سے اُن کے دولت کدے کا پتہ لگانے کی درخواست کی۔ کچھ دیر کے بعد میرے دوست واپس آئے اور فرمانے لگے کہ ڈاکٹر زورؔ ابھی ابھی حیدر آباد جانے کے لیے ہوائی اڈہ کی سمت روانہ ہو گئے اور جاتے ہوئے یہ فرما گئے ہیں کہ کنور بھائی سے کہہ دیجئے گا کہ واپسی پر ملاقات ہوگی معلوم نہیں کیوں لیکن میرے دل نے مجبور کیا کہ ڈاکٹر زورؔ سے مل لو پھر خدا معلوم کیا ہو جائے چنانچہ میں فوراً ہی موٹر لے کر ہوائی اڈہ پہنچا

لیکن وائے قسمت کہ میرے پہنچنے سے دو تین منٹ پہلے ہوائی جہاز پرواز کر چکا تھا۔ میں مایوس ہو کر واپس لوٹا اور ہوٹل میں پہنچتے ہی انھیں ایک خط لکھا۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے سری نگر سے قبل از وقت لوٹنا پڑا۔ دو تین دن کے بعد ہی ڈاکٹر زور کی وفات کی منحوس خبر سنی اور دل حمام کر رہ گیا۔

ڈاکٹر زور کی یاد اُن کے ہزاروں لاکھوں مداحوں کی طرح میرے دل میں بھی ہر وقت تازہ رہیگی۔ اُن کی نیک ہستی۔ اُن کی محنت۔ قابلیت۔ تحقیق اور مشقت اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیگی اور جب تک اردو زندہ ہے ڈاکٹر زور بھی زندہ رہیں گے۔

آخر میں میں اُس نظم کے چند اشعار ضرور درج کروں گا جو میں نے حیدرآباد دکن اور اہل حیدرآباد سے متاثر ہو کر ڈاکٹر زور کی خدمت میں الوداعی ہدیہ کے طور پر پیش کی تھی :۔

جہاں ہر کلی اک مہکتا چمن ہے
جہاں فرد اپنی جگہ انجمن ہے
جہاں شوخیاں ہیں ادائے بھین ہے
جہاں سادگی میں بھی اک بانکپن ہے
جہاں شعر بیت ہے جہاں قدر فن ہے
جہاں علم و فن کے لئے اک لگن ہے
جہاں کی زمیں رشک چرخ کہن ہے
جہاں ذرّے ذرّے میں مشک ختن ہے
جہاں زور و حیرت کا بھی اب وطن ہے
جہاں انجمن واقعی انجمن ہے
جو سچ پوچھتے ہو سخنور تو وہ خطہ
دکن ہے دکن ہے دکن ہے دکن ہے

کاش کہ میں اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکتا۔ انسان کی زندگی میں چند ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں دل روتا ہے آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں جہاں جذبات کا بے پناہ ہجوم دہن کے تنگ راستے سے الفاظ بن کر نکل نہیں سکتا جہاں صبر اور صرف صبر کے سوا اور کوئی معاون و مددگار نہیں ہوتا۔ یقیناً یہ بھی ایک ایسا ہی مقام ہے۔ خدا کرے کہ ہم مرحوم و مغفور کے نقش قدم پر چل سکیں۔

میر لئیق علی خاں

چند یادیں — چند آہیں

زور صاحب کو حیدر آباد میں کون نہیں جانتا تھا، اسی طرح میں بھی جانتا تھا لیکن ۱۹۳۶ء کے اواخر میں پہلی مرتبہ زور صاحب سے ملنا ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ اس وقت میں نیاز فتحپوری صاحب کی فرمایش پر داغ مرحوم کی اٹھارہ سالہ حیدر آبادی زندگی پر مضمون لکھ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے داغ سے متعلق غیر مطبوعہ مواد کی تلاش تھی۔ اسی جستجو میں سب سے پہلے مفاخر جنگ مرحوم کے پاس وہ سارا قلمی مواد لے کر پہنچا جو خاندانی ورثہ کے طور پر مجھ تک پہنچا تھا۔ اور وہ ساری باتیں بھی ان کے آگے بیان کیں جو رفیقانِ داغ اور ان کے معاصرین سے سنی تھیں۔ اور قدیم تذکروں۔ رسالوں اور دکنی تاریخوں سے برسوں میں جمع کیا ہوا مواد بھی پیش کیا۔ مرزا صاحب نے قلمی مواد کو سرسری طور پر شروع سے آخر تک دیکھ ڈالا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ یہ باتیں جو تم کو یاد ہیں من و عن قلم برداشتہ لکھ ڈالو اور فی الحال یہ سارا مواد جو تم لائے ہو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میں اسے ترتیب دے لوں گا اور ہفتہ عشرہ بعد جب تم اپنا نوشتہ مجھے دے دو گے تو تمھارے حوالے سے ایسا مضمون لکھ ڈالوں گا کہ یاد گار رہے گا۔ میں تو یہ سوچ کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ یہ دلی والے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور داغ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ بہت کچھ ان سے حاصل کر کے خوش خوش گھر لوٹوں گا۔ مگر وہاں معاملہ ہی برعکس نکلا۔ اس وقت ایک حقیقت میرے کام آگئی میں نے عرض کیا داغ سے متعلق اس مواد کا ذکر ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سے کر چکا ہوں اور وہ بھی اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے ملاحظہ کے بعد آپ کو دے دوں گا۔ مرزا صاحب یہ سنکر خاموش ہو گئے اور میں وہاں سے چلا آیا۔ دو چار دن بعد اس ملاقات کا ذکر میں نے ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سے کیا۔ یہ سنتے ہی ایک چمک سی ان کی آنکھوں میں پیدا ہوئی اور مسکرا کر فرمایا۔ تم وہاں کیوں گئے۔ مجھ سے پوچھ لیا ہوتا۔ اب تم خود یہ کام کرو۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ میں تم کو بتا دوں گا۔ دو تین دن تک میرے اوراق پریشاں دیکھ کر مجھے بتا دیا کہ ان سرخیوں کے تحت اس مواد کو پھیلا لو اور جلد از جلد مضمون لکھ ڈالو۔ دس پندرہ دنوں میں میرا مضمون تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر یزدانی صاحب نے اسے دیکھ لینے کے بعد فرمایا اب ایک کام اور کرو۔ ڈاکٹر زور صاحب کے کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ دکنی کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں داغ صاحب کی مواقفت اور مخالفت میں لکھا ہوا بہت کچھ ملیگا۔ اس کی سیر ضروری ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ زور صاحب سے ضرور ملو ان کا مطالعہ وسیع ہے اور دکنی ادب کے وہ رسیا ہیں بہت کچھ خود بتا سکیں گے۔ یہ سن کر زور صاحب سے ملنے کا اشتیاق میرے دل میں پیدا ہوا اور تعطیل کے دن شام کے چار بجے ادارۂ ادبیات اردو پہنچا۔ مولوی جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ سے ملاقات ہوی۔ میں نے اپنا کام بتا کر ڈاکٹر زور صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ جمال الدین صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر زور ابھی ابھی باہر سے آئے ہیں اور شاید آرام لے رہے ہوں گے۔ میں نے کہا میرا کارڈ یہ سمجھ کر اور اس پر میں نے

لکھ دیا اس وقت اگر تکلیف ہوتی ہو تو وقت مقرر فرما دیا جائے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے کہنے لگا صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ میں رہائشی بنگلہ کی طرف دس بیس قدم چل کر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر زور صاحب چھوٹے سے ورانڈے میں بت کی طرح خاموش کھڑے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں جب قریب پہنچا اور عطیت (خالص) حیدرآبادی سلام بجالایا تو خندہ پیشانی سے میری طرف بڑھتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اور ڈرائنگ روم میں لیجا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ مختصر سے تعارف کے بعد مجھ سے پوچھنے لگے فرمائیے کیسے آنا ہوا۔ اور آپ کے ہاتھ میں یہ کاپی کیسی ہے۔ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ داغ کا نام سنکر زور صاحب کچھ ٹھنڈے پڑ گئے میں نے وہ کاپی جلدی سے ان کے ہاتھ میں دے دی۔ نیک گو نہ بے دلی کے ساتھ کاپی کے اوراق الٹ الٹ کر دیکھتے رہے اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے آپ نے یہ مضمون داغ پر کیوں لکھا ہے۔ میں نے کہا داغ کی اٹھارہ سالہ حیدرآبادی زندگی پر آج تک کسی نے سیر حاصل مضمون نہیں لکھا ہے۔ کہنے لگے۔ تو پھر آپ کیسے لکھ سکیں گے۔ میں نے کہا اس مضمون کا بیشتر مواد قلمی اور دستاویزی ہے جو مجھے اپنے خاندانی ورثہ میں ملا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس سے بھی مجھے کارآمد مواد مل جائے تو اسے بھی شامل کر لوں۔ اور یہ کام آپ کی رہبری میں ہو۔ میرا یہ کہنا تھا کہ زور صاحب کے چہرے پر بشاشت سی آگئی۔ میرا سارا شجرۂ خاندان گنا دیا۔ اور کہنے لگے آپ سمجھتے ہوں گے میں بھول گیا ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے آپ ان ہی کے پوتے ہیں تاجن کا ذکر داغ کے سلسلے میں نواب عزیز یار جنگ بہادر بار بار کیا کرتے تھے۔ اور آپ ہی وہی ہیں تاجب احسن مارہروی صاحب کے متعدد خطوط کی بنا پر نواب عزیز یار جنگ مرحوم نے آپ سے داغ کے غیر مطبوعہ خطوط اور ایسی ہی دوسری چیزیں مانگیں تو آپ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سمجھ کر کہ اب ڈاکٹر صاحب رخصت چاہتے ہیں میں نے کہا اچھا اب اجازت دیجئے پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ زور کا قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہا نہیں نہیں ابھی نہیں یہ کہہ کر اندر چلے گئے۔ اور دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ خود پاندان ہاتھ میں سنبھالے ہوئے شیروانی اتار کر برآمد ہوئے۔ پان بنا کر پہلے مجھے دیا پھر خود کھایا۔ اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنے میں چائے بسکٹ کچھ موز اور سیب آگئے۔ اور چائے نوشی کے ساتھ ساتھ باتیں ہوتی رہیں اور باتوں باتوں میں مجھے ٹٹولتے بھی رہے کہ یہ کس پایہ کا دکنی ہے اور اپنے وطن کی قدیم معاشرت تہذیب اور زندہ روایات سے اسے کتنی محبت ہے۔ جب ان کو یقین سا ہو گیا کہ یہ عطیت دکنی ہے تو کہنے لگے آپ حیدرآبادی شاعروں اور ادیبوں اور دکنی ادبی ماحول پر کیوں نہیں لکھتے۔ جن کا آپ پر حق ہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب وہی تو لکھ رہا ہوں۔ میرے اس مضمون میں داغ کی اٹھارہ سالہ زندگی اور اس وقت کے حیدرآبادی ماحول کی ایسی تصویریں نظر آئیں گی جو کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ میرے اس جملے پر چونک سے گئے اور پوچھنے لگے میری یا اس ادارے کی کون کون سی کتابیں دیکھی ہیں۔ میں نے چند اہم کتابوں کے نام گنائے اور مرقع سخن کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ اور بھی بہت سے مشہور شاعر اور ادیب ہیں جو آپ کی نظروں سے اوجھل ہی رہے۔ چہرہ سرخ ہو گیا مگر بڑی ملائمت سے فرمانے لگے وہ کون ہیں۔ میں نے کہا مثلاً تفضل، نادان عالم۔ نیر۔ نواز۔ اور عورتوں میں امتیاز۔ سکندر وغیرہ ایسے بیسیوں ہیں جنھیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ تھوڑی دیر تک حیرت سے میرا منہ تکتے رہے پھر کہا ان کا ذکر کن کتابوں میں ہے۔ میں نے بتایا بعض کا کلام اور قلمی تالیفات میرے پاس ہیں اور امتیاز کی مثنوی اور سکندر کی تصنیفات بھی میرے پاس ہیں۔ اور بعض مطبوعہ تصانیف بھی ہیں ڈاکٹر صاحب کو

شاید اس وقت میری باتوں کا یقین نہ ہوا اور خاموش ہو گئے۔ میں چلنے لگا تو گیٹ تک میرے ساتھ آئے اور فرمایا کل شام کے پانچ بجے آجائیے آپ کے مطلب کی کتابیں نکال کر رکھوں گا۔ میرے مضمون کی کاپی میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا میں کل تک اسے بھی پڑھ ڈالوں گا۔ میں سنا کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی قدر گرم مزاج۔ کم آمیز اور زود رنج انسان ہیں مگر میں نے پہلی ہی ملاقات میں ان کو متوازن المزاج۔ ہنسمکھ۔ درد آشنا اور صاف گو انسان پایا۔ اس کے بعد کی دو چار طولانی ملاقاتوں کے بعد تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ مجھ جیسے بے بضاعت آدمی کی ان جیسے بلند قدر انسان سے جسم جنم کی شناسائی ہے۔ دوسرے دن میں بروقت ان کے پاس پہنچا تو کہنے لگے میں نے آپ کا سارا مضمون پڑھ لیا ہے۔ اس کی نیاز صاحب کیا قدر کر سکتے ہیں۔ اب آپ داغ کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر اس میں سے کچھ لکھ کر بھیج دیجئے اور باقی خود اپنے لئے اٹھا رکھئے۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے یہ سزائے بامشقت تجویز فرمائی کہ میں ناصر الدولہ سے لے کر محبوب علی بادشاہ کے دور تک کے حیدرآبادی شاعروں پر شاعروں۔ ادیبوں۔ ادبی محفلوں اور علمی کارناموں وغیرہ سے متعلق ایک کتاب ہی لکھ دوں اور اپنے دادا کا دیوان بھی شائع کر دوں۔ دیڑھ دو سال تک بڑی تخت سے اس قسم کا جیدہ جیدہ مواد جمع کرتا رہا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً دکھاتا بھی رہا اور اس کی اشاعت کی غرض سے آج سے کئی برس پہلے ڈاکٹر صاحب نے غالباً رائے جانکی پرشاد صاحب کے ایما سے ادارہ کی مٹھی سے سات آٹھ سو روپے بھی منظور کروا لئے تھے۔ مگر میری عدیم الفرصتی نے مجھے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کے پیش لفظ کے ساتھ ایک ایسی کتاب کے منظر عام پر لانے سے قاصر ہی رکھا جس کا مجھے عمر بھر افسوس ہی رہے گا۔

خصوصاً ۱۹۴۳ء سے ڈاکٹر صاحب کی روز افزوں شفقتوں نے مجھے اس قدر رام کر لیا تھا کہ ہفتہ میں تین چار دن کی حاضری لازمی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری ملاقات کا وقت رات کے ۸½ بجے مقرر کر رکھا تھا جب کہ وہ ادارے کے کاروبار اور دوسری مصروفیتوں سے فارغ ہو کر اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں تخت پر گاؤ تکیے سے لگے چار زانو بیٹھے ہوئے تازہ وارد قلمی کتابوں پر نوٹ لکھا کرتے تھے یا باہر سے آئے ہوئے خطوط کے جواب اپنے قلم سے لکھتے تھے یا خود اپنے زیر اشاعت مضامین اور دوسروں کی شائع ہونے والی کتابوں کے مسودے یا پروف دیکھا کرتے تھے۔ یا پھر اپنے ادارے یا اردو کی ترویج اور توسیع سے متعلق اہل ملک کی تجاویز اور حکومتوں کی دارسی کے عملی پہلوؤں پر غور کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے خواجہ تاشوں کے دو یہ اور لوکھاٹ پر پُر لطف تنقیدیں بھی کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ ان ہی باتوں میں رات کے ۱۰½ بج جاتے اور میں کہتا ڈاکٹر صاحب بہت دیر ہو چکی آپ کو آرام کرنا چاہئے تو فرماتے آرام بے کاروں کے لئے ہے۔ انسان کی عمر تھوڑی ہے اور کام بہت کرنا چاہئے۔ پھر ہنس کر فرماتے آپ بہت بیکار آدمی ہیں۔ کچھ نہیں کرتے۔ اپنے کاموں کی وجہ سے اگر میں زیادہ دن تک غائب رہتا تو صبح ۶ بجے یا رات کے ۸ کے بعد ٹہلتے ہوئے میرے پاس آجاتے (چونکہ میں قریب ہی رہتا تھا) اور سب سے پہلا جملہ یہ ہوتا کہ میں آپ سے بہت خفا ہوں۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ ٹیلیفون پر کہتے میں بہت خفا ہوں۔ میں اپنے عذرات پیش کرنا چاہتا تو یہ کہہ کر ٹیلیفون رکھ دیتے کہ جب تک آپ خود آکر سبب نہیں بتائیں گے میں نہیں مانوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کی نوازشوں نے مجھے اس قدر جسارت عطا کر دی تھی کہ میں بعض دفعہ ان کے درپردہ سخت سے سخت مخالفین کے ساتھ چند اصولی باتوں میں سمجھوتا کرنے کا دبی زبان سے مشورہ دیا کرتا اور بعض دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ جو باتیں مخالفوں نے آپ تک پہنچائی ہیں وہ قطعاً

غلطیں۔ پہلے تو بگڑتے اور جب دل کی بھڑاس نکل جاتی تو لمبا سانس لے کر کہتے ٹھیک ہے۔ یہ لوگ خود شرمندہ ہو جائیں گے۔ نتیجۃً بعض تحریریں جو کسی ناواجبی تنقید کے جواب میں پریس کو جا رہی ہوتیں یا ایسے جوابی خط جو سخت انداز میں لکھے جا چکے ہوتے اُن میں مناسب ترمیم کر دی جاتی یا وہ جُز ہی اڑا دئے جاتے جو ناگوار ہوں۔ جو کچھ میں نے اس وقت عرض کیا ہے اُس سے اپنی خود نمائی منظور نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب کے اُس سیرتی پہلو پر نظر پڑتی ہے کہ وہ پُرخلوص اور بے غرض مشوروں کی کتنی قدر کیا کرتے تھے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں ڈاکٹر زور۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ اب میں زور صاحب کی دلکش اور بلند پایہ شخصیت کے تعلق سے ایسی چند باتیں لکھنا چاہوں جو دس پانچ برس قربت میں خود میں نے دیکھی ہیں اور ان کا تجزیہ بھی اپنے طور پر کیا ہے:۔

دوست احباب:۔ زور صاحب کے شناساؤں اور احباب کا حلقہ ان کے دل کی طرح وسیع تھا۔ اس میں عالم۔ فلسفی۔ شاعر۔ مؤرخ۔ ادیب طالب علم۔ صوفی۔ پنڈت۔ مہنت۔ مولوی و رند ڈاکٹر یکیم۔ عمائدین سلطنت۔ منسٹر۔ سیاسی لیڈر۔ صحافی۔ انجنیر۔ آرٹسٹ۔ پروفیسر۔ منجم۔ فوٹو گرافر۔ تاجر۔ امیر و غریب۔ مفلس و فقیر سب شامل تھے۔ اور ہر ایک سے ان کی دوستی یا ملاقات اُس کی یا اپنی شان اور منشا کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ دوسروں کی اغراض چاہے کچھ ہوں مگر انکی اپنی غرض ایک ہی تھی یعنی اُردو۔ اردو کا تحفظ۔ اردو کی ترقی۔ اردو کا ملک بھر کی زبانوں سے سمجھوتا اور بھائی چارہ۔ قومی یک جہتی اور ملک کی ہمہ گیر ترقی میں اردو کی نمایاں کارگزاریاں ادیبوں۔ مورخوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی اور اپنے ادارے کے توسط سے دکھنی لٹریچر کی تاریخی اور ادبی حیثیت کا احیا۔ جس میں انھوں نے تلنگی کو بھی شامل کر لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے کام:۔ ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دکنی ادب کو عوام اور خواص دونوں کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی ایک ایسے ادارے کی نہ صرف بنیاد ڈالی بلکہ خون پسینا ایک کر کے اس کو پروان چڑھایا۔ اور ایک ایسا ایوان بنایا جس میں صدیوں کی حوریں کھڑی جھانک رہی ہیں۔ قدیم اسناد۔ فرامین اور مخطوطات کو گمنامی کے تہہ خانوں سے نکال کر بام عروج پر لا بٹھایا۔ ایوان اردو کی با مقصد نقاشی۔ بے زبان کتبوں کی اثر انگیز گفتگو ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کی دلکش تصویریں الغرض ایوان کی ہر شے میں زور صاحب کے خون جگر کے وافر آب و رنگ کی موج در موج جھلک موجود ہے۔ ایک دن بے تکلفی سے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ ڈوم آپ نے کیوں بٹھایا اس کی کیا ضرورت تھی۔ بعض لوگ اسے مقبرہ کہنے لگے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے پھر ہنسی آ گئی۔ پان کی ایک گلوری منہ میں دبائی اور فرمانے لگے اس میں بھی ایک مصلحت ہے۔ شاید آج سے سو برس بعد یا اس سے پہلے ہی یہ ادارے بھولے بسرے عجائب خانے بن جائیں گے۔ اگر یہ ڈوم (گنبد) قائم رہا تو متجسس نگاہیں اس پر پڑیں گی اور لوگ اسے کوئی مندر۔ مسجد یا مقبرہ سمجھ کر دیکھنے آئیں گے۔ اور ان ہی میں ایسے لوگ بھی نکل آئیں گے جو ان انمول خزانوں سے استفادہ کریں گے اور اس طرح دکن کی تاریخ پھر زندہ ہوگی۔ اور ہندوستان کا نام روشن ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کے سوچ بچار اور کام کرنے کا طریقہ:۔ ان کا ذہنی رجحان بالکلیہ عقلی تھا۔ تاریخی اور ادبی مطالعے میں ڈاکٹر صاحب کا طریقہ عام روش سے جداگانہ تھا۔

وہ تاریخی واقعات سے صرف زمین کا کام لیتے تھے۔ اور عمارت کے لئے تذکرہ۔ سوانح عمری۔ رقعات۔ اسنادات۔ محاضرات۔ کشکول۔ قدیم کتابوں کے مقدموں۔ شخصی تفصیلی قصوں۔ کہانیوں۔ کتبوں اور ملکی اور غیر ملکی ماخذات سے واقعات کو رونما کرنے والی حقیقتوں کا کھوج لگاتے تھے۔ جاگیری وثیقوں اور پرانے احکام کے وسیع ذخیروں پر بھی ان کی نظر تھی۔ اس طرح تاریخ اور افسانوں کو سمو کر ڈاکٹر صاحب نے ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ ان کے اس فن اور تاریخی مطالعہ کے انداز نظر سے معاشر کی اکثریت نے بڑے ذوق و شوق سے استفادہ کیا۔ وہ اپنی پسند کا کام کرنے میں کبھی تھکتے نہیں تھے اور نہ پریشانی اور الجھن محسوس کرتے تھے۔ ان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرتا تھا اور جس وقت جس چیز کو یاد کرنا چاہتے یاد آجاتی۔ بڑی سے بڑی اسکیم دنوں میں تیار کر لیتے اور کام شروع کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلو ان کے پیش نظر ہوتے۔ معمولی جزئیات پر بھی ان کی نظر ہوتی یہاں تک کہ جن سے کام لینا ہے ان کے نام بھی نوعیت وار ان کے ذہن نشین ہوتے۔ اور بجٹ بھی فراخ دلی سے خود ہی بنا لیا کرتے تھے۔ بہت کم اس میں کاٹ کسر کی نوبت آتی۔ وہ انسانی زندگی میں ہمیشہ رجائی پہلوؤں کو دیکھتے اور پست ہمتی کو برا جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ تادم آخر ان کے دولوں کے چراغ روشن اور ان کے امنگوں کی شمعیں فروزاں ہی رہیں۔ ان کی معلومات برسوں کے مطالعہ کی جانگداز کمائی تھی۔ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ جس فن کی کتاب ہاتھ میں لیتے اس فن کی بے شمار کتابوں اور مصنفوں کے حالات بیان کر ڈالتے۔ جب کسی اصول یا پالیسی کو اختیار کر لیتے تو پھر انھیں کوئی چیز اپنے عزم سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ہی ان کا عزم مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ وہ مخالفین کے مضامین کو اس طرح پڑھا کرتے تھے جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لئے عمل پڑھ رہا ہو۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کے ادبی اور علمی نظریات کو بڑی ہمدردی اور غور سے دیکھا کرتے تھے۔ اور انھیں اگر کوئی ایسا عنصر مل جاتا جو ان کے کام کا ہوتا تو اس کی تلاش اور جستجو میں لگ جاتے۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کی رائے صحیح نہیں ہے تو اس پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مجھ سے فرمانے لگے اگر کسی کی کوئی صحت مند خوبی پسند آجائے تو اسے اپنی ذات میں جذب کر لینا چاہئے۔ اور یوں سمجھنا چاہئے کہ لطافت سے لطافت پیدا ہوتی ہے اور کثافت گریز کر جاتی ہے۔

ان کے لکھنے کا طریقہ عجیب تھا۔ مواد جمع کرتے رہتے اور جب ان کی دانست میں وہ پورا ہو جاتا تو پان کی خود ساختہ گلوری منہ میں آئی۔ پیشانی پر کبھی بل پڑے اور کبھی تبسم کھیلا اور لکھنا شروع کر دیا۔ بعض وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ قلم کی روانی اور وقت کے مابین جنگ شروع ہو گئی۔ ادھر شیلیفون گونج رہا ہے۔ ادھر ارباب ادارہ کاغذوں پر دستخط لے رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں پہلوان (ملازم خاص) اپنی دن بھر کی داستان سنا رہے ہیں۔ سب کی سن رہے ہیں اور سب کے جواب دے رہے ہیں مگر اپنے مرکز خیال پر قائم ہیں۔ اور ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ ایک بار بھی وقت نے قلم پر فتح نہیں پائی۔ کام پورا ہو گیا اور معمولی سی تصحیح کے بعد پریس کو بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا کردار بلند تھا۔ بے باکی اور صاف گوئی ان کا شعار تھا۔ خوش باشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے خود رہتے اور اپنے متعلقین کو رکھا کرتے تھے۔ عہدہ بھی معقول تھا۔ تنخواہ بڑی تھی۔ گھر دار۔ موٹر۔ نوکر چاکر سبھی کچھ تھے مگر طبیعت میں غرور نہ تھا۔ بعض لوگ اپنی نااہلی یا بار بار کی خطاؤں پر ان کے بے پناہ غصے کا شکار ہو جایا کرتے تھے مگر تھوڑی دیر بعد ہی ان کی نگاہوں کی کشش اور حیات آفریں مسکراہٹ ان کے دلوں کے داغ دھو ڈالتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ریاستی ماحول میں گزارا مگر کبھی عیش و عشرت میں نہیں پڑے اور نہ ریاستی ماحول کے مذموم اثرات سے اپنا دامن تر ہونے دیا۔ بلکہ ان پر اس ماحول کا ردعمل ہوا۔ اسی لئے انھیں ایسی باتوں سے ہمیشہ نفرت ہی رہی جو زوال اور انحطاط کی طرف

لے جایا کرتی ہیں۔ ریاستی ماحول چاپلوسی اور زمانہ سازی سکھاتا ہے مگر وہ اس سے بھی متنفر رہے۔ اس کے برخلاف وہ ہمیشہ روشن خیالی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ابھرتی ہوئی تحریکوں کا خیر مقدم کرتے رہے۔ وہ عمر بھر انسان کی عظمت کے قائل رہے۔ انسانوں کے ادنیٰ میلانات اور نفسانی دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے اور بعض دفعہ سخت سے سخت الفاظ میں تنقید سے بھی دریغ نہ کرتے تھے مگر ان کو خدا نے ہر بات کے بیان کرنے کا ایک ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کسی موقع پر بھی وہ تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے تھے ڈاکٹر صاحب علم مجلس کے لحاظ سے منفرد شخص تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد ہم ایک پُر نہ ہونے والا خلا سا محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ بڑے خلوص، محبت اور شفقت سے تشنہ کامانِ علم و فضل کی تشفی کا سامان بہم پہنچایا کرتے تھے۔ وہ ہر طالب علم کا استقبال خندہ پیشانی اور شگفتہ خاطری سے کرتے تھے۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی استعداد دیکھتے اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے تھے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے نہیں بلکہ اُن کے مقام سے دیکھا کرتے تھے۔ لطائف و ظرائف اُن کے کشکول میں ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔ ہر درجہ کے انسان کو اس کی پسند کی باتوں سے محظوظ کیا کرتے تھے۔ جس سے جو تعلق ہو گیا۔ حاضر و غائب یکساں تھا۔ جو منہ پڑ گئی زندگی بھر نباہا کئے۔ بات کرتے وقت تمہید میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اپنے خیالات مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کرتے تھے۔ ہر اس شخص سے وقت بے وقت ملنے کے لئے تیار ہو جایا کرتے تھے جو اردو کا نام لے کر ان کے پاس آئے مگر وہ کسی کی اکڑفوں یا جھوٹی نمائش کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ کوئی شام کے چھ بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر زور صاحب چار پانچ بے تکلف ملنے والوں کے ساتھ کرتا پہنے ہوئے اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم نے ایک کارڈ لا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا اور ہم سب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے بھئی ایک نئی آفت آ گئی ہے۔ پاکستان کے کوئی ریسرچ اسکالر آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اٹھے اور اندر جا کر شیروانی پہن کر باہر آئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لیتے گئے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ خود صوفے پر بیٹھ گئے اور ان کو سامنے والی گدے دار کرسی پر بٹھا دیا۔ اُن صاحب نے جو بالکل نوجوان تھے اور بہت ہی قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے لباس سے انگریزی عطر کی لپٹیں چلی آ رہی تھیں۔ پاؤں پر پاؤں ڈال کر پیٹھ اور سر لمبی کرسی کے پچھلے حصہ پر ٹکاتے ہوئے پہلا سوال ڈاکٹر صاحب سے یہ کیا کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہو گا۔ میں نے کراچی سے لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی بے رخی سے جواب دیا کہ مجھے تو کوئی خط نہیں ملا۔ فرمائیے کام کیا ہے۔ اب میں ڈاکٹر صاحب کے چہرے کو تک رہا تھا کہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور بس پڑیں گے۔ مگر بڑے صبر و تحمل سے سنتے رہے۔ اُن صاحب نے بتلایا کہ میں کراچی کی فلاں نوساختہ انجمن کا معتمد ہوں اور ہم نے ایک کتب خانہ کھولا ہے اس کے لئے آپ کے ادارہ کی مطبوعہ کتابوں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے منہ بنا کر پوچھا۔ یہی کام ہے یا کوئی اور بات بھی ہے۔ انھوں نے کہا میں یہ کتابیں آج ہی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ملازم کو آواز دے کر کہنے لگے آپ کو دفتر میں لیجاؤ اور ہماری کتابوں کی فہرست دیدو۔ اور اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو بھی کتابیں آپ کو پسند آئیں گی اُس کی قیمت دفتر والے آپ کو بتا دیں گے۔ اُن صاحب نے کہا کہ میں تو مفت چاہتا تھا کیونکہ یہ ہمارا اردو کا ادارہ ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ایسے چھوٹے موٹے ادارے میرے ملک ہی میں بہت سارے ہیں اگر میں ان سب کو مفت کتابیں دیتا رہوں تو مجھے اپنا ادارہ بند کر دینا پڑے۔ اور رخصتی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہاں سے واپس ہو کر سیدھے

وہ تاریخی واقعات سے صرف زینہ کا کام لیتے تھے۔ اور عمارت کے لئے تذکرہ۔ سوانح عمری۔ رقعات۔ اسنادات۔ محاضرات۔ کشکول۔ قدیم کتابوں کے مقدموں۔ شخصی تعقیبی قصوں۔ کہانیوں۔ کتبوں اور ملکی اور غیر ملکی ماخذات سے واقعات کو روشنا کرنے والی حقیقتوں کا کھوج لگاتے تھے۔ جاگیری وثیقوں اور پرانے احکام کے وسیع ذخیروں پر بھی ان کی نظر تھی۔ اس طرح تاریخ اور افسانوں کو سمو کر ڈاکٹر صاحب نے ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اُن کے اس فن اور تاریخی مطالعہ کے انداز نظر سے معاشر کی اکثریت نے بڑے ذوق وشوق سے استفادہ کیا۔ وہ اپنی پسند کا کام کرنے میں کبھی تھکتے نہیں تھے اور نہ پریشانی اور الجھن محسوس کرتے تھے۔ ان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرتا تھا اور جس وقت جس چیز کو یاد کرنا چاہتے یاد آجاتی۔ بڑی سے بڑی اسکیم دنوں میں تیار کر لیتے اور کام شروع کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلو ان کے پیش نظر ہوتے۔ معمولی جزئیات پر بھی ان کی نظر حوق یہاں تک کہ جن سے کام لینا ہے ان کے نام بھی نوعیت واران کے ذہن نشیں ہوتے۔ اور بجٹ بھی فراخ دلی سے خود ہی بنا لیا کرتے تھے۔ بہت کم اس میں کاٹ کسر کی نوبت آتی۔ وہ انسانی زندگی میں ہمیشہ رجائی پہلوؤں کو دیکھتے اور پست ہمتی کو بُرا جانتے تھے یہی جذبہ تھا کہ آدم خاں کے ولولوں کے چراغ روشن اور ان کے امنگوں کی شمعیں فروزاں ہی رہیں۔ ان کی معلومات برسوں کے مطالعہ کی جائز کمائی تھی۔ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ جس فن کی کتاب ہاتھ میں لیتے اس فن کی بے شمار کتابوں اور مصنفوں کے حالات بیان کر ڈالتے۔ جب کسی اصول یا پالیسی کو اختیار کر لیتے تو پھر انھیں کوئی چیز اپنے عزم سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ہی ان کا عزم مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ وہ مخالفین کے مضامین کو اس طرح پڑھا کرتے تھے جیسے کوئی عالم بہت اتارنے کے لئے عمل پڑھ رہا ہو۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کے ادبی اور علمی نظریات کو بڑی ہمدردی اور غور سے دیکھا کرتے تھے۔ اور انھیں اگر کوئی ایسا عنصر مل جاتا جو ان کے کام کا ہوتا تو اس کی تلاش اور جستجو میں لگ جاتے۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کی رائے صحیح نہیں ہے تو اس پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مجھ سے فرمانے لگے اگر کسی کی کوئی صحت مند خوبی پسند آجائے تو اسے اپنی ذات میں جذب کر لینا چاہئے۔ اور یوں سمجھنا چاہئے کہ لطافت سے لطافت پیدا ہوتی ہے اور کثافت گریز کر جاتی ہے۔

ان کے لکھنے کا طریقہ عجیب تھا۔ مواد جمع کرتے رہتے اور جب ان کی دانست میں وہ پورا ہو جاتا تو پان کی خود ساختہ گلوری منہ میں آئی۔ پیشانی پر کبھی بل پڑے اور کبھی تبسم کھیلا اور لکھنا شروع کر دیا۔ بعض وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ قلم کی روانی اور وقت کے مابین جنگ شروع ہو گئی۔ ادھر ٹیلیفون گونج رہا ہے۔ ادھر ارباب ادارہ کاغذوں پر دستخط لے رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں پہلوان (ملازم خاص) اپنی دن بھر کی داستان سنا رہے ہیں۔ سب کی سن رہے ہیں اور سب کے جواب دئے جا رہے ہیں مگر اپنے مرکز خیال پر قائم ہیں۔ اور ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ ایک بار بھی وقت نے قلم پر فتح نہیں پائی۔ کام پورا ہو گیا اور معمولی سی تصحیح کے بعد پریس کو بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا کردار بلند تھا۔ بے باکی اور صاف گوئی ان کا شعار رہا۔ خوش باشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے خود رہتے اور اپنے متعلقین کو رکھا کرتے تھے۔ عہدہ بھی معقول تھا۔ تنخواہ بڑی تھی۔ گھوڑا۔ موٹر۔ نوکر چاکر سبھی کچھ تھے مگر طبیعت میں غرور نہ تھا۔ بعض لوگ اپنی نااہلی یا بار بار کی خطاؤں پر ان کے بے پناہ غصے کا شکار ہو جایا کرتے تھے مگر تھوڑی دیر بعد ہی ان کی نگاہوں کی کشش اور حیات آفریں مسکراہٹ ان کے دلوں کے داغ دھو ڈالتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ریاستی ماحول میں گزارا مگر کبھی عیش وعشرت میں نہیں پڑے اور نہ ریاستی ماحول کے مذموم اثرات سے اپنا دامن تر ہونے دیا۔ بلکہ اُن پر اس ماحول کا ردعمل ہوا۔ اسی لئے انھیں ایسی باتوں سے ہمیشہ نفرت ہی رہی جو زوال اور انحطاط کی طرف

لے جایا کرتی ہیں۔ ریاستی ماحول چاپلوسی اور زمانہ سازی سکھاتا ہے مگر وہ اس سے بھی متنفر رہے۔ اس کے برخلاف وہ ہمیشہ روشن خیالی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ابھرتی ہوئی تحریکوں کا خیر مقدم کرتے رہے۔ وہ عمر بھر انسان کی عظمت کے قائل رہے۔ انسانوں کے ادنیٰ میلانات اور نفسانی دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے اور بعض دفعہ سخت سے سخت الفاظ میں تنقید سے بھی دریغ نہ کرتے تھے مگر ان کو خدا نے ہر بات کے بیان کرنے کا ایک ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کسی موقع پر بھی وہ تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے تھے ڈاکٹر صاحب علم مجلس کے لحاظ سے منفرد شخص تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد ہم ایک پُر ہونے والا خلا سا محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ بڑے خلوص۔ محنت اور شفقت سے تشنہ کامانِ علم و فضل کی تشفی کا سامان بہم پہنچایا کرتے تھے۔ وہ ہر طالب علم کا استقبال خندہ پیشانی اور شگفتہ خاطری سے کرتے تھے۔ جو صلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی استعداد دیکھتے اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے تھے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے نہیں بلکہ اُن کے مقام سے دیکھا کرتے تھے۔ لطائف و ظرائف اُن کے کشکول میں ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔ ہر درجہ کے انسان کو اس کی پسند کی باتوں سے محظوظ کیا کرتے تھے۔ جس سے جو تعلق ہو گیا۔ حاضر و غائب یکساں تھا۔ جو وضع پڑ گئی زندگی بھر نباہ گئے۔ بات کرتے وقت تمہید میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اپنے خیالات مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کرتے تھے۔ ہر اس شخص سے وقت بے وقت ملنے کے لئے تیار ہو جایا کرتے تھے جو اردو کا نام لے کر ان کے پاس آئے مگر وہ کسی کی اکڑفوں یا جھوٹی نمائش کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ کوئی شام کے چھ بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر زور صاحب چار پانچ بے تکلف ملنے والوں کے ساتھ کرتا پہنے ہوئے اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم نے ایک کارڈ لا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا اور ہم سب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے بھئی ایک نئی آفت آ گئی ہے۔ پاکستان کے کوئی ریسرچ اسکالر آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اٹھے اور اندر جا کر شیروانی پہن کر باہر آئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لیتے گئے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ خود صوفے پر بیٹھ گئے اور ان کو سامنے والی گدے دار کرسی پر بٹھا دیا۔ اُن صاحب نے جو بالکل نوجوان تھے اور بہت ہی قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے لباس سے انگریزی عطر کی لپٹیں چل رہی تھیں۔ پاؤں پر پاؤں ڈال کر بیٹھے اور سر لمبی کرسی کے پچھلے حصہ پر ٹکاتے ہوئے پہلا سوال ڈاکٹر صاحب سے یہ کیا کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہو گا۔ میں نے کراچی سے لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی بے رخی سے جواب دیا کہ مجھے تو کوئی خط نہیں ملا۔ فرمائیے کام کیا ہے۔ اب میں ڈاکٹر صاحب کے چہرے کو تک رہا تھا کہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور بس پڑیں گے۔ مگر بڑے صبر و تحمل سے سنتے رہے۔ اُن صاحب نے بتلایا کہ میں کراچی کی فلاں نوساختہ انجمن کا معتمد ہوں اور ہم نے ایک کتب خانہ کھولا ہے اس کے لئے آپ کے ادارہ کی مطبوعہ کتابوں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے منہ بنا کر پوچھا۔ یہی کام ہے یا کوئی اور بات بھی ہے۔ انھوں نے کہا میں یہ کتابیں آج ہی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ملازم کو آواز دے کر کہنے لگے آپ کو دفتر میں لیجاؤ اور ہماری کتابوں کی فہرست دیدو۔ اور اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو بھی کتابیں آپ کو پسند آئیں گی اس کی قیمت دفتر والے آپ کو بتا دیں گے۔ اُن صاحب نے کہا کہ میں تو مفت چاہتا تھا کیونکہ یہ ہمارا اردو کا ادارہ ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ایسے چھوٹے موٹے ادارے میرے ملک ہی میں بہت سارے ہیں اگر میں ان سب کو مفت کتابیں دیتا رہوں تو مجھے اپنا ادارہ بند کر دینا پڑے۔ اور رخصتی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہاں سے واپس ہو کر سیدھے

اندر چلے گئے اور پھر اپنی محفل میں آ بیٹھے۔ اور غصہ سے کہنے لگے کمبخت اپنے آپ کو ریسرچ اسکالر کہتا ہے اور اُس میں علم کی بو باس ہی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں ہے کہ میں کس سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اپنے استادوں سے بھی اسی طرح ملتا ہوگا۔ لوگوں نے ٹھنڈا کرنا چاہا تو کہا دیکھئے عرصۂ دراز تک میں بھی طالب علم رہا ہوں۔ ملکوں ملکوں پھرا ہوں مگر ایسے طالب علم نہیں دیکھے۔ بات آئی گئی ہوگئی اور وہ صاحب فہرست لئے بغیر ہی روانہ ہوگئے۔ اس کے برخلاف یہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ ایک دن ایک بہت بڑے آدمی ادارہ دیکھنے کے لئے آئے۔ ایسے موقعوں پر ڈاکٹر صاحب ایک چھوٹی سی دعوت دے کر اپنے جاننے والوں اور ادارے کے بہی خواہوں کو ضرور بلا لیا کرتے تھے۔ اور مہمان خصوصی سے اس قدر دانہ انداز میں ان کا تعارف کراتے تھے کہ جیسے ان میں کا ہر ایک فرد ایوان اردو کا ایک قوی ہیکل ستون ہے۔

ادارے کی محبت: — ڈاکٹر صاحب کو ادارے کے ذرہ ذرہ سے والہانہ محبت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ایوان کی چھتیں بن چکی تھیں اور کہیں کہیں سے ٹپکنے لگی تھیں تو ڈاکٹر صاحب تھاپی اور سمنٹ لے کر اپنے ملازموں اور مزدوروں کے ساتھ علی الصباح خود بھی کام میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ اور ادارے کی رقم کی پائی پائی کا حساب کیا کرتے تھے۔ اور ادارہ کے لئے سامان کی فراہمی اور کتابوں کی خریدی میں وہ بنیوں کو بھی مات کر دیا کرتے تھے۔ تب ہی تو ہم کہتے ہیں کہ بقول "کمتر سرمایہ میں ایک بڑی سے بڑی چیز ہمارے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ ایوان اردو کا گوشہ گوشہ ڈاکٹر صاحب کی چشم نگراں کا منت پذیر ہے اور اس کے ذرے ذرے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دل کی دھڑکنیں پوشیدہ ہیں جو نسلاً بعد نسلاً عاشقان اردو کے خون کو گرماتی رہینگی۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کا سرسید کے بغیر۔ تاریخ شعرائے اردو کا محمد حسین آزاد کے بغیر انقلابی شاعری کا حالی اور اقبال کے بغیر اور تحفظ اردو کا تصور مولوی عبدالحق کو علیحدہ کر کے نہیں کیا جا سکتا اسی طرح دکنی ادبیات اور ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کا تصور زور صاحب کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ مجھے ان ہی کے ایک شعر پر اس نوشتے کو ختم کرنے دیجئے۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

محمد یوسف ٹینگ
(سری نگر)

ڈاکٹر زور کشمیر میں

اپنی نسل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرے لئے بھی زور صاحب کے نام میں ایک اساطیری کشش تھی۔ اُن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہمارا شعور جوان ہوا اور اُن کی شہرت کے ڈنکے سے ہمارے کان اُس وقت گونج اُٹھے، جب کہ بقول غالب: ؎

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

گو "تعمیر" کے زمانۂ ادارت میں زور صاحب سے خط و کتابت کے مراسم قائم ہو چکے تھے لیکن پہلی مرتبہ جب میں نے سُنا کہ وہ شہر میں جموں و کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے آگئے ہیں تو مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ (LEGEND) کے خلاؤں سے نیچے آکر اب یہ شخصیت ہمارے درمیان موجود تھی۔ ان ہی دنوں سرینگر کے ریڈیو سٹیشن پر گیا تو وہاں سٹوڈیو میں خواجہ غلام السیدین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ ایک اور وجیہہ شخص کو مصروف گفتگو دیکھا۔ میں وراندے میں ٹہل رہا تھا کہ یہ تینوں صاحبان باہر آگئے۔ زور صاحب چلتے میں مجھ پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن چند دنوں کے بعد زور صاحب "شیرازہ" کے دفتر پر تشریف لائے۔ ابھی میں اپنا تعارف کرنے ہی والا تھا کہ وہ بڑے تپاک سے بڑھے اور کہنے لگے "بھئی آپ سے ریڈیو سٹیشن پر ملاقات ہو چکی ہے"۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو بولے کہ وہ گذشتہ کئی دنوں سے میری تلاش میں تھے۔ اس کے بعد نہایت شفقت سے باتیں کرتے رہے اور کچھ ہی دنوں میں میں نے اپنے آپ کو اُن کا حلقہ بگوش پالیا۔ جب بھی اُن کے یہاں جانے کا خیال آتا، طبیعت شگفتہ ہو جاتی۔ اپنی اُن دنوں کی حالت کا ماجرا یاد کر کے اقبال کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے: ؎

بہ عشوہ ہائے جوانان ماہ سیما چیست
در آ بہ حلقۂ پیرے کہ دلبری داند

زور صاحب کی محفلیں بڑی لطیف اور پاکیزہ ہوتی تھیں۔ لیکن اُس "بوریت" اور خشک مزاجی سے کوسوں دور، جو کسی معمر محقق کی مجلسوں سے متوقع ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں محور تو بہرحال علم و ادب ہی رہتے تھے لیکن ذہنیات مزاج اور ہلکے پھلکے موضوع بھی ساتھ ساتھ جاری رہتے۔ خود اُن کا قہقہہ "چیزے دگر" والا رنگ رکھتا تھا۔ جب وہ با آواز بلند اپنا قہقہہ لگاتے تو گویا ماحول پر ہنسی طاری ہو جاتی۔ گویا اُن کی شخصیت کے سارے بند کھل جاتے اور اُنکی عالی ظرفی کا دھارا ٹھاٹھیں مارتا ہوا باہر آجاتا۔ جس کسی نے اُن کا یہ قہقہہ سُنا ہے وہ اسکی گونج کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔

زور صاحب کشمیر اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے آگئے تھے لیکن وہ بہت جلد اس خول کو توڑ کر باہر آگئے۔ ہم نے یہاں بہت سی ادبی شخصیتوں کو آتے دیکھا ہے۔ لیکن زور صاحب جس انداز سے آئے اور پھر جس سُرعت سے چھا گئے اُس کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ اُن کی اس کامیابی اور ہمہ گیری کا یہ کارنامہ بڑا غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آپ کو زور صاحب سے ایک مرتبہ ملنا تھا۔ آپ خود سمجھ جاتے کہ وہ اس کام کو کس قدر آسان اور کس قدر دلنشیں بنا سکتے تھے۔ اُن کی علمی استعداد سے کسے انکار ہے۔ لیکن اُن کی اِنسانیت اُن کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں پر بھاری تھی۔ اُن کی قامت کے ماہر زبان اور عالم کے پاس جاکر استعجاب (AWE) کی کیفیت پیدا ہونا لازمی تھی۔ لیکن یہ تاثر وقتی ہوتا تھا۔ اُن کے ہونٹوں کی جنبش میں آنا ہوتا تھا کہ تناؤ اور تصنع کا یہ عالم کو یا شفقت، خلوص اور مُروت کی شیرینیوں میں تحلیل ہوجاتا تھا۔ اُن سے کم درجے کے آدمی مرعوب کرنے کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ وہ غیریت کی اِس فضا کو ختم کرکے برابر کے درجے پر ذہنی مفاہمت کے حصول کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے پاس مرتبے اور منصب کی درجے بندیاں نہیں تھیں۔ وہ ہر مرتبہ لوگوں سے ضرور احترام سے ملتے تھے لیکن اُن کی محفل میں باریابی اور دخل اندازی بہرحال جستجوئے علم اور ذوقِ ادب کو ہی حاصل تھی۔ زور صاحب کو صرف یہ یقین دلانے کی ضرورت ہوتی تھی کہ فلاں شخص تحقیق کار سا ہے۔ ادب کا متوالا ہے یا علم کا شوق رکھتا ہے۔ وہ اُس پر فریفتہ ہوجاتے۔ اس کی ناز برداریاں کرکے اُسے کام کرنے کی ترغیب دیتے اور اُسے سچ مچ چاہنے لگتے۔ یہ جملے لکھنا بڑا معمولی کام معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ایسے شفیق اور بے ریا بزرگوں کی کتنی کمی ہے۔ وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ اسی لئے زور صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لہجے میں جذبات اُبھر آتے ہیں، آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں اور گلا رُندھ جاتا ہے۔

زور صاحب جہاں رہے خلوت کی تاریکیوں کے بدلے جلوت کی روشنیاں جلاتے رہے۔ حیدرآباد میں تلاش و جستجو کا ایک شہر آرزو تعمیر کرکے وہ کشمیر آئے۔ وہ مجھ سے بارہا کہتے آئے کہ صرف شعبۂ اُردو کی صدارت ہی انہیں وطن چھوڑنے پر قادر نہیں ہوسکتی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ کشمیر میں رہ کر اُردو کی زیادہ بہتر طریقے سے خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔ اپنی آمد کے چند ہی دنوں کے اندر اندر اپنی اس مہم کا آغاز کردیا۔ جو بھی شناسا اُن کے پاس چلا جاتا وہ اپنی آرزو اُس کے سامنے رکھتے تھے۔ منصوبے پیش کرتے تھے اور یہاں کے ادیبوں سے تعاون کی استدعا کرتے تھے۔ آپ سے کیا چوری، ہم کشمیری بڑے تساہل پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہمیں علم و ادب اور خاص طور پر اپنی تمدنی میراث سے دلچسپی نہیں ..... ایسا کہنا غلط بیانی ہوگی۔ مگر ہماری کچھ ایسی خواہش رہتی ہے کہ "غواص" کا بل سے ہی آئے اور تحقیق کے خارزار سے ہمارے اسلاف کے کارناموں کے پھول چن کر ہماری شام جاں معطر کردے۔ ہمارے بزرگ کلہن پنڈت کی "راج ترنگنی" کو سر آرل سٹائین (AURELSTEIN) نے بازیافت کیا۔ سر جارج گریرسن آئے انھوں نے کشمیری زبان کی لغت مرتب کی اور ہماری صوفی شاعرہ لل دید کی عظمت سے دنیا کو روشناس کرادیا۔ اپنے سب سے بڑے کشمیری شاعر مہجور کو اُس وقت تک ہم یوں ہی ٹال رہے تھے۔ جب تک بلراج ساہنی کا مضمون پڑھ کر رابندر ناتھ ٹیگور نے اُس کے کلام کی داد دی اور ہم جھوم گئے۔ آج بھی غنی پر ایک غیر ریاستی ادیب کام کر رہا ہے اور ہم اُس کے نتائج افکار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اسی پس منظر میں زور صاحب

ہمارے توسن تحقیق پر تازیانۂ جستجو لگا رہے تھے۔ اُن کے سامنے ہم ایک مسکین گھوڑے کی طرح کان ہلا کر خاموش رہتے تھے۔ لیکن وہاں سے چلے آئے اور معاملہ ختم۔ زور صاحب کچھ عرصے تک یہ حال دیکھتے رہے۔ ابتدا میں کچھ مایوس بھی ہوئے۔ لیکن بقول شاعر: ؎

یہ گھاتیں جانتے تھے آزمودہ کار رستے حمزہ[۴]

آخر خود ہی کمر ہمت باندھ کر میدان میں آ گئے۔ الگ الگ شاعروں۔ افسانہ نگاروں اور ادیبوں سے ملتے رہے اُن کی تخلیقات دیکھتے رہے۔ انھیں شائع کرانے کا انتظام کرتے رہے اور اُن پر لکھتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے ہمارے مشہور شاعر رسا جاودانی (جو اردو کے علاوہ کشمیری کے بھی مقبول و معروف سخن گو ہیں) پر قلم اٹھایا اور انھیں بیرونِ کشمیر متعارف کرنے کی کوشش کی۔ اس پر بعض دوستوں کو ساؤ آ گیا۔ آخر زور صاحب کو کیا حق ہے رسا پر لکھنے کا؟ لکھنا ہی تھا تو پھر رسا پر ہی کیوں لکھا؟ یہ باتیں زبانی ہی نہیں ہوئیں بلکہ زور صاحب کو تحریری طور پر اس "تشدد پسندی" سے آگاہ کیا گیا۔ لیکن اُن کے پائے ثبات میں لغزش آنی نہ تھی نہ آئی۔ میں نے جب ایک مرتبہ یہ ذکر اُن سے کیا تو جواباً یہ شعر پڑھا: ؎

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

معترضین سے وہ خفا نہیں ہوئے بلکہ اُن کے دوست بن گئے۔ اسی بہانے اُن سے راہ و رسم بڑھائی اور انھیں عمل کی ترغیب دیتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے اس پروقار سلیقے سے حیرت ہوتی تھی۔ اُن میں "پھول کی اس پتی" کی نرمی تھی، جس کی کاٹ بعض اوقات ہیروں کا جگر چیر دیتی ہے۔

زور صاحب بدستور عمل کا راستہ اپناتے رہے، جیسے کوئی عابد شب زندہ دار کسی کی داد سے بے نیاز ہو کر اپنی ریاضت میں مشغول رہتا ہے۔ اُن کے قدم زیادہ مثبت راستوں پر گامزن ہونے لگے۔ کشمیر میں کیا اردو کا کشمیری لگ بھگ تمام ادیبوں کو اچھے ناشرین دستیاب نہیں ہوتے۔ زور صاحب اس مشکل کا حل لے کر سامنے آ گئے اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی خدمات پیش کر دیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے حامدی کاشمیری کا ایک ناول، قاضی غلام محمد کا مجموعۂ کلام "حرفِ شیریں" اور محمود حسین کا افسانوی مجموعہ "نیل کنول مسکائے" شائع ہو کر آ گئے۔ یہ ابھی اُن کے منصوبوں کی شروعات تھیں۔ ان پر بہار اب آنا تھی۔ لیکن شاید اجل اس بہار کی نیرنگ سامانی کا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔

زور صاحب نے اپنے کو اُردو کے ساتھ کھلے بندوں (IDENTIFY) کر دیا تھا۔ کسی مکر و ریا حیل و حجت اور احساس کمتری کے بغیر وہ اُردو کے عاشق زار تھے اور اس میدان میں ان کا یہ حال تھا: ؎

خیر بیتِ جاں، راحتِ تن، صحت و اماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اُن کے اسی رویے کا اظہار اُن کی بے باک گفتگو میں ہر وقت ہوتا رہتا تھا۔ اُردو کی وکالت وہ اس انداز سے

کرتے تھے۔ کہ کچھ جبینوں پر شکن پڑ جاتے، کچھ چہروں پر برہمی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ لیکن وہ اپنے اصولوں میں میانہ روی اور مفاہمت کو دخل اندازی کا موقع دینے کے روادار نہ تھے۔ اُن کے مسلک سے اختلاف کرنا آسان تھا۔ لیکن اُن کے خلوص سپردگی اور سرشاری کی داد نہ دینا ناممکن تھا۔ اعتقاد و یقین کے اس بھرپور مظاہرے پر خواہ مخواہ پیار آجاتا تھا۔ اُردو اُن کے لئے ایک عشق کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور اس بارے میں اُن کے جذبات سے ازمنۂ وسطیٰ کے کٹر عقیدتمندوں کی یاد آجاتی تھی۔ لیکن اُن کا ایثار۔ سرمستی اور جنون احترام اور عقیدت کے جذبات بیدار کرتے تھے۔ کشمیر میں بھی اُن پر سب مرحلے آئے۔ لیکن اُن کا عزم راسخ ہر چیز پر غالب رہا۔

زور صاحب کی موت ایک المناک سانحہ تو ہے ہی۔ لیکن اس کی شدت اُس وقت اور زیادہ ہو جاتی۔ جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ یہ کس قدر اچانک۔ اور کس غیر متوقع انداز سے وقوع پذیر ہوا۔ زور صاحب عمر کی پانچویں دہائی سے گزر رہے تھے۔ لیکن اُن کا تن و توش دیکھ کر جوانوں کو رشک آجاتا تھا۔ اُن کے چہرے کی بشاشت دوسروں کے اندر ولولہ اور جوش کے جذبات کو برانگیختہ کرتی تھی۔ جب جوان قوت اور حرکت کے اس مجسمے کو دن رات گھڑی کی سی باقاعدگی کے ساتھ مصروف عمل دیکھتے تو اُن کے اندر بھی کام کا عزم بیدار ہو جاتا۔ وہ اپنی قوتوں کے عروج پر تھے اچانک ایک روز ریڈیو سے اُن کی موت کی خبر آئی۔ سرینگر میں ہم لوگوں کو جنھوں نے ایک ہی روز قبل انھیں دیکھا تھا جس قدر حیرانی ہوئی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ ایک رات کی پہنائی میں مدوجزر کا یہ پورا چکر ختم ہو چکا تھا۔ جب ہم تلسی باغ میں اُن کی قیام گاہ پر پہنچے تو وہاں غالب کے اس مصرعے کی مجسم تصویر بنی ہوئی تھی: ؎

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ مقامی معززین، تاجر، طلبا اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے سبھی اشکبار تھے۔ اُن کے کمرے میں جب ہم آخری دیدار کے لئے پہنچے اور چادر اُن کے منہ سے سرکائی تو جلال کا وہی عالم نظر آیا۔ گویا ایک شیر دم لینے کے لئے لیٹ گیا ہو۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس پُرشکوہ جسد میں اب جان نہیں ہے۔ جب اُن کا جنازہ خانیار شریف کی طرف روانہ ہوا تو اس کے عقب میں گاڑیوں کا ایک لمبا جلوس رواں تھا۔ خانیار میں نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد دکن کا یہ ہیرا کشمیر کی سرزمین کو سونپ دیا گیا ہے۔ جس وقت اُن کا تن خاکی پیوند زمیں کیا جا رہا ہے۔ اس وقت قبر کے سرہانے کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد۔ وزیر تعلیم غلام محمد صادق یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے۔ ایم پائیکر کے ساتھ ہزاروں لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں۔ اُردو اور زور صاحب کے باہمی ربط کا خیال کر کے میرے ذہن میں یہ شعر گونج رہا تھا: ؎

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کہ اے معشوقِ بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد!

وقار خلیل

ڈاکٹر زور کی شخصیت

سوانحی لحاظ سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی جبکہ سرسید کے رفقائے کار گیسوئے اردو کی مشاطگی میں منہمک تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حالی اور شبلی کا آخری زمانہ ڈاکٹر زور کی طالب علمی کا آغاز ہوگا۔ لیکن اردو کے ان مشاہیر محسنوں سے وہ لوگ ضرور متاثر ہوئے جن کو شروع ہی سے اردو سے لگن تھی، ان مربیوں کے جذبۂ خدمت اور ایثار نے اس دور کے کتنے ہی نوجوانوں میں اُمنگ، جوش اور اردو کی خدمت کا ولولہ پیدا کیا ہوگا۔ ڈاکٹر زور کا شمار اُن ہی چند نوجوانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے اردو کی خدمت اور اس کی ترویج و فروغ کا بیڑا اُٹھایا تھا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۲۵ ڈسمبر ۱۹۰۵ء کو اردو بنیاد شہر فرخندہ آثار حیدرآباد میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد حضرت ابوالبرکات حافظ سید غلام محمد شاہ قادری زعم ایک عابد شب زندہ دار، زاہد مرتاض اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ ڈاکٹر زور نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم میں پائی، ۱۹۲۳ء میں اعزاز کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔ حکومت حیدرآباد نے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھجوایا، جہاں آپ نے آریائی زبانوں کی تقابلی لسانیات" پر تحقیقی مقالہ لکھا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں حاصل کی۔ لسانیات کے مطالعہ کے سلسلے میں صوتیات سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور پیرس کے "صوتیاتی تحقیقاتی ادارہ" میں صوتیات پر دو سال تک تحقیقاتی کام انجام دیا اور ڈپلوما حاصل کیا۔ اس دوران انگلستان اور پیرس کے کتب خانوں سے دکنیات کے بارے میں کئی نوٹس بھی لئے، جن سے بعد کو آپ نے دکنیات پر اپنے گراں قدر کاموں کی بنیاد رکھی۔ انگلستان سے واپسی پر ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۳ء تک صدر شعبۂ اردو کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ پھر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی سے وظیفۂ حسن خدمت پایا اور جموں و کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو و فارسی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ اورنٹیل لینگویجز مقرر ہوئے، قریب سولہ مہینے کشمیر میں رہے، اور ۲۴ و ۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات میں وہیں حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب رحلت فرما گئے اور خانیار شریف کے احاطے میں سپرد خاک کردئے گئے۔ بقول بہادر شاہ ظفر ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے ۔۔۔ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہ تھی ڈاکٹر زور مغفور کی سرکاری زندگی کی سرسری جھلک، جب کبھی ڈاکٹر زور کی شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت سامنے آجاتی ہے، کام کرنے کا وہی جوش اور ولولہ، دوسروں سے کام لینے کا وہی قرینہ

اور ہلکا' زور تحریر اور طرز تقریر کا وہ انداز کہ پڑھنے یا سننے والا ان کی بات مان جائے۔ شبلی نے بھی بہت لکھا اور تیز رفتاری سے لکھا' ڈاکٹر زور نے بھی بہت لکھا اور برق رفتاری سے لکھا' مرنے سے دو دن پہلے تک بھی وہ لکھتے رہے۔ شبلی نے "دار المصنفین" کی بنیاد رکھی جس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اور ڈاکٹر زور نے بھی "ادارۂ ادبیات اردو" اور "ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" جیسے ٹھوس علمی و ادبی اور تحقیقاتی اداروں کی نیو رکھی اور قلیل مدت میں انکی سرکردگی میں "ادارۂ ادبیات اردو" نے وہ بیش بہا اور ٹھوس خدمات انجام دی ہیں کہ ادبی تاریخ میں ہمیشہ جاوداں رہیں گے۔

علی گڈھ اور سرسید ایک تصویر کے دو رخ ہیں' اسی طرح ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور بھی قدر مشترک رہے ہیں اور جب تک ادارہ' ایوان اردو اور اس کی کتابیں اور رسالہ "سب رس" باقی ہے' ڈاکٹر زور جزو مشترک کی حیثیت سے یاد کئے جاتے رہیں گے۔ بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر "ایوان اردو" ڈاکٹر زور کے لئے سنگ و خشت کی ایک خوب صورت عمارت ہی نہیں تھی' بلکہ اُن کے خوابوں کی تعبیر' اُن کے تخیل کا رنگ محل' اُن کی مشقتوں اور آرزوؤں کی جادو نگری اور اُن کا شہر آرزو تھا" منشی تلوک چند محروم نے کیا خوب لکھا ہے ؎

بنا کر زور نے "ایوان اردو" بڑھا دی ملک بھر میں شان اردو

۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر زور نے ادارہ کی بنیاد رکھی تھی' اور دیکھتے کے دیکھتے اپنے حسن عمل' بے لوث جذبے اور قدر شناسی کے مقناطیسی جوہر کے سبب دنیائے ادب میں اس ادارہ کو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے علم و ادب کا روشن ترین مینار بنا دیا' جس سے آنے والی نسلیں صدیوں استفادہ کرتی رہیں گی اور ہر ہر مرحلہ پر ڈاکٹر زور چراغ علم و دانش کی صورت جگمگاتے ملیں گے۔ نامساعد حالات میں ادارہ کے تحقیقاتی کاموں کو جاری رکھنا اور پھر ڈیڑھ لاکھ کا سرمایہ فراہم کرنا' "ایوان اردو" کی تعمیر اور اس میں محفوظ شدہ سرمایہ' یہ سب ڈاکٹر صاحب مغفور کی انتھک سعی و کاوش' اثر و رسوخ اور دیوانہ پن کی حد تک ادارہ سے شیفتگی پر دال ہیں اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بیسویں صدی میں سرسید کے بعد ڈاکٹر زور ہی واحد عملی انسان تھے۔

ادب اور زندگی کے کئی شعبوں میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور یکساں خصوصیات کے حامل رہے ہیں خصوصاً کام لینے اور کام کرنے' انجمن اور ادارہ کے قیام و ترقی وغیرہ جیسے کئی موڑ پر اس صدی کے یہ دو مجاہد ہندو پاک کو صدیوں راستہ دکھاتے رہیں گے۔ جو لوگ بے لوث کام کرتے ہیں' وہ اپنا مقام خود پیدا کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے تعلقات ہمیشہ وسیع اور عمیق رہے' اس لئے کہ تعلقات کی بنیاد کبھی بھی ذاتی غرض و غائت نہ رہی اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ہمیشہ اُن کی قدر و منزلت رہی۔ اردو کے لئے انھوں نے بڑے بڑے اُمراء کو ہموار کیا' اپنے کاموں سے دوسروں کو مرعوب بھی کیا اور متاثر بھی مگر خود کبھی کسی سے بھی مرعوب نہ ہوئے' خواہ وہ کوئی وزیر اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ سب سے ایک ہی انداز میں پیش آتے۔ اُن کی بے لوث خدمت ہی ان کی مقبولیت کی ضامن بنی۔ اُردو کے معاملے میں ایک طرف نواب سالار جنگ بہادر اور پرنس مکرم جاہ بہادر ایسے امیروں کو اپنا ہم خیال بنایا تو دوسری طرف مرکزی و ریاستی حکومتوں کے وزیروں کے علاوہ مغرب زدہ ذہنیتوں کے عہدہ داروں کو بھی اُردو کی خدمت کے لئے کمربستہ ہونے پر مجبور کیا۔

ڈاکٹر زور میں غیر معمولی جرأت، بے خوفی اور استقامت پائی جاتی تھی، سخت محنت اُن کا ایمان تھا۔ جس کسی کام کو اپنے لئے منتخب کر لیتے اُس میں وہ نہایت انہماک اور توجہ کے ساتھ مشغول ہو جاتے اور بعض دفعہ حد سے زیادہ کام کر جاتے۔ اسی مستقل مزاجی اور کام سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی اور والہانہ شغفیت ہی نے در اصل اُن کی شخصیت میں متانت، طبیعیت اور جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ جن لوگوں نے اُن کے ساتھ جفا کی تھی اُن کا ذکر وہ بے دردی کے انداز میں کبھی نہیں کرتے تھے اس سے اُن کی رفعتِ نظری اور بلند اخلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ اِس اجمال کی تفصیل کے لئے ورق در کار ہوں گے۔

سونے سے دھول ہٹا کر اُس کو چمکانا تو اچھا ہے۔ لیکن جو کسی بھی دھات کو سونا بنا دے تو اس کے کیا کہنے۔ ڈاکٹر زور نے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے نکالا اور جادۂ نور پر رواں دواں کر دیا۔ جن کاروں کے ساتھ انصاف کیا، شاعروں کی قدر و منزلت کی اور اُنھیں تاج اور خلعت پہنائے، ادیبوں کو ان کا حق دلایا تو کہیں صوفی منش اصحاب کو خلوت سے جلوت میں لانے کی سعی کی۔ بھولی بسری باتوں کو صدیوں کی زندگی بخش دی مدتوں گولکنڈہ کی خاک چھانی۔ مٹی کے ڈھیروں سے گولکنڈے کے ہیروں کو کھوج نکالا۔ قطب شاہی لیل و نہار کے نقشے کھینچے، دکنی سلطنتوں کی مٹتی ہوئی نشانیوں کے مرقعے پیش کئے، دکن کے گوشے گوشے سے صدیوں کے خفتہ بخت ادیبوں، شاعروں اور باکمالوں کے پتے ڈھونڈ نکالے، اُن کی یادگاریں قائم کیں، کتبے کندہ کرائے، تاریخیں لکھوائیں، یوم منائے، کلام مرتب کرائے اور زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے اردو ادب کی عمر میں چار سو سال کا اضافہ کر دیا اور اس طرح نہ صرف اردو کی بلکہ حیدرآباد کی نامکمل ادبی و تہذیبی تاریخ کو ڈاکٹر زور نے مکمل کر دیا وہ دبستانِ دکن کے قرارِ واقعی آخری معلّم تھے۔ دکنیات کے معاملے میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ دکنی تہذیب اور زبان و ادب کے وہ نہ صرف بہت بڑے رسیا اور قدر شناس تھے بلکہ خود جیتی جاگتی تاریخ بھی تھے۔ اُن کے دل و دماغ، کردار و گفتار، شخصیت اور لب و لہجہ پر دکن کی گہری چھاپ تھی۔ قطب شاہوں کی تہذیب اور دکنی زبان پر اُنھیں اتنا ہی فخر تھا جتنا دہلی والوں کو اردوئے معلیٰ پر ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی تصانیف کے بیشتر حصے دکن کی قدیم یادگاروں، دکن کی قدیم زبانوں، حیدرآبادی ثقافت اور حیدرآبادی روایتوں اور دکنی حکومتوں کے عروج و زوال کے تذکروں سے معمور ہیں۔ یہ سب دکن کے ذرّہ ذرّہ سے اُن کی والہانہ و عاشقانہ پرستش کا بین ثبوت ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں قطب شاہی یک جہتی کے علم بردار ادب اور ثقافت کا اس صدی میں "چار مینار" تھے۔ غرض وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور ادب کے کسی بھی موضوع پر عالمانہ طریقے پر اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر زور کو شہرت ملی، ناموری ملی، عزت ملی اور دولت بھی ملی، لیکن جو کچھ اُنھیں ملا اس سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لئے انھوں نے کسی کو دھکیلا نہیں، کسی کے آگے کنواں نہیں کھودا، بلکہ انھوں نے دوسروں سے الگ اپنے لئے ایک راہ منتخب کی، بڑے سنگلاخ، کٹھن اور کھٹور راستے پر رواں دواں رہے، فاتح و کامراں، فرحاں و شاداں اور یہ صحیح ہے کہ دوسروں سے بہت پہلے وہ چوٹی پر پہنچے۔ انھوں نے قلم یا عمل سے

کبھی کسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اور یہ بات اُن کی عظمت کی شاہد ہے۔ وہ کشادہ قلب، نورانی فراست کے حامل اور وسیع النظر شخص تھے اور صحیح معنوں میں ایک موحد تھے۔ جن کا کیش ترک رسوم تھا۔ شخصیت بارُعب، متین اور پُروقار تھی۔ اعلیٰ سماجی پوزیشن اور سیاسی اقتدار رکھنے والے لوگ بھی اُن سے برابری کی سطح پر ملتے اور اُن کا احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور بڑے محنتی، مخلص، صاحب نظر اور جوہر شناس تھے۔ دُنیا میں اپنی دُھن کے پکے ایسے دیوانے کم ہی پیدا ہوئے۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی ایسے جیالوں نے جنم لیا، اُن کے حیرت انگیز کارناموں سے تہذیب و تمدن کو سرفرازی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر زور کا شمار بھی ایسے ہی دیوانوں میں ہوتا ہے۔ وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک اور مجلسی آدمی تھے۔ ذرا کی ذرا میں بادل کی طرح گرجتے اور برسنے لگ جاتے اور جب غصہ ہرن ہو چکتا تو ہیٹھے قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ اُن کی زندگی جلالی بھی تھی اور جمالی بھی، صاف دل آدمی جو ٹھہرے۔ غصہ آیا تو دل کا غبار مُنہ سے نکال دیا اور پھر ایسے ہو گئے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ بڑے ہی مرنجان مرنج اور ملنسار جس طرح شیر اپنا شکار نہیں چھوڑتا، ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں یا مقربوں کو قطرے سے گہر بننے تک چین نہیں لیتے تھے اور ان کی طبیعت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

قدامت پسند اور ترقی پسند ہر دو طبقوں کے نزدیک ڈاکٹر زور اُن کی جماعت کے رکن رکین سمجھے جاتے رہے، ظاہر کا یہ تضاد اُن کے ہمہ گیر ہونے کا ثبوت ہے۔ نقاد، محقق، ماہر لسانیات و صوتیات، مورخ، مخطوطات کے ماہر افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب بلند مرتبے کے حامل تھے، وہ بڑے ادیب ہی نہیں ادیب گر بھی تھے حیدرآباد کی نئی نسل میں ادب کا ذوق، تحقیق و تنقید کی لگن اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے میں اُن کا بڑا حصہ رہا ہے جس کے سبب جدید حیدرآباد کی ادبی تاریخ میں اُن کا نام سرفہرست رہے گا۔ طالب علمی کے زمانے میں آپنے فن تنقید پر اردو میں پہلی کتاب "روح تنقید" لکھی جس کا شمار اردو کی گنی چنی اہم اور وقیع کتابوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور کی طبیعت میں بلا کی جلد بازی بھی تھی، وہ چاہتے تھے کہ ہر کام فوراً ہو جائے، یہ جذبہ اُن کی تحریروں میں بھی کارفرما رہا۔ اردو ادب کی ہر صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی۔ اُن کی تصنیفیں کوئی کہاں تک یاد رکھے۔ ستر اسّی کے قریب کتابیں اُن کی یادگار ہیں۔ وہ اتنا لکھ چکے ہیں کہ سب تحریروں کو یاد رکھنا بھی تو مشکل ہے بعض اہل قلم حضرات کو دیکھا ہے کہ جب اُن سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی جائے تو وہ طرح طرح کے عذر پیش کرتے ہیں، وقت کی تنگی، مصروفیات کی زیادتی اور موڈ نہ ہونے کی شکایت۔ لیکن ڈاکٹر زور میں ہم نے یہ بات دیکھی ہے کہ باوجود مختلف النوع مصروفیات کے جب وہ کاغذ قلم سنبھالتے تو پھر کچھ لکھ کر ہی سانس لیتے۔ جس طرح وہ بات کرتے تھے اُسی طرح لکھتے بھی تھے، اُن کی تقریر کا انداز بھی وہی ہوتا جو تحریر کا۔ انھوں نے اظہار خیال میں کبھی تکلف اور تامل سے کام نہیں لیا۔ دل میں جو آتا وہ کہہ گزرتے اور لکھ بھی دیتے، کوئی لاگ لپٹ اُن کے پاس نہیں، صاف گوئی اور صاف دلی اُن کا شعار جو رہا۔ منفرد اور دلکش اسلوب تحریر کے مالک اور اُردو کے ممتاز انشا پردازوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کے مکاتیب میں تو صاف گوئی اور صاف دلی کی خصوصیات زیادہ نظر آتی ہیں۔

اُردو زبان کی طرح اردو کے اس چاہنے والے میں بھی ایک خصوصیت تھی اور وہ یہ کہ ہر قسم کی چیز کو اپنانے کی اُن میں بھرپور صلاحیت تھی۔ برصغیر ہندو پاک کا ممتاز نقاد، محقق اور ادیب، لندن یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی، جامعۂ عثمانیہ اور جامعہ کشمیر کا پروفیسر اپنے والد کے عرس یا ادارہ کے چھوٹے بڑے کاموں کے وقت رخصت لے کر بذات خود سینہ سپر ہوجاتا تھا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ راتوں کی نیند حرام کرلی ہے اور رپورٹ لکھی جارہی ہے، یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کیا جارہا ہے، پروف دیکھے جارہے ہیں، ٹیلی فون پر پریس کو نوٹ لکھوائی جارہی ہے، ادارے کی کردی اور آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حسابات دیکھے جارہے ہیں، ٹائپ کو ہدایتیں کی جارہی ہیں اور مسودہ کلی یا جاری ہے۔ رقعوں کی طباعت سے لے کر تقسیم اور پتوں کی تعیین تک کرائی جارہی ہے۔ وقت کی پابندی ڈاکٹر زور کی طبیعت کا جزو بن گئی تھی، وہ نہ صرف ہر کام خود بروقت انجام دیتے بلکہ دوسروں سے بھی بروقت تکمیل کراتے۔ کھانے، پینے، آرام کرنے اور دیگر علمی و ادبی مصروفیات میں بھی وہ وقت کی پابندی کو بطور خاص ملحوظ رکھتے تھے اور مجال نہیں کہ معمولات میں سرمو فرق آجائے، اگر اتفاقاً کسی غیر معمولی وجہ سے ایسا ہوتا تو انھیں بڑی بے چینی رہتی۔ وہ لگاتار اور انتھک محنت کرنے کے عادی تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر صبح چھ بجے سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک وہ مسلسل کام کرتے، ٹھیک ایک بجے کھانے کی میز پر ہوتے۔ دس یا پانچ منٹ میں فارغ ہوجاتے اور پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قیلولہ کرتے۔ تخت پر کروٹیں بدلتے اور دوپہر کی ڈاک دیکھا کرتے۔ ساتھ کا ساتھ تجویزیں ہوتیں، رسائل کی ورق گردانی کی جاتی۔ پھر تین سوا تین بجے سے ادارے کے کاموں میں لگ جاتے اور چائے کے دو چسکے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ احباب، ضرورت مند، فوٹو لیوں کے متلاشی اور سفارشوں کے خواہاں، غرض سبھی موجود ہوتے اور ڈاکٹر صاحب ہر ایک سے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ لوگوں کے کام کرنے کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ فرط مسرت سے اُن کی پیشانی جگمگا رہی تھی اور وہ بیحد خوش ہوتے تھے۔

حکومت ہند کی مرکزی ساہتیہ اکادمی اور سرکاری رسالہ "آجکل" دہلی کے وہ سرگرم رکن تھے اور اکثر ادیب و شاعر اپنے علمی و ادبی کاموں کی تکمیل کے بارے میں یا پھر مضامین و کلام کی اشاعت کے سلسلے میں آتے اور صبح سے شام تک آتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب اپنے "تخت" پر تشریف فرما ہنستے، مسکراتے، چائے پیتے، پلاتے سفارشی خطوط لکھتے رہتے اور خود ہی ادارہ کی طرف سے مجاز یہ کروادیتے اور اس طرح اردو زبان کی قدیم سنگے خدمت کرتے۔ غیر ملکی وزراء اور امراء کی صحبت میں بیٹھنے والا، علمی جلسوں اور ادبی محفلوں اور کانفرنسوں کی صدارت قبول کرنے والا بعضے وقت کالج کے چپراسی آپریٹو یا ادارے کے چوکیدار نذیر الدین اور ٹپہ رساں محی الدین پہلوان اور انسٹی ٹیوٹ کے حمید خاں سے ادھر ادھر کے قصے سننے میں منہمک نظر آتا ہے۔ جس شخص نے آخر وقت تک۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علموں کی رہنمائی کی ہو، رجسٹرائی یم۔ اے اور بی۔ اے کا مختلف جامعات کا ممتحن مقرر کیا جاتا رہا ہو، اس کو ہم نے چار چھ آنے درجن والے کیلوں (موز) اور دو تین آنے سو والے پان سے متعلق ملازم سے پوچھ گچھ کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس ہمہ جہتی توجہ، دلچسپی اور لگن سے ہم ڈاکٹر زور کی پہلو دار شخصیت کے اُس گوشے کو پاتے ہیں جس کے لاشعور میں ہر ہر قدم پر عوذ فکر کی پرچھائیاں اور رنگ رلیاں مہکتی نظر آتی تھیں۔

بقول ڈاکٹر حفیظ قتیل "ڈاکٹر زور بڑے خوش وضع، خوش پوش، لانبی لانبی زلفیں شانوں پر چھٹکی ہوئی اونچی پیشانی اقبال مندی کی نشانی، پان کی گلوری سے رخسارہ بھرا ہوا، چکلی چکلی پٹیوں کے کپڑے کی شیروانی، پاؤں میں زرکا سلیم شاہی، وضع قطع جس قدر شاعرانہ، بات کرنے کا انداز اُسی قدر غیر شاعرانہ، پان اس طرح چباتے جیسے پیاری کی سختی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی خوش پوشی اور خوش وضعی پر چال ایسی جیسے غصّے سے بے قابو ہو کر کسی سے گتھم گتھا ہونے کو چلے ہیں۔ اس چال پر شیروانی تو خیر بیچ جاتی لیکن جب کبھی سوٹ پر کرم فرمائی ہوتی تو اس لباس کی عزت پر آ بنتی"۔ کہاں تک ڈاکٹر صاحب کی باتیں یاد کی جائیں۔ غرض وہ اردو ادب، اُردو تہذیب اور کلچر کی ایک باغ و بہار اور زوردار شخصیت تھے اور ایسی عہد آفریں شخصیتیں صدیوں بعد جنم لیتی ہیں اور مرنے پر بھی حیات جاوید پاتی ہیں۔

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اپنی گراں قدر کتاب "چند ہم عصر" میں حالی کی سیرت کا خاکہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ "مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے، شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی، اُن کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے"۔ حالی کی سیرت کے یہی خدوخال ہم ڈاکٹر زور کی شخصیت میں بھی دیکھتے ہیں، روشن روشن، رقصاں رقصاں۔

ڈاکٹر زور صاحب کی اچانک وفات کا غم ابھی میرے قلب و دماغ میں تازہ ہے۔ یہ وہ گھاؤ ہے جو شاید ہی مندمل ہو۔ میرے لئے موزوں الفاظ میں یہ بتلانا ممکن نہیں کہ میری نگاہ میں اُن کی بہ حیثیت امیر کاروان قافلۂ اردو اور بحیثیت انسان کتنی قدر و منزلت ہے۔ یہ جو کچھ میں نے ڈاکٹر زور کی ہمالیائی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے، بڑی مشکل سے لکھا ہے۔ مجھ ایسے کم سواد اور بے بضاعت کا مضمون چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہوگا ؎

شہید جنتِ ارضی تری تُربت پہ رحمت ہو
تجھے روئے گا صدیوں حیدرآباد دکن ساقی

(بشکریہ "آندھرا پردیش" حیدرآباد)

سید رفیع الدین قادری

بابا کی زندگی کے آخری تین دن

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامیؒ نے سچ کہا تھا کہ ماہ ستمبر ہمیشہ ستمگر ہی بن کر آیا ہے۔ غور کیجئے تو تمام بڑے بڑے دردناک واقعات اسی ماہ میں رونما پذیر ہوئے ہیں۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء کی صبح ہم لوگ ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ نوکر نے آکر بڑے بھائی سے کہا کہ "صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ ناشتہ سے فارغ ہو کر جلد تیار ہو جائیے۔ باہر جانا ہے"۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم اور رمنی استاد کے پاس پڑھنے چلے گئے۔ استاد صاحب نے کہا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہم نے جا کر بابا سے کہا وہ موٹر میں سوار ہو رہے تھے۔ کہا کہ اب تو میں جا رہا ہوں پھر کل ملیں گے اور موٹر چلی گئی۔ سنا تھا کہ چیف سکریٹری صاحب کا مزاج کچھ ناساز ہے پہلے ان کے یہاں گئے۔ وہ بستر پر تھے' بابا کے آنے کی اطلاع پاتے ہی بلوا لئے۔ وہاں سے چشتی صاحب ڈپٹی رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی کے گھر گئے۔ سب گھر والوں سے ملے۔ اس کے بعد زیدی صاحب کے یہاں گئے۔ وہ نہ تھے ان کی بیگم صاحبہ سے مل کر عشائی صاحب کے پاس گئے یہ بھی بابا کے قدردانوں میں تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے بھائی صاحب سے کہا تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب کو حیدرآباد چلے جانا چاہئے۔ ملتے ہی بابا نے یہ سوال کیا کہ "آپ نے مجھے واپس چلے جانے کو کہا؟ کس لئے؟" تو انھوں نے کہا کہ "ہاں اس خیال سے کہا تھا کہ آپ کا صرفہ یہاں بہت ہو رہا ہے' وہاں بچیوں کا اور یہاں آپ کا صرفہ بہت ہے۔ پھر آمد و رفت کے اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے اس لئے کہا تھا۔" پھر ان کی لڑکیوں کی شادی کا ذکر آیا۔ بابا نے پوچھا کہ کوئی کام مجھے بھی بتلائیے تو کہا کہ آپ سے تو بہت کام لیتا ہے۔ بابا نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ اس کے بعد وائس چانسلر سردار کے یہاں پانی کر کے یہاں گئے۔ یہ بابا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ہمیشہ ہر ایک سے کہتے تھے کہ میں نے ان کو نواب صاحب کا خطاب دلایا ہے۔ خاص انداز کے آدمی ہیں حیدرآباد کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی۔ ہمیشہ پان کا بٹوہ ساتھ رہتا ہے۔ مخصوص انداز میں تھوڑی تھوڑی دیر سے کھاتے ہیں۔ اسی بٹوے سے بابا انھیں چکنی الائچی دیتے تھے یہ بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے بعض وقت خود مانگ لیتے تھے۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور کہا کہ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو روس بھجوانے کی کارروائی کر رہا ہوں۔ اسی جگہ میں خیال تھا کہ حمید صدیقی صاحب چیف آرکٹک کے پاس بھی جائیں وہ بھی ادھر ہی رہتے ہیں مگر پانی کر صاحب کے پاس ہی کافی دیر ہو گئی تو کوئی ڈیڑھ بجے گھر آگئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔ تین بجے اٹھے چائے پی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ دو تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ پانی خطرے کے نشان کے قریب آ رہا تھا۔ ہر طرف یہی پریشانی تھی کہ کہیں سیلاب نہ آجائے۔ اگر اک آدھ روز اور بارش ہو جاتی تو بہت ممکن تھا کہ سیلاب

آ ہی جاتا۔ خدا نے فضل کیا' بارش تھمی۔ شام میں بابا نے والدہ سے کہا کہ چلئے بیگم صاحب جا کر پانی دیکھیں گئے کتنا آیا ہے۔ ہم لوگوں سے بھی کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کو لے کر پہلے فلڈ چانل دیکھی جو ہماری کالونی کے پیچھے ہی واقع ہے جو ہر وقت خالی پڑی رہتی تھی۔ اب اس میں پون حصہ پانی تھا۔ اس کے بعد اس بنڈ پر گئے جہاں سے جھیل بہتا ہے۔ پانی اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام ہاؤس بوٹس اوپر آ گئے تھے۔ بابا نے کہا کہ یہ بھی عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ سب جزیرے زیر آب تھے۔ وہیں ایک جزیرے میں بابا کا چپراسی پیر علی بھی رہتا تھا۔ وہ اس روز صبح نہیں آیا تھا بابا کو فکر تھی کہ لازمی اس کا جزیرہ بھی پانی کی زد میں آ گیا ہوگا۔ وہاں پہنچے دیکھا کہ اس کے مکان کی پہلی منزل پانی میں ہے۔ اس پل پر سے جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا کئی فٹ پانی بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑے ہو کر دیکھا کئے کہا کہ اس کو تو نکلنے کے لئے بھی راستہ نہیں کیا گھر چھوڑ دیا ہوگا۔ پھر کچھ اوپر کی منزل میں اندر حرکت معلوم ہوئی تو آواز دی۔ وہ آواز سن کر نکل آیا۔ اس سے خیریت پوچھی۔ ایک دو روز پہلے پیر علی کے لڑکے کا ایک حادثہ میں ہاتھ ٹوٹ گیا تھا اس کی خیریت پوچھی اور کہا کہ تم تو نکل نہیں سکتے کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگوا کر بھجوا تا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں کل ہی جو سامان لایا تھا چل رہا ہے آپ فکر نہ کریں پھر اس سے کہا کہ تم جاؤ سردی ہو جائے گی۔ کچھ دیر بنڈ پر ٹھیر کر واپس ہوئے۔ راستے میں ڈاکٹر نذیر کا کلینک پڑتا تھا کہا کہ میں ان سے بھی ملوں۔ اتر کر ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد رضوی صاحب لائبریرین کے پاس پہنچے تھوڑی دیر ٹھیرے ان کی بیوی نے چائے کے لئے کہا تو منع کر دیا کہ اب جا کر ہمیں کھانا کھانا ہے تکلیف نہ کیجئے۔ راستے میں عبدالعزیز پٹ کا مکان پڑتا تھا کہا کہ نا ہوں کہ وہ رجسٹرار ہو گئے ہیں انھیں مبارک باد دے لیں گے۔ پہلے وہ ایس پی کالج کے پرنسپل تھے مگر وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ وہاں سے ذکی الدین احمد پرنسپل انجینیرنگ کالج کے پاس گئے کہ کئی روز سے ان کے ہاں سے کوئی نہیں آیا۔ بچے تو آیا کرتے تھے نہ معلوم کیسے ہیں۔ تھوڑی دیر ان کے یہاں ٹھیر کر گھر آ گئے۔ ۸ بجے اپنے وقت پر کھانا کھایا۔ پھر چھوٹے بھائی رضی کو حسب معمول پڑھایا۔ اس کے بعد اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہو گئے۔ ۱۰½ بجے بستر پر سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ہمیشہ اپنے اوقات کے پابند تھے۔ اس پر برابر عمل پیرا رہے۔ کوئی ایک بجے کے قریب کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے یہ سمجھا کہ شاید خواب دیکھ رہے ہیں۔ آنکھ کھول کر جو دیکھا تو بابا کے کمرے کی روشنی کھلی نظر آئی۔ اٹھا اور جا کر دیکھا تو والدہ اور بڑے بھائی کھڑے ہوئے تھے۔ بابا کہہ رہے تھے کہ معدے کی خرابی معلوم ہوتی ہے مجھے ذرا ریڈ لمکسچر پلائیے۔ دو اپینے کے بعد کہا کہ سینے میں جو دباؤ معلوم ہو رہا تھا اک دم کم ہو گیا۔ اب لیٹتا ہوں لیٹے اور پھر اٹھ بیٹھے کہ نہیں یہ کچھ اور ہی ہے بائیں ہاتھ میں بھی ایک نئی بات پیدا ہو گئی ہے کہ ٹک نہیں رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے سہارا دیتا پڑ رہا ہے۔ سینے کی تکلیف مسلسل رہی۔ بڑے بھائی نے کہا کہ ہم ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ انھیں منع کر دیا کہ یہ ہر ایک کی نیند کا وقت ہے کچھ دیر اور انتظار کریں۔ لیکن تکلیف تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی یہ دیکھ کر والدہ نے چپکے سے بڑے بھائی کو ڈاکٹر کے لئے بھجوا دیا۔ وہ کافی دور رہتے تھے۔ آنے میں وقت لگ گیا اور یہ خالی ہی آ گئے۔ پھر فوراً ڈاکٹر نائیڈو جو یہاں ہلتھ آفیسر بن کے آئے ہیں ان کے ہاں گئے۔ بابا نے کہا اب رہنے بھی دو اتنی رات میں کون اٹھے گا۔ سردی بڑھی ہوئی ہے اور بادل گھرے ہوئے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد وہ آئے۔

نبض دیکھی اور کہا کہ قلب پر حملہ ہوا ہے اور کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لینا چاہئے۔ والدہ نے کہا کہ ڈاکٹر مرزا کے لئے موٹر گئی تھی وہ نہ ملے تو خود نائیڈو صاحب بازو ڈاکٹر کول کے یہاں گئے۔ دروازے پر آوازیں دیں بل بجائی مگر بے سود۔ بڑے بھائی پھر مرزا صاحب کے پاس گئے۔ ادھر تکلیف بڑھ رہی تھی۔ والدہ نے کہا کہ اب جا کر کول صاحب کو جگا کر دیکھو میں اور چھوٹے بھائی اُدھر گئے۔ مشکل سے وہ جاگے آئے اور دیکھا اس وقت تک تو کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی پوچھا کہ یہ کھانسی کب سے ہے۔ ان کے یہاں بھی کچھ موجود نہ تھا کہا کسی اور کو بلانا چاہئے۔ والدہ نے کہا کہ موٹر گئی ہے انھوں نے بابا کو لیٹنے کے لئے کہا کیونکہ اس وقت تکلیف کی شدت سے اٹھتے بیٹھتے گزار رہے تھے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر کہا کہ میں جا کر فون کرتا ہوں، یہ نیچے اترے ہی تھے کہ بڑے بھائی ڈاکٹر مرزا اور ڈاکٹر نذیر کو لے آئے۔ بلڈ پریشر دیکھا گیا انجکشن لگائے گئے۔ ایک گھنٹہ ڈاکٹر ٹھیرے رہے تکلیف میں کچھ کمی نہیں ہوئی۔ مارفیا کے انجکشن کے بعد ایک قے ہوئی۔ مگر کھانسی اور تکلیف برابر رہی۔ ڈاکٹر کول نے آکسیجن لانے کے لئے چٹھی لکھ کر دی بڑے بھائی موٹر لا کر لائے۔ آکسیجن دینی شروع کی گئی۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد ذرا آرام ہوا۔ کھانسی کم ہوئی۔ مارفیا اور خواب آور گولی نے اپنا اثر کیا اور پونے سات بجے نیند آ گئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ نیند آ جائے تو اچھا ہے۔ پورے دو گھنٹے سوتے رہے۔ اس اثنا میں ڈاکٹر کول آ گئے اور یہ معلوم کر کے کہ سو رہے ہیں اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔ کہہ گئے کہ گیارہ بجے کے اندر ایک اور انجکشن دلوا دینا۔ بابا اٹھے اور وقت پوچھا تو والدہ نے بتلایا کہ نو بج رہے ہیں۔ کہا کہ میں بہت دیر سو گیا۔ اس وقت تک تو میرے کتنے کام ہو جاتے اب طبیعت صاف ہے اٹھ کر منہ ہاتھ دھولوں۔ دوا کا اثر باقی تھا، تھوڑی دیر میں پھر سو گئے۔ پونے گیارہ بجے ڈاکٹر نذیر آئے اور انجکشن دیا گیا۔ ڈاکٹر نائیڈو بھی آ گئے تھے ان سے باتیں کیں اپنے مزاج کا حال پوچھا کہ یہ اچانک کیسے ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ ہے کوئی فکر کی بات نہیں۔ اب تو آپ کی طبیعت بہتر ہے آرام کیجئے۔ وہ بھی چلے گئے۔

روز کی طرح پیر علی آئے بابا کے ساتھ کالج جانے کے لئے۔ یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کل شام آئے اچھے تھے۔ وہ یونیورسٹی سیکل پر چلے گئے۔ وہاں سب بابا کے منتظر تھے۔ یہ خبر پاتے ہی وائس صاحب نے چیف سکریٹری صاحب کو فون کیا۔ حال کہا۔ انھوں نے فوراً ڈاکٹر حفیظ اللہ کو بھجوایا۔ ڈاکٹر نے آ کر معائنہ کیا۔ اس وقت بائیں ہاتھ کی انگلیاں اور ناخن نیلے ہو گئے تھے بابا ہوش میں تھے پوچھا کہ آپ کا اسم گرامی؟ ڈاکٹر نے نام کہا۔ پھر کہا کہ آپ کو کیسے خبر ہوئی کس نے بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ چیف سکریٹری صاحب نے فون کیا کہ آپ کو دیکھوں۔ وہ چلے گئے تو والدہ سے کہا کہ ان کا نام یاد نہ تھے یا لکھ لیجئے۔ اس اثنا میں یہ خبر تمام سرینگر میں پھیل گئی۔ ڈپارٹمنٹ سب اٹھ آیا۔ ادھر ڈاکٹروں کی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی اور تین چار ڈاکٹرز ڈاکٹر علی جان۔ ڈاکٹر مورتی۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ آ گئے۔ پورا معائنہ کیا۔ بابا نے اپنی کیفیت کہی اب ڈاکٹر کول اور نائیڈو بھی آ چکے تھے۔ ہر ایک نے باری باری دیکھا، پھر نیچے چلے گئے۔ سب نے بیٹھ کر مشورہ کیا۔ دوائیں لکھیں۔ ڈاکٹر اوتار سنگھ کو یہیں چھوڑا۔ ان کے ساتھ رات کے لئے دو نرسز کا انتظام کیا۔ کارڈیوگرام لیا گیا۔ جتنے ہارٹ اسپیشلسٹ تھے سب جمع ہو گئے۔ ڈاکٹرز کے نیچے جانے کے بعد والدہ سے کہا کہ میرے ہاتھ نیلے ہو گئے ہیں ڈاکٹرز کچھ آپس میں اشارے کر رہے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اب تو کم ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ

آکسیجن سے ایسا ہوتا ہے۔ ان کا خیال اس طرف سے ہٹانے کی خاطر کہہ دیا۔ وہ خود کتنی پریشان تھیں۔ صفی بھائی بھی وہیں تھے ان سے کہا کہ کون کون آئے ہیں ان کے نام لکھتے جاؤ۔ ایک کاغذ قلم باہر رکھوا دو کہ لوگ اپنے نام اس پر لکھ دیں۔ والدہ نے کہا کہ باتیں نہ کیجئے ہرج ہوتا ہے تو کہا کہ خیر میں بات نہیں کرتا آپ لوگ کم از کم یہاں بیٹھ کر باتیں کیجئے میں سنتا ہوں ہم سب کو تو ڈاکٹروں نے اوپر جانے سے منع کر دیا تھا۔ صرف وہاں والدہ تھیں باری باری سے ہم میں سے کوئی جاتا۔ شام سے حالت گرنے لگی۔ بڑے بھائی تو صبح سے مسلسل ڈاکٹروں کو لانے لے جانے اور دوائیں لانے کی چکروں میں رہے آتے بابا کے پاس ٹھہرتے اور پھر چلے جاتے۔ ہم سبھوں نے صبح ناشتہ تو جوں توں کر لیا تھا۔ دوپہر کو کوئی کھانے ہی نہ پایا۔ بھائی صاحب کی حالت تو یہ ہو گئی تھی فکر و پریشانی میں موٹر چلانا بھی دشوار ہو گیا۔ اچھا ہوا کہ سردار بلدیو سنگھ صاحب جو گزشتہ سال ہمارے ہمسایہ تھے ان کا لڑکا آ گیا تھا انھوں نے موٹر ان سے چلوائی۔ گلوکوز اور دوائیں متعدد لائیں لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

لوگ سب جمع تھے چیف سکرٹری صاحب معہ اپنی بیگم صاحبہ ۴ بجے سے آ کر بیٹھے رہے۔ پانی کر صاحب بھی مزاج پرسی کے لئے آئے سب ڈاکٹروں کو طلب کیا گیا۔ وہ پھر ایک بار آ کر دیکھ گئے۔ پتہ نہیں ان سے کیا کہا۔ والدہ سے وہ کہہ رہے تھے کہ انسان کے بس میں تدبیر کرنا ہے باقی خدا کے ہاتھ ہے۔ آپ دعا کیجئے۔ اور کہا کہ ابھی میں نیچے بیٹھتا ہوں ڈاکٹر اوتار سنگھ اوپر آئے اور ایک گولی والدہ صاحبہ کو دی کہ اس کو سفوف بنا کر گلوکوز میں ملا کر رکھئے ۸ بجے دینا ہے۔ اور خود کچھ انجکشن دے کر چلے گئے۔ اس کے بعد پونے آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب آئے اور کہا کہ وہ دوا دے دینا چاہئے۔ بابا اس وقت سو رہے تھے ڈاکٹر نے کہا کہ انھیں آواز دیجئے۔ صفی بھائی نے بابا کہہ کر پکارا پھر دوسری آواز میں ایسا معلوم ہوا کہ ہوشیار ہو رہے ہیں۔ تیسری آواز پر آنکھیں کھول لیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دوا پی لیجئے منہ کھولا وہ تین چمچے پینے کے بعد کہا کہ بس اب نہیں پی جاتی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ چھوڑ دو بہت کر دی ہے۔ ہم سب بھائی اور والدہ وہیں تھے ڈاکٹر نے بائیں کروٹ لٹا دی اور نیچے چلے گئے۔ کمرے میں لائٹ کم رکھی گئی تھی۔ والدہ وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ۸ بجے کے قریب تنفس میں کچھ فرق آیا۔ یہ گھبرا گئیں سمجھا کہ آکسیجن کا ٹیوب نکل گیا ہے۔ بڑی روشنی کھولی۔ ڈاکٹر کو بلوایا قریب سے دیکھا تو سسکیاں لے رہے تھے اور کہتی ہیں کہ سر تکیے سے ڈھل رہا تھا۔ فوراً دو تین ڈاکٹر آ گئے۔ اوتار سنگھ نے سرنج میں انجکشن لیا۔ ان کو سید معاکیا۔ انجکشن دینے بھی نہ پائے تھے کہ ایک ہچکی نے ہمیشہ کے لئے انھیں خاموش کر دیا۔

اس وقت ہم سب وہیں موجود تھے۔ کبھی ایسا دیکھا نہ تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

ابھی کچھ لوگ تھے کچھ جا چکے تھے کہ یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ لوگ آنے لگے۔ گھر ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد صاحب اسی وقت پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کو روتا دیکھ کر سمجھانے لگے۔ کہا کہ صبر کرو۔ جب حضرت محمد مصطفےٰ صلعم سے موت ٹل سکی تو ہم جیسے انسانوں کا کیا ہے۔ ہر ایک کو مرنا ہے۔ کسی کو آگے کسی کو پیچھے آج وہ کل ہماری باری ہے۔ پھر بڑے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ تم کو ہمت سے کام لینا چاہئے اب یہ بار تم پر پڑا ہے۔" معلوم ہوا کہ جناب بخشی صاحب کسی ڈنر پر تھے۔ خبر پاتے ہی ادھر آ گئے۔ چیف سکرٹری صاحب معہ بیگم صاحبہ پھر واپس آئے وہ یہ کہتے گئے تھے کہ

گھر پہنچا تو فون بج رہا تھا۔ اٹھایا تو یہ خبر ملی۔ بڑا بج کر رہے تھے کہتے تھے کہ اتنی تھوڑی مدت کے لئے ملے تھے تو بہتر ہوتا کہ ان سے ملاقات ہجانہ ہوتی۔ یہ ہمارے دلوں پر بڑا داغ دے گئے۔ تمام وزراء۔ عہدہ دار۔ ڈاکٹرز وغیرہ سب آگئے۔ رات بھر لوگ گھر پر جمع رہے جتنی ملنے والی عورتیں تھیں سب آگئیں۔ اکثر یہی کہتی تھیں کہ کل شام ہی تو ملنے آئے تھے۔ ہر ایک رنجیدہ۔ سب ہی رو رہے تھے۔

بخشی صاحب نے والدہ سے دریافت کروایا کہ اب کیا کیا جائے۔ جیسا کہینگی اس پر عمل کیا جائے گا۔ والدہ صاحبہ نے کہلوایا کہ حیدرآباد لے جائیں گے۔ بخشی صاحب نے فون طلب فرمایا۔ لوگوں نے کہا کہ فون نہیں ہے۔ تعجب سے پوچھا کہ فون نہیں ہے؟ زور صاحب کے پاس فون تک نہ تھا۔" پھر افسوسناک لہجہ میں کہا کہ عجب درویش صفت انسان تھے کہ کبھی مجھ سے کہا تک نہیں، افسوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔" ہوائی جہاز کے لئے فون کیا گیا۔ حیدرآباد کے چیف منسٹر سنجیوا ریڈی سے ملایا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ سراج الدین احمد (ماموں صاحب) کو ٹرنک کال کیا گیا اطلاع کی۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ لالیں۔ رات بھر اسی میں گزری۔ مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ مسلسل کئی روز کی بارش نے راستے خراب کر رکھے تھے۔ مطلع ابر آلود ہونے کے باعث ہوائی سروس بند تھی۔ اس وقت ہم سب کیلئے بڑی ہی پریشانی کا وقت تھا۔ ممکنہ کوشش جاری تھی۔ لیکن کوئی صورت نہ بنی کہ یہاں سے لے جایا جاتا۔ یہ بھی مشیت ایزدی ہوگی۔ تار و ٹیلیفون کے لائینز تک خراب ہو چکے تھے۔ رات بھر کی کوشش بیکار ثابت ہوئیں آخر کار یہی تصفیہ کرنا پڑا کہ یہیں دفن ہو۔ آل انڈیا ریڈیو کو اطلاع کر دی گئی۔ صبح کے نیوز میں یہ خبر بھی سارے ہندوستان اور پاکستان تک پہنچ گئی۔ مقامی لوگ ہی بنا پڑنے شروع ہوئے۔ دفاتر۔ یونیورسٹی۔ ایس پی کالج۔ امرسنگھ کالج۔ میڈیکل کالج اور دیگر ادارے بند کر دئے گئے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبا رہائش گاہ پر آگئے تھے۔

بخشی صاحب، چیف سکرٹری صاحب کابینہ کے وزراء۔ وائس چانسلر کے یم پانی کر اور دوسرے عہدہ داران کے علاوہ دوست احباب بھی جمع ہو گئے۔ محلہ سوللنا کے تمام لوگ آگئے اور غسل کا تمام سامان اپنے ساتھ لائے اور چاہتے تھے کہ ہمارے ہمسایہ تھے مسلمان تھے ہمارا فرض ہے کہ اس کام کو انجام دیں ہم اپنے قبرستان میں جگہ دیں گے۔ جب دیکھا کہ بخشی صاحب اور ان کے تمام لوگ انتظام میں ہیں تو خاموش ہو گئے۔ بارش برابر جاری تھی۔ غسل تک یہ سلسلہ جاری رہا اور جب لے جانے کا وقت آیا تو بارش تھم گئی۔ میت ٹرک میں رکھی گئی۔ ہم سب بھائی اور کئی لوگ اس میں سوار ہو گئے سب سے آگے یہ تھی اس کے پیچھے بخشی صاحب کی پھر چیف سکرٹری صاحب، وائس چانسلر اور دیگر وزراء کی موٹریں اسکے بعد دوسرے دوست احباب کی موٹریں تھیں۔ لوگوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر بسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ جلوس بہت بڑا تھا۔ بے حساب موٹریں، بسیں، تانگے اور سائیکلیں تھیں۔ راستہ میں لوگ شریک ہوتے رہے۔ چونکہ مکان سے خانیار شریف دور ہے کافی وقت لگا۔ اسی مسجد میں نماز پڑھائی گئی سب ہی شریک تھے۔ خانیار شریف حضرت غوث اعظم پیر دستگیر کا چلہ ہے، یہ متبرک جگہ مانی جاتی ہے اور چونکہ بابا قادری تھے اس لئے اس مناسبت سے یہ جگہ تجویز کی گئی اور وہیں سپرد خاک کیا گیا۔ دفن کے وقت لوگ مٹی دیکھکر کہہ رہے تھے کہ "بڑی صاف ستھری ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی نیک مستی تھی، مسلسل کئی دن کی بارش کے باوجود اتنی خشک مٹی نکلی"۔ ہم سب گھر آتے ہی پھر بارش شروع ہو گئی اور دو تین دن تک موسلا دھار برستی رہی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ مہاراجہ کرن سنگھ کے یہاں سے ان کے پرائیوٹ سکرٹری صاحب

تعزیتی پیام لائے بیگم صاحبہ بخشی صاحب بھی والدہ کے یہاں تعزیت کے لئے تشریف لائیں اور اسی روز رات کی حاضری ان کی طرف سے آئی۔ گھر والوں کے سوا جتنے لوگ جمع تھے سبھوں نے کھایا۔ اس غریب الوطنی میں غیروں نے وہ ساتھ دیا کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

حاضریوں کا سلسلہ دنوں جاری رہا۔ ہر ایک نے باری باری باوجود والدہ کے منع کرنے کے بھجوائی۔ اور ان مہرباں احباب نے ہم لوگوں کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ والدہ کا خیال کرتے ہوئے اپنا گھر بار چھوڑ کر کئی رانیں ہمارے یہاں گزاریں۔ اس سلسلے میں بیگم ڈاکٹر ذکی الدین احمد، بیگم چشتی اور بیگم رضوی قابل ذکر ہیں۔ دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ تیسرا دن یوں آ گیا فاتحہ سوم بعد عصر مقرر تھی۔ زنانہ اور مردانے میں لوگ جمع ہونے لگے۔ کئی قرآن ختم ہوئے۔ حافظ قرآن بھی مقرر تھے۔ یہاں کے رواج کے مطابق حلوہ روٹی اور قہوہ سے سب کی خاطر کی گئی اور غربا میں تقسیم کیا گیا۔ مزار پر پھول چڑھائے گئے۔ فاتحہ پڑھی گئی۔ ہنوز بارش کا سلسلہ جاری تھا صرف اتنی دیر تھی کہ ہم لوگ فاتحہ کے لئے نکلے اور گھر لوٹ آئے ہی تھے کہ موسلا دھار شروع ہو گئی۔ ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا اور آسمان بھی ہم پر ستم ڈھا کر ہمارا شریک غم بنا تھا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم تھرتھراتا ہے مگر اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ اپنے بلند اخلاق اور ہنس مکھ چہرے کے ساتھ ہم میں نہیں رہے، ہم اس ہنس مکھ چہرے کو ڈھونڈیں گے اور نہیں پائیں گے ایسے بلند اخلاق کو ہماری آنکھیں تلاش کریں گی اور وہ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب تک ان کی تحریریں موجود ہیں وہ زندہ رہیں گے۔

(ہفتہ وار "الفاروق" کامٹی۔ ہینڈلوم نمبر۔ ۵۔ اپریل ۶۳ء)

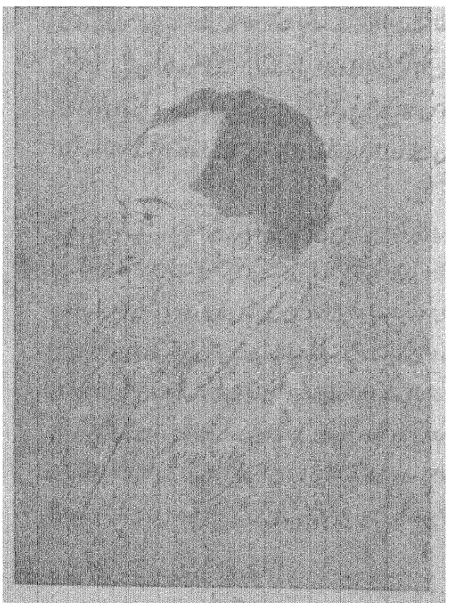
ڈاکٹر زور

کا



فن







پروفیسر عبدالمجید صدیقی

تاریخ دکن میں ڈاکٹر زورؔ کا حصّہ

۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات کو حضرت زورؔ کا انتقال ہوا۔ زورؔ صاحب کی موت علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے۔ ایک عربی کہاوت ہے "موت العالم موت العالم" عالم کی موت تنہا اس کی موت نہیں ہوتی بلکہ ایک دنیا کی موت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی موت بھی اردو دنیا کا ایسا نقصان عظیم ہے جسکا شمار اس کی آئندہ تلافی نہ ہو سکے۔ ان کی موت پر ہند و پاکستان کا ہر اردو بولنے والا رویا۔ اور ہر اردو ادارے نے آنسو بہائے۔ اور اب تک بہا رہے ہیں۔ مرحوم میں ایسی قوتِ محرکہ تھی کہ وہ برسوں کا کام ہفتوں میں کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے اردو کی خدمت کو اپنا وظیفۂ حیات بنایا اور مرتے دم تک یہ وظیفہ پڑھتے رہے یہ کس کو معلوم تھا کہ وہ آج ہم میں نہ ہوں گے اور اردو دنیا ان کا سوگ منائے گی۔ ہم سب کی تمنا تھی کہ وہ آئندہ دس سال تک اردو کی خدمت کرتے رہیں گے اور واقعی وہ چند سال اور زندہ رہ جاتے تو اردو کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔

اردو کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ کا بہت بڑا کارنامہ تاریخ دکن کا احیا بھی ہے۔ مرحوم اچھے پائے کے مورخ بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان اس کے ملک کے تاریخ و تمدن کا آئینہ ہوتی ہے۔ جو زبان بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اس میں زبان کے بولنے والوں کی تاریخ و تمدن چھپا رہتا ہے جوں جوں تمدن بڑھتا ہے زبان بھی نکھرتی ہے اور اس میں لطافت پیدا ہوتی ہے لسانیات کا مطالعہ کرنے والے پہلے قوموں کی تاریخ اور ثقافت کی چھان بین کرتے ہیں اور اسی چھان بین سے انھیں زبان کی صحیح بنیاد اور اس کی ارتقائی منزلیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ تھے تو اردو کے عالم لیکن جب وہ اردو کا مطالعہ کرنے بیٹھتے تو انھیں اس کے پیچھے تاریخ و تمدن کے بڑے دفینے نظر آتے یہ دفینے ہی تو زبان کے بڑے محرک ہیں۔ تمدن کے ارتقاء سے ہی زبان آگے بڑھتی ہے اس لئے زورؔ مرحوم نے اردو کی سرپرستی کے ساتھ تاریخ کے مطالعہ پر بھی اپنی خاص توجہ مبذول کی کیونکہ تاریخ کے بغیر زبان کی چھان بین نہیں ہو سکتی۔

اب اردو کو دیکھو تو وہ کئی ارتقائی منزلوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے اس کے اصلی جنم بھوم سے متعلق اب تک کوئی حتمی بات نہیں کہی گئی۔ شاید اہل دکن دکھنی زبان کو اردو کی ماں قرار دیں۔ خواہ یہ دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت کو کون انکار کر سکتا ہے کہ اہل دکن نے اپنے مخصوص انداز میں اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی اور بڑا سرمایہ چھوڑا۔ دکن میں جس قدر اردو یا دکھنی کا سرمایہ ملتا ہے ویسا شاید ہندستان کے دوسرے خطّوں کو نصیب نہ ہو۔ دکھنی اور دکن کا بہت بڑا سرمایۂ حیات ہے جس میں عوام کے علاوہ خود سلاطین کا بھی شایانِ شان حصہ رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ گولکنڈے اور بیجاپور کے تاجداروں نے دکھنی زبان کی جس قدر سرپرستی کی اور اس درخت کی جس قدر آبیاری کی وہ بیان سے باہر ہے۔ انھیں تاجداروں کا دیکھا دیکھی ملک کے شاعروں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی شروع کی اور دکھنی کو اپنی شاعری سے مالا مال کر دیا۔ ڈاکٹر زورؔ نے عام اردو کے ساتھ دکھنی زبان کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دکھنی زبان کی کتابیں جو گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاعروں نے تصنیف کی تھیں ان کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اس بات کو نہیں بھولنا

چاہیئے کہ ڈاکٹر زور نے سب سے پہلے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اور کلیات محمد قلی شائع کیا۔ کلیات محمد قلی کی تدوین اور اس کی اشاعت کوئی چھوٹا کام نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلیات دکھنی زبان کا شاہ کار ہے۔ اس میں شاعر نے آندھرا پردیش کی سیاست و معاشرت کی جیتی تصویر کھینچی ہے۔ اس کلیات کو آندھرا پردیش کی زندگی کا مرقع کہنا چاہیئے۔ ڈاکٹر زور کی رہبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار اہل قلم اس میدان میں اترآئے اور دیکھتے دیکھتے کئی دواوین اور مثنویاں منظر عام پر آگئیں اور اس کے طفیل میں دکن کی تاریخ اور ثقافت بھی بے نقاب ہوگئی۔ اگر یہ کلام منظر عام پر نہ آتا تو نہ صرف دکھنی ادب چھپا رہتا بلکہ تاریخ دکن بھی آنکھوں سے اوجھل رہتی۔ قوموں کی زندگی تاریخ ہی سے سنورتی ہے تاریخ نہ ہو تو قومیت کہاں اجاگر ہو سکتی ہے۔

اب ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں ڈاکٹر زور نے دکھنی شاعری کو اپنے مطالعہ کا مرکز توجہ بنایا تھا۔ اور اپنے غیر معمولی شغف سے اس شاعری کو اجاگر کیا۔ اور غالباً مرحوم نے اسی شاعری کے حقایق سمجھنے کے لئے تاریخ دکن کے مطالعہ کو بھی اپنا فرض اولین قرار دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ بغیر تاریخی پس منظر کے دکنی شاعری تو کیا دنیا کی کوئی شاعری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہر ادب اپنی قوم کو ایک زندہ پیام دیتا ہے۔ اور اس سے نہ صرف اس زمانہ کے سیاسی و سماجی رجحانات معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایک فلسفۂ حیات بھی سامنے آتا ہے۔ اور یہ فلسفہ تاریخ کی روشنی کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قوموں کی زندگی میں مد ہا سیاسی و سماجی تلاطم آتے ہیں اور انھیں تلاطم سے قومی زندگی کروٹ لیتی ہے اور اس کے سامنے ایک مقصدِ حیات متعین ہوتا ہے۔ اور یہ تمام تصورات بالآخر ادب کے ہر گوشے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ادب اصل میں قومی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ دوسرے طریقے سے دیکھا جائے تو ادب ایک تاریخ بھی ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر زور مرحوم نے اپنے وقت کا بڑا حصہ تاریخ دکن کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور اپنے تاریخی شغف سے تاریخ دکن میں زندگی پیدا کر دی۔

اب یہ دیکھنے کے لئے کہ مرحوم نے تاریخ دکن میں کس طرح روح پھونکی تھی ان کے چند کارناموں کو روشنی میں لانا ضروری ہے۔ تاریخ کے بڑے ماخذوں میں کتابوں کے علاوہ قدیم تاریخی آثار، مناور، مساجد، مقبرے، آلات و اسلحہ اور ظروف جیسی بہتیری چیزیں شامل ہیں۔ صرف تاریخ کی کتابیں لکھنے سے یہ مضمون پورا نہیں ہوتا۔ اور پورا پس منظر سامنے نہیں آتا۔ بلکہ صحیح ثقافت تعمیری آثار اور ظروف و اسلحہ سے روشنی میں آتی ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر زور مرحوم نے "تاریخ کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی اور ہر گوشے کی چھان بین کی۔ تاریخی کتابوں میں مرحوم کی دو کتابیں "حیات محمد قلی" اور "حیات میر محمد مومن" پائے کی کتابیں ہیں جو بڑی جستجو اور کاوش سے لکھی گئیں۔ جس جستجو سے مرحوم نے ان کتابوں کا مواد جمع کیا ہے اگی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم صرف عالم لسانیات ہی نہ تھے بلکہ بڑے پایہ کے مورخ بھی تھے۔ یہ دو کتابیں اصل میں دو بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات ہیں غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک صدی کی تاریخ سموئی ہوئی ہے۔ مرحوم نے محمد قلی اور میر محمد مومن کو اپنی تاریخ نگاری کے لئے اس وجہ سے منتخب کیا تھا کہ یہ دونوں بادشاہ اور وزیر گولکنڈے کی باعظمت شخصیتیں تھیں۔ اور یہ دونوں دکن کے بڑے تاریخ ساز اور ثقافت کے معمار تھے۔ ان دونوں نے اپنی ثقافتی خدمات سے گولکنڈے کی سلطنت میں چار چاند لگا دیئے ان سوانح سے گولکنڈے کی تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ ہو گیا۔

تاریخ نگاری کے علاوہ ڈاکٹر زور مرحوم نے دکن کے آثار قدیمہ کی بھی چھان بین کی۔ مسجدوں، مندروں، اور مقبروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ یہ آثار تاریخ اور ثقافت کے بڑے ماخذ ہیں۔ جب کبھی موقع ملتا وہ خود ان تاریخی مقامات کی تلاش میں نکل جاتے اور دوسروں کو دکھاتے تھے۔ دکن میں ماضی کے بے شمار آثار بکھرے پڑے ہیں اور بہتیرے ایسے ہیں جو اب مٹ رہے ہیں۔ از یاد رفتہ ہو رہے ہیں۔ مرحوم نے بعض آثار کی خود نشان دہی کی عوام کو بتایا۔ بعض مقبرے جو بے نام و نشان ہو گئے تھے ان کا پتہ چلایا بعض مقبروں پر کتبات

نصب کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکن کی بہترین شخصیتیں جو از یادرفتہ ہوگئیں تھیں وہ مرحوم کی نشان دہی اور کتبات کے تنصیب کی بدولت زندہ ہوگئیں۔ اور لوگ ان کو جاننے لگے۔ یہ آئندہ نسلوں کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے رہی ہیں۔

تاریخی میوزیم بھی مرحوم زور کے تاریخی شغف کا آئینہ دار ہے۔ یوں تو "ایوان اردو" کی پوری عمارت مرحوم کی اہم یادگار اور حیدرآباد کی بڑی ذہنی پیداوار ہے۔ لیکن اس کا بصیرت افروز شعبہ تاریخی میوزیم ہے جس میں صدیوں کے آثار جمع ہیں۔ ان آثار میں سکوں، فرمانوں، کتبوں اور تحریروں کے علاوہ قدیم نقاشی کے نمونے ظروف، اسلحہ اور فرنیچر کا بیش بہا ذخیرہ شامل ہے۔ اس کو دیکھنے سے دکن کی صحیح تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ دنیا میں میوزیم کئی طرح کے پائے جاتے ہیں۔ بعض میوزیم صرف نقاشی کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ اور بعضے صرف اسلحہ اور ظروف سے پُر ہیں لیکن "ایوانِ اردو" کا میوزیم دکن کی ہمہ جہتی زندگی کا بہترین مخزن ہے جو لوگ تاریخ نہیں پڑھتے ان کے لئے میوزیم تو ایک زندہ تاریخ کا کام دیتا ہے لیکن تاریخ پڑھنے والوں کے لئے بھی اس میں معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ دکنی تمدن کے جو پہلو اس میوزیم سے واضح ہوتے ہیں وہ سب لکھی ہوئی تاریخوں سے معلوم نہیں ہوتے۔ اور تمدن کا صحیح تصور ذہن میں مرتسم نہیں ہوتا۔ اگر اس کے لئے میوزیم کا معائنہ ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس سے قومی زندگی کے اکثر پردے کھل جاتے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر زور نے اس میوزیم کو سنوارنے میں بڑی کد و کاوش کی اور اس میں ہزاروں روپیوں کا سامان جمع کر دیا۔ جس کو مرحوم کی بہت بڑی یادگار سمجھنا چاہیئے جو کبھی بھولی نہیں جائے گی۔

بہ شکریہ شیر الدین مری نگر

۳۲ء؁ صحیح ہے بچے کا نام رکھا گیا سید غلام محی الدین عرف چاند پاشاہ میرے خاندان میں دستور ہے کہ اپنے بزرگوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ غلام محی الدین نامی میرے خاندان میں کوئی نہیں ہوئے۔ یہ نام رکھنے کا قصہ اس طرح ہے کہ جب میری لڑکی صدر النساء کا انتقال ہوا تو چونکہ میرا پہلا صدمہ تھا مجھے بہت رنج ہوا۔ تعزیت کے لئے حضرت مولانا محدث محمد عبدالوہاب نقشبندی جو میرے استاد اور پیر طریقت تھے تشریف لائے اور تسلی آمیز گفتگو کے بعد فرمایا کہ تم کو اولاد بہت ہوگی صبر کرو۔ "الصبر مفتاح الفرج" پھر فرمایا کہ تمہارے محل میں حمل ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ چھٹا مہینہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ انشاء اللہ اب کی دفعہ فرزند نرینہ ہوگا۔ اس کا نام حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے نام پر رکھنا۔ عمر دراز ہوگی اور یہ تجربے کی بات ہے۔

جب یہ لڑکا پیدا ہوا اور حضرت تشریف لائے تو میں نے اس نومولود کو آپ کی آغوش میں دیا۔ حضرت نے پیار کیا اور دیر تک دعا دیتے رہے۔ اور سید غلام محی الدین نام تجویز فرمایا۔ حضرت محدث نے اس لڑکے کو بارہا دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا صاحب اقبال ہوگا۔ اس کی پیشانی پر علائم پائے جاتے ہیں۔ چونکہ اس کے لئے حضرت ممدوح نے اور میں نے بھی سفر و حضر میں خاص طور پر دعائیں مانگی ہیں اس لئے مجھے امید ہے کہ یہ ضرور صاحب اقبال اور نامور لوگوں میں سے ہوگا اور مدارج ترقی طے کرے گا۔

(ڈاکٹر زور کے والد حضرت زعم کے ایک غیر مطبوعہ روزنامچے سے)

نصیر الدین ہاشمی

میرے عزیز دوست ڈاکٹر زور مرحوم

آج سے پچاس سال پہلے ایک جید حیدرآبادی عالم، دوست صاحب علم یعنی مولوی مظفر بیگ صاحب مرحوم نے امداد باہمی کے اصول پر ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اس کا نام "مکتبہ ابراہیمیہ" تھا۔ اس ادارہ میں اردو کی اچھی اچھی اور معیاری کتابیں فروخت ہوتی تھیں اور ایک علمی ادبی رسالہ "مکتبہ" کے نام سے ماہوار شائع ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں جامعہ عثمانیہ کو قائم ہوئے دو تین سال ہو چکے تھے۔ چند فرزندان جامعہ کو مکتبہ ابراہیمیہ اور رسالہ مکتبہ سے دلچسپی تھی۔ ان کے مضامین رسالہ مکتبہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان ہی فرزندان جامعہ میں ایک نوجوان علم دوست اردو کے پرستار، طبقہ مشائخین سے تعلق رکھنے والے ہونہار فرزند جامعہ بھی شامل تھے جو کسی قدر پست قد، گورا رنگ، اچھی صورت شکل کے اور جن کی چھوٹی سی سیاہ ڈاڑھی بھی تھی جو گورے رنگ پر خوب زیب دیتی تھی یہ تھے سید محی الدین قادری زورؔ۔

رسالہ مکتبہ میں میرے مضامین بھی شائع ہوتے تھے اس لئے میں بھی کبھی کبھی ادارہ مکتبہ ابراہیمیہ جاتا تھا۔ رسالہ مکتبہ اور مکتبہ ابراہیمیہ کی وجہ سے ہم دونوں واقف ہو گئے تھے اور دوستی کا ہاتھ ملا چکے تھے۔ زورؔ صاحب کی پہلی کتاب روح تنقید شائع ہو چکی تھی۔ زورؔ صاحب ۱۹۲۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے ہونے پر حکومت کے وظیفہ پر مزید تعلیم کے لئے انگلستان روانہ کئے گئے اور مجھے بھی اپنی کتاب دکن میں اردو کے صلہ میں حکومت نے یورپ جانے کے لئے امداد منظور فرمائی۔ میں ستمبر ۱۹۲۷ء میں لندن پہونچا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں جب برٹش میوزیم میں پہونچا تو اس کے احاطہ میں دور سے ایک نوجوان کلین شیو، دیدہ زیب سوٹ زیب تن کئے اسمارٹ چہرہ والے نظر آئے قیاس ہوا غالباً سید محی الدین قادری زورؔ ہوں گے۔ چنانچہ قریب آکر گلے ملے۔ زورؔ صاحب میرے انگلستان آنے کی خبر بہت پہلے سن چکے تھے اور ڈاکٹر بیلی پروفیسر ارمور کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ شہر لندن میں زورؔ صاحب ایک سمت میں قیام کرتے تھے اور دوسری سمت میں میں رہا کرتا تھا مگر جب وہ برٹش میوزیم یا انڈیا آفس لائبریری آتے یا میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جاتا تو موصوف سے ملاقات ہوتی تھی کبھی وہ میری قیام گاہ پر آتے اور میں کبھی ان کی قیام گاہ پر بھی جایا کرتا جہاں اسی مکان میں پروفیسر سید محمد علی خاں اور ان کے بھائی سید حسین علی خاں صاحب رہا کرتے تھے۔ غرض ہماری دوستی میں ترقی ہوتی گئی اور اتحاد میں خلوص آتا گیا۔

لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر زورؔ صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں اولاً مددگار پروفیسر اور پھر ترقی کر کے پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دارالعلوم اور پھر چادرگھاٹ کالج کے پرنسپل ہوئے بالآخر وہ سال بھر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وہ کشمیر چلے گئے جہاں صدر شعبہ کے علاوہ وہ ڈین آف فیکلٹی بھی بنائے گئے۔ یہ ہے ڈاکٹر زورؔ صاحب کی اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کی مختصر ترین داستان۔ اس ملازمت کے دوران میں زورؔ صاحب کو کیا کیا دشواریاں پیش آئیں کیسے کیسے مرحلے درپیش ہوئے۔ کن کن مشکلات کا سامنا ہوا اس کی صراحت یہاں غیر ضروری ہے۔ اور اس کا کوئی موقع بھی نہیں ہے۔

انگلستان سے واپسی اور ملازمت کے بعد حیدرآباد کے ایک صاحب علم اعلیٰ عہدہ دار نیز نواب رفعت یار جنگ کی دختر سے زورؔ صاحب کی

شادی ہوگئی اور زور صاحب کچھ عرصہ کے بعد پرانے شہر کے اپنے والد کے مکان سے اپنے نئے مکان خیریت آباد منتقل ہوگئے۔ صاحب اولاد ہوئے۔ دو لڑکیوں کی شادی کی ڈاکٹر زور صاحب کے دوستوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ امرا، جاگیردار۔ پروفیسر انجینیر ڈاکٹر، تجار، شاعر، ادیب غرض وہ ہر فن کے اشخاص سے متعارف تھے اور اچھے دوست ثابت ہوئے تھے۔ حیدرآباد آتے ہی زور صاحب اپنے علمی ادبی تاریخی خدمات اور کارناموں کے باعث مشہور ہوگئے۔ اور ان کے مخالف اور بعض منافق دوست حسد سے جلنے لگے۔ زور صاحب کے علمی خدمات کو چند اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اردو کی تعلیم دینا (۲) کتابیں تالیف کرنا (۳) ادارۂ ادبیات اردو قائم کرنا اور اس کو ترقی دینا۔ (۴) ادارہ میں کتابیں اور نوادرات کا جمع کرنا، (۵) یوم سلطان محمد قلی کی آغاز کرنا (۶) آزاد انسٹی ٹیوٹ کا قائم کرنا (۷) اپنے شاگردوں وغیرہ سے کتابیں لکھوانا (۸) علمی ادارہ کی شرکت (۹) شاعری۔

(الف) زور صاحب انگلستان سے واپسی کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں مامور ہوئے ادیب اے۔ ایم اے کے طلباء اور طالبات کو اردو نظم اور نثر کی تعلیم دینے لگے پھر جب دارالعلوم اورچارمینار گھاٹ کالج میں پرنسپل ہوگئے تو وہاں بھی روزآنہ ایک دو گھنٹہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم سے طلبا خوش تھے زور صاحب کا یہ معمول تھا کہ نصاب تعلیم کو اس کے مقررہ مدت میں ختم کروایا جائے۔ جب جامعہ عثمانیہ میں پی ایچ ڈی کے لئے ریسرچ ہونے لگا تو ایسے طلبا اور طالبات بھی آپ کے طریقہ تعلیم۔ طریقہ ہدایت۔ رہبری ریسرچ سے خوش رہا کرتے۔ زور صاحب اپنی تعلیمی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرتے تھے اور اس کے لحاظ سے درسی کتب مقررہ وقت میں ختم کرتے اور اس کے متعلق دیگر کتابوں سے استفادہ کرانے اور معلومات کے وسیع کرنے کے لئے ہمیشہ شاگردوں کو ہدایت دیتے وہ اچھے رہبر اور رہنما ثابت ہوتے تھے۔ موصوف کے بیسیوں شاگرد آج اردو کے اچھے اسکالر اور اچھے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جس سے واضح ہوسکتا ہے کہ زور صاحب کس طرح تعلیم دیا کرتے اور علمی ترقی کرنے کے گر بتاتے، ریسرچ کا طریقہ ذہن نشین کراتے تھے وہ اچھے اور قابل پروفیسر ذہین رہبر اور رہبر و پرنسپل رہے۔

(ب) زور صاحب کی تصانیف اور تالیفات کو مختلف فنون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی

۱۔ تنقید۔ ۲۔ لسانیات۔ ۳۔ تاریخ ادب۔ ۴۔ تاریخ وسوانح عمری۔ ۵۔ افسانہ۔ ۶۔ وضاحتی فہرست ہائے کتب۔ ۷۔ مجامع۔

۱۔ تنقید:۔ روح تنقید۔ تین شاعر۔ روح غالب ..... تنقیدی مقالات۔

۲۔ لسانیات:۔ ہندستانی لسانیات۔ اردو کے اسالیب بیان۔

۳۔ تاریخ ادب:۔ اردو شہ پارے۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ داستان ادب حیدرآباد۔ محمود غزنوی کی نثر اور ادب۔ دکنی ادب کی تاریخ

۴۔ تاریخ وسوانح:۔ حیات سلطان محمد قلی قطب۔ میر محمد مومن۔ فرخندہ بنیاد۔ سرگذشت غالب۔ سرگذشت حاتم۔

۵۔ مختصر افسانے گولکنڈہ کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ۔ طلسم تقدیر و فسانہ تازیانہ۔

۶۔ کتب خانہ ادبیات کی قلمی کتابوں کی پانچ فہرستیں۔

۷۔ مجامع یعنی انتخابات دواوین اور مکتوبات۔

مرقع سخن حصہ اول دوم۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ متاع سخن۔ کیف سخن۔ رمز سخن۔ معانی سخن۔ بادۂ سخن۔ مکتوبات شاد۔ عظیم آبادی۔ شاد و اقبال۔ کلیات قلی قطب شاہ۔

ڈاکٹر زور صاحب کی تمام کتابوں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو مضمون طویل سے طویل تر ہوجائے گا۔ یہ کام اس کا ہوگا جو

پی ایچ ڈی کے لئے ڈاکٹر زورؔ اور ان کے کارنامہ کو اپنا عنوان قرار دے۔

میں یہاں مختصر طور پر ڈاکٹر صاحب کے چند شہ کاروں پر کچھ تبصرہ کروں گا۔ میرے خیال میں یہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) سلطان محمد قلی قطب شاہ (۲) میر محمد مومن (۳) تذکرہ اردو مخطوطات (۴) روح تنقید (۵) داستان ادب حیدرآباد۔

(۱) حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ یہ کتاب رائل سائز کے (۴۹۰) صفحات پر حاوی ہے۔ اس میں قطب شاہی سلاطین کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی کے حالات زندگی کے علاوہ اس کے کلام پر تبصرہ ہے۔ حالات زندگی میں اس وقت کے تمدن اور معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک بادشاہ کی سوانح عمری ہے مگر ایسی سوانح عمری ہے کہ جس میں سلطان کے ذاتی حالات پیدائش تعلیم و تربیت۔ آغاز شباب۔ شباب کی بدمستیاں۔ رندی اور مستی۔ جوانی و رعنائی۔ مذہبی پابندی عقائد کی پختگی۔ فتوحات جنگ و جدل تدبر و سیاست۔ بیرونی تعلقات کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے رسم و رواج پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد سلطان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

اس کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ صاحب صرف ایک ادیب اور نقاد نہیں بلکہ بلند پایہ مورخ بھی تھے اور سوانح نگار بھی انھوں نے واقعات کی تحقیق اور جانچ میں پوری کد و کاوش کو کام میں لایا ہے اور تاریخی موشگافی کر کے بڑی چھان بین کے ساتھ واقعات لکھے ہیں۔ تمدن اور معاشرت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے قطب شاہی دور کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ جس جانکاہی و دقت سے انھوں نے واقعات کی عکاسی کی ہے وہ ایک بہترین ماہر فن کی حیثیت رکھتی ہے چونکہ سلطان اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر تھا اس حیثیت سے اس کے کلام پر جو تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ ہر آئینہ قابل تحسین ہے۔ انھوں نے سلطان کے کلام کی خوبیاں اُجاگر کی ہیں اس کے ہر قسم کے کلام پر تنقید کر کے یہ واضح کیا ہے کہ سلطان اپنے عہد کا زبردست اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اور اس کا کلام درحقیقت کلام الملوک ملک الکلام کہلانے کا مستحق ہے۔

(۲) "میر محمد مومن" علامہ میر محمد مومن قطب شاہی عہد کے پیشوائے سلطنت اور وزیر اعظم ہونے کے علاوہ بہت بڑے عالم اور معلم بھی تھے جن کا مقبرہ "دائرہ میر مومن" آج تک حیدرآباد کا مشہور مدفن ہے۔

ڈاکٹر زورؔ صاحب کی یہ کتاب متوسط سائز کے (۳۱۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دس باب ہیں۔ ان میں علامہ کے خاندانی حالات تعلیم و تربیت۔ ایران میں عروج اور پھر دکن میں آنے اور یہاں آکر ترقی کرنے۔ اقتدار حاصل کرنے۔ مذہب امامیہ کی ترویج۔ فن تعمیر کی مہارت اور حیدرآباد کو تعمیر کرنا اور دوسرے تعمیری کارنامے۔ ان کی جاگیرات۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کے کارنامے علمی حیثیت سے ان کی یادگاریں۔ تصنیف و تالیف میں ان کا مرتبہ وغیرہ امور کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

علامہ میر محمد مومن کے حالات لکھنے کے لئے زورؔ صاحب نے جو تلاش اور تجسس کی ہے وہ ان کے بہترین مورخ اور عصر حاضر کے بہت بڑے سوانح نگار ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے ادبیات پر ریسرچ کر کے ڈگری نہیں لی۔ بلکہ بہ حیثیت مورخ انھوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ میر مومن کے حالات جو خستہ اور پراگندہ تھے ان کو جمع کرنے کے لئے نہ صرف بیسیوں کتابوں سے مدد لی ہے بلکہ ان کے آثار قدیمہ اور فن تعمیر پر روشنی ڈالنے کے لئے انھوں نے کئی قصبات اور دیہات کا دورہ کر کے حالات جمع کئے ہیں بیسیوں کتابوں کو پڑھا ہے اس طرح ایک ضخیم سوانح عمری اردو میں پیش کر کے اس کے خزانے میں بیش بہا نگینے کا اضافہ کیا ہے۔

(۳) "روح تنقید" یہ کتاب ڈاکٹر زورؔ صاحب کے زمانہ تعلیم کی یادگار ہے اور اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ اب تک کئی

مرتبہ شایع ہو چکی ہے کئی یونیورسیٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں فنِ تنقید کی نہ صرف پہلی کتاب ہے بلکہ کتابت آخر میں بھی ہے۔ اس کے بعد ہی تنقید پر عام طور سے لوگوں کا رجحان ہو گیا اور بہت زیادہ تعداد میں اور مضامین اس فن کے متعلق شایع ہونے لگے۔

"روح تنقید" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تنقید کی تعریف۔ ادب کی تعریف۔ ادب کی پیدایش۔ ادب کی تقسیم۔ ادب کا مقصد۔ تنقید نگار کے فرایض۔ تنقید نگار کی تمہید اشت اور اصول تنقید کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں ارتقائے تنقید سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں از منۂ قدیم یونان اور روما از منۂ متوسط عصر اصلاح۔ عصر بیداری اور انقلاب فرانس اور انگلستان میں ارتقائے تنقید۔ اٹھارھویں صدی کے بعد تنقید کی ترقی۔ اور مشہور نقاد (کولرج ورڈ سوتھ میاتھیو آرنلڈ) کا تذکرہ ہے۔ آخر پر مروجہ تنقید اور چند تنقیدی کارنامے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ آخری باب ہی خصوصیت سے معلومات کا گنجینہ ہے۔

اس صراحت سے ظاہر ہے کہ "روح تنقید" درحقیقت اسم بامسمّٰی ہے۔

(۴) "داستان ادب حیدرآباد" اگرچہ داستان میں جھوٹ سچ صدق و کذب سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن حیدرآباد کے ادب کی داستان حقیقت بردار اور صداقت کی آئینہ دار ہے اس میں قطب شاہی دور کے علامہ ابن خاتون سے لے کر آصفیہ دور کے جامعہ عثمانیہ کی تاسیس تک ادب کا جائزہ لیا گیا ہے بہ الفاظ دیگر ۱۰۰۰ھ سے آغاز ہو کر ۱۳۵۰ھ پر اختتام کیا ہے۔ دس باب میں یہ کتاب تقسیم ہے اور بڑی دلچسپ دلکش شگفتہ انداز میں حیدرآباد کی ادبی تاریخ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس داستان میں ادب حیدرآباد کا اگرچہ صرف جائزہ لیا گیا ہے ادب کے ارتقار کی تاریخ یا ادبی نمونوں کو پیش کرنا اس کتاب کا مقصد نہیں ہے لیکن جو کچھ واضح کیا گیا ہے وہ تاریخ ادب اردو میں زندگی جاوید کا مستحق ہے۔

(۵) "تذکرۂ اردو مخطوطات" ادارۂ ادبیات اردو میں کئی ہزار عربی فارسی اور اردو مخطوطات محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے ان مخطوطات کی تفصیلی فہرست لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لندن کے عربی فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرستیں جو ڈاکٹر اتھے ریو اور بلوم ہارٹ نے لکھی ہیں دنیائے ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور اپنی بیش قیمت معلومات آفرینی اندراجات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے بھی اسی نہج پر ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کو اہل علم سے روشناس کرنے کا تہیہ کیا اور پانچ جلدیں شائع کر دیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ کتاب معلومات آفریں ہے۔ مخطوطات ان کے مصنفین اور مولفین کے متعلق اچھے معلومات اور بیش بہا مسالہ پیش کرتی ہے۔ پانچ جلدوں میں (۱۱۵۰) مخطوطات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۳) زور صاحب کا تیسرا اہم نمایاں کارنامہ "ادارۂ ادبیات اردو" کو قائم کرنا اور اس کو ترقی دینا اور اس کو میوزیم کی صورت دینے کے لئے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرانا ہے۔

زور صاحب نے اپنے چند دوستوں کو فراہم کر کے ان کے تعاون سے ۱۹۳۲ء میں ادارۂ ادبیات اردو قائم کیا تھا۔ اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت کے لئے اس ادارہ کو ترقی دینے کے لئے اپنے قابل اور لایق شاگردوں کو ترغیب دیکر کتابیں اور مقالے لکھواتے اور اس کو ادارہ کی جانب سے شایع کراتے تھے۔ چنانچہ اس وقت تک ادارہ کی تین سو کے قریب مطبوعات منظر عام پر آگئی ہیں اور چند کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ ادارہ کی جانب سے رسالہ "سب رس" شائع کرنے لگے۔ "ادارۂ ادبیات اردو" نے جو ترقی کی ہے اس کی صراحت کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ اس مختصر مضمون میں ادارہ کی ترقی اور حیدرآباد و ہندستان میں اس ادارہ نے جو مقام حاصل کیا ہے اس کی وضاحت دشوار ہے۔ بہرحال ادارۂ ادبیات اردو قائم کر کے اس کو ترقی دینا ڈاکٹر صاحب کا

ایسا دور نشاں کارنامہ ہے جو فراموش نہیں ہو سکتا۔

(۴) زور صاحب نے ادارہ کے لئے ایک کتب خانہ قائم کیا اور اس میں قلمی اور مطبوعہ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ ہندی کتابیں جمع کرتے گئے چنانچہ اس وقت تک تقریباً پانچ ہزار قلمی اور پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں ادارہ کے کتب خانہ میں جمع ہوئی ہیں۔ قلمی کتابوں کی پانچ فہرستیں خود ڈاکٹر صاحب نے مرتب کر دی اور مطبوعہ کتابوں کی تین فہرستیں اکبر الدین صاحب صدیقی نے مرتب کی ہیں۔ کتب خانہ میں کتابوں کے علاوہ قدیم اخبارات اور رسایل بھی جمع کئے۔ کتابوں کا ایک حصہ خریدا تو ایک بڑا حصہ لوگوں سے تحفتہً بھی حاصل کر کے ادارہ کے کتب خانہ کو نوادرات سے پُر کر دیا۔

ادارہ کے نوادرات کی فہرستیں مرتب کرائیں۔ نوادرات میں مشاہیر کے خطوط، فرامین۔ رقعے۔ تصاویر۔ ہتیار غرض علمی اور تاریخی ذخیرہ سے ادارہ کو سجا کر ایک چھوٹا سا اچھا میوزیم بنا دیا جو کام کرنے والوں اور شائقین کے لئے مفید میوزیم اور پیش بہا گنجینہ بنا ہوا ہے۔

(۵) پولیس ایکشن کے بعد جاگیردار یت ختم ہو گئی تاریخی چیزوں سے لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ حیدرآباد کے قدیم تمدن اور کلچر کو جاننے والے معدوم ہونے لگے۔ دکھنی خطوط، تہذیب اور مشترک کلچر مٹنے لگا۔ اس کے احیاء کے لئے ڈاکٹر صاحب نے یوم سلطان محمد قلی منانے کی بنا ڈالی اور آج کئی سال سے یوم محمد قلی منایا جا رہا ہے۔ یوم محمد قلی کے موقع پر مقالوں اور خطوں کے علاوہ کتابوں کے شائع کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ یوم قلی کے دو روز کے تقاریب ہوتے ہیں دوسرے دن تلنگی زبان میں قطب شاہ کے متعلق مقالے نائے جاتے ہیں۔ غرض یوم محمد قلی ماہ جنوری کی گیارہ کو مقبرہ سلطان محمد قلی اور پھر اس کا سلسلہ ادارہ وغیرہ میں ہوا کرتا ہے یوم قلی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس سے حیدرآباد کے کلچر اور ادب کو مدد ملتی ہے اور علم دوست اصحاب کو معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی نے اپنے قلمرو کی کیسی سیشن بہا خدمت انجام دی تھی۔

(۶) ادارۂ ادبیات اردو کے ساتھ گذشتہ کئی سال سے مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا گیا اور اس کے ضابطہ کے لحاظ سے ادارۂ ادبیات اردو کا سکریٹری ہی آزاد انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری ہوتا ہے۔ آزاد انسٹی ٹیوٹ سے قابل اسکالروں کو ماہوار معقول وظایف دیئے جاتے ہیں اور ان کے مرتبہ مقالوں کو شایع کیا جاتا ہے۔ صرف چند سال کے عرصہ میں اس ادارہ نے جو ترقی کی ہے وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ کئی اچھے اچھے مقالے مرتب اور شایع ہوئے اور کئی مقالے مرتب ہو چکے۔ ان کی اشاعت ہونے والی ہے۔ اس ادارہ کا ایک مستقل علٰحدہ کتب خانہ ہے جس میں ریسرچ کرنے والوں کے لئے خاص خاص کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔

(۷) زور صاحب کے کارناموں میں ایک دور نشاں کارنامہ یہ ہے کہ موصوف نے اپنے ہونہار شاگردوں کو علم کا شایق بنایا۔ شاگردوں کی ہمت افزائی کرتے ہوئے تالیف و تصنیف کا شوق دلایا۔ ایسے کئی اصحاب ہیں جن کی کتابیں محض زور صاحب کی ہمت افزائی کرنے اور توجہ دلانے سے عالم وجود میں آئی ہیں۔ مثلاً مخدوم محی الدین کی کتاب سگیورا اور اس کی شاعری۔ میر حسن کی کتاب مغربی تصانیف کے اردو تراجم۔ جہاں بانو بیگم کی محمد حسین آزاد۔ رشید قریشی کی من کی دنیا۔ لطیف النسا بیگم کی من کی ہنپتا سکینہ بیگم کی کتاب نذر دکن اور مقالات طیبہ۔ جہاں بانو، نعیم النسا وغیرہ کی کتاب تذرولی۔

(۸) زور صاحب حیدرآباد اور ہندوستان کے کئی علمی اور ادبی اداروں کے رکن تھے۔ مثلاً انجمن ترقی اردو، آندھرا ساہتیہ اکیڈیمی۔ آل انڈیا ساہتیہ اکیڈیمی۔ رسالہ آج کل۔ وغیرہ اس کے علاوہ کئی یونیورسٹی کے ممتحن وغیرہ کی حیثیت سے ان سے کام لیا جاتا تھا۔ اور ان کی معلومات سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ کئی یونیورسٹیوں کے پروفیسر کا انتخاب ڈاکٹر زور صاحب کی رائے سے کیا گیا ہے۔

(۹) ڈاکٹر زور صاحب نے جب ادبی میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت انھوں نے شاعری کے لئے اپنا تخلص زور رکھا تھا۔ چنانچہ مرقع سخن حصہ چہارم میں انکے کلام غزلیات اور نظمیں شامل ہیں اس کے بعد جب ڈاکٹر صاحب ادارہ کے کاموں میں مصروف ہوگئے اور پریسیڈنسی کالج کی اردو خدمت ان کے ذمہ ہوگئی تو انھوں نے شاعری کی جانب توجہ کم کردی تھی۔ جب وظیفہ ہوگیا اور کشمیر جنت نظیر میں قیام ہوا تو شاعری کا رنگین اور دلچسپ پرلطف جذبہ ابھر آیا۔ اور وہ غزل کے میدان میں اپنی جولانی طبع کے جوہر پیش کرنے لگے۔ ان کا کلام اپنے تخیل کی بلندپروازی۔ جذبات کی گہرائی۔ اسلوب کی جدت اور رنگین شگفتگی لطف زبان روانی و سادگی غرض ہر لحاظ سے قابل داد اور لایق ستائش ہے۔ ان کو شاعری کے لحاظ سے شعرا کی پہلی صف میں جگہ نہ دیجائے تو دوسری صف میں وہ ضرور جگہ پا سکتے ہیں۔

صفحات گذشتہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مختصر تعارف اور ان کے کارناموں کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے ان اصحاب کو معلومات ہو سکتے ہیں۔ جو ڈاکٹر صاحب پر ریسرچ کرنے کے خواہشمند ہوں ان کو ریسرچ کے لئے جن جن موضوعات پر توجہ کرنے کی ضرورت ہو ایک خاکہ ان کو مل جائے گا۔

زور صاحب اپنے کردار کے لحاظ سے ایک اچھے انسان تھے۔ انسان میں بعض کمزوریاں بھی ہوتی ہیں مگر اس کے کردار کی نیکی ان کمزوریوں پر غالب آجاتی اور پردہ پوش ہو جاتی ہے اور وہ انسان اپنے نیک کردار کے باعث عوام کے احترام کا باعث ہوتا ہے۔ لہذا کہنا چاہیئے کہ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہ اردو والوں کا اجتماعی اور دکن والوں کا خصوصی نقصان ہے۔ وہ تمام زندگی اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے بانی و معمار تھے۔ وہ خود بھی کام کرتے تھے اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا ایک گروہ پیدا کرلیا تھا۔ دکن کی زبان دکن کے ادب دکن کی تاریخ و تہذیب کو انھوں نے از سر نو زندہ کیا۔ سرزمین دکن سے انھیں عشق تھا لیکن مشیت کو یہ منظور نہ تھا کہ جس نے عمر بھر اس سرزمین کی خدمت کی وہ اسی سرزمین میں دفن ہو۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

سید حرمت الاکرام

ڈاکٹر زور کی شخصی اور ادبی زندگی

گذشتہ ربع صدی کے دوران زبان و ادب کے قدیم مراکز دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ پنجاب اور حیدرآباد نے اردو کی ارتقائی جد و جہد کو آگے بڑھانے، اہل فن کی شخصیتوں کو پروان چڑھانے، ان کی تحقیقی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے نیز اردو کتب و رسائل کی اشاعتی مہم کو نئی توانائیاں بخشنے میں جو امتیازی کردار ادا کیا ہے، اسے ہماری ادبی تاریخ اپنے صفحات کا بیش قیمت سرمایہ تصور کر کے زیر مجبود ہے۔ پنجاب، ہندوستان کی فرخی ملاو کا ایک صوبہ تھا جو حصول آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ لیکن حیدرآباد ایک خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں پنجاب کے مقابلے میں اردو کی ترقی و ترویج و اشاعت کی سہولتیں از روئے آئین میسر تھیں۔ حیدرآباد ہی وہ سرزمین ہے جہاں عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعۂ تعلیم مقرر کرنے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا، اس موقع پر مجھے اردو سے متعلق پنجاب اور حیدرآباد کی خدمات کا موازنہ مقصود نہیں بلکہ غیر ضروری تفصیل سے قطع نظر یہ کہنا ہے کہ اسی حیدرآباد کی نرم و گرم آغوش نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو جنم دیا جس کے گرو اردو کی حیدرآبادی تاریخ کا ایک اہم تر دور منسلک ملتا ہے اور یہ حیدرآبادی تاریخ اپنی معنوی کیفیات کے تحت اردو دنیا کی پوری تاریخ کو متاثر کرتی ہے

ڈاکٹر زور نے ۲۸ رمضان ۱۳۲۶ھ کو حافظ غلام محی الدین کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جن کے نسبی سلسلے کی کڑیاں دکن کے مشہور صوفی اور ولی سید شاہ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان کی ذات والا صفات سے ربط رکھتی ہیں۔ قدیم دستور کے تحت ڈاکٹر زور نے اول اول دار العلوم میں عربی و فارسی کی تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد سٹی کالج میں داخلہ لیا، پھر ۱۹۲۵ء میں بی اے اور ۱۹۲۷ء میں ایم اے (اردو و فارسی) کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد سرکاری وظیفہ پر انگلستان گئے اور آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ نیز اردو کا تحقیقی کام کر کے تین سال کے بجائے دو ہی سال میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے لی اور اسی نقطہ سے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" اپنی بہار کے شاداب مستقبل کی جھلکیاں دکھانے لگے۔ ان کا مقالہ اس قدر پر مغز تھا کہ ڈاکٹر گرارسن جیسے صدر شعبۂ اردو لندن یونیورسٹی نے خود بھی اس کی کافی تعریف کی جسے ایک خصوصی قدر افزائی قرار دیا جائے گا۔ ڈاکٹر زور نے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج لندن میں بھی صوتیات کی تعلیم حاصل کی، پھر ہند آریائی لسانیات اور بالخصوص پہلوی اور جیسی زبانوں کے متعلق "سوربورن یونیورسٹی" پیرس میں درس لئے نیز پیرس ہی سے انگریزی زبان میں ایک کتاب "HINDUSTANI PHONETICS" شائع کی جو اس موضوع پر اولین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ انھوں نے "ہندوستانی کی گجراتی شاخ" کے موضوع پر بھی ایک بلند معیار اور پر مغز مقالہ پر ڈاکٹریٹ لیا۔ بلوک کی گرائمر میں قلمبند کیا جسے علمی اور ادبی حلقوں نے کافی پسند کیا۔

ہندوستان واپس آنے پر ڈاکٹر زور کو عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) نے اردو کے پروفیسر کا عہدہ پیش کیا اور جب انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی منتقل کیا گیا اور خود ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی دہلی چلے گئے تو ان کی جگہ عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر زور کو شعبۂ اردو کے صدر کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس عہدہ کے بعد دار العلوم کالج اور پھر چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، اور چونکہ ان کی روشن طبع کے سبھی قائل تھے لہٰذا یہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد بخشی غلام محمد (وزیر اعظم کشمیر) کی ذاتی خواہش پر کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کا عہدہ قبول کیا جو ان کی خدمات جلیلہ

منزلِ آخر ثابت ہوا۔

اپنی جنم بھومی سے ہر شخص کو ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے جس میں کسی نمائشی عنصر کی کارفرمائی ہو ہی نہیں سکتی لیکن ڈاکٹر زورؔ کو حیدرآباد سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ممکن نہیں جس کا اساسی سبب وہ ناقابلِ فراموش کارنامے بھی ہو سکتے ہیں جو حیدرآباد کی سرزمین اور ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کے باہمی ربط و تعلق کو اٹوٹ بناتے ہیں۔ چنانچہ سری نگر میں موجِ قلب کے دورے پڑنے کے بعد ان کی زبان پر حیدرآباد کا ورد تھا اور ان کے ارمان میں ہوتا تو غالباً وہ اڑ کر اپنے وطن پہنچ جاتے لیکن ان کی یہ آخری خواہش شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی اور وہ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو دیارِ غیر میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر زورؔ نے ۷۰ سال کی عمر پائی جسے کسی اعتبار سے طویل نہیں کہا جا سکتا لیکن اس قلیل مدت کو انھوں نے اپنی قوتِ کار کا معنوی پھیلاؤ دیکر بے کنار و بے پایاں بنا دیا۔ دکنی زبان اور اس کے مخطوطات پر ان کا کام حدیث المثال ہے، انھوں نے اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کیا جو بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ نیز ان کا یومِ منانے کی بنا ڈالی۔ ڈاکٹر زورؔ کی مصروفیات کا حلقہ بڑی وسعت رکھتا تھا، وہ حکومتِ ہند کی کئی اہم کمیٹیوں میں شامل تھے، ساہتیہ اکیڈیمی کے شعبۂ اردو کے مشیر تھے، ان کی شمولیت رسالہ "آجکل" دہلی کی مجلسِ ادارت میں بھی تھی اور وہ مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن بھی تھے۔

حصولِ تعلیم کے دوران بھی ان کی ذہانت قابلِ رشک حد تک بے نظیر تھی جو بعض اوقات ان کے شناساؤں کے لئے استعجاب کا باعث ہوا کرتی تھی اپنے مقصد سے انتہائی پرخلوص لگاؤ نیز اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کے لئے شدید جفاکشی کا جذبہ ان کے فطری اوصاف کا اہم ترین جزو تھا۔ ان کی بالغ نظری اور جوہر شناسی نے بھی ان کی مقبولیت و شہرت کو چار چاند لگائے ان کی یادداشت غضب کی تھی اور انھیں قدیم دکنی شعراء بالخصوص محمد قلی قطب شاہ کے صدہا اشعار ازبر تھے لیکن یہ غالباً اس قدر اہم بات نہیں کیونکہ اشعار کو محفوظ رکھنے میں بہتوں اس صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں مگر ان کی یہ خصوصیت بڑی انوکھی ہے کہ ان کی یادداشت کے خزینے میں نثری مضامین کے کئی کئی پیراگراف محفوظ تھے جنھیں وہ تقریباً اسی روانی کے ساتھ دہرا سکتے تھے جتنی روانی و بیساختگی سے شعر سنائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی کامرانی و سرخروئی کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ ان کو فطرت نے زبردست تنظیمی صلاحیت و دیعت کی تھی جس نے ان کی شخصیت کو زیادہ قیمتی اور کارآمد بنا دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کسی دور میں سیاست سے لگاؤ نہیں رکھا اور اس کے ساتھ ہی "ادارہ ادبیاتِ اردو" کو بھی سیاسی حدود سے دور رکھا جس سے ان کی ہر دل عزیزی کو مزید تقویت ملی۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر زورؔ نے کشمیر کی انتہائی مختصر زندگی کے علاوہ قریباً اپنی پوری زندگی حیدرآباد میں گزاری اور اپنی ذات کو ایک عظیم ادارے کی شکل دیکر جس کی سی قطار سے کام کرتے رہے جس سے ان کی بے جگری کے ساتھ اردو زبان و ادب سے ان کے مجنونانہ عشق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ آرام سے بیٹھنا جانتے ہی نہیں تھے، چنانچہ انہیں حرکت و عمل کا پیامبر اور پیکر دونوں کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے خود کام کیا نیز اپنے گرد کام کرنے والوں کا ایک ایسا حلقہ بنایا جو نہ صرف ان کی تجاویز کو بروئے عمل لانے میں مددگار ثابت ہوا بلکہ خود بھی وفورِ جذبات اور مخلصانہ جذبات لیکر مصروفِ کار رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بعد کام کرنے والوں کی پوری کی پوری جمعیتہ ان کی عملی جانشینی میں کامیاب نہ ہو سکے جس کی ایک بڑی نمایاں اور ٹھوس وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ محض ایک کارکن نہیں تھے بلکہ ان کے پیکر میں ایک جانباز مجاہد کی روح انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ روح جس نے سرسید کو تا حیات پارہ کی مانند متحرک و بے قرار رکھا۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی طالب علمی کے دور سے تصنیف و تالیف کے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا، وہ تکمیلِ تعلیم کے بعد ایک بیکراں سودا، ایک اتھاہ جنون بن کر ان کی زندگی پر چھا گیا، معاشی اعتبار سے وہ زندگی

کے مختلف ادوار میں ایک پروفیسر، ایک پرنسپل اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی صورت میں طالبانِ علم کو فیض پہنچا تے رہے لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تر علمی مصروفیات کے متواز ی مضامین اور کتابیں لکھنے، دکنی ادب پر تحقیق کرنے، مخطوطات حاصل کرکے انھیں ترتیب دینے، دوسروں سے مضامین اور کتابیں لکھوانے، "دارۂ ادبیاتِ اردو" کی بنا ڈالنے اور "سب رس" کو فروغ دیکر ایک ادبی و علمی جریدہ کے سانچے میں ڈھالنے نیز پے در پے مشکلات کا مقابلہ کرکے "ایوانِ اردو" کا سنگِ بنیاد رکھنے اور اس کی تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے جو کارنامے انجام دیئے، ان کے پیشِ نظر یہ تسلیم کرنا اور کہنا پڑتا ہے کہ زورؔ نے اردو کے لئے صرف شاعرانہ الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اپنا لہو دیا۔

ڈاکٹر زورؔ ارضِ دکن کے پرستار تھے لیکن اسے علاقائی عصبیت نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے جو کام کیا وہ انھیں کے ہاتھوں ممکن بھی تھا۔ کیونکہ انھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی لہٰذا شمالی ہند کا کوئی شخص، بالخصوص مخطوطات کے کام کو اتنی آسانی اور خوبی سے انجام نہیں دے سکتا تھا جتنی آسانی اور خوبی سے ڈاکٹر زورؔ نے انجام دیا اور ہو سکتا ہے کہ انھیں اس کا احساس خود بھی نہ رہا ہو۔ اس احساس میں کتنی شگفتگی تھی اس کا اندازہ ان کارناموں سے کیا جاسکتا ہے جن کا تعلق مختلف زبانوں اور مختلف شعبوں سے دکن کی ادبی، علمی اور تاریخی حیثیت کو اجاگر کرنے، بڑھانے نیز اس کی روایتی و تہذیبی عظمت کو جو ماہ و سال کے غبار میں چہرہ پوش تھی، روشنی میں لانے سے ہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ دکن کے تمام قدیم شعرا و ادبا کے فن پاروں کو شہرت دوامی کی روشن ترین فضا میں پہنچا دیں جس کی تکمیل کے لئے وہ تن من دھن سے تا حیات کوشاں رہے۔ مخطوطات کے حصول کے لئے انھوں نے سیکڑوں میل کا سفر کیا نیز سفر میں بے شمار زحمتوں اور سختیوں سے دوچار ہوئے جو زیادہ سے زیادہ روح فرسا اور حوصلہ شکن تھیں لیکن چونکہ ڈاکٹر زورؔ کے دل میں ایک سچے اور کھرے محقق کی لگن کا طوفانی خروش موجزن تھا لہٰذا وہ کبھی حوصلہ نہیں ہارے، وہ اس راہ میں ہر دکھ اور پریشانی کا استقبال کرتے ہوئے بیدر، گلبرگہ، اورنگ آباد، بیجاپور اور حیدرآباد کے صدہا دشوار گذار مقامات تک پہنچے نیز اس کے صلہ میں ان گنت قلمی نوادر حاصل کئے۔ ڈاکٹر زورؔ کو شاعروں اور ادیبوں کی بے نام و نشان قبروں کی جستجو کا بھی سودا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کتنی ہی قبروں کا سراغ لگایا اور ان کو لوحِ مزار سے مزین کیا۔ ڈاکٹر زورؔ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے مخطوطات کے مطالعہ کا زبردست شوق تھا جو انھیں ہر شام کو نہا دھو کر پابندی کے ساتھ حیدرآباد کی کسی نہ کسی لائبریری میں پہنچا دیتا جہاں وہ گھنٹوں مخطوطات کے مطالعہ میں مصروف رہتے اور یہی وجہ تھی کہ پرانے مخطوطات کو وہ اتنی روانی سے پڑھا کرتے تھے جیسے کوئی چھپی ہوئی صاف ستھری کتاب پڑھ رہے ہوں۔

"ایوانِ اردو" ڈاکٹر زورؔ کی نظر میں کیا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون "ڈاکٹر زور مرحوم" میں کیا ہے۔

> "ایک رات یکایک طوفانی بارش شروع ہوگئی، زورؔ صاحب چونک کر اٹھ بیٹھے۔ سب سے پہلے انھیں "ایوانِ اردو" کے دارالمطالعہ کا خیال آیا (اس میں جالی لگی ہوئی ہے اور یہاں میزوں پر ہندو پاکستان کے تمام معیاری رسالے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اکثر زور سے ہوا چلے یا بارش زیادہ ہو تو پانی اندر بھی آجاتا ہے) اس خیال سے زورؔ صاحب بے چین ہوگئے کہ کہیں تمام رسالے بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے کمرہ کا سوئچ آن کیا لیکن روشنی ندارد تھی کیونکہ فیوز جل گیا تھا۔ بہ وقت تمام مکان کے کسی گوشے سے قندیل اٹھا لائے اسے روشن کیا اور بھیگتے ہوئے "ایوانِ اردو" پہنچے۔ چوکیدار کو بیدار کیا اور

دونوں نے مل کر تمام رسالے محفوظ مقام پر پہنچا دیئے اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ اس مشقت میں رات کا کتنا حصہ گزر گیا ہے۔"

یہ سب کچھ غالباً اس لئے تھا کہ انھوں نے "ایوان اردو" کی حسین آغوش میں اپنی زندگی کے اہم کارناموں کی ایک گراں بہا متاع محفوظ کر دی ہے۔ حیدر آباد کی ریاست اپنی تمام روایات کے ساتھ ہم آغوش فنا ہو گئی، قصر سلطانی کے منارے سرنگوں ہو گئے اور ساتھ ہی وہ مراعات بھی ختم ہو گئیں جو کسی دور میں اردو کو حیدر آباد کی حدود میں حاصل تھیں لیکن ڈاکٹر زور کی یہ یادگار جسے "ایوان اردو" کہا جاتا ہے اپنی تمام عظمتوں اور افادیتوں کے ساتھ زندہ و تابندہ ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ ایوان شاہی کے مقابلے میں اردو کا یہ ایوان کتنا پائیدار، مستحکم اور پائندہ ہے۔ ایک کی بنا سیم و زر پر تھی اور دوسرے کی بنیاد میں ایک سرفروش مجاہد کا لہو صرف ہوا تھا جس کے نقوش ہمیشہ لازوال ہوتے ہیں۔ نظام حیدر آباد کی شوکت و جلالت ان کی حیات ہی میں ذہنوں سے محو ہو گئی لیکن ڈاکٹر زور مر کر بھی اپنے عظیم کارناموں کے جلو میں زندہ ہیں۔

ڈاکٹر زور ایک محقق کی حیثیت سے بڑی انفرادی وقعت و عظمت رکھتے ہیں خصوصاً اس لئے کہ انھوں نے کسی کمرہ میں بیٹھ کر ادب تحقیق نہیں دی بلکہ اس کے لئے در بدر کی خاک چھانی۔ انھیں ہر شئے سے زیادہ وہ مقصد محبوب تھا جس کے نتیجے ان کی شریانوں میں ابتدا ہی سے رقصاں و جولاں تھے اور اس مقصد کی تکمیل گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ڈاکٹر زور بلاشبہ اپنے دور کے کوہکن تھے اور ان کی شیریں اردو تھی۔ وہ تا عمر مشکلات و موانع کی خسروی کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور عمل پیہم کے تیشے سے بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر لانے میں مصروف رہے نیز یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اپنے تیشے کا ہدف نہیں بننا پڑا بلکہ وہ جوئے شیر لانے میں کامیاب و سرخرو رہے۔ ان کی علمی زندگی جسے بظاہر محض اردو کی خدمت تک محدود کہا جائے گا۔ اپنے دامن میں بیکراں وسعت رکھتی تھی، چنانچہ حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے بیک وقت اتنے تمام کاموں کو جن کا سلسلہ بحد طویل، مشقت طلب اور صبر آزما تھا اپنی تنہا ذات میں کیسے سمیٹ رکھا تھا؟

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ڈاکٹر زور نے کتنے شاعروں اور ادیبوں کو گمنامی و ذہول کی تاریک وادیوں سے ابھار کر ادب کی روشن و وسیع اور گنجان دنیا میں پہنچا دیا جہاں ان شاعروں اور ادیبوں نے خود بھی عزت و ناموری کی دولت حاصل کی اور شعر و ادب کو بھی اپنے قلم سے مالا مال کیا۔ گوشہ نشینی کی زندگی بعض معنوں میں اس خروش عمل سے محروم ہوتی ہے جو شہرت کی زندگی کا خاصہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی اہل فن کی فطری و ذاتی صلاحیتیں اپنی جگہ پر بڑی مضبوط اکائی کی شکل رکھتی ہیں۔ لیکن لمس عزلت کی محدودیت انھیں جلا پانے، بڑھنے اور پھیلنے کے وہ مواقع نہیں دے پاتی جو ارتقائی عمل کے لئے ناگزیر ہیں اور جن کی اہمیت سے انحراف ممکن نہیں۔ چنانچہ جن ارباب علم و فن کو ڈاکٹر زور کے خلصانہ تجسس نے دنیائے ادب سے روشناس کرایا، ان کی علمی، فکری اور فنی صلاحیتوں کو دیگر امور کے علاوہ جذبہ مسابقت نے یقیناً زیادہ بیدار، فعال اور کارآمد بنایا ہوگا جو اپنے مقاصد و نتائج کے تحت بڑی قیمتی، وقیع اور عظیم چیز ہے۔ قیام کشمیر کے دوران بھی جو انتہائی مختصر تھا ڈاکٹر زور کے ذوق ادب کا یہ پہلو بیدار و متحرک رہا اور کشمیر جیسے دور افتادہ علاقہ میں جو ہندوستان کی اردو دنیا سے بڑی مدت سے منقطع ہے وہ برقی لہریں پیدا ہو گئیں جنھوں نے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں نئی تڑپ بھر دی اور وہ اس راہ پر چل پڑے جس سے غالباً زور کی رہنمائی کے بغیر محروم رہتے۔

ڈاکٹر زور کی تصنیفات و تالیفات کی طویل تر فہرست میں درج ذیل کتابیں کسی نہ کسی نہج سے نمایاں اہمیت و خصوصیت کی حامل ہیں جن سے زبان و ادب کے بعض گوشوں کو توانائی و تابناکی کے نئے کوندے ملے ہیں،

اردو شہ پارے، اردو کے اسالیب بیان، تنقیدی مقالات، ہندوستانی اساطیر

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، میر محمد مومن، سیر گولکنڈہ، گولکنڈہ کے ہیرے، مالم تقدیر ہر گذشت غالب، روح غالب، گارساں دتاسی، مکتوبات شاد عظیم آبادی، شاد و اقبال، داستان ادب حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، تذکرۂ اردو مخطوطات، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، گلزار ابراہیم، کیفیت سخن، فیض سخن، فن انشاء پردازی۔ وغیرہم

ان میں سے چند کتابوں کے موضوع و مواد کا اجمالی تذکرہ پیش خدمت ہے جس سے ڈاکٹر زور کی خدمات کے علمی، ادبی نیز تحقیقی مرتبہ کا تعین بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

اردو شہ پارے: اس میں جدید ترین تحقیق کی رو سے نثر و نظم کے ان کارناموں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے دور کا سرمایہ ہیں۔ علاوہ ازیں متذکرہ ادوار کے شعراء و ادباء کے شہ پاروں کا اہم انتخاب بھی شامل کتاب ہے۔ جو اس کی اہمیت اور دلچسپی میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر زور نے کتنی عرق ریزی اور کاوش کی ہے، اس کے اظہار کے لئے محض اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس میں نثر و نظم کے جو اقتباسات اور انتخابات دیئے گئے ہیں ان کے حصول کے لئے پاکستان اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں محفوظ قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے، اس کی ضخامت ۲۸۰ صفحات ہے۔

تنقیدی مقالات: اس میں اردو کے مستند نیز قابل قدر ادیبوں کے فن پاروں کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے جو فکر و نظر کی بڑی گہرائیوں اور گیرائیوں کا حامل ہے۔ یہ کتاب ادب کے بعض ایسے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کتاب کے (جو ۲۹۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے) اب تک تین ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

ہندوستانی لسانیات: اردو زبان میں لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب ہے اور ساتھ ہی بڑی جامعیت بھی رکھتی ہے۔ کتاب کے حصۂ اول میں علم لسان کے مقاصد، تاریخ و زبان کی ماہیت نیز تشکیلی و ارتقائی عمل کے بارے اصولی بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی مختلف زبانوں کی تقسیم، ان کے مختلف خاندان اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کی زبانوں کو زیر بحث لایا گیا ہے جس سے ڈاکٹر زور کی نکتہ رسی، بالغ نظری نیز ان کے علمی تفوق کا پتہ چلتا ہے۔ حصۂ دوم میں اردو کے آغاز و ارتقاء نیز ادبی بولیوں اور ان کی ہمہ گیر خصوصیتوں پر جدید ترین تحقیق کے تحت روشنی ڈالتے ہوئے اردو ہندی تنازعہ نیز اردو کے نئے رجحانات و میلانات پر بحث کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا

گیا ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کن اُمور کی ضرورت ہے۔ مزید برآں سائی تجربات کی توضیح دلچسپ اور سلیس پیرائے میں کی گئی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۱۶۰ صفحات ہے۔

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ : یہ ڈاکٹر زور کا بڑا عظیم تاریخی نیز امول کارنامہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو اردو دنیا سے روشناس کرایا اور ان کے کلیات کو جو مخطوطہ کی شکل میں تھا ترتیب و تدوین کی منزل تک لایا۔ کلیات کے ابتدائی ۵۰ صفحات میں محمد قلی قطب شاہ کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ۱۰۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور ایک مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے بھی اتنا ہی بلند مرتبہ رکھتے تھے جتنا ایک ادیب نقاد اور محقق کی حیثیت سے۔

میر محمد مومن : اس کتاب میں جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے قطب شاہی عہد کے باوقار وزیر اعظم میر محمد مومن کے حالاتِ زندگی نیز علمی اور تعمیری کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے صفحات ڈاکٹر زور کے فن انشا پردازی کا بطور خاص پتہ دیتے ہیں۔ اب تک اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

سرگذشت غالب : اس میں مرزا غالب کی زندگی، ان کے ادبی و علمی کارنامے نیز ان کے اعزہ و احباب کا تذکرہ ہے جس سے غالب کی شخصی اور شاعرانہ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں غالب کا خاندانی شجرہ بھی شامل ہے جو اس کی اہمیت میں یک گونہ اضافہ کر دیتا ہے۔

روحِ غالب : یہ کتاب مرزا غالب کے خطوط کے ان اقتباسات پر مشتمل ہے جو ادبی اور تاریخی حیثیت سے کسی نہ کسی اہمیت یا دلچسپی کے حامل ہیں۔ ابتداء میں ڈاکٹر زور کا مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جو اس اعتبار سے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے کہ اس میں غالب کی اردو و فارسی تصنیفات، ان کی نوعیت اور زمانۂ تصنیف و اشاعت سے متعلق معلومات و تفصیلات یکجا کر دی گئی ہیں۔

گارساں دتاسی : گارساں دتاسی فرانس کا ایک نامور مستشرق گذرا ہے جسے اردو کا علیم محسن قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اس کے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ ان امور و حقائق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق مذکورہ کی تائید و تبلیغ سے متعلق اس کی پُر زور جد و جہد سے ہے۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی: یہ اردو کے قادر الکلام شاعر شاد عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ مکتوبات پر مشتمل ہے جو اس لحاظ سے بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے سرسید اور حالی کی تحریکات کے مخصوص گوشوں کا سراغ ملتا ہے جنھیں تاریخ کے صفحات زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر دو مستقلہ کے ادبی کارنامے نیز اس موضوع کے خطوط بڑے کار آمد اور معلومات افزا ثابت ہوتے ہیں۔

شاد و اقبال: یہ ان مکتوبات پر مشتمل ہے جو علامہ اقبال اور مہاراجہ سرکشن پرشاد نے تقریباً تیس سال کے دوران ایک دوسرے کو تحریر کئے اور جو دیگر امور سے قطع نظر اس اعتبار سے انتہائی اہم ہیں کہ ان سے علامہ اقبال اور مہاراجہ شاد کی شخصی زندگی کے ان پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوئی ہے جو کسی اور ذریعہ سے روشنی میں نہیں آ سکتے تھے۔ کتاب میں ڈاکٹر زور کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔

داستان ادب حیدرآباد اور فرخندہ بنیاد: ان دونوں کتابوں کا تعلق حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں سے ہے جن کا ذکر ڈاکٹر زور نے مبسوط طور پر کیا ہے۔

تذکرۂ مخطوطات اردو: ڈاکٹر زور نے "ادارۂ ادبیات اردو" کو اردو فارسی اور عربی کے تقریباً پانچ ہزار مخطوطات جمع کئے جو ان کی ذاتی سعی و تجسس کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے ان بکھرے ہوئے مخطوطات کو نہ صرف مختلف مقامات سے حاصل کیا جس کا ذکر آ چکا ہے بلکہ انھیں سنہ وار ترتیب بھی دیا۔

اس ہفت خواں کے پیچ و خم سے گذرنے کے بعد ڈاکٹر زور کی مہم پسند طبیعت نے انھیں مخطوطات کے تذکرے رقم کرنے پر ابھارا جن میں مخطوطات کی انتہائی مفصل تشریح و توجیہہ پیش کی گئی ہے۔ مخطوطات کی اہمیت کا بڑا پھیلاؤ رکھتا ہے لہٰذا انھوں نے اس تذکرہ کی پہلی جلد جو ۲۷۵ مخطوطات کے تذکرہ پر مشتمل ہے ۱۹۴۵ء میں شائع کی۔ دوسری جلد جس میں ۵۰۰ مخطوطات کا ذکر ہے اس کے چھ سال بعد ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آئی، تیسری جلد جو دو سو قلمی کتابوں کے تذکرہ کی حامل ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی، چوتھی جلد صرف ایک سال بعد ۱۹۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ کر شائع ہو گئی جس میں ۲۰۰ مخطوطات کا تذکرہ ہے۔ ۱۹۵۹ء میں پانچویں جلد کی اشاعت عمل میں آ گئی جو ۲۵۰ کمیاب اور نادر مخطوطات کے تذکرہ کی حامل ہے اور یہ کہتے ہوئے جی لرزتا ہے کہ وہ چھٹی جلد کی ترتیب و تکمیل میں مصروف تھے کہ ان کا قلم ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت ذہنی، فکری نیز عملی اعتبار سے بیک وقت متنوع صلاحیتوں سے معمور ہونے کے دوش بدوش بڑی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کی مالک تھی جس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب یقیناً ہیں۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ان کی دوسری تصنیفات و تالیفات سے قطع نظر اگر حیدرآباد اور بالخصوص پورے ہندوستان کے مخطوطات ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیئے جائیں تو اس میں حیدرآباد سبقت لے جائے گا جس کا سہرا ڈاکٹر زور کی ذات واحد کے سر ہے۔ ان کی سیمابی فطرت کسی مخصوص منزل پر رکنا اور توقف کرنا جانتی ہی نہیں تھی، وہ ہمیشہ نئے دور و جگر کے متلاشی رہتے

تھے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کے خزینہ میں چند مزید اضافہ اس شکل میں کئے کہ ہماری زبان میں جتنے اسلحہ جات کے نام پائے جاتے ہیں ان کی فہرست مرتب کی نیز اس کے لئے ایک میوزیم کا قیام عمل میں لایا ۔ اسی طرح اردو میں سواریوں کے جس قدر نام ملتے ہیں، انھیں یکجا کیا، اتنا ہی نہیں بلکہ ان تمام سواریوں کی تصاویر مہیا کرکے ایک مرقع تیار کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں مذہب سے تجاہل و تغافل کا زہر بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتا جا رہا ہے جس کے ردِ عمل نے ان میں اتنی بے حسی پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے ہیئت بہاتر کہ اور اثاثے سے بھی بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی نگاہ اس پہلو پر بھی گئی اور انھوں نے دور اندیشی کے تحت بزرگان دین کے متعدد تبرکوں کو گمنامی سے نکال کر ایک میوزیم کی محفوظ آغوش میں پہنچا دیا۔ انھوں نے ارض دکن کی سربلندی و سرخروئی کے لئے بہت کچھ کرنے کے بعد ایک نمایاں کارنامہ یہ انجام دیا کہ "ادارۂ ادبیات اردو" میں شعبۂ تاریخ کی بنا ڈالی اور بالالتزام قطب شاہی یادگاروں کو امتداد زمانہ سے محفوظ رکھنے کا کام پوری توجہ سے انجام دیا، اس کے ساتھ ہی انھوں نے قطب شاہی تاریخوں کی طباعت کا بھی پروگرام بنایا تاکہ جس حد تک اور جس طرح ممکن ہو دکن کی عظیم روایات، حال و آئندہ کو ماضی کا آئینہ دکھاتی رہیں۔ ان کے اس قسم کے کاموں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ انھوں نے جا بجا بکھرے ہوئے کتبوں کے چربے لئے قدیم سکے جمع کئے نیز مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے قطعات اور طغرے حاصل کئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کام ظاہری اعتبار سے معمولی نوعیت رکھتے ہوں لیکن تاریخ کے نزدیک بڑے گراں مایہ اور قابل قدر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے "آزاد اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ" کا قیام عمل میں لاکر ایک اور بڑا کام کیا، جہاں نہایت تندہی، مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ماہرین علم و فن کی ایک جمعیۃ تحقیقی کاموں میں منہمک ہے۔ اس کے لئے مائیکرو فلم کیمرہ اور پروجیکٹر خریدا جا چکا ہے تاکہ ہر کام جدید ترین معیار اور انداز کے مطابق انجام پائے۔ نیز متعلقہ افراد زیادہ خوش اسلوبی، توجہ اور آسانی کے ساتھ داد تحقیق دے سکیں۔

ڈاکٹر زور ایک انسان کی حیثیت سے بھی کم اونچا مرتبہ نہ رکھتے تھے لیکن وہ بہرحال انسان تھے جس سے سہو و خطا کا ارتکاب ناممکن نہیں تاہم وہ کبھی کسی کے لئے عمداً گزند یا نقصان پہنچانے کا باعث نہیں ہوئے جو بڑی خوبی کی بات ہے۔ احباب و اعزہ ہوں یا کوئی اور ڈاکٹر زور کی ذات سب کے لئے یکساں نفع رساں رہی، اس میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا تھا جس سے ان کی وسیع النظری اور فراخدلی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک اصول پسند، خوش خلق اور باحمیت آدمی تھے بلکہ مشرقی وضع و تہذیب کے ان قیمتی نقوش کے بھی امانت دار تھے جن کی تابناکی روز بروز مدھم پڑتی جا رہی ہے نیز ان کا دل عالی ظرفی، شرافت اور مروت کا گنجینہ تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ ایک صوفی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لہٰذا ذہنی و علمی لحاظ سے ان کا ناہی اختلافات سے الگ اور بالاتر ہونا کسی طرح حیرت انگیز نہیں کیونکہ یہ خصوصیات ان کا ترکہ نہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قومی یکجہتی نیز جذباتی ہم آہنگی کے نظریات و خیالات ان میں طبعاً موجود تھے اور چونکہ ڈاکٹر زور کی دنیا محض تخیل و تصور تک محدود نہیں تھی لہٰذا اپنے کردار کے اس پہلو کا ثبوت بھی انھوں نے عملاً پیش کیا۔ ۱۹۴۷ء کے جشن کی شکل میں پیش کیا نیز اس کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے، ملنے جلنے اور باہمی اخوت و محبت کے جذبات کے پھلنے پھولنے کی داغ بیل ڈالی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کی فضاؤں میں سانس لینے والے تمام انسان امتیاز و افتراق کی سطح سے بلند ہو کر اس طرز حیات کو اپنائیں جو نہ صرف انسانی بھائی چارگی کا آئینہ دار و علمبردار ہو بلکہ اس سے ملک و قوم کی خوشی و خوشحالی کی بنا مستحکم تر ہو نیز خوش آئند مستقبل کی جڑیں زیادہ گہری، شاداب اور مضبوط ہوں۔ وہ ہر نوع کی مذہبی تقریبات میں بخوشی شرکت کرتے اور چونکہ ان کی فطری وجاہت، متانت بڑی کشش انگیز تھی جس میں ان کا ادیبانہ و عالمانہ وقار بھی شامل تھا۔ لہٰذا ان طبقوں اور حلقوں کے افراد بھی جو عموماً خود پسندی و بندۂ برتری کا شکار ہوتے ہیں، ان سے مساویانہ طور پر ملنے میں فخر و مسرت محسوس کرتے نیز ادب و احترام کے لوازم کو ملحوظ نظر رکھتے۔

چنانچہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ موجودہ سیاسی حالات میں جبکہ مختلف مذہبی، سماجی اور ثقافتی دھاروں کو باہم گہرے پیوستہ دیکھا کرنے کی تحریک تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، ڈاکٹر زور کی ہمہ گیر اور ہر دل عزیز شخصیت ان کی کشادہ دلی کے جلو میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی نیز ان کی ذات سے اس عظیم مقصد کو تقویت کے ساتھ وسعت و گیرائی بھی ملتی لیکن گلچین اجل کے حوصلہ شکن کو کیا کہئے:

پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر کی ویرانی ہوئی

ڈاکٹر زور نے مخطوطات کی فراہمی کے علاوہ ایک ادیب، ایک محقق، ایک نقاد نیز ایک مورخ و سوانح نگار کے روپ میں اردو زبان و ادب کو جو گنج گراں مایہ عطا کیا ہے اس کی قیمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً مولوی عبدالحق کے پاکستان جانے کے بعد ڈاکٹر زور کا وجود سایۂ رحمت سے کم نہ تھا جس سے ہندوستان کی اردو دنیا کو بڑی تقویت ملی اور ان کی رہبری میں اردو نے ارتقا کے کئی مرحلے طے کئے۔ ہم ہر عظیم شخصیت کی مفارقت پر رسماً و اضطراراً یہ کہہ دینے کے عادی ہیں کہ ہمارے درمیان سے اٹھنے والے شاعر یا ادیب نے جو خلا پیدا کیا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا اور اس کی موت سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں لیکن ڈاکٹر زور کی جدائی پر یہ فقرے ایک جاں گداز اور جگر خراش حقیقت بن کر دلوں میں اتر رہے ہیں اور ہم اس موقع پر محض اس خیال سے تسلی پا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے ابدی کارناموں کی جگمگاتی مشعل آئندہ کئی نسلوں کو راہ دکھائے گی اور منزل کا سراغ دیتی رہے گی۔

اردو زبان کے مشہور خدمت گذار اور نامور صاحب قلم ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری کی وفات دنیائے اردو کا بڑا سانحہ ہے انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی، وہ دکن کے مولوی عبدالحق اور دکنیات کے خصوصیت کے ساتھ بڑے ماہر تھے۔ قدیم دکنی اردو کی بہت سی نادر کتابیں انھوں نے شائع کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد" ہے۔ اس ادارے نے اردو زبان و ادب کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں، اس کی مثال اردو کے اس کی عمر کے اداروں میں نہیں مل سکتی۔ اس کی حیثیت دکن میں وہی ہے جو شمال ہند میں انجمن ترقی اردو ہند کی ہے۔ اور آج آندھرا پردیش میں اردو کا وجود اور اس کا وقار اسی ادارے کے دم سے قائم ہے۔ ڈاکٹر زور کی مستقل تصانیف اور ان کی مرتب اور شائع کردہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی۔ وہ حیدرآباد کے ایک خانوادۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ قادری لکھتے تھے، اور اس سلسلے کو انھوں نے قائم بھی رکھا تھا۔

چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے ان کی خاندانی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں مگر ان کی علمی و ادبی شہرت نے ان کی اس حیثیت کو اتنا چھپا دیا تھا کہ اس کا علم بھی بہتوں کو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

"معارف"

اعظم گڈھ۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

دکنی اردو ادب کا ایک محقق مورخ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو میں نہ جانے کے برابر جانتا ہوں۔ ان ملاقاتوں میں اپریل ۱۹۵۴ء میں ایک جلسۂ عام میں بغل گیر ہوئے۔ ایک شب کو ایک تماشا گاہ میں مدعو ہوا اور ایک پوسٹ کارڈ انھوں نے کسی استفسار کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا۔

اک نگاہ ناز بس ہے دلبری کے واسطے

وہ قادری ہیں۔ فقیر ربّی ہے۔ صوفی کو صوفی کی پہچان فطرتاً میسر ہے۔

اگر میں کسی ادبی ادارے میں منسلک ہوتا تو ڈاکٹر موصوف کو محقق اعظم کا خطاب پیش کرتا اس لئے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں جمع ہیں جو تحقیق۔ تدلیل۔ تنقید کے کار اہم کے لئے ناگزیر ہیں۔ جیسے (۱) کھوج پڑتال کا فطری جذبہ (۲) مواد کی ڈھونڈ بھال کی فطری اہلیت (۳) وسیع و عمیق مطالعہ اور اساتذہ کی صحبت (۴) موضوع سے ہمدردی و موافقت (۵) فکر غائر کی عادت (۶) شک اور ایمان سے سجا سلیقہ (۷) تنوع اور تعمق کی لگن۔ (۸) تحلیل و تنسیق کا گر (۹) بے قصبی بے غلوئی (۱۰) حوصلۂ صبر، خود اعتمادی، انکسار (۱۱) ٹھیک بیٹھتی جچی تلی نپی مختصریات کہنے کی کاوش اور تاکید و تکرار سے حذر (۱۲) حقیقت کا عشق اور داد گستری کا جنون (۱۳) مقابلہ اور موازنہ اور تکمیل جامعیت کا شوق (۱۴) فکری اور جذباتی توازن اور ماضی حال مستقبل پر بیک وقت نظر (۱۵) سلیس طرز تحریر (۱۶) تعمیری تصور اور تخلیقی و تجدیدی عمل (۱۷) اپنی زبان پر قدرت اور غیر زبانوں سے آشنائی (۱۸) روحانی فیوض و برکات جو کوشت پوست حرف صرف مکان و زماں حسن و قبح سے بہت پرے کی خبر رکھتے ہیں۔

آپ ثبوت چاہتے ہیں شہادت لیجئے۔ مختصر ہو سہی۔ کیا کروں تقسیم نے ذاتی کتب خانہ غارت کر دیا۔ زور صاحب سے ان کی جملہ مطبوعات مانگتے شرم آتی ہے۔ اس پر ستم ہائے پیری کا اضافہ۔ ٹالتا چلا آرہا ہوں۔ مگر کب تک قبل اسکے کہ زندگی سے اجازت چاہوں ذکر مبتاں ضروری سمجھتا ہوں ؎

پیری میں بھی ہے لب پہ مرے ذکر بتوں کا احیائے جوانی کا نہ شاید یہی باعث (دیوانہ)

کھوج پڑتال کا فطری جذبہ:- زیادہ تو جانتا نہیں ہاں زور کی داستان ادب حیدر آباد" سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کے پرنانا تھے محمد محسن محسن مشہور شاعر اور ادیب قصبہ بودھن ضلع نظام آباد کے رہنے والے نواب فخر الدین خاں شمس الامرا کے متوسل محسن نے نواب کی فرمائش پر ۱۲۶۹ھ میں "گلدستہ محسنی" فارسی نثر میں لکھی۔ اس کے کئی باب ہیں، ایک باب میں مصطفےٰ آباد بودھن کی تاریخ ہے اور باقی میں شہر حیدر آباد سے متعلق بہت سی تاریخی اور سماجی معلومات درج ہیں۔ اور یہ نہ بھولئے کہ کتاب کا موضوع ہے انشا و اخلاق، یقیناً حسن اخلاق، انشا پردازی میں مہارت، تاریخ دانی اور

تاریخ جوئی۔ ماحول پروری اور ماحول شناسی زور صاحب کو ورثہ میں ملیں۔ یعنی ان کی فطرت کا جزو ہیں۔ زور صاحب کے دادا تھے سید شاہ عنایت اللہ حسینی جن کے سوانح حیات امیر حمزہ قندھاری نے قلمبند کئے

مواد کی ڈھونڈھ بھال کی فطری اہلیت :- برٹش میوزیم اور ادارۂ ادبیات اردو، جامعہ حیدرآباد اور ذاتی کتبخانہ میں کتنی فارسی اردو کتابیں ہیں جن کی دریافت اور جن کا مطالعہ زور صاحب کا مرہون منت ہے، یہ زور صاحب خود ہی بتا سکتے ہیں۔ میں تو شہ پارے سے داستان ادب تک کی تحریروں کو دیکھ کر قائل ہو چکا ہوں کہ زور صاحب سراغ رساں ہیں نہایت کامیاب۔ فقیر دیسی ہندی زبانوں کے سینہ محققوں کی بیشتر تحریروں سے خوب واقف ہے۔ نقل کی نقل ان کا شیوہ ہے۔ پھر وہی مصنف اور وہی عبارتیں کام میں لاتے ہیں جو اُن کے مفید مطلب ہوں اور اُن کے نظریات کی تائید کرتی ہوں۔ اصل تک پہنچنے کی نہ ضرورت نہ ہمت۔ اختلاف رکھنے والوں کو نظر انداز کرتے ہیں مغربیوں کے چبائے ہوئے نوالوں پر پلے ہوئے۔ دیس کے اصلی محققوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور دیس کے محرروں میں امتیاز یوں کرتے ہیں کہ یہ موافق ہے یہ مناقق۔ حالانکہ حالیکہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ ہر حوالے بہم کئے جائیں اور کسی مطبوع یا مخطوط کا حوالہ اسے خود دیکھے بغیر نہ دیا جائے۔ ڈھونڈھ بھال کے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اکثر ایک فطری سوچ سراغ دیتی ہے کہ فلاں مصنف و کتاب میں ضرور مطلوبہ معلومات ملیں گی فلاں گوشے میں مواد ضرور میرا منتظر ہوگا۔ فلاں تحریک یا مضمون یا شعبہ کا میرے موضوع سے تعلق ضرور ہونا چاہئے۔ یہی سراغ رسانی کی فطری اہلیت کبھی کبھی ایک فقرہ۔ مصرع۔ لفظ۔ صرفی۔ نحوی استعمال سے وقیع نتائج اخذ کر سکتی ہے۔ یوں کہئے کہ محقق پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم و تربیت سے بنائے نہیں جا سکتے۔ معمولی چون وچرا کی بات نہیں۔ بات کی تہوں تک جانے، بیخ و اساس تک پہنچنے۔ تعمیر و ترقی کے اسباب۔ اطوار۔ سامانوں کی تصویریں کھینچنے کی بات ہو رہی ہے۔ تحقیق کا کاروبار ایک شغف ایک مستی، ایک لگاتار تجسس کی کیفیت چاہتا ہے۔

وسیع و عمیق مطالعہ اور کاملین کی صحبت :- علوم و فنون اُن گنت ہیں۔ تاریخ ادبیات حیدرآباد میں سب کا احاطہ کیا ہے جس سے مطالعہ کی وسعت اور عمق ظاہر ہے۔ کاملین کی صحبت یورپ میں بھی رہی اور خود حیدرآباد میں بھی۔ عربی، فارسی، دکھنی، دہلوی، انگریزی ادب کیا کم ہے۔ کم مطالعہ اور بے صحبت لوگ جب جائزے لینے بیٹھتے ہیں تو زعم و تعصب کا شکار بنے حذف و غلو کے گناہ بے دریغ کئے جاتے ہیں۔ ان سے جامع و مانع کیفیتوں کی آس کہاں۔ پچھڑے پن اور ادھورے پن کے تاسف انگیز اور غم افروز نمونے ہوتی ہیں ان کی کچی اور ناقص عبارتیں۔

موضوع سے ہمدردی اور موافقت :- اللہ، وہ لوگ بھی ہیں جنھیں خدا اور الہام و القا سے انکار ہے مگر صوفیائے کرام اور رموز تصوف پر لکھنے کا شوق چرایا ہے۔ ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے۔ نثر میں موسیقیت کی رتی سے بے خبر مگر شعر منظوم و شعر منثور کے نقاد بنے بیٹھے ہیں۔ سلیقے سے بات نہیں کر پاتے مگر افسانہ طرازوں کے حال پر من مانی چٹیاں کرنے کی دھن ہے۔ ادب کے لغوی اور ارتقائی معنوں سے ناآشنا، ادب کے تولچی ادب سے تادیب و تہذیب کا کام لینے والوں کی بلندیاں ناپ رہے ہیں۔ سید محی الدین کے

دل میں جو درد ہے اسلام اور انسانیت کے لئے اور رہ رسم و تحریر سے جو وفاق وہ جون کی طرح پھٹا پڑتا ہے۔ حیدرآباد سے حیدرآبادی بھی مکمل واقفیت رکھتا ہے اور تاریخی دریا فتوں سے گزری اقدار سے ایک وحدت پرست نظام پرور تاریخ داں ہی سید صاحب ایسا۔ میر ناصر علی خاں۔ پیارے لال آشوب۔ ذکاء اللہ خاں۔ عبدالرؤف عشرت۔ نذیر احمد رتن ناتھ سرشار۔ ناصر نذیر فراق۔ یہ لوگ دلی اور لکھنؤ کے چپہ پر جان دیتے تھے۔ ان کے دل میں وہاں کی زبان وہاں کی خوراک، پوشاک، وہاں کے رسم و رواج وہاں کی خامیاں اور کمزوریاں علتیں اور عادتیں۔ سب مطبوع اور منظور تھیں۔ وہ ان شہروں اور ان کے ساکنین کی مکمل تصویریں اپنے دماغوں میں محفوظ لئے پھرتے تھے اور چاہتے تھے کہ الفاظ میں نہیں ہمیشہ کے لئے مضمون محفوظ کرتے جائیں۔ زور صاحب میں حیدرآباد کے لئے وہی درد ہے اور حیدرآباد کے لئے ہی نہیں کہ فقط ادیب انھیں عزیز ہیں یا صرف روسا اور حکام سے تعلق اور غرض ہے، وہ حیدرآباد کے عوام سے حیدرآباد کی گلی کوچوں سے حیدرآباد کی عمارات اور سڑکوں سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ شہر حیدرآباد یا زبان دکنی اشارے اور نمونے ہیں۔ جس چیز پر، جس شخص پر، جس تحریک پر جس انداز اور طرز پر، جس نظریہ پر سیر حاصل تبصرہ لکھا ہے درد و وفاق سے لکھا ہے اور موضوعات کے تنوع کا یہ حال ہے کہ ادھر حیدرآباد کی عمارت اور تعمیر کنندگان کا تذکرہ ہے تو ادھر سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب کا چرچا۔ کبھی لسانیات پر بحث، کبھی صوتیات پر۔ ابھی محمد قلی قطب شاہ کی حیات پر لکھے ہیں۔ ابھی غالب کی روح سے ہم پرواز ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ کسی مضمون کے ساتھ جبھی انصاف کیا جا سکتا ہے کہ محاورہ کی زبان میں ڈوب کر لکھا جائے۔ زور اس کو خوب سمجھتے اور برتتے ہیں۔

۵ سے ۸ تک فکر غائر کی عادت۔ شک اور ایمان سے سوا یا سلیقے۔ تنوع اور تعمق کی لگن تحلیل و تنسیق کا گر۔ ان خصائص کے حاملی چند فقرے چن چن کر پیش کرتا ہوں۔ رمز شناس قارئین کے لئے یہی کافی ہیں۔ آخر نہ آپ عدالت ہیں نہ میں وکیل۔ جو بات اچھی لگی اُسے دُہرا رہا ہوں۔ آپ غالباً پہلے ہی سے دیکھ اور جانچ چکے ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ فقرے ایک خشک سی داستان علوم و فنون میں نمودار ہوئے ہیں جیسے اندھیری رات میں روشن رُو اور روشن ضمیر پریاں۔ ادب کا احاطہ زور صاحب کے لئے محدود نہیں۔ اس کی آغوش میں تمام علوم و فنون کے بارے میں لکھی ادبی محاسن کی حاملی تحریریں لے لی گئی ہیں۔ خیر سنیئے۔

"سینکڑوں ادیب باہر سے آکر اس میں کچھ اس طرح رس بس گئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔"

"جدید سیاسی نظریوں نے ہر جگہ ہر چیز کی قدر و قیمت کو متاثر کیا ہے جو پہلو پہلے تاریکی میں تھے اب اجاگر ہوتے جا رہے ہیں اور جو روشن تھے ان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا ہے۔"

"اسی طرح آج کے شاعروں اور ادیبوں کی اردو بھی کل کو متروک ہو سکتی ہے اور زمانے کے حالات اور اہل ملک کی ضروریات کے تحت ہر زندہ زبان کی طرح اس میں بھی ردو بدل ہوگا۔ اگر کوئی اس کے شہر بدر ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں تو اس سے ہر طبقہ و ملت کے صاحب بصیرت حیدرآبادیوں کو بڑا تعجب ہوگا۔"

"یہ ظاہر ہے کہ ہر انقلاب کے پیچھے خواہ وہ کتنا ہی تعمیری کیوں نہ ہو تخریبی قوتوں کو اُبھرنے اور سر سبز ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن جونہی غیر عبوری دور ختم ہوتا ہے۔ سیاسی بصیرت اور بھلے بُرے کی تمیز پیدا ہونے لگتی ہے۔"

"اردو والوں کی ہراسانی بجا ہے، مگر محض ہراسانی اور پریشانی سے نقصان ہوتا ہے۔ ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی زبان کی فطرت میں ایسی لچک ہے کہ وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔"

"حیدرآباد کی ایک ایک اینٹ اردو کے خمیر سے گھڑی ہوئی ہے۔"

"راقم الحروف کی ساری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، اور بطور خاص حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور کارناموں کی تلاش و تحقیق میں بڑی جستجو کی ہے۔"

"عہد رفتہ کے ارباب کمال کے نام کو اس طرح ضائع جانا: صرف کمالی کی ناقدری ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے کمال کے دروازے بند کر دینے کے مترادف ہوگا۔"

"بعض دفعہ نقش قدم ہی رہبری اور رہنمائی کا کام کر جاتے ہیں۔"

"شاعروں اور ادیبوں کے حالات کی ترتیب اور ان کے رشحات قلم کی نسبت رائے قائم کرنے میں حتی الامکان تحقیق و تلاش اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔"

"ابن نشاطی ایک ایسا صاحب کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کو درباری اور سرکاری قدردانی سے بے نیاز ہو کر شعر و سخن میں مصروف رہنے کا راستہ سجھایا۔"

"چونکہ اورنگ زیب اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لئے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غمزدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکال لی۔"

"کسی چیز کے بگڑنے اور اُجڑنے میں جتنا کم وقت صرف ہوتا ہے اس کے بننے اور سنورنے میں اتنی ہی زیادہ مدت درکار ہوتی ہے۔"

"اورنگ آباد اُس وقت ہر طرح سے عروج کمال کو پہنچ چکا تھا لیکن زمانے نے اس کے زوال کے بھی اسباب (اُسی وقت) پیدا کر دئے۔"

"صرف اورنگ آباد ایک ایسا شہر تھا جہاں مغل ارباب اقتدار کے طویل قیام اور مغلیہ فوجوں کا مرکز ہونے کے باعث زبان میں تھوڑا بہت فرق ہوا تھا۔"

"ضرورت تھی کہ کوئی شخص اس تیار ماحول سے فائدہ اُٹھاتا۔"

"عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کی وجہ سے ممدوحوں کی یاد محفوظ ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے۔"

"شاہ تجلی کے یہ دونوں مجموعے نہ صرف اس عہد کے شعراء کے تذکرے ہیں بلکہ معاشرت اور حالات و واقعات و سیاسیات کے انسائکلو پیڈیا ہیں۔"

"وجہی اور نائکی دونوں داغ ہی کی مخالفت اور مقابلے کی کوشش میں خود اعلیٰ پایہ کے شاعر اور اساتذۂ سخن بن گئے۔"

بے تعصبی اور بے غلوئی:- صوفیہ کے سلسلے سے متعلق نیک بخت کبھی تعصب کا مریض نہیں ہو سکتا، اور غلو سے ہر لحظہ دامن بچاتا ہے۔ زور صاحب نے سینکڑوں ادیبوں کے بارے میں لکھا ہے مگر کیا مجال کہ

کسی کو بھی اپنے گنے مناسب اور واجب اور موزوں الفاظ سے ایک لفظ بھی کم یا بیش نہیں کیا ہو۔ شاعر، ناشاعر، متشاعر، تیم شاعر میں برابر فرق روا رکھا اور ظاہر کیا ہے۔ کسی ادیب نے ادب سے زیادہ تاریخ یا رواییت کی خدمت کی ہے تو اسے اس کا حق پہنچایا ہے۔ کسی سے نفرت نہیں دکھائی۔ اسے نظر انداز نہیں کیا۔ غزل گوؤں کو مثنوی نویسوں پر ترجیح نہیں دی۔ ریختی لکھنے والوں کو رگید انہیں: ان سے نفرت جتائی ہے۔ اگر کسی نے قصیدے لکھنے کے بجائے تاریخ کو نظم کر دیا ہے تو اسے بھی داد سخن دی ہے۔ شعرا پر لیبل نہیں لگائے۔ درجہ اوّل، درجہ دوم، درجہ سوم شعرا نہ ہوئے گویا عرق عنبہ کی بوتلیں ہیں یا حوت کے شربت۔ اچھے شاعر اور بڑے شاعر کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اگر کسی کے کمال کا تقاضا تھا کہ وضاحت کی جائے تو واضح بھی کر دیا ہے۔ گلاب چند ہمدم کے بارے میں کہتے ہیں "اپنے کلام میں تشبیہیں اور استعارے بڑی خوبی سے استعمال کرتے تھے۔ ان کا ہر شعر نازک خیالی میں فرد تھا۔"

چندو لال شاداں کے بارے میں۔ "اصل دیوانی کا کام چندو لال ہی انجام دیتے رہے، اور اپنی وفات سے ایک سال قبل تک شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ اہل حیدرآباد کے قلوب پر حکومت کی۔" ہمہ گیر نقد و نظر کی بہترین مثال۔ "ساتھ ہی آصف سابع نے اپنے طبعی رجحان کے مطابق مذہبی اصلاح کی کوشش کی اور قدیم رسم و رواج کی خرافات کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی جس کی وجہ سے اس شہر کی بہت سی دلچسپیاں ختم ہو گئیں اور ایسے مواقع تفریحی کم ہو گئے جن میں اس ملک کے باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت مل جل کر حصہ لیتے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں پر بھی اس تبدیلی کا اثر پڑنا ضروری تھا۔" زور جانتے ہیں کہ حکومت قلوب پر ہی کی جانی بھی چاہیے۔

پھر لکھتے ہیں۔ "ارسطو جاہ سوچ سمجھ کر دیتے تھے۔ لیکن چندو لال آنکھ بند کر کے دینے والے انسان تھے۔" ایسے ہی شخص اخلاق میں میرے مولیٰ کی تقلید کرنے والے ہوا کرتے ہیں ؎

میرے مولیٰ کو کافی ایک سجدہ دور سے وہ بھی — در انساں پہ سو سو بار دستک دینی پڑتی ہے
مانگنے سے تو مرادیں بت بھی کرتے ہیں عطا — تو خدا ہے اے مرے مولیٰ مجھے دے بے طلب (دیوان)

عام نقادوں کا وطیرہ یہ ہے کہ ممدوح کے لئے جملہ اسمائے صفت استعمال کئے بغیر پانی نہیں پیتے اور اگر ان کے ممدوح ایک سے زیادہ ہیں تو سب کے لئے جملہ کلمات تعریف بہم کر دیں گے۔ سب ہی بلاغت، فصاحت، سلاست، روانی وغیرہ وغیرہ میں فرد ہیں۔ کسی اردو یا ہندی یا پنجابی یا بنگالی تاریخ ادب کو اٹھا کر دیکھ لو۔ کسی سالگرہ نمبر کے ورق الٹو جو تعریفیں غالب کی ہیں وہی اقبال کی۔ وہی عمر۔ بکر۔ زید کی۔ مقررہ کلمات ہیں۔ انہیں کو ممدوح کی نذر گزران دیا جاتا ہے۔ ادھر زور صاحب سے کوئی دو شاعر ایک سے تعریفی کلمات نہیں معمول کر سکے۔ آخر انفرادیت بھی کوئی شئے ہے۔

حوصلہ۔ صبر۔ خود اعتمادی اور انکسار۔ جس قدر خدمت زور صاحب نے حوصلے، صبر اور خود اعتمادی کیساتھ اپنی محبوب زبان پر ایمان رکھتے ہوئے کی ہے اس کے تناسب سے آپ کو ایک ہزارواں حصہ بھی داد نہیں ملی۔ دوسرے لوگ چند مضامین غلط سلط ملنگے تانگے کے زیورات سے مرصع تیار کر کے نقادِ اکبر بن گئے ہیں۔ کسی سلسلۂ ۱۰ ارہ میں منتخ ہو جایئے، جتنی تعریف چاہئے کرا لیجئے برادری والوں سے اور پھر پروفیسروں کے لئے نامور ادیب ہونا یعنی داخل نصاب مشہور ہونا اور اعلیٰ درجہ کا نقاد با تفاق رائے قرار پانا تو بالکل سہل ہے اور

یقینی ایسے ہی جیسے ریڈیو کے ملازموں کے لئے عمدہ ادیب تسلیم کیا جاتا۔ جی تو چاہتا ہے کہ نام گناؤں کہ فلاں فلاں ۱۹۲۶ء میں کیا تھے اور اب پروفیسری کے بدولت کیا ہو گئے مگر باز رہنا ہی اچھا ہے ؎

بنا، معلم وارنس پھرے ہے اتراتا ولے نہ خاصے ہیں حضرت کی آبرو کیا ہے

انکسار تو ان لوگوں کو چھو تک نہیں گیا اور ناز و غرور زیب نہیں دیتا کہ بہ حسن معنوی و باطنی دیرینہ۔ کبر و ناز حسینوں کو زیب دیتا ہے۔ ان کو جنھوں نے ریاض مسلسل سے یا جدوجہد طلبی خداوندی سے اچھی طبیعت اچھے مذاق کے ساتھ ساتھ اکتساب سے علوم و فنون میں تبحر حاصل کر لیا ہو ہے، غرور زیب دیتا تھا۔ غرور بجا تھا۔ شوکت میرٹھی کو یا میر ناصر علیخاں دبلوی کو۔ فقیر ایک مرتبہ محض دیدار کی غرض سے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ کہلا بھیجا کہ ہم نہیں مل سکتے۔ آپ سے مل کر ہماری زبان کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ جب فقیر نے فقیرانہ اصرار کیا تو داخلی ہو گئے۔ اس ہیچمداں کے ہمراہ محبی شمیم ناتھ چوپڑہ سونڈہ لوی تھے۔ پہلے ان سے مخاطب ہوئے "آپ کب سے دلی میں رہتے ہیں" کے پشت سے۔ کون سے محلے میں اور کیا کام کرتے ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ تین پشت سے پڑے ہیں۔ کھتری ہیں۔ قلم داں نہیں۔ شاہ بولا کے بڑکے پاس والے محلے نائی واڑہ میں رہتے ہیں تب کہیں جا کر میر صاحب کی دل جمعی ہوئی۔ اور اس پر مزہ یہ کہ جب دل جمعی ہوئی تو فقیر کی اردو دانی کے بارے میں تو ایسی دل جمعی ہوئی کہ میرے دوسرے رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین بھی "صلائے عام" میں طبع فرمائے، جیسے نواب محبت خاں کی مثنوی کی تعریف اور اردو شاعری میں انسانیت، حالانکہ وہ شاذ و نادر ہی کسی اور کو اس قابل سمجھتے تھے کہ اس کا غیر مطبوعہ مضمون بھی برائے اشاعت قبول فرمائیں۔ یہ لوگ تھے جنھیں ناز کبر جائز و روا تھا۔ کیونکہ وہ پرلے درجے کے منکسر بھی تھے۔ انھیں اپنے پر بھی اعتماد تھا اور دوسروں پر بھی۔ جنھیں وہ اپنی بصارت اور بصیرت سے قابل داد و قدر انتخاب کر چکے ہوتے۔

اس عبارت عقیدت کے طول اور اس کے بے مزہ ہو جانے کے ڈر سے اسے تشنہ ہی رہنے دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ دو الفاظ میں کہہ دیا۔ محقق اعظم اور میرا کہنا کیا معنی کہ فقیر کی دعا ہے۔ سید صاحب نے ہمیں اس قدر اونچی ارمغان عنایت فرمائے۔ طبیعت محظوظ ہوئی۔ عوام سے ایک فقیر دعا دینے لگا۔ نمائندہ حیثیت میں قصہ بس اتنا ہی ہے۔

۱۸۔ فیوض و برکات کے بارے میں البتہ وہ ایک گفتنی باتیں ہیں۔ کوئی شخص قادری یا سہروردی یا نقشبندی یا شطاری یونہی نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے تو اس سلسلہ کی روحانیت کے خزانے اس کے دل میں منتقل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا اہتمام عجبی رہتا ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب سے ملا، زور صاحب سے ملا، میر ولی الدین صاحب سے ملا، حضرت موہانی سے، شاقب کانپوری سے مل چکا تھا۔ کوئی مانے یا نہ مانے فقیر کا ایمان ہے کہ سادات کی کرامت خصوصی ہے اور حلقہ بگوشی صوفیہ کا کردار اختصاصی۔ ادب[1] زندگی کی طرح معرفت کی گود میں پل کر حسین تر۔ مفید تر۔ صادق تر اور لطیف تر ہو جاتا ہے۔ شاہ میراں جی اور چندا اور کشن پرشاد شاد اور فیض ایسے لوگوں کے بارے میں لکھنے کے لئے سید محی الدین قادری زور ایسا ہی صوفی و

---

[1] زور صاحب فیض کے بارے میں لکھتے ہیں "تصنیف و تالیف اور علم و فضل ان کے فیوض باطنی اور کشف و کرامات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے" حالانکہ اوپر کہہ چکے ہیں کہ فیض ایک اعلیٰ پایہ اور ترقی پسند شاعر تھے۔ یہ قادری ہی لکھ سکتے ہیں۔

ادیب چاہئے تھا سو مل گیا۔ شاد کے متعلق زور صاحب لکھتے ہیں :۔

" اپنے نانا چند ولال کی طرح سب لوگوں کی مدد کرنے اور ان کو آنا دینے کے بعد ہی خوش ہوتے تھے کہ خود کے پاس کچھ نہ رہے " ایک مصرع کسی کا یاد آیا ؎

کچھ تو اسی لئے ہے کہ لوٹا کرے کوئی

حیدرآباد کے ادب اور ادیب کے متعلق لکھا جائے تو واجب ہی ہے لازم ہی ہے کہ خاتمہ تبرکاً کسی والی حیدرآباد کے کلام پر کیا جائے۔ میں غفران مکان محبوب علیخاں آصف کے تین اشعار دیتا ہوں جن کا انتخاب زور صاحب کے حسن ذوق کا نمونہ ہے ؎

جب اس کے کام کا نہ مرے کام کا ہے دل — پھر کس مرض کی بار خدایا دوا ہے دل
کچھ وسعت زمین و فلک کی نہیں بساط — گر حوصلہ ہو دل میں تو سب سے بڑا ہے دل
آصف کا امتحاں تو کیا منصفی بھی کر
یہ ہر کسی کا حوصلہ ہر ایک کا ہے دل

مضمون لکھا گیا۔ فوراً بعد سید مراد علی طالع صاحب کی لکھی " حضرت مشکل آسان ثانی رحمۃ اللہ علیہ " کتاب ملی نیز تہنیت النسا بیگم کا فتیتہ کلام " ذکر و فکر " مجھے مرحمت ہوا۔ وہ جو ایک شک سا گمان سا میرے دل میں کھٹکتا تھا دور ہو گیا۔ ہویدا ہوا کہ مجھ سے اپنی تعریف اردو کا سٹنس بری ہی نہیں کرا رہا تھا ایک خوش نصیب باپ۔ شاد بخت شوہر اور سعادتمند بیٹا ہی نہیں خراج تحسین وصول کر رہا تھا بلکہ ایک صوفی ابن صوفی ابن صوفی ابن ..... کا تذکرہ میری قوت اندوزی کا کارن بن رہا تھا۔ گویا میں جیبان حبیب خدا کی ثنا میں بے اختیار رطبا ہوا تھا۔ بارے دل جمعی ہوی۔

ڈاکٹر زور کے والد تھے قطب وقت حضرت مولانا حافظ قاری ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد ذمم قادری الرفاعی الچشتی مشکل آسان ثانی۔ قندھار شریف کے مشہور ولی اللہ پڑدادا تھے۔ سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان۔ اور دادا مولوی حاجی سید شاہ عنایت اللہ حسینی رفاعی المعروف بہ صاحب عالم۔ زور صاحب کے ماجزادے ہیں الحاج سید شاہ تقی الدین ایم سجادہ نشین حضرت مشکل آسان ثانی اور زور صاحب کی بیگم تہنیت النسا تہنیت کا تخیل علما و فرنگی محل سے ہے۔

آپ ہی بتائیے کہ اتنی دولتیں اور عظمتیں جس فرد میں جمع ہوں وہ خیال و عمل سے خدمت اسلام اور خدمت ادب کے آسمان پر ستارہ بن کر کیوں نہ چمکے۔ تعجب ہوتا ہے کہ تاریخ ادب حیدرآباد میں زور صاحب نے تہنیت النسا کا ذکر نہ کر کے ہم سے بے انصافی کیوں کی۔ اس کمی کو فقیر پورا کئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

بہترین اولی ترین پاکیزہ ترین مفید ترین ادب کی سرحدیں روحانیت کی حدوں سے ملحق ہو جایا کرتی ہیں معرفت کا جوشا بکارہے منفرد کو عالمگیر کر دینا اور عالمگیر کو منفرد بنا دینا ہی ادب کا کارنامہ ہے۔ سبحان اللہ جزاک اللہ کس رفعت پر پہنچکر تہنیت نے یہ شعر کہا ہوگا ؎

کربلا ہی کے تصور سے یہ آتا ہے خیال
دہر کی ساری بلاؤں سے لپٹ کر رو لیں

اور اسی نعتیہ غزل کے دو اور اشعار ؎

وقتِ رخصت دلِ مضطر کی تمنا تھی یہی — آپ کے در کے گداؤں سے لپٹ کر روئیں
حشر میں ان کے سبب وہ متوجہ ہوں گے — کیوں نہ ہم اپنی خطاؤں سے لپٹ کر روئیں

کربلا کے عدیم النظیر سانحہ پر بے مثل شعر کہنے والی خاتون بے شک رفعتِ اسلام ہے۔ نعت محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور محبت تغزل کی جان و ایمان ہے۔ دیکھئے کیا پیارا اور پاکیزہ شعر ہوا ہے ؎

بن جاتی ہے خود ان کی محبت ہی سہارا — جب پیشِ نظر کوئی سہارے نہیں ہوتے

مگر اس میں بھی ایک افشا کرنے کے قابل راز ہے ؎

ہے ہم کو یقیں تہنیت اس طرح نہ لکھتے
کچھ ان کی طرف سے جو اشارے نہیں ہوتے

دیوانہ ؎

زیست کے ہر دوراہے پر کوئی — چشم و دل کو اشارے کرتا ہے

کل پرسوں صحبت فقرا میں بحث چلی کہ اختیار اچھا ہے یا جبر۔ اس ہیچمداں نے عرض کیا۔ مجھ بندۂ ظلوم و جہول کو اگر اختیار قدرے ملے بھی تو میں جبار کے قدموں میں رکھ دوں۔ میرے لئے مجبوری ہی میں افادیت ہے۔ مجھے اپنے اوپر بھروسہ ہی نہیں۔ تہنیت نے فقیر سے ہزار درجہ بہتر انداز میں پہلے ہی کہہ رکھا ہے ؎

خوشی سے سونپ دیتے ہیں سب اپنا اختیار انکو — گرفتارِ محبت ورنہ کب مجبور ہوتے ہیں

قسم خدا کی اس مرکب اور اس فعل نے تنقید کو حلال ہی تو کر دیا ؎

وسعتِ کشمکشِ زیست پہ چھا جاتے ہیں — وہ ہیں خوش بخت مدینہ میں جو آجاتے ہیں

ادب دربارِ رسولؐ میں پہنچ کر بخشا گیا یعنی کامران و کامگار ہوا ؎

سفر کی دقتوں کے تھے جو چرچے
حقیقت میں وہ افسانے سے نکلے

اللہ کس قدر عالمگیر اطلاق ہے اس شعر کا۔ وہاں پہنچے تو سفر مسافر دنیا سب کو افسانۂ محض پایا۔ نہ دنیا تھی نہ ابن آدم۔ نہ شیطان۔ نہ فرشتے۔ ایک واحد لاشریک تھا۔ اور ہے۔ وہاں پھر دوسرے کی موت ہے۔ اور ابدی زندگی بھی۔ یعنی تفسیر ہے لا الٰہ الا اللہ کی۔ سرمد یاد آیا اور مولانا ابوالکلام کا مضمون سر مد پر ؎

جان دی رازِ حق افشا نہ کیا
ہائے سرمد سے رازدار کہاں

(منقول از ساقی۔ کراچی اکتوبر ۱۹۵۵ء)

ڈاکٹر گیان چند

اُردو لسانیات کے ابوالآبا ڈاکٹر زور

ڈاکٹر زور نقاد۔ ماہر لسانیات۔ محقق۔ مؤرخ۔ سوانح نگار۔ مرتب۔ مدیر۔ سبھی کچھ تھے اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی جولانیاں محض صفحۂ قرطاس تک محدود نہ تھیں، وہ میدان عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی ذات ہزار شیوہ ایک ادارہ تھی جس نے بہت سے ادارے بنائے۔

ایک بار میں نے بھوپال کے اسٹیشن پر ڈاکٹر زور سے پوچھا کہ آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کس کتاب پر ملی تھی۔ انھوں نے جواب دیا ہندوستانی صوتیات پر ..... ہندوستانی لسانیات اور اردو شہ پارے چونکہ ڈاکٹر زور کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں مل چکی تھی اور یہ کتابیں اس کے بعد مرتب ہوئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ ان کتابوں کے نقوش اوّل کا مرقع ہوگا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لسانیات کے باب میں اردو ہندی سے ۲۵ سال پیچھے ہے یعنی آزادی کے بعد اُردو کی دُکان لسانیات میں جو متاع فخر دکھائی دیتی ہے وہ ہندی میں کم از کم ۲۵ سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ لیکن ڈاکٹر زور نے صوتیات پر جس وقت کام کیا اس وقت تک ہندی کے موجودہ علما میں سے کسی نے لسانیات پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ بابو شیام سندر داس کی بھاشا وگیان ۱۹۳۸ء تک ہندی لسانیات کی کُل کائنات تھی۔ ڈاکٹر زور لسانیات کی دنیا میں بڑی لگن گرج سے آئے۔ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں لیکن افسوس صد افسوس انھوں نے اپنے شوق کو جاری نہ رکھا۔ ۱۹۲۹ء میں لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہ ڈی لٹ کے لئے پیرس پہنچے اور پروفیسر جیولز بلاک کے رہنمائی میں گجراتی فارم آف ہندستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ اگر مرحوم لسانیات سے دلچسپی لیتے رہتے تو ملک کے بڑے ماہرین لسانیات میں شمار کئے جاتے۔ لسانیات کے سلسلے میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ہندوستانی صوتیات ۱۱۶ صفحات کا یہ انگریزی کتابچہ ۱۹۳۲ء میں پیرس سے شائع ہوا

۲۔ ہندستانی لسانیات۔ ۱۹۳۲ء۔

ان کے علاوہ دو مضامین میری نظر سے گزرے اردو اور پنجابی۔ یہ مضمون نقوش لاہور میں پہلی بار غالباً ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ یہی نقوش کے ادب عالیہ نمبر بابتہ اپریل ۱۹۶۰ء میں شامل کیا گیا۔ ۲ اردو کی ابتدا[1]

---

[1] اردو کی ابتدا مشمولہ اردوئے معلی لسانیات صفحہ ۶۸۔

یہ مضمون دلی یونیورسٹی کے رسالے اردوئے معلّٰی کے لسانیات نمبر جلد سوم شمارہ ۴ - ۵ بابتہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔
ان کی کتاب ہندوستانی لسانیات اور ان کے اردو مضامین سے قائمیں اردو متعارف ہیں۔ ان تحریروں میں اردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے لیکن لسانیات میں ان کا اصل کارنامہ ہندوستانی فونیٹکس ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اردو دنیا اس کے نام سے بھی روشناس نہیں حالانکہ ڈاکٹر زور کو لسانیات کی تاریخ میں کوئی مقام دیا جائے گا تو اسی کتاب کی بدولت۔
ڈاکٹر زور کی لسانیاتی تحقیقات پر پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں لسانیات بالخصوص صوتیات کا علم زمین سے آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ آج ہمیں ڈاکٹر زور کی تحریروں میں سقم نظر آتے ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں یہی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ ذیل میں ان کے کارناموں کا ایک سرسری تعارف پیش کیا جاتا ہے:-

ہندستانی فونیٹکس (انگریزی میں)۔ اردو دنیا ڈاکٹر زور کو تاریخی و تقابلی لسانیات کے ماہر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن ان کا زیادہ اہم کام صوتیات کے ضمن میں ہے۔ لندن اور پیرس کی تجربہ گاہوں میں ڈاکٹر زور نے آوازوں کا جو تجزیہ کیا ہندوستانی صوتیات اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں علم زبان کے وہ موتی بھرے ہیں کہ جب بھی اس کی سیر کی جائے کوئی نہ کوئی گوہر غلطاں ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

تمہیدی باب میں فاضل مصنف نے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ پیش کیا ہے کہ بارھویں صدی سے قبل صوبۂ سرحد سے الہ آباد تک ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بارھویں صدی کے بعد زبانوں کا اختلاف شروع ہوا۔ پنجاب میں پنجابی بن گئی یوپی میں کھڑی بولی۔ اردو نہ پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ ان دونوں کے مشترک ماخذ سے تشکیل پائی ہے۔ میں اس نظریے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیوں کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اسے اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ اس باب کے دوسرے جزو میں زور صاحب نے شمالی اور دکنی اردو کے اختلافات بڑی وضاحت اور تفصیل سے پیش کئے ہیں۔ اس سے پہلے کسی نے دکن کی خصوصیات کے بارے میں شاید ہی لکھا ہو۔ زور صاحب نے داتا کے راز کی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے پہلے صوتیاتی اختلافات کی شرح کی ہے بعد میں صرف و نحو کی۔ یہ سب ڈاکٹر زور کے اپنے مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے آئندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لئے ان کی یہ تحریر مشعل راہ ہے۔

دوسرے اور تیسرے باب میں اردو کی اصوات میں ایک ایک کو لے کر اس کا تجزیہ کیا ہے انھوں نے اردو میں ۹ مصوتے اور ۶ جوڑوا مصوتے DIPTHONG قرار دئے ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مصمتوں میں انھوں نے تھ - ٹھ - ڑھ - ڑھ - وھ - زھ کو بھی شامل کیا ہے حالانکہ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی اردو یا ہندی عالم نے اس کی تائید نہیں کی۔ لیکن بجی کو اردو مصمتوں میں جگہ دے کر انھوں نے حقیقت نگری کا ثبوت دیا ہے ان اختلافات سے قطع نظر اصوات کا تجزیہ قابل داد ہے یعنی پہلے ایک آواز کا طریق تلفظ دیا ہے پھر مختلف ماحولوں میں اس میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی شرح کی ہے۔ مزید وضاحت کے لئے ہر آواز کا کم از کم ایک

PALATOGRAM دیا ہے۔ (پیلیٹوگرام تالو کے اس نقشے کو کہتے ہیں جس سے یہ واضح ہو کہ کسی خاص آواز کو ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس کس حصے کو چھوتی ہے) اس کے علاوہ بعض آوازوں کے نازک اختلافات کو کائموگراف KYMO سے بنی ہوئی لکیر کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو کی ایک ایک آواز کو لے کر اس کا تجزیہ پیش کرنا ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر تا حال اردو اور ہندی کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ گو لوک بھاری دھل کی ہندی کتاب "صوتی ودیان" میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے ہندی آوازوں کا نہیں۔ اس میں پیلیٹوگرام دئے ہیں لیکن کائموگراف کے چارٹ نہیں دئے۔

مصمتوں کے تجزیے میں ڈاکٹر زور نے کس باریک بینی اور عمق نظر کا ثبوت دیا ہے وہ چند مثالوں سے واضح ہوگا۔

۱۔ لفظ کے آخری ب کے بعد ہم عموماً ایک نہایت خفیف مصوتہ بھی بولتے ہیں۔ ثبوت میں درالفاظ 'تب' اور 'دھب' کا کائموگرافی خط درج کیا ہے جس میں ب کے بعد ایک خفیف مصوتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ لفظ کا ابتدائی ت درمیانی یا آخری ت کی نسبت زیادہ وضاحت سے ادا ہوتا ہے۔

۳۔ درمیانی ٹھ اور دھ میں ابتدائی ٹھ اور دھ کی نسبت تنفس یعنی ھ کا ریت کم ہوتی ہے۔

۴۔ درمیانی ٹ ابتدائی ٹ سے زیادہ شدت سے ادا ہوتا ہے۔

۵۔ لفظ کے درمیان ٹھ کے بعد کوئی غیر ہیتی اسپوٹ آواز آئے تو ٹھ ٹ کی آواز دیتا ہے مثلاً بیٹھنا اور کٹھ پتلی میں۔

۶۔ لفظ کا آخری چ نہایت خفیف ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ یہ یا در ہوا دعوے نہیں ان سب کو پیلیٹوگرام یا کائموگراف کے نقشوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

آوازوں کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر زور نے مفرد و مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل کی ہے جو متعاقب آواز کے اثر سے کسی مذنگ بدل جاتی ہیں۔ مثلاً 'چپ بیٹھو' میں پ کی آواز ب سے مشابہ ہو جاتی ہے کیونکہ میں ت کی آواز د جیسی۔ 'پچ دار' میں چ کی آواز۔

ج کی مانند اور 'بات چیت' میں ت کی آواز چ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ ان جملوں اور مثالوں کی کثرت سے ان کے مشاہدے کی وسعت اور ہمہ گیری کی غماز ہے۔

چوتھے باب میں بُل اور سُر لہر سے بحث کی ہے۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے آج بھی قلم کو لرزش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو زبان میں بُل اور سُر لہر کی تعیین جس وقت کی اس وقت تک کسی ماہر لسان نے اردو یا ہندی کے اس پہلو پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ڈاکٹر زور کے اصول غنیمت ہیں۔ انھوں نے دوگنی اور سہ رکنی الفاظ کے بُل کو بڑی حد تک صحیح طور پر گرفت کر لیا چنانچہ ان سے ۲۴ سال بعد لکھتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے

ف مقدمہ تاریخ زبان اردو۔

ان اصولوں کی تائید و تصدیق کی۔ زور صاحب کے اصولوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے، ان میں ترقی کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں کیا لیکن ۱۹۲۸ء کا زمانہ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر زور کے اجتہاد اور اپج کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس باب کے دوسرے جزو میں اردو کلام کی سُر لہر کی تشریح کی ہے۔ اس موضوع پر ابھی تک کوئی دوسرا کام سامنے نہیں آیا۔

غرض یہ مختصر کتابچہ کوزے میں دریا سما دینے کی اچھی مثال ہے۔ اس میں محض اصول و نکات ہیں حشو و زوائد یا اطناب کا نام نہیں۔ آج اردو صوتیات کے کسی بھی مسئلہ پر لکھنا ہو ہندوستانی فونیٹکس کی ورق گردانی ناگزیر ہے کیونکہ جویائے علم کے لئے یہ رسالہ ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

کی مثال ہے۔

"ہندوستانی لسانیات" میں ڈاکٹر زور نے ان موضوعات پر لکھا جو نہ صرف اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک اردو میں نئے تھے۔ مثلاً زبانوں کی صوتی تبدیلی اور اس کے اسباب دنیا کی زبانوں کے خاندان۔ ہند آریائی کی گروہ بندی وغیرہ۔ صوتی تبدیلی کا بیان آج کی معلومات کے اعتبار سے تشنہ ہے لیکن ہند آریائی کی تفصیلات آج بھی بیشتر صحیح ہیں۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں ہندستانی کے آغاز اور ارتقا سے بحث کی ہے جس کا مرکزی حصہ ان کے اپنے نظریہ کی تشریح ہے۔ اسے سب سے پہلے اپنی انگریزی کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

اس حصے کا ایک عالمانہ باب "ادبی بولیاں۔ گجراتی۔ دکنی۔ شمالی" ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور کے ڈی لٹ کے نامکمل کام گجراتی اردو کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج کے لکھنے والوں میں کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دکنی اور گجری مختلف بولیاں ہیں۔ انھیں ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے لیکن زور صاحب نے دونوں بولیوں کے چار اختلافات پیش کئے اور اس طرح گجری کو دکنی سے ممیز کیا۔ اگر وہ اس کام کو جاری رکھتے تو اس بولی کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا۔ دکنی اور گجری میں فرق کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے دکنی اور شمالی اردو کے اختلافات کا مجمل بیان کیا ہے۔ یہ وہی ہیں جو انگریزی رسالے میں تفصیل سے درج کئے جا چکے ہیں۔

اپنے دو مضامین میں، ڈاکٹر زور نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی۔ اردو سے متعلق اپنے نظریے کا اعادہ کیا ہے ۱۹۲۸ء کے بعد اردو اور ہندی کی تاریخی تحقیق بہت آگے بڑھی ہے لیکن زور صاحب کو اپنے نظریے کی صحت پر یہاں تک اعتماد ہے کہ وہ بعد کی تحقیقات کی روشنی میں ترمیم کے لئے آمادہ نہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر زور کی لسانیاتی خدمات کا صحیح اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے نہ عقیدت کے جوش میں ہیرو پرستی کی گئی ہے نہ ۱۹۶۳ء کی عینک سے دیکھ کر خواہ مخواہ خردہ گیری کی گئی ہے۔ اس جائزے سے روشن ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی طبیعت تاریخی لسانیات سے زیادہ تجزیاتی لسانیات بالخصوص صوتیات سے مناسبت رکھتی تھی وہ ہمارے ملک کے ابتدائی علمائے صوتیات میں سے تھے۔ اگر وہ لسانیات سے قطع تعلق نہ کر لیتے بلکہ خود بھی پڑھتے لکھتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے لکھنے پر مائل کرتے تو اردو زبان اس صنف میں اتنی پچھڑی نہ ہوتی کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ہوتی۔

غلام رسول

لسانیاتی ادب میں ڈاکٹر زور کا حصّہ

لسانیات سے مراد وہ علم ہے، جس میں تاریخی اور تقابلی مطالعے کے ذریعے کسی زبان کے آغاز، ماہیت، نظریت، ارتقا، حیات اور موت سے بحث کی جاتی ہے۔

لسانیات کے اہم شعبے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کلامیات (SYNTAX) ۲۔ تشکیلیات (MORPHOLOGY) ۳ صوتیات (PHONETICS)

۴۔ معنیات (SEMANTICS)

بعض ماہرین لسانیات اس کی پانچ شاخیں قرار دیتے ہیں:۔ (۱) کلامیات (۲) تشکیلیات (۳) لفظیات (WORDOLOGY) (۴) صوتیات (۵) معنیات۔

ہم اپنے مافی الضمیر کو ایک دوسرے پر زبان کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ اظہار خیال میں عموماً جملوں سے کام لینا پڑتا ہے، اسی لیے جملہ یا کلام کو لسانیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے، پس لسانیات کے جس شعبے میں اس سے بحث کی جاتی ہے، وہ کلامیات کہلاتا ہے۔ اس کے مطالعے کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تاریخی کلامیات، دوسری تقابلی کلامیات۔ تاریخی کلامیات میں کسی زبان کے آغاز سے لے کر موجودہ زمانے تک اس کے جملوں کی ساخت کے اصولوں کو بیان کیا جاتا ہے اور تقابلی کلامیات میں کسی دو زبانوں کے جملوں کی ساخت مذکور ہوتی ہے۔ چونکہ تبادلۂ خیالات میں لفظوں کا استعمال ہوتا ہے اور لفظوں ہی سے مل کر جملہ یا کلام بنتا ہے، اس لیے کلام کے بعد ہی الفاظ اہم سمجھے جاتے ہیں۔ جس علم میں لفظوں کے مادّے، لاحقے سابقے اور ان پر حروف مغیرہ کے اثرات وغیرہ کا حال بیان کیا جاتا ہے، اس کو تشکیلیات کہتے ہیں۔ تشکیل یا کھلے کا دارومدار لفظ پر ہے۔ لفظوں پر ساخت اور تاریخ کے لحاظ سے غور اور ان کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ جس علم میں کسی زبان اور شخص وغیرہ کے مجموعۂ الفاظ پر غور اور مقابلہ ہوتا ہے، اسے لفظیات کہتے ہیں۔ آوازوں کی ملاوٹ سے الفاظ بنتے ہیں، لہٰذا لفظوں کے بعد ہی آواز کا درجہ اہم قرار پاتا ہے، چونکہ انسان کے اعضائے نطق یعنی لب، دہن، حلق، خنجرہ، غیشوم اور پھیپھڑے وغیرہ ہی کے ذریعے آواز پیدا ہوتی ہے، اس لیے آواز کی لہر اور اس سے سنے جانے والی چیزوں کا مطالعہ، جس علم سے ہوتا ہے، وہ صوتیات کہلاتا ہے۔ اس سے آواز کا تغیر، اس کا پھیلاؤ اور اس کے وجوہ اور انجی سمتوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ صوتیات کے مطالعے کی بھی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تقابلی ہے، جس میں ایک خاندان کی زبانوں کو لیکر صوتی ارتقا پر غور کرکے اس سے اصول متعین کیے جاتے ہیں۔ دوسری تاریخی ہے، جس میں ایک زبان پر تاریخی نظر سے پتا چلایا جاتا ہے کہ اس میں کس آواز کے ذریعے کب اور کیونکر تغیر پیدا ہوا؟ زبان کے مطالعے میں جس علم سے لفظوں کے معنوں میں تغیرات اور ان کے وجوہ کا پتا

ظاہر ہوتا ہے اس کو معنیات کہتے ہیں۔

اردو میں لسانیاتی ادب اردو میں شمس العلما محمد حسین آزاد نے لسانیات کا ڈول ڈالا اور سب سے پہلے آپ نے ۱۸۸۶ء میں 'سخندان فارس' لکھی اور ۱۹۰۷ء میں لاہور کے مشہور ناشر منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے اس کو شایع کیا۔ اس کتاب میں لسانیات کے صرف ایک شعبہ 'لفظیات' پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وقت علم زبان بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ ہمارے مشرقی علما اکثر اس سے نابلد تھے۔ ان میں فقط مولانا ہی منفرد تھے، جو اپنے فطری لگاؤ اور سنسکرت فارسی زبانوں کی معلومات وہمارت کی بنا پر الفاظ حروف اور حرکات کی حد تک یعنی الفاظ کی پیدایش، ان کا باہمی تعلق، معنوں میں تغیر و تبدل، زبان کا اصل خاندان، فارسی اور سنسکرت مشترالاصل الفاظ میں بعض اصولوں کے مطابق رد و بدل، حروف کی اشکال، ان کے تلفظ اور لہجہ کا اختلاف اور ان کی حرکات کا حال کتاب مذکور میں بیان کیا ہے۔

عام طور پر لسانیات ایک جدید علم ہے، جو انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور یورپ سے نکل کر ایشیا میں پھیلا۔ اس کے علما نے بہت سی زبانیں سیکھ کر اپنی محنت اور کوشش سے لسانیات کو علم کے ساتھ فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

'سخندان فارس' کے بعد قابل ذکر کتاب پنجاب میں اردو ہے، جس کو پروفیسر محمود شیرانی نے ۱۹۳۰ء میں تصنیف کیا۔ اس میں اردو زبان کی قدامت پر تحقیقی پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے اور تاریخ اور الفاظ کے تقابلی مطالعے کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کا میدا سرزمین پنجاب ہے نہ کہ دکن، اردو، پنجابی سے اخوذ ہے۔ اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو زبان کی دو تحریکیہ ریختہ اور اس کی قسمیں، دہلوی، گوجری، دکنی، ہندستانی اور ہندی و ہندوی کی وضاحت ہے۔ اس کے علاوہ دوسری سرخیوں میں اردو کا آغاز، پنجاب، پنجابی اور اردو، قدیم اردو پر پنجاب کا اثر اور پنجاب میں اردو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

سرگذشت الفاظ یہ کتاب مولانا آزاد کے شاگرد احمد دین نے ۱۹۳۵ء میں لکھی ہے، جس کو موصوف نے پادری ٹرمینچ کی کتاب 'مطالعۂ الفاظ' کے اساس پر انگریزی، فرنسیسی اور لاطینی الفاظ کی بجائے اردو، ہندی فارسی اور عربی الفاظ کو منتخب کرکے اس طرح لسانیات کے ایک شعبہ و تشکیلیات یا لفظیات میں ایک اور کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے۔ جو افتتاحیہ کو ملا کر سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں زبان سے متعلق الفاظ کا مطالعہ بلحاظ مختلف نوعیت، نادر خیالی، اخلاقیات، تاریخ اتنے الفاظ، متراوفات اور تعلیمیات کے نقاط نظر سے ہوتا ہے اور اس میں مذکور بالا اقسام کا وافر ذخیرہ فراہم کرکے ہر ایک کی وجہ تسمیہ، تاریخ اور تشریح بیان کی گئی ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کے لیے معلومات اور دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے۔

آریائی زبانیں یہ کتاب پروفیسر سدھیشور ورما اتنا و سنسکرت اور لسانیات نے لکھی ہے، اس میں ایک تمہید اور تین سرخیاں ہیں۔ تمہید میں ہندوی زبان (اردو ہندی کا ماخذ وارتقا) ہندوی اور مسلمان، اردو کا آغاز، ہندی اور اردو نثر کا آغاز عہد حاضر کی معیاری ہندوی (ہندی، اردو، ہندستانی) پہلی سرخی آریائی زبانیں ہے، جس میں آریائی زبانوں کا ماخذ وارتقا، قدیم آریائی زبان کی تشکیل کیا تھی؟ ہند آریائی اور ایرانی کی باہمی مشابہت، قدیم ہند آریائی اور قدیم ایرانی میں اختلافات، دوسری سرخی ہند آریائی زبانیں ہیں، جس میں ہند آریائی کی خصوصیتیں، ہند آریائی کا ارتقا، عہد حاضر کی ہند آریائی کی گروہ بندی اور تیسری سرخی ایرانی زبانیں ہے، جس میں ایرانی زبان کی خصوصیتیں، ایرانی زبان کا ارتقا، اوستا اور قدیم فارسی کا مقابلہ، قدیم فارسی اور پہلوی کی باہمی مشابہت، وسطی فارسی یا پہلوی وسطی فارسی کی بولیاں، عہد حاضر کی ایرانی زبانوں کی گروہ بندی اور ایرانی زبان کا ارتقا شامل ہیں۔ اس کتاب میں آریائی زبانوں کے

ارتقا، ہند آریائی اور ایرانی زبانوں اور ان کی خصوصیات کا ذکر وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے یہ اپنے موضوع پر مفید کتاب ہے۔

ہندستانی لسانیات کا خاکہ یہ اصل میں ماہر ہندوستانی لسانیات جان بیمز کی انگریزی کتاب (OUTLINE OF INDIAN PHILOLOGY) کا اردو ترجمہ ہے جس کو پروفیسر سید احتشام حسین نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں مختصر حواشی کے اضافے کے ساتھ عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں ملکد کر شائع کیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں ضروری ردوبدل اور مزید معلومات کے ساتھ طبع ہوا۔ اس کتاب میں چھ ابواب اور ایک ضمیمہ ہے، جس میں زبانوں کی گروہ بندی، ہندستانی زبانوں کی تقسیم، ارتقائے لسان کے مدارج، زبانوں کی خاندانی خصوصیتیں، بولیاں، نئی بولیوں کے مطالعہ اور قلم بند کرنے کے متعلق ہدایات درج ہیں اور ضمیمے میں ہندستان کی لسانی تقسیم کا خاکہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں سے متعلق معلومات آفریں ہے۔

مقدمہ تاریخ زبان اردو یہ پروفیسر مسعود حسین صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اس میں چار ابواب ہیں۔ پہلا باب۔ ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ (۱) آریاؤں کا وطن اور داخلۂ ہند و خاندان (۲) آریائی زبان کا عہد قدیم ——— پہلی پراکرت و ویدی زبان (۳) آریائی زبان کا دور وسطیٰ ——— دوسری پراکرت (۴) آریائی زبان کا تیسرا دور ——— اپ بھرنش۔ دوسرا باب۔ ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانیں ——— (۱) تقسیم و گروہ بندی (۲) ہر زبان کے مختصر حالات (۳) مغربی ہندی اور اس کی بولیاں۔ تیسرا باب۔ شمالی ہند میں اردو (ہندوستانی) کا عہد بعہد ارتقا (ا) راجپوتوں کے عہد سے ابتدائی سلاطین دہلی کے عہد تک (ب) سلاطین دہلی کے عہد سے اورنگ زیب کے عہد تک چوتھا باب (۱) تقابلی مطالعہ ——— پنجابی، برج بھاشا، ہریانی اور دکھنی (۲) اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی (آزاد کے لسانیاتی نظریہ کی تنقید) (ب) پنجابی، اردو اور دکنی پر ڈاکٹر شیرانی کے لسانیاتی نظریہ کی تنقید (ج) دکنی صرف و نحو کی بعض خصوصیات کی توجیہ نواح دہلی کی بولیوں سے داخل ہیں۔ اس کتاب میں اردو زبان کی تاریخ اور لسانیاتی نظریوں پر تنقید ہے۔ آزاد اور شیرانی کے نظریہ زبان کا ابطال کیا گیا ہے۔ اور مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کا اخذ ہریانی ہے نہ کہ پنجابی۔

زبان اور علم زبان یہ کتاب پروفیسر عبدالقادر سروری نے علمائے لسانیات کے لکچروں سے استفادہ کرکے اردو زبان میں مرتب کی ہے، جو لسانیاتی نظر سے خالص علمی کتاب ہے۔ یہ کتاب ایک دیباچہ اور ۱۸ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں زبان اور اس کی ماہیت، زبان کا آغاز، علم زبان، زبان کا ارتقا، علم زبان کی شاخیں، صوتیات، صوتی تبدیلی، صوت تجزیہ تشکیلیات نحو، معنیات، آرکیکی طریقہ، مماثلت اور دوسرے عوامل، زبانوں کی تقسیم، دنیا کی زبانیں، ہندوستان کی زبانیں، علم زبان کی تاریخ اور تحریر کا آغاز اور ارتقا پر علمی طور پر بحث شامل ہیں۔ اردو زبان میں اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستانی لسانیات کے بعد یہ دوسری کتاب ہے، جس میں بعض جدید ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اب جب کہ ہماری جامعات میں شعبۂ اردو میں عام لسانیات کو بھی علیحدہ مضمون کے طور پر نصاب میں داخل کیا گیا ہے، تو ایسی صورت میں اس کتاب سے ضرور فائدہ پہنچ سکتا ہے، لیکن یہ اپنے غیر دلچسپ انداز بیان کی وجہ سے طلبا اور اساتذہ میں مقبول نہ ہو سکی۔

اردو زبان کا ارتقا یہ کتاب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھی ہے، جس میں تمہیدی حصہ، تین بابوں پر اور تحقیقی حصہ پانچ بابوں پر مشتمل ہے۔ تمہیدی حصے میں زبانوں کے خاندان اور ان کے نظریے، ہندو پاکستان کی قدیم

وجدید زبانیں، ہندو پاک کی زبانوں کے رشتے اور اردو زبان کا ماخذ اور تحقیقی حصے میں صوتی تبدیلیاں، اخذ و اشتقاق، اسمائے ماخذہ، اسمائے مطلقہ اور افعال و مشتقات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کا ماخذ پالی ہے۔

اردو زبان کے ماخذ کے بارے میں اب تک چار نظریے پیدا ہو گئے، جن سے اس کے صحیح مبدے کی نسبت کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا، اس لئے ڈاکٹر زور مرحوم کا مشورہ تھا کہ ان چاروں نظریوں کو پیش نظر رکھ کر ایک ایسی جامع تنقیدی کتاب لکھی جائے، جس سے اردو کا اصل مبدا دریافت ہو اور وہ قول فیصل کا حکم رکھے۔

ڈاکٹر زور کا لسانیاتی کارنامہ

یہ بات مشہور ہے کہ دکن کی سرزمین ہیروں کی زمین ہے، چنانچہ یہاں کے ہیرے کوہ نور نے اپنی آب و تاب کی بدولت ساری دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا۔ اسی مادر دکن نے ڈاکٹر زور جیسا ہیرا پیدا کیا، جو اپنی علمی، ثقافتی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے سبب سارے برصغیر یعنی ہند و پاک میں مشہور ہوا۔ اب ہم میدان ہائے علم کے اس مجاہد کے مذکورۂ بالا کارناموں کے قطع نظر صرف لسانیات میں اس نے جو خدمات ادا کی ہے، اس کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ۱۹۲۷ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے اور ۱۹۲۸ء میں باقاعدہ لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں آریائی زبانوں کی لسانیاتی تعلیم پروفیسر آر، ایل ٹرنر سے اور صوتیات کی تعلیم پروفیسر اے، لائیڈ جیمس سے حاصل کی۔ عام صوتیات اور انگریزی صوتیات ڈینیل جونس، مس ٹی لیاس اور ای، آرم سٹرانگ پروفیسروں سے سیکھی۔ ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقی کام لے انسٹی ٹیوٹ وی فونیٹک میں انجام دیا۔ اسی زمانے میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور قدیمی زبانوں کا درس سوم بون یونیورسٹی پریس کے 'ادارہ صوتیات' میں لیا اور گجراتی زبان پر ایک مقالہ پروفیسر جے، بلوک کی نگرانی میں لکھا۔ لسانیاتی تعلیم کے حصول کے بعد وہ اپنے وطن لوٹے اور جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہو گئے۔ موصوف کی لسانیاتی خدمات کا اپنے اہل علم میں بڑا شہرہ ہے۔ چنانچہ آپ نے دو گراں مایہ کتابیں لکھیں، جو ارباب علم زبان کے نزدیک مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

(۱) ہندستانی صوتیات۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ اس کی تیاری بزمانۂ قیام لندن ۱۹۲۷ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۳۰ء میں بمقام پریس اس کی تکمیل و اشاعت عمل میں آئی۔ یہ دکنی صوتیات پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب معتبر سمجھی جاتی ہے اور اس دکنی صوتیات کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اکثر انگریزی اور ہندی کی مصنفین اس سے حوالہ اور استشہاد پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جیونس بلوک پروفیسر ہند آریائی لسانیات اور ناظم ادارۂ تحقیقات عالیہ پریس کا تعارف اور خود مصنف کا دیباچہ ہے۔ علاوہ ازیں چار فصلیں ہیں۔ پہلی میں تمہید (ا) تاریخی ارتقا (ب) شمالی اور جنوبی روپوں میں اختلافات۔ دوسری میں آوازیں (ا) حروف علت یا مصوتے اور مرکب مصوتے (DIPHTHONGS) (ب) غنہ دار حروف یا حروف انفیہ۔ تیسری میں (ا) حروف صحیح یا مصمتے (ب) یقاع اور چوتھی میں آوازوں کی خصوصیتیں (ا) زور (STRESS) (ب) ایقاع سر لیے (INTONATION) تمہید میں ارتقا کی تاریخ کے ضمن میں اردو کی ابتدا سے متعلق تین نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ پہلا اردو دکن میں پیدا ہوئی۔ دوسرا اردو کا آغاز سندھ میں ہوا۔ تیسرا اردو پنجابی سے نکلی۔ پہلے دو نظریوں پر تبصرہ کر کے ان کو ناقابل لحاظ ٹھیرایا اور تیسرے کو لائق غور اور ترمیم طلب قرار دیا۔ اور بیان کیا کہ اردو کی بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اردو کے شمالی اور جنوبی روپوں کے اختلافات کے بارے میں بتلایا گیا کہ ہندوستانی کا ارتقا پنجاب سے شروع ہوا اور اس کی تکمیل گجرات اور دکن میں ہوئی۔ سیاسی اسباب کی بنا پر تین شاخوں میں منقسم ہو کر صدیوں تک اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی آخر کار جب ۱۸۳۷ء

میں بہمنی سلطنت کا قیام ہوا تو دکن، شمال سے بالکل الگ ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہند ستانی کے دو روپ ہوگئے ایک شمالی اور دوسرا جنوبی۔ شمالی ہند وستانی پر فارسی کے اثرات مرتسم ہو گئے اور دکھنی پر دراوڑی عناصر کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ان دونوں میں جو اختلافات پیدا ہوگئے ان کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصوتے، مرکب مصوتے اور حروف انفیہ کے باب میں مصوتے کا ایک چارٹ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مصوتوں اور مرکب مصوتوں کا ایک تفصیلی نقشہ بھی ہے، جس میں اردو اعراب کی علامتوں کے ساتھ بین قومی علامتیں، لاتینی علامتیں الفاظ اور معانی درج ہیں۔ بعد میں مصوتوں اور مرکب مصوتوں کی آوازوں کی تشریح مثالوں اور اشکال سے کی گئی ہے۔ حروف انفیہ کے صوتی عمل کو مثالوں کے ذریعے اور صوتی گردونے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مصمتے اور ایقاع۔ اس میں اردو مصمتے کا تقابلی مخارج کے لحاظ سے دیا گیا ہے اور مصمتوں کی آوازوں کو مثالوں اور اشکال کے ذریعے ظاہر کیا گیا اور صوتی گردونوں سے بھی آوازوں کے نتیجوں کو واضح کیا گیا ہے۔ لسانیاتی اصطلاح میں ایقاع سے مراد ایک صوتیہ (دن) کو دوسرے صوتیے کی لیے میں ادا کرنا ہے۔ ایقاع سے متعلق چند اصول مقرر ہیں۔ زبان و مکان کے لحاظ سے زبانوں اور ان کے لفظوں کے تلفظ میں صوتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس کو زبان کا فطری ارتقا کہتے ہیں۔ اس کے تحت تمام اردو دکھنی میں صوتی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ لفظ 'ٹاٹ' جس کے شروع میں اور درمیان میں 'ٹ' آیا ہے وہ دکھنی میں 'تات' ہوجاتا ہے۔ گویا ابتدائی حروف بدل گیا ہے۔ اسی طرح اکبر کا 'ک' اور اچار کا 'چ'، ترتیب وارگ، اور 'غ' کے قریب قریب دکھنی میں بولا جاتا ہے۔ آوازوں کی خصوصیات (ا) زور (ب) ایقاع دوران گفتگو میں جب کبھی کوئی لفظ یا اس کا رکن اہم سمجھا جاتا ہے، تو اس پر خاص زور دے کر کہا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (STRESS) کہتے ہیں (ا) میں زور کا عمل دو رکنی اور تین رکنی اور زیادہ سے رکنی لفظوں کے ساتھ کب کرنا چاہیئے۔ ان کو مثالوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ (ب) میں صوتوں کے تلفظ اور ادائی میں جو اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ ان کی مثالوں کو توضیحی اشکال سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(۲) ہندستانی لسانیات۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے، جو کالج کے طلبا کو جدید علم یعنی لسانیات سے واقف کرانے اور اردو کی خدمت کی خاطر لکھی گئی ہے۔ اس میں دیباچہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور تمہید از خود کے علاوہ حصہ اول میں (۱) لسانیات۔ مقاصد، فوائد اور تاریخ (۲) زبان ——— ماہیئت، آغاز اور تشکیل (۳) نظری ارتقا ——— صوتی تغیر و تبدل، ادغامی اثرات (۴) ادائی تشکیل۔ عوام کا حصہ، عالموں کا اثر اور وضع اصطلاحات (۵) دنیا کی زبانیں ——— طریقۂ تقسیم، مختلف خاندان، ہند یورپی اور ہند ایرانی (۶) ہند آریائی ارتقا ——— ہند آریائی ادوار، آریاؤں کا ورود، گریرسن کا نظریہ (۷) جدید ہند آریائی زبانیں۔ شمال مغربی، جنوب مغربی، وسطی، مشرقی اور جنوبی (۸) ہند کی غیر آریائی زبانیں۔ دروستانی، اوستی، ہند چینی، کول، ڈراویڈی۔ حصہ دوم میں (۱) ہندوستانی کا آغاز۔ مواد، مختلف نظریے اور جدید تحقیقات (۲) ہندستانی کا ارتقا ——— مرکزی تقریق، اختلاف کے اسباب (۳) ادبی بولیاں ——— گجراتی، دکھنی، شمالی (۴) ہندستانی کی ہمہ گیری۔ فتح دکن، تحریک ظہیر، لکھنؤ کی خدمات (۵) عہد حاضر ——— اردو، ہندی کا جھگڑا (۱) اسباب، تاریخ اور اردو کی ضرورتیں۔ حصہ سوم میں (۱) ہندوستان کی زبانیں (۲) اردو زبان کا پھیلاؤ۔ دو نقشے درج ہیں۔

ہمارے علما اردو زبان کے آغاز، ارتقا اور ساخت سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس کا تعلق لسانیات سے ہے۔ اکثر نئے علم سے بے بہرہ ہونے کے باعث اب تک اردو زبان کا صحیح اخذ تحقیق نہ ہوسکا۔ لہٰذا اس مفید اور کارآمد علم کے حصول کے لئے ارباب اردو، تعلیم یافتہ لوگوں کو ترغیب و تشویق دلائیں اور لسانیات کے ماہرین سے اردو زبان میں عام فہم اور دلچسپ کتابیں لکھوا کر شائع کریں تاکہ اردو والے

اُن سے مستفید ہو سکیں۔

آج کل تعلیم یافتہ اس علم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ نیز یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں اس مضمون کو داخل کرنے کے سبب لوگوں میں اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ حکومت بھی مختلف زبانوں کے طلبا میں لسانیات کو مقبول اور ہر دل عزیز بنانے کے لیے میقاتی کورسوں کے ذریعے اس کا پرچار کر رہی ہے۔ چنانچہ اب کی دفعہ حیدرآباد میں مرکزی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے جامعہ عثمانیہ کے اندر گرمائی سکول آف لینگویسٹک قائم کیا گیا جس میں حیدرآباد کے علاوہ ہندستان کے مختلف صوبوں کے طلبا نے بڑی تعداد میں شریک ہو کر اس سے استفادہ کر کے۔

ہندستانی لسانیات ایک مختصر اور مفید کتاب ہے جس میں اہم لسانی مسائل کو سلیس اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ آج سے تیس بتیس سال پہلے اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہ تھی، اس وقت یہی کتاب اردو میں سنگ میل کا کام دے رہی تھی۔ اب جب کہ اس علم کی اشاعت و ترویج سے اس کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اس مختصر کتاب سے آج کے لسانیات جاننے والوں کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس فن میں ایک جامع کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمارے ارباب اردو لسانیات کی طرف خاص توجہ کریں جس کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ ملک کے حالات اور اردو کی ضرورت کے لحاظ سے اس میں جدید کتابوں کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کریں تو ہماری زبان کی بڑی خدمت ہو گی۔

ایک عرصے تک عربی فارسی کے علما اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ کسی زبان کے الفاظ اور ان کے لغات کے مباحث دونوں اصل علم اللسان ہیں، حالانکہ یہ علم زبان کی دو مختلف شقیں ہیں، جو الگ الگ لفظیات یا تشکیلیات اور معنیات کہلاتے ہیں۔ مشرقی تعلیم یافتہ حضرات کو آج سے بتیس سال پہلے محض ہندستانی لسانیات کی بدولت اس کا صحیح علم ہوا اور یہی کتاب نئے علم کی رہنمائی کرتی رہی۔

غرض اس کتاب کی اشاعت سے علم "ا" ان کی نسبت پہلے ہی سے علمائے مشرق میں جو غلط فہمی موجود تھی، وہ رفع ہوئی اور ہماری زبان میں ایک نئے علم کا اضافہ ہوا۔ اس بنا پر ڈاکٹر زور پہلا محسن اردو ہے، جس نے لسانیات جیسے جدید علم سے ہمیں روشناس کیا۔ اور اپنے یورپ کی حاصل کردہ لسانیات اور اس کے تجربات کو کتابی شکل میں پیش کر کے کم مایہ زبانِ اردو کو مالا مال کیا۔ اس کا یہ احسان دارالکلام ہے، جو تاریخ اردو ادب میں یادگار رہے گا۔

ڈاکٹر زور کی موت دنیائے اردو ادب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ مدتوں اس نقصانِ عظیم کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کے استحکام و بقا کے لئے جتنے کام کئے ہیں کہ ان کا نام مٹ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کی بے وقت وفات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصر اردو کا ایک زبردست ستون گر گیا۔ مرحوم نے اردو زبان کی ترقی و بقا کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کی وجہ سے ان کا شمار اردو کے محسنوں کی فہرست میں کیا جائے گا۔ حیدرآباد دکن میں ایوان اردو کی شاندار عمارت اور ایک زبردست کتب خانہ کا قیام ان کی نہ مٹنے والی یادگاریں ہیں۔ مرحوم رفاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور طلبا، میں اور پبلک میں اور حکام میں یکساں طور پر ہر دل عزیز تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ اکیلے ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا انتقال سری نگر میں جہاں وہ شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوا۔ خدا انھیں اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔

(ماہنامہ کتابی دنیا کراچی۔ اکتوبر اور نومبر ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر خلیق انجم

زور ـ ایک ماہر لسانیات

دکن کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ اردو نظم و نثر دونوں کی باقاعدہ ابتدا اس کی سرزمین سے ہوئی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اردو کا سب سے پہلا ماہر لسانیات بھی خاک دکن سے اٹھا۔ زور صاحب کی تحقیق سے قبل اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں عجیب عجیب مضحکہ خیز خیالات تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اردو نے فارسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بڑے وثوق کے ساتھ آب حیات میں لکھا تھا کہ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان برج بھاشا سے نکلی۔ اور برج بھاشا خالص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ عجیب خیالات کا اظہار ایک صاحب نظر ادیب اور دیدہ ور نقاد مولانا سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں کیا تھا۔ "یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی"[1]

ہندوستانی پر بعض یورپین ماہرین لسانیات نے بھی کام کیا ہے مگر ان میں سے کسی کی توجہ ہندوستانی اور پنجابی کے باہمی تعلق پر نہیں گئی۔ یہ شرف ایک ہندوستانی ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر ٹورنے "ہندوستانی لسانیات" پر ایک مقالہ لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں۔ شوکت سبزواری صاحب نے "اردو زبان کا ارتقا" میں لکھا ہے کہ مولانا شیرانی مرحوم (حافظ محمود شیرانی مولف "پنجاب میں اردو") کا اردو داں طبقہ کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے غالباً اردو میں سب سے پہلے اردو کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کے خط و خال کا گہرا حکیمانہ مطالعہ کیا۔ اور پنجابی، سرائیکی، برج بھاشا سے اس کا مقابلہ کر کے اردو داں طبقہ کو تقابلی لسانیات کی ہلکی سی جھلک دکھائی۔ زور صاحب مرحوم ۱۹۲۷ء میں لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی لسانیات پر مقالہ لکھ رہے تھے تو تقریباً انھیں نتائج پر پہنچے تھے۔ شیرانی صاحب کی کتاب پہلی بار ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دونوں تقریباً ایک ہی قسم کے نتائج پر پہنچے تھے۔ زور صاحب کے الفاظ میں فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا

---

[1] مولانا مرحوم نے جب "نقوش سلیمانی" میں اردو کے آغاز کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا، تو حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" اور زور صاحب کی "ہندوستانی لسانیات" شائع ہو چکی تھیں۔

تھا[1]۔ اس مختصر سی بحث سے میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ زور صاحب اور شیرانی صاحب ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور اور ایک دوسرے کی تحقیق سے بالکل بے خبر تقریباً ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اس لئے اس تحقیق کا سہرا ان دونوں کے سر بندھنا چاہیئے۔

زور صاحب کی "ہندوستانی لسانیات" اردو لسانیات پر پہلی کتاب ہے۔ جو کسی ہندوستانی نے لکھی۔ اور جس میں لسانیات کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کا جائزہ لیا گیا۔ اس کتاب کے سلسلے میں زور صاحب تین سال تک لندن اور پیرس کی درس گاہوں میں مصروف رہے۔ یہ اُن کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہرین لسانیات کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز لندن کے پروفیسر آر۔ ال۔ ٹرنر اور ہندوستانی زبان کے ماہر ڈاکٹر گراہم بیلی نے زور صاحب کی بہت مدد کی۔ اور بہت قیمتی مشورے دیے۔ سوربون یونیورسٹی پیرس کے مدموزیل دیران اور کالج دے فرانس کے پروفیسر شراک نے تجرباتی صوتیات میں ان کی رہنمائی کی ڈاکٹر جیولز بلاک کی رہنمائی میں زور صاحب نے اردو کی گجراتی شکل پر ڈی لٹ کے لئے کام کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ مکمل نہیں ہو سکا۔

ہندوستانی لسانیات میں زور صاحب نے علم لسانیات کے مقاصد و فوائد اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈال کر یہ بتایا ہے کہ زبان کی ماہیت کیا ہے۔ کسی زبان کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ اور کن کن ارتقائی منزلوں سے گزرتی ہے۔ الفاظ کی ساخت اور تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ زبان سے متعلق عام معلومات فراہم کرنے کے بعد زور صاحب نے دنیا کی زبانیں اور انکے مختلف خاندان بیان کئے ہیں اور پھر ہند ایرانی خاندان اور اس کی مختلف زبانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرے حصے میں انھوں نے ہندوستانی کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ اُن کے اس وقت کے اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتا چلا ہے۔ یہ واقعہ دراصل بارھویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے۔ کہ موجودہ زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش شروع کی جو آج انھیں ایک دوسرے سے جدا ظاہر کرتے ہیں[2]۔ اس کتاب کے

---

[1] اردوئے معلی۔ لسانیات نمبر صفحہ ۸۹۔

[2] ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی بنیاد "ہریانی" ہے۔ مگر اُن کے دلائل قابل قبول نہیں ہیں۔ اور بقول زور صاحب:

"اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اہم فروگزاشت یہ ہوئی کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی کر کے نتائج اخذ کئے ہیں حالانکہ دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشو و نما حاصل کیا اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ (اردوئے معلی لسانیات نمبر صفحہ ۶۹)

آخری باب میں زور صاحب نے اردو اور ہندی کے تنازع کا لسانی جائزہ لیا ہے۔ اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ اردو اور ہندی کے جھگڑے کی تمام تر ذمہ داریاں انگریزوں پر ہیں۔ جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ہندو منشیوں کو سمجھایا کہ فارسی رسم خط بدیسی ہے اس کا سرزمین ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ان منشیوں سے ہندو مسلمانوں کی عام مشترکہ زبان کو ہندی رسم خط میں لکھوانا شروع کیا۔ انگریزوں کی ان ناپاک کوششوں نے بہت جلد مذہبی رنگ اختیار کیا مسلمان ہندوستانی کو فارسی رسم خط میں لکھتے اور اس میں عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے۔ اس کے برعکس ہندو دیوناگری رسم خط میں لکھتے اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال ہوتا۔

اس سلسلے میں زور صاحب کی دوسری کتاب "ہندوستانی صوتیات" ہے۔ یہ انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ اور ہندوستانی لسانیات سے دو سال قبل پریس سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اس زبان کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ جو بقول مصنف جید آباد دکن کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں۔ اردو زبان پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس میں جدید تحقیق اور سائنٹفک ٹیکنک کے مطابق اردو کے مصوتوں اور مصمتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک ماہر لسانیات ڈاکٹر جیولنیاک نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ وہ زور صاحب کی لسانی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:—

"ابھی تک ایسی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جن میں ہندوستانی زبانوں کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہو۔ اُن کی تعداد کو بڑھانے کے لئے ڈاکٹر قادری (زور صاحب مرحوم) کو ایک غیر مطبوعہ کتاب کا حوالہ دینا پڑا۔ ہندوستان کی زبانوں میں "ہندوستانی" کا تمام دنیا میں مطالعہ ہوتا رہا ہے۔ خاص طور پر یہ بات عجیب ہے کہ اس زبان کا بھی کوئی اس قسم کا جائزہ لیا گیا۔ اکثر و بیشتر تلفظ کے مسائل پر بڑی قابلیت کے ساتھ اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر مجموعی حیثیت سے کام نہیں کیا گیا اور یہی وہ کام ہے جس کی لسانیات کے مطالعہ اور عملی مقاصد کے لئے ضرورت ہے۔

یہ امر قابل تحسین ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم ایک ہندوستانی اسکالر نے اٹھایا ہے۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

زور صاحب نے علم لسانیات کو جہاں تک پہنچایا تھا افسوس ہے کہ اُس میں بہت کم اضافہ ہو سکا ہے۔ ہندی میں لسانیات پر بہت کام ہو رہا ہے، مگر اردو والے اس طرف بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔

رشید الدین

ڈاکٹر زور کے تین لافانی کام

میر نے کہا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم بھی ایک ایسے ہی انسان تھے ان کی ذات پر ان کا ملک و قوم اور زبان و ادب بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ دنیا میں ہر روز کئی آدمی پیدا ہوتے ہیں اور کئی مرتے ہیں۔ مگر ان میں بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جن کی پیدائش کے ساتھ ہی کسی قوم یا خطے کی قسمت چمک اٹھتی ہے یا جن کی کمی ان کے مرنے کے بعد بھی بُری طرح محسوس کی جاتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے پیچھے آنے والی نسلوں کے لئے ایک گنج گراں مایہ چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے بھی ہمارے اور ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے اردو زبان و ادب میں ایسا ہی گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ عام انسانوں کی طرح زمین پر بوجھ بن کر نہیں رہے۔ اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ بھرنا، تن ڈھانکنا اور چار پیسے جمع کرنا ہی ان کا مقصد زندگی نہ رہا۔ بلکہ اپنی زبان و ادب کی خدمت اور اپنی تہذیب و تمدن کی ترقی ان کا شعار تھا۔ انھوں نے اپنے سے پہلے کے ہم زبان و ہم ادب لوگوں سے جو کچھ حاصل کیا اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور آنے والی نسلوں کو یہ ورثہ سونپ کر چپ چاپ اور اچانک وادی کشمیر میں ابدی نیند سو گئے۔ اور اب تو اس بات کو بھی ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔

اردو زبان و ادب کی ساری تاریخ میں ہمیں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے بعد ڈاکٹر زور ہی ایسے انسان نظر آتے ہیں جنھوں نے تن من دھن سے اردو کی خدمت کی۔ مولوی عبدالحق کی طرح انھیں بھی اردو سے ایک عشق سا تھا۔ مگر یہاں ڈاکٹر زور کی اہمیت کچھ اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے یا ہمارے نزدیک زیادہ قابل تحسین ہو جاتی ہے کہ وہ پہلے دکنی آدمی تھے جنھوں نے زبان و ادب کی ان گتھیوں کو سلجھایا ہے اور زعم طور پر اس زمانے میں یو۔پی کے لوگ ہی اہل زبان اور اہل علم و ادب و مستند اور دکنی اجڈ و گنوار سمجھے جاتے تھے جنھیں علم و ادب اور زبان و تہذیب سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ بعد میں پروفیسر عبدالقادر سروری۔ سید محمد۔ نصیر الدین ہاشمی اور نمکین کاظمی مرحوم جیسے دکن کے لوگوں نے بھی زبان و ادب اور تحقیق و تنقید کا کام کیا مگر اس سلسلے میں پہل کا سہرا ڈاکٹر زور مرحوم ہی کے سر ہے۔ ڈاکٹر زور سے میری عقیدت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میری ہی آبائی سرزمین مرہٹواڑہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت بڑی پہلو دار اور ہمہ رنگی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی۔ مزاح بھی تھے اور نقاد بھی۔ ماہر لسانیات بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی۔ کوئی چالیس سال تک وہ زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اور

چالیس کے قریب ہی ان کی مستقل تصنیفات بھی تھیں۔ چیدہ چیدہ مضامین کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہیں سمجھتا ہوں خود مرحوم بھی اپنی زندگی میں ان کی صحیح تعداد سے واقف نہ ہوں گے۔ اس کاغذی اور نظری کاموں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں اردو کے عملی طور پر بھی بہت کام کیا ہے۔ اس طرح ان کے نظری اور عملی ہر دو کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ یقیناً اُن کے یہ سارے کام بے حد اہمیت کے حامل اور قابل قدر ہیں۔ مگر میرے خیال میں ان کے مندرجہ ذیل تین کام تو ایسے ہیں جو لافانی ہیں اور اردو زبان و ادب میں تا ابد یاد رکھے جائیں گے۔ زمانے کی ترقی اور بدلتی ہوئی قدریں ان پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی :۔

(۱) کلیات قلی قطب شاہ (۲) ہندستانی لسانیات (۳) ادارۂ ادبیات اردو

گولکنڈہ کے پانچویں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی تدوین جو قدیم دکنی زبان میں ہے، ڈاکٹر زور کا ایک زبردست کارنامہ ہے کسی گمنام شاعر کے کلیات کو مرتب کرنا ایسا کوئی معرکے کا کام بھی نہیں کہا جا سکتا مگر اس کی اہمیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس سے اردو ادب (اور خصوصاً شاعری) کی عمر میں ایک قابل لحاظ مدت کا اضافہ ہو گیا۔ ورنہ اس سے قبل ولی کو ہی اُردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر فاضل مرتب نے صرف اس کے سارے بکھرے ہوئے اور چیدہ چیدہ کلام کو یکجا ہی نہیں کیا (مگر اپنی جگہ یہ بھی ایک اہم کام ہے) بلکہ اس کے ساتھ (۳۳۵) صفحات کا ایک طویل، بسیط اور پُر مغز مقدمہ بھی لکھا جس میں قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اور معاشرتی حالات بیان کرنے کے علاوہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا شاعر ہے اور دکنی اردو کی ہی ایک قدیم شکل ہے۔ یہ ڈاکٹر زور مرحوم کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ اہل ذوق حضرات سے داد وصول کرتا رہے گا اور آنیوالی نسلوں کا کوئی سخت سے سخت نقاد بھی اس کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے گا۔

ایک ہزار سے بھی زیادہ صفحات کی یہ ضخیم اور عظیم کتاب قلی قطب شاہ کی (۲۲۰) نظموں (۳۱۲) غزلوں اور کچھ قصائد رباعیات اور مثنویات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس کام کے لئے انھیں کتنی زحمت نہ اٹھانی پڑی ہوگی اور کس کس کتب خانہ اور علم گاہ کے طواف نہ کرنے پڑے ہوں گے۔ اس چیز سے کچھ وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ کی خاک چھانی ہو۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کے لئے جو بھی محنت و مشقت برداشت کی اس کا صلہ انھیں مل چکا ہے اور یہ کتاب اردو کی ایک غیر معمولی اور اَن ہٹ کتاب تسلیم کی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی زبان پر اور بھی کام کیا ہے اور بہت سے قدیم شاعروں اور ادیبوں کی چیزیں تلاش کر کے مرتب اور شائع کی ہیں مگر انھیں وہ مقام اور شہرت نہ مل سکی جو کلیات قلی قطب شاہ کے حصہ میں آئی ہے۔ اس لئے ان کے دکن کے تعلق سے کئے گئے سارے کام میں میری نظر اس کتاب پر پڑی اور میرا خیال ہے مستقبل میں جب ہماری یہ نسل نہ ہوگی اور شخصی طور پر ڈاکٹر زور سے کوئی واقف نہ ہوگا اس وقت بھی یہ کتاب اتنی ہی اہمیت کی حامل ہوگی جتنی آج ہے۔ بلکہ جب قدامت کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی اور وہ اُردو کی کلاسیکی کتابوں میں شمار ہوگی۔

کلیات قلی قطب شاہ کی تدوین کے بعد ڈاکٹر زور کا دوسرا اہم کارنامہ "ہندوستانی لسانیات" ہے۔ یہ کتاب اردو میں لسانیات کے موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے اور آج بھی اردو میں اس موضوع پر ہمیں کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جسے ہم اس کے مدمقابل رکھ سکیں۔ اس کتاب کا بیشتر مواد ڈاکٹر زور نے لندن میں اپنے قیام کے دوران جمع کیا تھا۔ ان میں فطری طور پر لسانیات سے دلچسپی تھی اور وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے دوران ہی اس پر کام کرنا چاہتے تھے، مگر یہ ممکن نہ ہو سکا انگلستان میں جب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے گئے تو وہاں انھیں ڈاکٹر گراہم بیلی، پروفیسر ڈانیل جونس اور پروفیسر ٹرنر جیسے ماہر لسانیات کے

ہندوستان میں بھی رہ چکے تھے اور اردو سے اچھی طرح واقف ہونے کے علاوہ ہندوستانی لسانیات کے بھی ماہر تھے۔ ان اساتذہ کے لکچروں سے ڈاکٹر زور مرحوم کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوا اور ان کا وہ شوق جو ایک زمانہ سے نامساعد حالات کی وجہ سے دبا ہوا تھا پھر جاگ گیا۔ چنانچہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اپنے مقالے کی تیاری کے ساتھ ساتھ (پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے ڈاکٹر صاحب کا موضوع "اردو کا آغاز اور ارتقاء" تھا) انھوں نے اس پر بھی کام کیا اور ایک قابل لحاظ مواد اکٹھا کرنے میں وہ کامیاب بھی ہو گئے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ہندستانی لسانیات کے موضوع پر راست قلم اٹھانے سے پہلے ڈاکٹر زور مرحوم نے ابتدائی تین چار ابواب لسانیات کے عام مطالعہ کے لئے مختص کئے ہیں۔ اس میں انھوں نے لسانیات سے پڑھنے والوں کا اچھی طرح تعارف کروایا ہے اور زبان اور علم زبان سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا تجزیہ کیا ہے اور انھیں مختلف گروہوں میں بانٹا ہے۔ اپنی بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے انھوں نے مختلف جدول بھی کتاب میں دئے ہیں۔ اردو کی ابتدا اور نشو و نما پر بھی انھوں نے اس کتاب میں بحث کی ہے۔ عام طور پر اس باب میں ہمارے ماہران لسانیات اور ماہران ادب کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ زور صاحب نے اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی (پروفیسر پنجاب یونیورسٹی) کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے اردو کی ابتدا و کا سہرا مسلمانوں کے دہلی فتح کرنے سے بھی قبل سرزمین پنجاب کے سر باندھا ہے۔ غرض اس کتاب میں بہت کچھ ہے، یہاں اس مختصر سے مضمون میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو تمام کلیات قلی قطب شاہ مرتب کر کے زور صاحب کے ایک محقق کے طور پر ملا ہے وہی مقام اس کتاب کی وجہ سے انھیں اردو میں ایک ماہر لسانیات کے طور پر بھی حاصل ہوا ہے۔ لسانیات اور صوتیات کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی بعض اور تصنیفات اور مضامین بھی ہیں مگر میرے خیال میں اس کتاب کے لکھنے کے بعد وہ اس موضوع پر کچھ نہ بھی لکھتے تو ان کی حیثیت میں فرق آنے والا نہیں تھا۔ "کلیات قلی قطب شاہ" کی طرح "ہندوستانی لسانیات" بھی ہمیشہ اہمیت اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور زور صاحب کی یاد دلاتی رہیگی۔

ان دو نظری اور تصنیفاتی کاموں کے علاوہ اردو کے لئے زور صاحب نے ایک بہت اہم عملی کام بھی کیا ہے۔ اور وہ ہے "ادارۂ ادبیات اردو" کا قیام۔ یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا۔ اس کام میں زور صاحب کے چند ساتھیوں کا بھی تعاون شامل رہا مگر حق بات تو یہ ہے کہ اس کام میں مرکزی حیثیت زور صاحب کو ہی حاصل تھی اور آخر تک رہی۔ زور صاحب اور ادارۂ ادبیات اردو بعد میں چل کر لازم و ملزوم ہو گئے۔ اور نئی نسل کے لوگوں کو تو یہ غلط فہمی بھی پیدا ہو گئی تھی کہ یہ زور صاحب کا ذاتی ادارہ ہے اور وہ تن تنہا اس کے کرتا دھرتا اور مالک ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بعد کو جب اس ادارہ کی اپنی عالیشان عمارت "ایوان اردو" تعمیر ہوئی تو حیدرآباد میں عام طور پر اسے زور صاحب کا ایوان اردو کہا جانے لگا۔ جس طرح مولوی عبدالحق مرحوم کے نام کے ساتھ ہی انجمن ترقی اردو کا خیال آجاتا ہے بالکل اسی طرح ڈاکٹر زور مرحوم کا نام بھی ذہن میں آتے ہی فوراً خیال ادارہ ادبیات اردو کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد اردو زبان و ادب کا اچھا ذوق پیدا کرنا نوجوانوں میں لکھنے اور پڑھنے کی عادت ڈالنا، عوام میں اردو زبان کا شوق پیدا کرنا، تاریخ و تمدن اور دکنی کلچر و آثار کی حفاظت کرنا اور ایک اچھا سا کتب خانہ قائم کرنا تھا۔ ادارہ کے یہ سارے کے سارے مقاصد

کیا حصہ پورے ہوئے اور وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مندرجہ بالا مقاصد کو سامنے رکھ کر ادارہ کو کئی شعبہ جات میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر شعبہ میں اس سے متعلقہ قابل اشخاص کی ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ چنانچہ شعبہ زبان۔ شعبہ تالیف و ترجمہ۔ شعبہ تنقید۔ شعبہ تاریخ دکن۔ شعبہ شعراء و مصنفین دکن۔ شعبہ سائنس۔ شعبہ کتب خانہ اور شعبہ انسائیکلو پیڈیا اس کی مثالیں ہیں۔ یہاں سے اب تک کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ ایک ادبی رسالہ "سب رس" جاری کیا گیا جو ۱۹۳۸ء سے لیکر آج تک برابر پابندی سے نکل رہا ہے اور جس کا "زور نمبر" اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بچوں کے ادب کے فروغ کیلئے "سب رس" کا بچوں کا ایڈیشن بھی نکلتا مگر وہ بہت دن ہوئے بند کر دیا گیا ہے۔ ادارہ کے تحت ہر سال اردو زبان کے امتحانات منعقد کئے جاتے ہیں جس کا سلسلہ آج تک پابندی اور کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ "ایوان اردو" میں ادارہ کے تحت ایک میوزیم بھی ہے جہاں دکنی کلچر اور اردو زبان کے تمام آثار محفوظ کر دئے گئے ہیں۔ ایک دار المطالعہ ہے جہاں ہندو پاکستان کے تمام اخبارات اور رسائل آتے ہیں۔ آج ادارہ کا سب سے اہم شعبہ کتب خانہ ہے جس کے ذکر کے بغیر میرے خیال میں ادارہ کا ذکر نامکمل ہی رہیگا۔ یہ کتب خانہ ایوان اردو کی اوپری منزل میں ہے۔ درجنوں بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جدھر نظر دوڑائیے آپ کو کتابوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر ایسا نہیں کہ صرف قدیم کتابوں کا ہی ذخیرہ ہے یا پھر تمام جدید کتابیں ہیں نہیں بلکہ یہ کتب خانہ ان دونوں قسم کی کتابوں سے مالا مال ہے یہاں نہ صرف قدیم اور جدید مطبوعہ کتب ہی ہیں بلکہ اردو مخطوطات کی بھی ایک وافر تعداد موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان سے اردو کے ریسرچ اسکالرس اس کتب خانہ سے استفادہ کے لئے حیدرآباد آتے ہیں۔ یہاں ایسے ریسرچ اسکالرس کے لئے ایک مہمان خانہ بھی تعمیر کیا گیا ہے جہاں وہ قیام کر کے اپنا ادبی اور تحقیقی کام کر سکتے ہیں۔ اس کتب خانہ میں قدیم رسالوں اور اخباروں کی بھی فائلیں موجود ہیں چنانچہ "اودھ پنچ" کی فائل کتب خانہ میں میری نظر سے گزری۔ اور بھی دہلی اور لکھنؤ و حیدرآباد کے تمام قدیم اخبارات و رسائل یہاں محفوظ ہیں خصوصی مجلد کر کے رکھا گیا ہے۔ میں جب بھی اس کتب خانہ میں جاتا ہوں کبھو سا جاتا ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پڑھا جائے اور کیا نہ پڑھا جائے۔ اس اثناء میں میز کے ساتھ کھڑے کھڑے اور قدیم اخباروں اور رسالوں وغیرہ کی ورق گردانی کرتے کرتے کافی وقت گزر جاتا ہے اور آخر لائبریرین صاحب خود کہتے ہیں "جناب آپ یوں کب تک کھڑے رہیں کے بیٹھ کر پڑھئے نا"۔ غرض ادارہ ادبیات اردو کا یہ کتب خانہ بڑی نادر چیز ہے۔

زور صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو کو اتنی مستحکم بنیادوں پر قائم کیا تھا اور اس کا انتظام اتنے منظم طریقہ پر چلاتے تھے کہ آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے اس وقت بھی ادارہ اسی طرح کام کر رہا ہے جس طرح ان کے زمانے میں کرتا تھا۔ ہر چیز ویسی ہی ہر کام ویسا ہی ہو رہا ہے۔ کچھ بگڑا نہیں کچھ رکا نہیں کچھ تھما نہیں۔ آج بھی جب میں "ایوان اردو" جاتا ہوں تو مجھے ڈاکٹر زور کی عظمت و محنت بے پناہ یاد آجاتی ہے۔ واقعی بڑے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مر کر بھی نہیں مرتے۔ وہ ہم میں نہیں ہوتے مگر ان کا کام برابر ان کی یاد دلاتا رہتا ہے اور ان کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔ ڈاکٹر زور ہی کا ایک شعر ہے ؎

موت سے بھی ہم ڈریں گے نہیں زور ہم زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

واقعی ڈاکٹر زور کے یہ تین کام ایسے ہیں جنھوں نے انھیں جاوداں بنا دیا ہے اور وہ مر کر بھی نہیں مرے۔

پروفیسر انور علی انور

ڈاکٹر زور کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اردو کے ایک ممتاز ادبی نقاد اور لسانیات کے عظیم محقق کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی مشہور و معروف شخصیت تھے جن کے علمی و ادبی کارناموں پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب کی جو بیش بہا اور گراں مایہ خدمات سرانجام دی ہیں انھیں اردو ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے ادبی کارنامے اس قدر عظیم الشان ہیں کہ اب اُنکی ہستی محض ایک فرد کی حیثیت نہیں رکھتی ایک مستقل ادارہ بن چکی ہے۔ ان کی ادبی و لسانی خدمات کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ اُن کی لسانی تحقیق کے کام سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دوسرا حصہ شعر و ادب کی تنقید سے۔ اور ان دونوں حیثیتوں میں اُن کی خدمات بڑی قابل قدر اور وقیع ہیں۔ لسانی تحقیق کے سلسلے میں زور صاحب کی تصنیفات "اردو شہ پارے" اور "ہندوستانی لسانیات" اس موضوع پر "حرفِ آخر" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ زور صاحب نے کئی ایک شعرا کی زندگی اور فن کے بارے میں تحقیقی نوعیت کا کام کیا ہے۔ مختلف علمی اور لسانی موضوعات پر گراں قدر مقالے ترتیب دیے ہیں۔ غرضیکہ علم و تحقیق کے میدان میں اُن کی خدمات بڑی قابل قدر اور مستحق ستائش ہیں جنھیں ادبی تاریخ کا کوئی مرتب نظر انداز نہیں کر سکتا۔

تحقیق کے علاوہ زور صاحب نے تنقید کے میدان میں بھی اپنی عظمت و برتری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ وہ دراصل اردو ادب کے سب سے پہلے قابل ذکر نقاد ہیں جنھوں نے جدید تنقیدی اصولیات و مبادیات سے قارئین اردو کو روشناس کیا ہے اور تنقید کے موضوع پر بلند پایہ علمی کتابیں لکھی ہیں جن میں علم الانتقاد خاص ایک فن کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے اور اُسی کے اہم ترین مسایل کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

نظری تنقید کے علاوہ زور صاحب نے عملی تنقید کے میدان میں بھی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور تنقید جدید کی روشنی میں اردو شعرا و ادبا کی نگارشات کے حسن و قبح پر بحث کی ہے۔ اُن کی قدر و اہمیت متعین کی ہے۔ ان حقایق کی موجودگی میں گیسوئے اردو کو سلجھانے اور آراستہ کرنے میں زور صاحب کا جو کارنامہ ہے اُس کی افادیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

تنقید ادب کے سلسلے میں زور صاحب کا بلند ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس موضوع پر خالص علمی اور لہجہ کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور اس فن کے مخصوص مسائل سے اردو داں طبقے کو متعارف کیا ہے۔ عام طور پر ادب کی تاریخ میں حالی کو اردو شعر و ادب کا اولین نقاد قرار دیا جاتا ہے۔ اور اُن کے مقدمۂ شعر و شاعری کو اسی نوع کی اولین تصنیف بھی۔ حالی اردو تنقید کی تاریخ میں "امام اور مجدد" کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ جدید اصولیاتِ

تنقید سے ناآشنا تھے اور اس کے لوازمات و مقتضیات کا شعور نہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فن تنقید نگاری خالصتاً مغربی اثرات کی پیداوار ہے۔ ہمارے قدیم ادبی سرمایے میں اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ عالی مغربی تعلیمات سے مستفید نہیں ہوئے تھے۔ اس وجہ سے فن تنقید نگاری کے مخصوص احوال و کوائف کی بھی انھیں خبر نہ تھی۔ اردو زبان میں تنقید کے موضوع پر ٹھوس علمی نوعیت کا کام کرنے کے لئے کوئی ایسا شخص موزوں ہو سکتا تھا جو ایک طرف تو اپنی زبان کی مخصوص روایات اور اس کے ذہن و مزاج کی کیفیات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اور دوسری طرف جدید مغربی علوم کے سرچشموں سے بھی اپنی پیاس بجھا چکا ہو۔ زور صاحب کی ذات میں یہ دونوں خوبیاں جمع تھیں۔ وہ محض مشرقی علوم ہی کے فارغ التحصیل نہ تھے۔ مغربی ادب و فن کی روایات میں بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فطری ذہانت اور اکتسابی صلاحیت سے کام لے کر اردو زبان میں سب سے پہلے تنقید کے موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کی۔ اور اس فن کے بارے میں علمی اور معیاری کتابیں تصنیف کیں جو آج تک تنقیدی ادب میں لاثانی اور بے مثال سمجھی جاتی ہیں۔

زور صاحب کی تنقیدی نگارشات دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم تو اُن متفرق تحریروں اور مقالوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے متعدد قدیم معروف اور غیر معروف شعراء کے کلام کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے کے لئے سپرد قلم کئے۔ اس قسم کی تحریریں زور صاحب کی عالمانہ بصیرت اور ناقدانہ دقیق النظری کا بین ثبوت ہیں اور اردو ادب کا قیمتی اور لازوال سرمایہ ہیں۔ جس کی افادیت ہر لحاظ سے مسلّم ہے۔ شعراء کے فکر و فن پر اظہار خیال کے دوران میں زور صاحب نے بسا اوقات بڑے مفید اور نادر نکات بیان فرمائے ہیں اور بڑی خیال افروز باتیں درج کی ہیں۔ ایسے مقالات ہند و پاکستان کے بیشتر علمی و ادبی رسائل کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں اور مکمل طور پر کتابی صورت میں اُن کی اشاعت وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

متفرق نگارشات کے علاوہ اردو تنقید نگاری کی تاریخ میں زور صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کی وہ مشہور اور لاجواب ادبی تصنیفات ہیں جو ہند و پاکستان کے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ اور جنھیں اردو کے تنقیدی ادب میں کلاسیک کا رتبہ حاصل ہے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل تین کتابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں:—

۱۔ روح تنقید ۲۔ تنقیدی مقالات ۳۔ اردو کے اسالیب بیان

یہ ہر سہ کتب فن تنقید نگاری کے بہترین معیار کو پیش کرتی ہیں۔ اول الذکر کتاب میں فن تنقید کے اصولیات و مبادیات سے بحث کی گئی ہے۔ اور تنقید کے اہم ترین مسائل پر زور صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔ تنقید کے موضوع پر زور صاحب کی یہ سب سے پہلی کاوش ہے۔ اور غالباً نظریاتی تنقید کے مسائل کے بارے میں اردو کی اولیں تصانیف میں سے ہے۔ یہ کتاب لکھ کر زور صاحب نے گویا کہ اردو ادب میں علم الانتقاد کی بنیاد رکھی ہے اور خود ہی اس بنیاد پر ایک عظیم عمارت تعمیر کرنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی ہے۔

اصولیات تنقید کے علاوہ زور صاحب نے تنقید نگاری کے عملی پہلوؤں پر بھی توجہ صرف کی اور تنقیدی مقالات اور اردو کے اسالیب بیان جیسی مفید اور معلومات افزا کتابیں لکھیں۔ "تنقیدی مقالات" میں فاضل مصنف نے جدید تنقیدی اصولوں کی رو سے اردو کے مشاہیر فن کی نگارشات کو جانچا اور پرکھا ہے اور اُن کے محاسن و معائب اجاگر کئے ہیں۔ یہ کتاب عملی تنقید نگاری کا ایک کامیاب تجربہ پیش کرتی ہے اور اردو ادب کے بیشتر عظیم فن کاروں کی ادبی تخلیقات کی

صحیح قدر و اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

اردو کے اسالیب بیان' ایک منفرد تنقیدی تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے زور صاحب کے ادبی شعور اور اُن کی ناقدانہ ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ زور مرحوم اردو ادب کے ایک عظیم محقق اور مبصر تھے جو اردو زبان کے ذہن و مزاج کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ اور ادبی اسالیب اظہار و بیان کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس کتاب میں زور صاحب نے اردو کے قدیم و جدید اساتذۂ فن کے طرز و اسلوب پر رائے زنی کی ہے اور اُن کی انفرادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اردو نثر نویسی کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

زور صاحب کے تنقیدی شعور کا مفصل طور پر جائزہ لینا ایک مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تمام تر خصوصیات تنقید کو پوری وضاحت سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ مختصراً اُن کی تنقیدی تحریروں کے چند ایک محاسن و خصائص درج کئے جا چکے ہیں۔

جیسا کہ پیشتر ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ اُن کے تنقیدی شعور کا سب سے نمایاں پہلو اُن کی وسیع علمیت اور عمیق بصیرت ہے۔ اُن کی نگاہیں مشرق و مغرب کے علوم کا احاطہ کئے ہوئے تھیں اور اُن کا ذہن دنیا بھر کے علمی خزانوں کے فیض سے معمور ہو چکا تھا۔ روح تنقید میں زور صاحب نے کثرت سے مشرق و مغرب کے ائمہ فن کی آراء نقل کی ہیں اور اُن کے اقوال دہرائے ہیں۔ اس سے اُن کی وسعت مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک اچھے نقاد کے لئے نظر کی وسعت اور ادراک کی گہرائی بنیادی اوصاف ہیں۔ اور یہ چیزیں کثرت مطالعہ کے بغیر نصیب نہیں ہوتیں۔ زور صاحب کی تنقیدوں میں یہ اوصاف نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ اور ان کی فنی مہارت اور مشاقی کی دلیل مہیا کرتے ہیں۔

زور صاحب کے تنقیدی رجحان کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ محض مشاہیر و ائمہ فن کے اقوال نقل ہی نہیں کرتے بلکہ خود اپنی بصیرت اور فن شناسی سے مفید اور موزوں نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اور بحث کو کسی نہ کسی قطعی فیصلے تک کھینچ لیجاتے ہیں۔ اس سے ان کی تنقیدی تحریروں میں الجھاؤ کا عیب واقع نہیں ہوتا۔ یہ بات زور صاحب کو عصر حاضر کے اکثر ممتاز نقادوں سے ممتاز کرتی ہے۔ آج کل کے کئی ایک نقادوں کی تحریریں بہت زیادہ الجھی ہوتی ہیں اور انھیں پڑھ کر قاری کسی نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ اکثر لوگ اسی عیب کی وجہ سے تنقیدی تحریروں کو پڑھتے ہوئے بیزاری محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسکے برعکس زور صاحب کی تنقیدیں ادبی لحاظ سے دلچسپ اور افادی اعتبار سے سود مند اور نفع بخش ہوتی ہیں۔ اور قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔

زور صاحب کی تنقید نگاری کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ہر مسئلے اور موضوع پر پوری شرح و تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ اور زیر نظر موضوع کے کسی گوشے کو نظر انداز نہیں کرتے اُن کی تنقیدیں اپنی جامعیت اور وسعت کے لحاظ سے بڑی قابل قدر اور مستحق تحسین ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے متفرق اور متضاد پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں یا بحث کے دوران میں کسی خاص جگہ پر ایک قطعی اور واضح نقطۂ نگاہ درج کر دیتے ہیں جس سے قاری کا ذہن متضاد پہلوؤں کی الجھنوں سے بچ جاتا ہے اور ایک قطعی نتیجے تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً روح تنقید میں "تنقید کی تعریف" کے موضوع پر متعدد مشاہیر کے نظریات و عقائد پیش کر کے ساری بحث کا ملخص ان الفاظ میں درج کیا ہے۔

"غرضیکہ فن تنقید اُس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کے حرکات و افعال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔ صحیح و غلط اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانے، وقتیہ معتقدات اور ذاتیات کو ملیامیٹ کرنے۔ نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں۔"

ملاحظہ کیجئے کتنی عمدگی اور مہارت سے ایک الجھی ہوئی بحث کو چند الفاظ میں سلجھا کر دکھایا ہے۔

تحریر و نگارش کی یہی پاکیزگی اور صفائی زور صاحب کا امتیازی وصف ہے۔ جو اُن کی تمام تنقیدی تحریروں میں جھلک رہا ہے یہ کمال ایک کہنہ مشق استاد اور ماہر فن ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زور صاحب نے اپنی تنقیدی تحریروں میں ایک اور چیز کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے وہ ادبی و شعری نظریات کو بیان کرتے ہوئے اُن کی صحت و صداقت کی دلیل کے طور پر ممتاز مشاہیر کی ادبی و فنی تخلیقات میں سے موزوں اور برمحل حوالے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اُس کی درستی اور صحت پر یقین کرلینے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات گہرے ادبی شعور اور مسلسل محنت و کاوش کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ آجکل کی ادبی تحریروں میں یہ خوبی بہت حد تک مفقود ہے زور صاحب نے بالعموم اپنی تنقیدوں میں حوالے اردو شعراء و ادبا کی نگارشات ہی سے اخذ کئے ہیں جس سے اُن کی ذاتی تحقیق اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔

زور صاحب کو اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے تمثیل پیش کرنے کا بھی خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے انھوں نے کسی نہ کسی عمدہ تمثیل کے ذریعہ اپنے زاویہ نظر کی توجیہ کر دی ہے۔ مثلاً ادب اور فنون لطیفہ کا فرق بیان کرتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہوئے ہیں۔

"دنیا میں مختلف طبقے پیدا کئے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی جداگانہ قابلیت سے متصف ہے اور ایک کی قابلیت دوسرے کے لئے کارآمد۔ کسان اپنی محنت سے ہمارے جسم کی پرورش کرتا ہے۔ اور معمار اپنے فن کے ذریعہ سے شدائد موسم سے بچاتا ہے۔ اسی طرح ایک بانسری بجانے والے کا مشغلہ کسان اور معمار سے کچھ کم فائدہ مند نہیں۔ اگر کسان درزی اور نان بائی کی مصنوعات ہماری جسمانی خواہشات اور نقاضا کو پورا کرتی ہیں تو فنون لطیفہ ہماری روحانیت اور ذوق کو برقرار اور زندہ رکھتے ہیں۔ جیسی نفسی دکھاتے ہیں۔"

زور صاحب نے علمی تنقیدوں میں بھی بسا اوقات تمثیلی پیرائے سے کام لیا ہے اور بڑی نکتہ آفرینیاں دکھائی ہیں حالی اور آزاد کی تنقید نگاری کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس قدر آزاد کی شخصیت اُن کی تحریروں میں سمٹی پڑتی ہے۔ اتنی ہی حالی کی طبیعت چھپی رہتی ہے۔ وہ کبھی ظاہر ہونا نہیں چاہتے۔ وہ تنقید نگاری کے وقت ایک ایسا حاکم بن جاتے ہیں۔ جو قانون اور شرع و فقہ کی سخت پابندی کرتے ہوئے نہایت امن و اطمینان اور بردباری کے ساتھ فیصلے صادر کرتا ہے۔ آزاد اپنی تنقید نگاری کے ذریعہ سے حاکم اور منصف نہیں بنتے بلکہ ایک ہمدرد اور مخلص خاندانی وکیل وہ اپنے مؤکل کی کامیابی کے لئے جان توڑ کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن مخالف کی مخالفت بھی نہیں کرتے۔ ان کی فیاض

طبیعت گوارا نہیں کرتی ۔ کہ کسی ایک کی طرف فیصلہ کیا جائے ۔ وہ دونوں فریقین کو خوش رکھنا چاہتے ہیں"۔

نظری تنقید کے علاوہ زور صاحب نے عملی تنقید نگاری میں بھی اسی شرح و تفصیل اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ جو اُن کی مخصوص روش ہے ۔ وہ سطحی نظر سے کسی فن پارے پر نظر نہیں ڈالتے بلکہ تنقید کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں اُسے اچھی طرح جانچتے اور پرکھتے ہیں ۔ اور اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں ۔ مصنف کی شخصیت اور اُس کے ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ۔ جن شعراء و مصنفین پر انھوں نے انتقادی نظر دوڑائی ہے اُن کے ساتھ ہر لحاظ سے پورا پورا انصاف کیا ہے اور اُن کے صحیح رتبہ و مقام کا تعین فرمایا ہے ۔ انھوں نے فن تنقید نگاری کیلئے چند ایک اصول وضع کئے ہیں جن کی پابندی کا ادب کے ہر نقاد کو مکلف ٹھہرایا ہے ۔ سچی بات یہ ہے کہ ان اصولوں پر جس سختی کے ساتھ زور صاحب نے خود عمل پیرا ہو کر دکھایا ہے وہ انہی کی ذات کا حصہ ہے ۔ اصول حسب ذیل ہیں : ——

۱ ۔ کتاب ظاہری شکل کے لحاظ سے جس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے وہ اس کی تمام خصوصیات پر حاوی ہے یا نہیں ہے ۔ اس کا اندازہ لگائیں ۔

۲ ۔ کتاب معانی و مطالب کے لحاظ سے اپنے موضوع کی تمام خوبیوں سے متصف ہے یا نہیں ۔

۳ ۔ کسی ادبی کارنامے کی زبان اور اسلوب بیان کی نگہداشت بھی نہایت ضروری ہے ۔

۴ ۔ تنقید کا چوتھا اصول یہ ہے کہ مصنف کی ذات اس کے ماحول اور اس کی تصنیفات کے ماخذوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے ۔

زور صاحب کی مذکورہ فنی خصوصیات اور اُن کے تنقیدی شعور کے نمایاں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اُن کی تنقید نگاری اردو ادب میں ایک اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے ۔ اور اس مخصوص صنف ادب میں بلند ترین رتبہ و مقام کی مستحق ہے ۔ اُن کا ادبی و تنقیدی شعور بڑا پاکیزہ صاف اور متوازن ہے ۔ اور صحیح طور پر آئندہ تنقید نگاری کے رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے ۔

انوار ظہوری (راول پنڈی)

ڈاکٹر زورؔ کی عظمت

"ہر عہد کی رُوح العصر ہوتی ہے۔ جس کو المانی Zeitgeist کہتے ہیں وہ روح القدس کی طرح حسبِ ضرورتِ زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے" یہ قول عصرِ حاضر میں ڈاکٹر زورؔ پر حرف بہ حرف پورا اُترتا ہے۔ میرا ایقان ہے کہ ہر دَور میں جس طرح منجانب اللہ اصفیا و اولیا رُوحانی اقدار کے تحفظ کی خاطر منصۂ شہود پر آتے ہیں بعینہٖ بعض اربابِ کمال بھی علّام الغیوب کی طرف سے علم و فضل کے الوند و ہمالہ بنا کر پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ ان کے سینوں میں علم کا سمندر موجزن رہے اور دنیا اپنی پیاس بجھائے۔

بہت ممکن ہے آج اکثر اہلِ علم صاف دلی کے ساتھ زورؔ کی عظمت کے اعتراف میں ہچکچائیں کہ یہ روگ ہماری مُردہ پرست قوم کے رگ و ریشہ میں سمیّت بکھیر چکا ہے۔ لیکن جب ایک صدی بعد اُردو ادب میں نئے تنقیدی رجحانات کا جائزہ کلاسک (Classic) کی حیثیت سے لیا جائے گا اور ڈاکٹر زورؔ کی محققانہ کد و کاوش کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے گا تو یقیناً انھیں وہی عظمت و برتری حاصل ہوگی جو آج ولیؔ، میرؔ، نظیرؔ اور غالبؔ کو اُردو شاعری میں یا سیّد احمد خاں، شبلی، آزاد اور نذیر احمد کو اُردو نثر میں نصیب ہو چکی ہے۔

اس وقت شاید کوئی "عبدالرحمٰن ثانی" یہ لکھنے پر مجبور ہو جائے کہ ہندوستان کے الہامی سرمایہ میں زورؔ کی تنقیدی تحریریں بھی شامل ہیں۔ بادی النظر میں آج آپ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی کہ تنقیدی تحریروں کا الہام سے واسطہ ہی کیا ہے۔ لیکن آپ اُردو ادب کی جدید تنقیدی تحریروں کا تسلسل و تواتر سے درجہ بہ درجہ مطالعہ کریں تو یہ بات بے جھجک خود بھی کہہ سکیں گے کہ زورؔ اور دیگر نقادوں میں ایک عظیم حدِ فاصل قایم ہے۔

محمد حسین آزاد اور حالی اُردو زبان میں صفِ اوّل کے نقاد ہیں۔ بے شُبہ دونوں کی تحریریں اس رہگذار میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی بلندی کا راز اسی میں ہے کہ انھوں نے ایک نئے راستے کی جانب واضح نشاندہی کر دی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری زندہ رہتے تو قوی امکان تھا کہ عمر بھر کے مطالعے کا نچوڑ پیش کر دیتے اور کوئی معیاری تصنیف سامنے آتی۔ غالبؔ، سیّد احمد خاں، شبلی نعمانی، نذیر احمد اور مشتاق احمد خاں وغیرہ بھی ہم عصر نئی نسل پر براہِ راست اثر انداز ہوئے ہیں۔ اسی عہد سے ہر مکتبۂ فکر میں عظیم شخصیتیں مرحلۂ وجود میں آئیں۔ عبدالحلیم شررؔ، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ، منشی پریم چند، وحید الدین سلیم، عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، سلمان منصور پوری، عبدالسلام ندوی، سلیمان ندوی، مشرقی، رشید احمد صدیقی اور مناظر احسن گیلانی کے احسانات سے اُردو نثر کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ان سب کے ساتھ نثر نگاروں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا ہے اور ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی انفرادی

۱؎ محاسنِ کلامِ غالبؔ ص ۱۱۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔

کوششوں کو آئندہ کا مورخ نظر انداز کر سکے۔ اُردو نثر کے عناصر خمسہ نے تو ایک عملی راستہ دکھا دیا تھا۔ ان کے بعد آنے والوں نے اُردو نثر کو نثر بنا کر دکھایا۔ احسان دونوں کا ہے اور دونوں ہی قابلِ احترام ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی بلاشبہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اُردو زبان میں سادہ و سلیس اور شستہ و رواں نثر لکھنے کا آغاز کیا اور "آسان اُردو" کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں نے سب سے پہلے اُردو نثر میں عربی اور فارسی زبانوں کے ثقیل و ادق اور مغلق الفاظ کا استعمال کم کر دیا۔ اور مقفیٰ و مسجع عبارتوں کے باقی ماندہ اثرات کو ایک سرے سے کلیتاً ختم کر دیا۔ اس طرح ذہن کو ہم قافیہ الفاظ ڈھونڈنے کی زحمت سے بچا کر عبارت کے اصل مفہوم و معنویت کی طرف مبذول کر دیا۔ یہ کہنا برحق ہے کہ دراصل انھیں دونوں نے اُردو زبان کو اس کا اصلی جامہ پہنایا اور انھیں دونوں سے موجودہ نسلوں نے شستہ و رواں اُردو لکھنے کا سلیقہ سیکھا۔

ڈاکٹر عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی کا اُردو نثر نگاری میں جو مقام ہے وہی مقام اور وہی رتبہ اُردو کے جدید اسلوب تنقید میں ڈاکٹر زور کو بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور آزاد اور حالی کی طرح صرف نشانِ منزل نہیں بلکہ رہبرِ کامل ہیں۔ وہ خود بھی منزلِ مقصود پر پہنچے اور دوسروں کو بھی تا بہ منزل قدم بہ قدم ساتھ لے گئے۔

حصولِ علم کی تگ و دو لاریب اس عہد میں ہر زمانے سے زیادہ ہے۔ جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی بڑھتی وسعتوں کو چھوتی چلی جاتی ہے۔ نت نئے اربابِ علم و فن، اہلِ قلم اور اصحابِ کمال اُبھر سامنے آ رہے ہیں۔ آج کتنے ایسے ہیں جو اپنی جولانیٔ طبع کا نصب زندگی بھر کے لیے تحقیق و تنقید کے میدانوں کی طرف موڑ چکے ہیں۔ لیکن عظمت و برتری کا سہرا انھیں کے سر باندھا جاتا ہے جنھیں کسی افادی ضمن میں اوّلیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی آج اُردو شاعری میں وہی حیثیت ہے جو شیکسپیر کی انگریزی ادب میں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ شیکسپیر انگریزی شاعری کا نظیر اکبر آبادی ہے۔

کوئی تذکرہ نگار حالی کے بعد کے عہد میں عظمت اللہ خاں، تصدق حسین خالد، ن۔ م۔ راشد اور میراجی کا ذکر کیے بغیر جدید اُردو نظم کی تاریخ شروع نہیں کر سکتا۔ ان کی انفرادی خصوصیات اور شعری افادیت پر علیحدہ علیحدہ بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چاروں جدید اُردو شاعری کا نقطۂ آغاز ہیں۔ انھوں نے شعرائے جدید کو حالی، اقبال اور جوش کی ڈگر سے ہٹ کر ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ اور یہ وہ شرف و امتیاز ہے جو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

بعینہٖ ڈاکٹر زور نے اُردو نثر کو ایک نیا اسلوب دیا۔ ڈاکٹر زور کی عبارت اُردو کے تنقیدی سرمایہ میں نثر کی سہل ممتنع ہے۔ ان کے ہاں وہی دل و دماغ کو براہِ راست متاثر کرنے والی بے پناہ صلاحیت نثر پاروں میں رچی بسی نظر آتی ہے جو میر کے اشعار میں نشتری جھلکیاں دکھاتی ہے۔ یہ ڈاکٹر زور کی وہ نمایاں ترین خصوصیت ہے جو بیشتر صورتوں میں انھیں متقدمین و معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ نئی نسل کے ناقدوں میں یہ خوبی یا تو یکسر موجود نہیں یا اس معیار و سطح کی نہیں جو ان کی تحریروں میں رواں دواں ہے۔ وہ یہ استثنائے چند بے شمار نقادوں کی طرح گنجلک عبارت نہیں لکھتے دُور از کار تشبیہات بعید از فہم استعارات اور بے مقصد محاکات کے سہارے قلم نہیں اُٹھاتے۔ جس طرح ان کا ذہن صاف ستھرا تھا تحریریں بھی صاف ستھری ہیں۔ وہ عملی زندگی میں نہایت انتھک محنت کے عادی رہے ہیں۔ آغازِ کار کے بعد مسلسل یکسوئی کے ساتھ اسے تکمیل تک پہنچانا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ان کی فطرت کے یہی نقوش اور ان کی جبلت کا یہی خصوصی رنگ ان کی عبارت میں بھی صاف صاف جھلکتا ہے۔ انھیں وقت کی قدر و قیمت کا جتنا شدید احساس تھا اتنا ہی شدید احساس الفاظ کی قدر و قیمت کا بھی تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی تحریروں کو بے جا طوالت نہیں دی۔ وہ مفہوم کو بہ تمام و کمال پیش کرنے کے لیے مناسب ترین الفاظ موزوں ترین مقام پر استعمال کرنے کی خداداد قدرت و

اہلیت رکھتے تھے۔ یہ ڈاکٹر زورؔ کا اتنا عظیم وصف ہے جو ان کے سوا کسی اور ناقد و محقق یا کسی بھی صاحب طرز نثر نگار کے پاس اس تکمیلی شان میں نظر نہیں آتا۔ اور خوبی یہ ہے کہ اس کے باوجود ان کی عبارت نہ خشک ہوتی ہے نہ سپاٹ۔ تنقید پڑھئے، نتائج تحقیق کا مطالعہ کیجئے لیکن ساتھ ساتھ عبارت کا لطف بھی لیتے جائیے۔ بلکہ خود عبارت پڑھنے والے کے ذہن کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پوری بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ انھیں معنوی پس منظر کے ساتھ الفاظ کے انتخاب و استعمال کی بھرپور قدرت حاصل ہے۔ ان کی عبارت میں ہر لفظ اپنے صحیح ترین مفہوم و معنیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

بڑے سے بڑے شاعر کو بسا اوقات اظہارِ خیال کے لیے فنی محاسن کی پابندی کی رعایت سے یا موزوں کلامی کی شرط کے باعث مترادفات اور زائد یا صفاتی الفاظ کا لامحالہ سہارا لینا پڑتا ہے۔ درآنحالیکہ شعرا کو عرضِ مطلب اور اظہارِ مدعا کے لیے یہ امر مجبوری، گنے چُنے الفاظ سے ہی کام لینا ہوتا ہے۔ بحیثیت نثر نگار وہ شعرا کی طرح پابند نہیں، لیکن اپنی تحریروں میں شعرا سے بھی زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں صفات کا استعمال برمحل و بامواقع ہوتا ہے۔ بعض موجودہ تنقیدوں میں افسانوی طرز پر جو کشمکش (Suspense) کی فضا پیدا کردی جاتی ہے، ان کی تنقیدی تحریریں اس عیب سے قطعاً پاک ہیں۔ وہ اعترافِ کمال میں جھجکتے نہیں لیکن تعریف و توصیف کرتے وقت حقیقت اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کے ہاں سکوتِ سخن شناس کا دُور دُور تک سُراغ نہیں ملتا۔ وہ نہ اعترافِ کمال میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں نہ عیوب کی نشان دہی میں غلو کرتے ہیں۔ ان کے ہاں افراط و تفریط بالکل نہیں کسی تحریر میں غیر متوازن اور غیر معتدل انداز بیان دکھائی نہیں دیتا ان کی عبارت میں وہ ہنگامہ آرائی نہیں جو بیشتر نثر نگاروں کا خاصہ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں وہ کسی کے خصوصی اوصاف کی تعریف میں زبان و قلم کھولتے ہیں، وہیں اگر ہوں تو اُس کے معائب کا بھی بے تکلف اظہار کر جاتے ہیں۔ اور کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھتے۔ لیکن تمام کوشش حقایق کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ہوتی ہے محض تحسین بے جا یا تنقیص ناروا کے لیے نہیں!

ڈاکٹر زورؔ کی تمام تقاریر یا مقدمات کا مطالعہ کر جایئے وہ ڈاکٹر عبدالحق کی طرح "مقدمہ باز" نہیں کہلائے جاسکتے۔ ان کی تمام تقاریظ پورے مقدمات اور سارے دیباچے اپنی اپنی جگہ مستقل تنقیدات کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں وہ حقیقتاً اصل تصنیف یا تالیف کی حقیقی رُوح پیش کردیتے ہیں۔ ان کی عبارت نہایت جامع ہوتی ہے اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ جامع ترین الفاظ میں اصل کتاب کی تلخیص کردی گئی ہے۔ صاحبِ کتاب کا پیش کردہ کوئی نمایاں پہلو ایسا نہیں رہ جاتا جس کی طرف واضح نشان دہی نہ کردی گئی ہو۔ یہ ان کی دقت نظر اور علمی کد و کاوش کی روشن دلیل ہے۔ جب وہ کسی کتاب کا مقدمہ لکھتے ہیں تو مقدمہ لکھنے کا پورا پورا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے بعض عادی یا پیشہ ور مقدمہ نگاروں کی طرح کسی تصنیف یا تالیف پر چند سطریں لکھ کر بات ختم نہیں کردی۔ جب وہ کسی خالقِ ادب کی صلاحیتوں کو پرکھ لیتے تو پھر اُس کی تخلیق پر بھرپور اور ایمان دارانہ تنقید سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوتے۔ ہر قاری کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انھوں نے اوّل تا آخر پوری کتاب کا حرف حرف بہ نظرِ غور دیکھا ہے۔ اور پھر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے نہایت مکمل جامع اور جچی تلی ہوتی ہے۔ نہ ان کے مضامین اتنے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ مرکزی خیال کا سمیٹنا دوبھر ہو جائے اور نہ ان میں تسلسل و ربط کا فقدان ہوتا ہے۔ وہ کسی داستان گو یا ناول نویس کی طرح بات میں بات نہیں پیدا کرتے جب ایک بات بہ تمام و کمال کہہ چکتے ہیں تو دوسری بات کا آغاز کرتے ہیں۔ جب دوسری بات کو اتمام تک پہنچا دیتے ہیں تو پھر تیسری بات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہی خوبی ان کی محنت و کاوش سے بھرپور عملی زندگی میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کام کا آغاز کیا اسے یکسوئی سے اتمام تک پہنچایا۔ وہ بہ یک وقت بیسیوں کام شروع کرکے ناتمام چھوڑنے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے عمل ان کی تحریر اور ان کی زندگی تینوں

ہیں گھڑی کی سوئیوں کی طرح یکساں ارتقائی رفتار نظر آتی ہے ایسی رفتار جو بروقت بھی ہے، وقت نما بھی ہے۔ وہ ان شخصیتوں میں سے ہیں جو تاریخ ساز ہوا کرتی ہیں اور زمانہ جن کے پیچھے چلتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر عبدالحق نے اُردو زبان کو عمومی طور پر آسان بنایا۔ ڈاکٹر زور نے خالصتاً علمی تنقیدی اور تحقیقی اسالیب نثر کی زبان کو آسان ترین بنا دیا۔ ڈاکٹر زور سے پہلے خالصتاً علمی و تنقیدی زبان کو آسان ترین لب و لہجہ اور انداز بیان کے ساتھ پیش کرنے والا کوئی صاحب قلم نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر زور کی تنقیدی زبان جس قدر آسان ہے اسی قدر اس کی تقلید مشکل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زبان و الفاظ پر ان کی مضبوط گرفت اور اظہار و ابلاغ پر ان کی بے پناہ قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد اس عہد میں صرف پیجر آفتاب حسن ہی وہ شخصیت ہیں جن کے اسلوب تحریر میں کم و بیش یہی تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی فکری جولانگاہ مختلف ہے۔ بالخصوص سائنسی موضوعات پر اُردو میں ان سے زیادہ آسان زبان کسی نے آج تک نہیں لکھی۔

حالی نے انگریزی زبان سے استفادہ ضرور کیا لیکن انھیں مغربی علوم پر وہ قدرت حاصل نہیں تھی جو اُن کے بعد ان کے متبعین کو حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سید محمود، شاہ سلیمان، راس مسعود، آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، محمد علی جوہر، ڈاکٹر ضیاء الدین اور علامہ مشرقی نے مغربی علوم و السنہ پر نہ صرف اہل زبان کی طرح بے پناہ عبور حاصل کیا اور ان سے آگے بڑھ گئے بلکہ اپنے معاصرین اور نئی نسلوں کے لیے فقید المثال شخصیتوں کے رُوپ میں سامنے آئے۔

ان شخصیتوں نے ہماری ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

حالی کے تنقیدی شعور نے ماضی کی مروجہ اقدار کے خلاف سب سے پہلے آواز اُٹھائی اور یہ شرف انھیں کو حاصل ہے کہ اپنے بعد آنے والوں کے تنقیدی شعور کو نئی منزل کی راہوں پر لا ڈالا۔ ڈاکٹر زور کے ذہن و فکر کو مشرق و مغرب کی شعوری، علمی اور فکری اقدار کا حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ وہ ناقل محض تھے نہ اندھی تقلید کے قائل۔! انھوں نے مشرق کی بہترین اقدار کو اپنے ہاتھ سے کبھی جانے نہ دیا۔ وہ مغربی ممالک میں مغربی علوم سے بہرہ مند ہونے کے باوجود زندگی بھر مشرقی رہے اور تہذیب مشرق کے بہترین خصائص ہمیشہ اپنائے رہے۔ نہ انھوں نے مغرب کی تقلید کی نہ وہ بیشتر مغربی تعلیم یافتہ اہل علم کی طرح کسی احساس کمتری کے باعث مغرب زدہ رہے۔ مغربی اقوام نے صدیوں تک مسلمانوں کے عہد اقتدار میں ان کے تہذیبی اثر و نفوذ کے باعث جہاں اعلیٰ ترین اوصاف کو اپنا لیا تھا وہیں وہ مسلمانوں کے عہد زوال کے رنگ میں بھی پوری طرح رنگے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر زور نے اس امر کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور ان کی تقلید محض سے اپنا دامن پاک رکھا۔ انھوں نے مغربی ممالک میں جا کر تحقیق بھی کی تو برِ صغیر کی صوبیات پر، ہندوستانی لسانیات پر، اپنی زبان اور اس کے قدیم شہ پاروں پر جنھیں انقلاب کی تند و تیز ہواؤں نے غیر منقسم ہندوستان سے اڑا کر مغرب کے دامن میں ڈال دیا تھا۔ انھوں نے جدید مغربی اسلوب تنقید کو مشرق کے بہترین اوصاف کے امتزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کام ایسا ہی شخص انجام دے سکتا تھا جسے بہ یک وقت مشرقی و مغربی علوم پر دستگاہ بھی حاصل ہو اور جدید صحت مند تنقیدی شعور بھی رکھتا ہو۔ دونوں اوصاف ان میں قدرت نے یکجا کر دیئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ضمن میں اوّلیت کا سہرا انھیں کے سر باندھا گیا۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو، مل گیا

اگر زور نہ ہوتے تو آج اُردوئے قدیم کہاں ہوتی۔ اُردو کے نقطۂ آغاز کا علم کیسے ہوتا۔ انھوں نے اُردو کے ان تمام اوّلین

محنتوں اور ان کی اُردو نظم و نثر سے متعارف کرایا جن کی ابتدائی کوششوں کی بنیاد پر آج اُردو زبان میں ادب و فن اور علم و ہنر کی عظیم عمارت کھڑی ہے۔

کہنے کو بہت آسان سی بات ہے لیکن عصر ولی تک اُردو کی عہد بہ عہد نظم و نثر پیش کرنے میں انھیں تلاش و تحقیق کی منزلیں طے کرتے ہوئے کیسی کیسی جانکاہی، جانفشانی، اور عرق ریزی کے مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا، اسے وہی لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں جو تحقیق و تلاش کے قق و دق صحراؤں میں اپنی زندگیاں گزار چکے ہیں۔

یہ ناممکن ہے کہ آج زبان کا مورخ یا کوئی محقق اُردو کے قدیم نثر نگاروں یا شاعروں کا ذکر کرے اور ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو نظر انداز کر دے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ایسا راستہ دکھایا ہے جس پر چل کر نہ جانے کون کون کب تک تحقیق کے جواہر بکھیرتا رہے گا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن کلیاتِ بحری کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "لاکلام کہ سمندر کی گہرائیوں سے سیپیاں اور موتی لانا بڑا کام ہے۔ مگر لاریب کہ ان موتیوں کو پرکھنا اور ان کی قدر و قیمت کو پہچان کر قدر دانوں کے دامن گریباں اور کلاہ تک پہنچا دینا اور بھی بڑا کام ہے"[1] اور یہ بڑا کام ڈاکٹر زورؔ نے کیا ہے۔ یہ فقرہ ان کی سعی و کاوش پر حرف بہ حرف منطبق ہوتا ہے۔

حافظ محمود شیرانی "پنجاب میں اُردو" لکھ کر اُردو زبان کے محققین پر قابل رشک احسان کر گئے ہیں۔ ان کی آواز پر لبیک سب سے پہلے ڈاکٹر زورؔ نے کہا اور تحقیقی جواہر پاروں کا ڈھیر لگا دیا۔ اپنے ساتھ بیسیوں کو اسی میدان میں گھسیٹ لائے۔

یہ کتنی بڑی صدق مقالی ہے ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

اگر ڈاکٹر زورؔ پیدا نہ ہوتے تو آج اُردو کہاں ہوتی۔

اربوں انسان پیدا ہوئے کروڑوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن ان میں ایسے کتنے ہوتے ہیں جو شخصیت بن کر پیدا ہوتے ہیں یا انھیں شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے ——— ان شخصیات میں بھی انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے جو ادارہ بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ بذاتِ خود ادارہ بن کر زندہ رہتے ہیں اور جب مر جاتے ہیں تو ادارہ مر جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زورؔ ان معدودے چند شخصیتوں میں سے ہیں جو خود بھی ادارہ بنی رہتی ہیں۔ اور اپنے بعد زندہ رہنے کے لیے ادارے چھوڑ جاتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ ریل کی پٹریوں کی طرح اُردو کی دو ایسی متوازی شخصیتیں ہیں جن کی عمل کوشش اور فکر و نظر کی روشنی میں جدید ادبیات اُردو کا پورا قافلہ رواں دواں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کو اللہ نے پارس بنا کر بھیجا تھا جو ان سے چھو گیا وہ سونا بن گیا لیکن ڈاکٹر زورؔ کو ڈاکٹر عبدالحق سے زیادہ جانکاہی، عرق ریزی اور محنت کرنی پڑی۔ یہ تقدیر کی بات ہے کہ وہ پارس بن کر پیدا نہیں ہوئے۔ انھیں کیمیا گر بنایا گیا تھا اس لیے انھوں نے سطح مرتفع دکن کی سنگلاخ زمینوں سے کارآمد ذہنوں کو چن چن کر اور گھس گھس کر سونا بنایا اور اپنی کیمیا گری کے جوہر دکھائے۔

مغربی تہذیب نے جہاں اپنے پیالوں میں بھر بھر کے زہر آمیز شراب دی ہے وہیں مغربی تعلیم نے ذہنوں کو علم و فن کے بعض نئے گوشوں کی طرف متوجہ بھی کیا ہے۔ نئی نسلوں کے ہر فرد نے کورانہ تقلید کو شیوہ نہیں بنایا۔ برطانوی تسلط نے ہر مکتبۂ فکر کو شعوری طور پر متاثر کرنے کے لیے جال پھیلا دیے تھے۔ تمام علوم و فنون میں وہ طرح طرح سے اپنی فوقیت و برتری کا سکہ بٹھانے پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ مغرب کو علم کی ہر شاخ کا مصدر و منبع ظاہر کرنا ان کا ایمان تھا۔ انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انگریزی شعر و ادب کا دھارا برصغیر

---

[1] مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ [2] صفحات ۲۱، ۲۲ (کلیاتِ بحری)

کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس ریلے میں یقیناً بہت سے اربابِ کمال بہہ گئے۔
لیکن اس وقت بھی ایسے افراد اور بالخصوص ایسے نوجوان کم نہیں تھے جنھیں اللہ نے عزتِ نفس، خودداری اور بصیرت کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر زور موخر الذکر افراد کی صفِ اوّل میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اپنے معاصرین اور مابعد آنے والی نسلوں کی ذہنیتوں کو بیشتر دیگر اہلِ علم کی طرح مرعوب ہونے سے بچا لیا۔ اجتماعی طور پر سب کو اپنے ساتھ ساتھ مشرقی، ہندوستانی، اور اُردو ادبیات و کلام اور علوم و فنون کی تلاش و تحقیق پر لگا دیا۔ وہ طبقہ جو نئی تعلیم سے آراستہ تھا اسلاف کی عظمت و برتری اور علمیت و فضیلت کی طرف ہمہ تن متوجہ بھی ہوا اور قائل بھی ہوا۔ تلاش و تحقیق میں صرف شدہ ایک ایک لمحے کی قیمت وصول ہوئی اور معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگ اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے کتنا عظیم سرمایہ اور کیسی شاندار زبان چھوڑ گئے ہیں ـــ وہ زبان جو آج دُنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اگر ڈاکٹر زور اور ان کی ایما پر تلاش و تحقیق کرنے والوں کی تمام کتب جمع کر لی جائیں تو بیسیوں نہیں سیکڑوں کتابیں سامنے آجائیں گی۔ افسانے اور ناول نہیں۔ ٹھوس علمی ادبی اور تحقیقی تصانیف و تالیفات! اگر ان تمام شخصیات کو سلسلہ وار گن لیا جائے جو ان کی، ان کے رفقا، ہمنوا معاصرین اور تلامذہ کی سعی و کاوش سے منظرِ عام پر آئی ہیں تو فہرست سیکڑوں نہیں ہزاروں ناموں تک جا پہنچے گی۔ کسی کو شک ہے تو لگن لے اور آزما دیکھے! لطف یہ ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ابھی جاری ہے۔ آج بھی جوان ہمت محققین کی سعی و کاوش کسی نہ کسی گم شدہ کڑی کو ڈھونڈھ نکالتی ہے اور کوئی نہ کوئی گم نام شخصیت منظرِ عام پر آجاتی ہے۔ یہ ان کی لگن تھی جو بہت سوں کو انھیں کے رنگ میں رنگتی چلی گئی۔ انھوں نے طلبہ، طالبات یا ریسرچ اسکالرز کو (تحقیقی مقالات) تھیسس کبھی بھی Dictate نہیں کرائے انھیں کام کرنے کا طریقہ سکھایا جی بھر کے مشقت کرائی اور محنت کا عادی بنایا تاکہ صرف حصولِ اسناد کا مقصد ہی ان کے پیشِ نظر نہ رہ جائے بلکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی ایک عظیم محقق اور انشا پرداز ثابت ہوں۔ آج ان کی اس لگن کے نتائج دُنیا کے سامنے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبا سنین میں وہ کون ہے جس پر ڈاکٹر زور کی نظرِ انتخاب نہ پڑی ہو اور اُس کی ایک نہ ایک عظیم تحقیق، شاندار تصنیف یا قابلِ قدر تالیف منظرِ عام پر نہ آئی ہو۔ ان کے رفقائے کار کو دیکھ لیجیے ان میں کون ایسا ہے جو آج صاحبِ کتاب نہیں۔ دکن میں تجارت پیشہ اشاعتی اداروں کے علاوہ دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، انجمن ترقی اُردو اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے عہدِ عثمانی میں جتنی کتابیں شائع کی ہیں اس کی مثال برصغیر کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ملتی۔ نہ حصولِ آزادی کے بعد کہیں تا حال اس کی نظیر دکھائی دی۔

ڈاکٹر زور نے صرف شاگردوں کی تعداد نہیں بڑھائی۔ ان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ علم کا صحیح ذوق عام کیا۔ عالم، فاضل، محقق، مصنف، نقاد اور انشا پرداز پیدا کیے۔ صرف "سب رس" کی ربع صدی کی خدمات پر نظر ڈالی جائے اور اس کی فہرست کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ تحقیقی مقالات اور تنقیدی تجزیات کی تعداد کتنی ہے اور معیار کیسا ہے۔

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ بڑے بڑے عالم فاضل پیدا ہوئے اور آج بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کا علم دُنیا کے لیے وسیع بنیادوں پر علم نافع نہیں۔ طالبِ علموں کی مقررہ تعداد کو پڑھایا اور گھر بیٹھ گئے۔ لیکن ڈاکٹر زور کا علم طالب علموں کو استاد بنانے والا تھا۔ ان کے علم سے ان کے ہم عصروں نے بھی بعد و قرب کی تمیز کے بغیر استفادہ کیا روشنی حاصل کی اور کندن بن گئے۔ وہ ایسا جوہر قابل تھے جس کا تتبع آدمی کو ہیرا بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر زور کی عظمت کے صحیح خدوخال پہچاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ماحول، ان کے عہد کی فضا، دکن کے شب و روز، دکن اور بیرونِ دکن کی سربرآوردہ نامی گرامی شخصیتوں اور ان کے معتقدین پر بھی گہری نظر ڈالی جائے۔

ڈاکٹر زورؔ نے جس عہد میں جنم لیا وہ تاریخِ دکن کا عہدِ عروج تھا۔

دکن برصغیر کے صاحبانِ کمال و فن، اربابِ علم و ہنر اور اصحابِ فضیلت کا مرجع تھا۔ دکن ہمیشہ اربابِ کمال کا قدرداں رہا ہے۔ اسی مقناطیسیت نے گوشہ گوشہ سے جذب و کشش کے زیرِ اثر کامل و اکمل شخصیات کو جمع کر لیا تھا۔ اب تو یہ بساط ہی اُلٹ گئی۔ ان میں سے اکثر بوریہ بستر سمیٹ کر جا چکے۔ جو رہ گئے وہ رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔

یہاں ہند اور بیرونِ ہند کی لاتعداد شخصیتیں حیدرآباد میں جمع ہو گئی تھیں۔ آدمی وہیں جاتا ہے جہاں اسے قدرشناس اور قدرافزائی کا ماحول ملتا ہے۔ دکن کے ہر در و دیوار سے اندلس و ترکی، عراق و شام، عرب و مصر، سمرقند و بخارا اور بغداد و غرناطہ کا قدیم اسلامی جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ جن آنکھوں نے یہ رنگ دیکھے ہیں وہ گواہی دیں گی کہ یہی جاہ و جلال سیکڑوں ہزاروں میل دور بھی وطن چھوڑ کر دکن پہنچنے کے لیے دلوں کو سینوں کے اندر بے چین کر دیا کرتا تھا۔ ان مقامات کی لاتعداد شخصیتوں کو اس گنہگار نے بھی نوعمری میں کہیں اور نہیں خود اپنے گھر[1] پر دیکھا ہے۔ والدِ مرحوم علامہ سید ظہور الحق[2] اپنے محلے کی مشہور شخصیت بابا میاں، مولوی عبداللطیف[3] مولانا فضل اللہ[4] علامہ ابراہیم رشید[5] مولانا مناظر احسن گیلانی[6] ڈاکٹر عثمان خاں[7] اور اپنے بڑے بہنوی حکیم انصاری کے مکانات پر آتے جاتے یا قیام کرتے دیکھا ہے۔

یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حیدرآباد میں دو طرح کے مسلمان رہتے بستے رہے ہیں۔ ایک تو وہ جو صدیوں سے یہاں رہتے بستے آئے ہیں دوسرے سالار جنگ اوّل کے عہد میں بیرونِ حیدرآباد سے آنے والے جن کو چھ ماہ قیام، یا کسی مقامی مقتدر شخصیت کی سفارش پر "ملکی صداقت نامہ" دے دیا جاتا تھا۔ جس کے بعد وہ ریاست میں سرکاری ملازمت کے اہل قرار پا جاتے۔ یہ صورت ہر ملک میں موجود ہے۔ ڈومی سائیل سرٹیفکٹ کے بغیر کسی بھی ملک میں نہ سرکاری ملازمت مل سکتی ہے نہ مستقل قیام کی اجازت! "ملکی صداقت نامہ" ایک سرکاری کاغذی کارروائی تھی جس کا تعلق عوام سے نہ تھا۔ یوپی کے بعض ناعاقبت اندیش اصحاب اس شرط پر نہایت چراغ پا رہے ہیں۔ اس مسئلے کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر زورؔ کی مخالفت پر بھی کمربستہ رہے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر زورؔ نہ ایسے محکمے سے تعلق رکھتے تھے جو ملکی صداقت نامے اجرا کرتا نہ اس قانون کا نفاذ ان کی وجہ سے ہوا یہ قانون سالہا سال سے نافذ تھا اور قریب قریب دُنیا کے ہر مہذب ملک میں نافذ ہے۔

دکن کی تہذیب اور اقدارِ تمدن میں شان و شوکت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ دکن کے باشندے نہایت اطمینان و فراغت، آرام و راحت اور سکون و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حصولِ معاش کے ذرائع کفالت کے لیے کافی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اقوامِ عالم گزشتہ دو سو برس میں عمومی توکل و غنا کی وہ مثال کہیں اور نہیں پیش کر سکتی جو باشندگانِ دکن کے طبائع میں رچ بس گیا تھا۔ اسی ماحول میں تعلیم یافتہ حیدرآبادیوں کے اذہان کو تربیت نصیب ہوئی۔ گھر گھر علم و فضل کے چرچے تھے۔ ایک دریائے ناپیدا کنار تھا جو دماغوں کو سیراب کر رہا تھا۔

دکن کی فارغ البالی نے دُنیا کو دکن کے اربابِ فضل و کمال سے تقریباً لاعلم ہی رکھا۔ یہ ایسا پہلو ہے جس کی نشاندہی کے بغیر ڈاکٹر زورؔ کی عظمت کا اعتراف صحیح خطوط پر نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے باہر کی تمام عظیم شخصیتوں سے اہلِ دکن واقف تھے۔ لیکن دُنیا دکن کے صرف ایک نام "نظامِ دکن" کو جانتی تھی۔ اور یہ نظامِ دکن کے علم و فن سے فطری لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ

---

[1] واقع محلہ عثمان شاہی بلدہ۔ [2] صدر مجلس دائرۃ المعارف [3] سابق صدر شعبۂ دینیات (عثمانیہ یونیورسٹی دہلی گڑھ) [4] سابق صدر شعبۂ دینیات (جامعہ عثمانیہ) [5] خطیب مکہ مسجد [6] سابق صدر شعبۂ دینیات (جامعہ عثمانیہ) [7] رکن دارالترجمہ۔ [8] ایڈیٹر الاعظم، نیوز سروس۔

دنیا نے دائرۃ المعارف، جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے آئینہ میں دکن کے اربابِ فضل وکمال کی صورتیں بھی دیکھیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد، بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو، قائدِ ملت نواب بہادر خاں، اور احمد حسین امجد حیدرآبادی یہی چار نام ایسے ہیں جو بیسویں صدی میں دکن سے باہر عمومی طور پر سب سے پہلے متعارف ہوئے اور شہرت پائی۔ بعد ازاں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر زور اور سیدہ اختر حیدرآبادی کے ناموں سے دنیا آشنا ہوئی۔ پنجاب اور بمبئی کی صحافت اور پنجاب و دہلی کے رسائل و جرائد نے عام حیدرآبادی نوجوانوں کے علمی و ادبی کارناموں سے وسطی و شمالی ہند کے اردو داں طبقہ کو واقف کرانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ اس ضمن میں ہمایوں، جہانگیر، عالمگیر، خیام، ادبی دنیا، زمیندار، اور انقلاب کی خدمات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے عہد میں دکن کا پرچا لکھا کون ایسا شخص تھا جو زمیندار کا خریدار نہ ہو۔ سیاسی موضوعات پر مضامین یا زبان و عبارت کی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اسے پڑھتے۔ کون سی پڑھی لکھی عورت ایسی تھی جو عصمت، زمانہ اور سہیلی کا مطالعہ نہ کرتی ہو۔ کس نے الہلال والبلاغ کا مطالعہ نہیں کیا۔ کامریڈ کس کا منظورِ نظر نہیں تھا۔ راقم الحروف سے ایک مرتبہ مولانا رازق الخیری نے کہا تھا "حیدرآباد سے باہر کی صحافت اور جرائد و رسائل کی زندگی حیدرآباد کے تعلیم یافتہ طبقہ کی وجہ سے تھی۔ صرف حیدرآباد میں عصمت کے سات ہزار سے زائد خریدار تھے۔ آج پاک و ہند کی دونوں مملکتوں میں وہ کون سا ماہنامہ ایسا ہے جو خالصتاً ٹھوس علمی و ادبی معیارات کا حامل ہے اور اُسے دونوں مملکتوں میں بحیثیت مجموعی اتنے خریدار حاصل ہیں۔" مولانا کے اس ارشاد سے حیدرآباد کی عمومی زندگی میں علم و ادب کی قدردانی کی ایک ہلکی سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے جب ہوش سنبھالا حیدرآباد لاتعداد بھاری بھرکم شخصیتوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق دکن میں علمی و ادبی سرگرمیوں کی روحِ رواں بنے ہوئے تھے۔ سید علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا وحیدالدین سلیم، مولوی عنایت اللہ، علامہ سید طفیر الحق، مولوی سید ابراہیم، حکیم آشفتہ، حکیم مقصود جنگ، اختر یار جنگ، ڈاکٹر سید سجاد، فصاحت جنگ جلیل مانک پوری، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا عبدالقدیر صدیقی حسرت، ایسے فقید المثال ماحول میں بھی وہ اوائل عمر میں ہی اپنی ذہانت، علمی استعداد، خداداد قابلیت اور تحقیقی شوق و شغف کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ ادبیاتِ اردو میں ایک مستقل باعزت مقام پیدا کیا۔ بلاشبہ وہ اردو زبان میں علمی تحقیق کے میدان میں دکن کی ناک تھے۔ دکن کی تاریخ زبان ادب میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کے ساتھ نئے دور کا آغاز ہوا۔

حیدرآباد میں پڑھے لکھے صاحبِ حیثیت لوگ بھی زیادہ آمد و رفت نہیں رکھتے تھے۔ شاذ و نادر ضرورتاً سفر کی نوبت آتی، بعض قدیم گھرانے سفر پر جانا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یا سرکاری ملازمت میں بسلسلۂ تبادلہ مستقر سے باہر جاتے جس کی نوبت عموماً سال بعد آتی۔ یا ان کا سب سے طویل سفر فریضۂ حج کی ادائیگی یا کاشی کی رسومات کے موقع پر ہوتا۔ عام حیدرآبادی گھرانوں میں کوئی فرد ایک ضلع سے اگر دوسرے ضلع کا بھی رُخ کرتا تو اس کے سفر کو بڑی اہمیت دی جاتی۔ طرح طرح کے اہتمام ہوتے۔ خاندان کے تمام افراد رخصت کرنے اسٹیشن پر موجود ہوتے۔ امام ضامن باندھے جاتے۔ آنکھوں میں آنسو ہوتے رقت طاری ہوتی اور گلے مل مل کر خدا حافظ کہا جاتا۔ اس ماحول میں تحقیق کی لگن ایک شخص کو شہر شہر لیے پھرتی ہے۔ جہاں چند مہینے کا سفر مسئلہ بن جاتا وہاں کا رہنے والا مغربی ممالک میں کتب خانوں میں دیدہ ریزی کرتا پھرتا ہے —— اور وہ شخص —— ڈاکٹر زور ہیں۔

ڈاکٹر زور نے تحقیقی کام شروع کیا اور اپنے ساتھ بہت سے نوجوانوں کو لیے آگے بڑھے تو شہرت نے کم عمری میں ہی قدم چومے جو قدر و منزلت انھیں جوانی میں حاصل ہوگئی وہ مختلف میدانوں میں پوری پوری زندگیاں گزار دینے کے باوجود بہت سوں کو

نصیب نہ ہوئی۔ یہی بات بعض تنگ دل شخصیتوں کے لیے سبب ملال بن گئی۔ سُنتے ہیں کہ ان میں جغادری بزرگ بھی تھے جو کھیڑ اُچھالنے کی سعی کرتے رہے۔ کہاں ڈاکٹر زورؔ ایک نوجوان جس نے ابھی ابھی طالب علمانہ زندگی ختم کر کے میدان عمل میں قدم رکھا تھا۔ اور کہاں بعض وہ شخصیتیں جو حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر متمکن تھیں۔ جن کی مستقل با اثر آواز تھی جن کا طنطنہ تھا۔ جن کا تمام ریاست میں رعب و دبدبہ تھا۔ جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار تھی جو براہ راست نظام دکن کے دربار میں رسائی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے انھیں عمر رسیدہ با اقتدار شخصیتوں کے مقابل ٹھہرانا ان کے ساتھ صریحاً زیادتی ہے ایک وقتی فتنہ تھا ختم ہوگیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر زورؔ نے اس فتنہ کو بڑھنے ہی نہ دیا۔ تدریس و تعلیم کی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ادارۂ ادبیات اُردو کی بنیاد ڈالی، سب رس کا اجرا کیا اور امتحانات اُردو کا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے ریاست بھر میں بطور مہم اُردو کی توسیع و اشاعت عمل میں آئی۔ اس ادارہ نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کی تدریجی منازل طے کیں۔ آج ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کی خدمات انجام دینے والا یہی سب سے بڑا ادارہ ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی شرافت نفس نے انھیں بدترین مخالفین و اعدا کے ساتھ بھی جنگ کرنے سے باز رکھا۔ وہ تو ایک ایک لمحے کو مصرف میں لانے والے آدمی تھے۔ زندگی بھر اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے رہے وہ اگر فساد و جنگ میں پڑ جاتے تو نتیجہ ہندوستان میں اُردو کا پرسانِ حال کوئی نہ ہوتا۔ انھوں نے عمر بھر جنگ کر کر کے اور لڑ لڑ کے حقوق نہیں مانگے۔ محبت سے تسخیر قلوب کی نعمت حاصل کی ہے۔ وہ دلوں کو جیتنا جانتے تھے اور اس فن کے ماہر تھے۔ یہ رویہ ان کی فراست و ذہانت کا ناقابل تردید ثبوت ہے وہ محنتی انسان تھے باعمل آدمی تھے۔ ان کے اطراف ہڑبونگ مچانے والے کبھی جمع نہیں ہوئے۔ ایسے ہی آدمیوں کو وہ گلے لگاتے رہے انھیں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے جن میں باعمل انسان بننے کی صلاحیتیں دیکھیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے تو کسی ایسے شخص کی سفارش بھی نہیں کی جس میں عملی صلاحیتوں کا فقدان دیکھا۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو بلاشبہ آج ہندوستان میں اُردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے لیکن اسے بڑا ادارہ بننے کے لیے کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا ہے کیسی کیسی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کوئی ادارہ کی تاریخ مرتب کرنے والے کے دل سے پوچھے یا پھر ڈاکٹر زورؔ کا دل یہ داستان سُناتا لیکن اب وہ کہاں!

حیدرآباد دکن میں "سب رس" اور "ہندستانی ادب" صرف دو ماہنامے ایسے ہیں جو سال آغاز کے بعد سے آج تک تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے اجرا کو ربع صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لگن دل میں نہ ہو تو یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔

انگریزی زبان میں "ہندوستانی صوتیات" اپنے موضوع پر ڈاکٹر زورؔ کی پہلی مبسوط کتاب ہے۔ "روح تنقید" کو مثالی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب اُردو زبان میں نظریاتی تنقید کے موضوع پر بنیادی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنقیدی مقالات میں صحیح عملی تنقید کے نادر نمونے پیش کیے ہیں۔ جن میں اُردو کی چند مشہور قدیم شخصیات سے بحث کی ہے۔ ان کے رسالوں جریدوں اور مجلّوں میں بکھری ہوئی تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو بہت سا قیمتی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ نئی پرانی گنتی ہی شخصیتوں پر ان کے قلم سے بھرپور تنقیدیں نکل چکی ہیں۔ اس مواد کی فراہمی "زور نمبر" کی اشاعت کے بعد ادارۂ ادبیات اُردو کا دوسرا اہم فریضہ ہے۔

"ہندوستانی لسانیات" ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ جس میں اُردو کی صرف دو کتابوں کے حوالے ملتے ہیں چار

مقامات پر "پنجاب میں اُردو" کے ایک مقام پر آبِ حیات کا۔ اس "مواد" کو دیکھا جا سکتا ہے یہی وہ کل مواد ہے جو اُردو سے لیا گیا۔ ڈاکٹر زورؔ لسانیات کے موضوع کو اُردو زبان میں روشناس کرانے والی پہلی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی "ہندوستانی لسانیات" کے دیباچے میں لسانیات کے موضوع کی اجمالی توضیح کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ

> "اُردو میں اب تک کوئی کتاب اس مضمون پر نہیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اس جانب پہلا قدم اُٹھایا ہے اور 'ہندوستانی لسانیات' کے نام سے یہ مختصر مگر جامع اور نہایت مفید کتاب لکھی ہے۔ جس میں اہم لسانیاتی مسائل اور خاص طور پر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات سے سلیس زبان اور دل نشین پیرائے میں بحث کی ہے۔ اس وقت ایسی ہی مختصر اور جامع کتاب کی ضرورت بھی تھی"۔

آج لسانیات کا موضوع قریب قریب ہر یونیورسٹی کے ایم۔ اے (اُردو) کے نصاب میں شامل ہے۔ ان کی اس اہم خدمات کی دنیا معترف ہے ـــــ کتنی ہی جامعات کے نصاب میں ڈاکٹر زورؔ کی تصانیف شریک ہیں۔ کتنے ہی ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے منظور ہونے والے تحقیقی مقالات ڈاکٹر زورؔ کی تصانیف، تالیفات یا تحقیقی مواد سے استفادہ کے بعد سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی خدمات نے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ آج بہت سے پڑھے لکھے آدمی بھی انھیں بحیثیت افسانہ نگار و شاعر نہیں جانتے۔ ڈاکٹر زورؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں بعض رومان پسندانہ نظمیں بھی کہی ہیں افسانے بھی لکھے ہیں اور طویل افسانہ بھی۔ ڈاکٹر زورؔ کے افسانوں میں تاریخی رومانی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے خصوصاً قدیم شہر حیدر آباد "بھاگ نگر" کی رانی بھاگ متی کی پوری داستانِ حیات کو نہایت خوش اسلوبی و چابک دستی کے ساتھ افسانوی جامہ پہنا دیا ہے۔ علمی و تحقیقی شغف نے ڈاکٹر زورؔ کو افسانہ نگاری اور شاعری کی جانب زیادہ عرصے تک متوجہ نہ رہنے دیا! اگر وہ اتنی ہی محنت و جانفشانی اس طرف اتنی ہی سنجیدگی سے مبذول کر دیتے جتنی انھوں نے تحقیقاتی کاموں کی طرف کی ہے تو خدا جانے اُردو افسانہ آج کس مقام پر ہوتا اور جدید اردو شاعری کا رنگ کیا ہوتا۔ پھر بھی یہ اعزاز ان کے لیے کم نہیں کہ "طلسمِ تقدیر" اور "تازیانہ" لکھ کر وہ اُردو کے افسانوی ادب میں بھی طویل مختصر افسانے کے بانی ہیں۔ ان کی شاعری بذاتِ خود ایک علٰحدہ موضوع ہے۔ ان کی شاعری نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ بہت کم کہا لیکن بہتوں سے اچھا کہا۔ یہاں بھی وہ بے جا روایت پرستی، معاملہ بندی اور گھسے پٹے موضوعات سے دامن بچاتے رہے۔ انھوں نے زیادہ شعر نہیں کہے لیکن جتنے شعر کہے ہیں جدید اُردو شاعری میں انھیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ شاعری انھوں نے ایامِ شباب میں کی لیکن پھر بھی ان کی طبیعت کی پاکیزگی ان سے زیادہ رنگین شعر نہ کہلوا سکی۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کے ایک اور وصف کی طرف بھی توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں پاکستانی ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ آج پاکستان میں ہندوستان کے دو "پدم بھوشن" بھی موجود ہیں۔ غالباً ڈاکٹر زورؔ کو "پدم بھوشن" کا خطاب اسی لیے نہیں دیا گیا کہ وہ جوشؔ ملیح آبادی اور نیازؔ فتحپوری کی طرح خطاب یافتہ ہو کر پاکستان چلے نہ آئیں۔ پاکستان مسلمانوں کے مطالبہ کی روشنی میں حاصل ہوا ہے اور برِصغیر کی تقسیم یا سقوطِ حیدر آباد کے بعد جو ترکِ وطن کا فیصلہ کر چکے تھے ان کا اقدام اس فیصلہ پر مبنی تھا کہ انھیں اب اپنے مرزبوم

سے کوئی علاقہ نہیں رہ گیا۔ یہاں ذکر عوام کا نہیں، خواص کا ہے۔ چودھری خلیق الزماں، جوش ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری، تین ایسی شخصیتیں ہیں جن کے ترکِ وطن سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو بڑی شدید ٹھیس پہنچی۔ نیاز اور جوش جب ہندوستان میں تھے اس وقت بھی یہاں کسی کے دل میں ان کی قدر و منزلت کم نہ تھی۔ ڈاکٹر زور بھی پاکستان آسکتے تھے اور ہم پاکستانی ان کی بھی عادتاً پذیرائی کرتے ——— لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر زور پاکستان میں رہائش اختیار کر لیتے تو حیدرآباد میں علمی و ادبی حلقے ہمیشہ کے لیے اُجڑ جاتے اُردو کا چمن ویران ہو جاتا اور کوئی آبیاری کرنے والا بھی نہ رہ جاتا۔ ڈاکٹر عبدالحق کے پاکستان آجانے سے ہندوستان میں اُردو کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں وہ ہندوستان میں رہ جاتے تو وہاں اُردو کو بہت بڑا سہارا مل جاتا۔ ان کے ہندوستان چھوڑ دینے سے اُردو کو زبردست نقصان پہنچا۔ اس کے برخلاف پاکستان میں اُردو کی نمایاں خدمات کے لیے وہ ذرائع میسر نہ آئے جو انھیں حیدرآباد میں اور حیدرآباد سے دلّی چلے آنے کے بعد بھی ریاستِ حیدرآباد سے حاصل رہے۔

——— ایسے حالات میں ڈاکٹر زور واحد آدمی تھے جن کی شبانہ روز کوششوں نے دردمندوں کے دل میں از سرِ نو اُردو کی محبت کے بیج بوئے۔ اور ہندوستان میں اس کے لیے ایک مستقل فضا پیدا کی۔ یہ مرحوم کا وہ احسان ہے جس سے تاحینِ حیات کوئی اُردو دوست سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم سے میرے خاندان کے مراسم کوئی نصف صدی سے زائد عرصہ تک رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی بابائے اُردو سے تیرہ چودہ برس تک نیاز حاصل رہا۔ وہ عمر کی جس منزل میں تھے اور اس کے باوجود جیسی محنت کے عادی تھے اس کی جھلک آج کے پُرجوش نوجوانوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ میری طرح جن لوگوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی آواز میں گونج کیوں باقی نہ رہی تھی۔ اور کن حالات کے تحت وہ "پاکستان میں اُردو کا المیہ" لکھنے پر مجبور ہوئے۔ یوں تو ہندوستان میں بھی اُردو کے بہت سے خدمت گزار ہیں جن کی فرداً فرداً خدمات ناقابلِ فراموش ہیں لیکن ڈاکٹر زور کی ہمہ گیر مساعیِ جمیلہ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان میں تنہا بذاتِ خود اس عہد کے "عناصرِ خمسہ" ہیں۔ یا یہ دیگر الفاظ رُوحِ اعصر!

بہ یک وقت پڑھنا پڑھانا، لکھنا لکھانا کئی اداروں کا انتظام سنبھالنا، علم و ادب کے مختلف شعبہ جات میں نئی راہیں نکالنا، رسائل، جرائد اور مجلات جاری کرنا، ایوانِ اُردو بنوانا، پرنسپل صدر شعبہ اور معتمد اعزازی کے فرائض بجالانا، تحقیق و تنقید میں لگے رہنا، تحقیق و تنقید میں لگائے رکھنا، شب و روز کام کرنا اور کام کرنا سکھانا، مخالفین کو دوست بنانا اور ان سے کام لینا، کام کا آدمی بنانا، اُردو زبان و ادب کی بے شمار گمنام شخصیتوں کو منظرِ عام پر لانا۔ بزرگوں کی عزت کرنا احباب کو ہمنوا بنانا اور چھوٹوں کا حوصلہ بڑھانا۔ ہندوستان میں اُردو کا حق منوانا اور اُسے مقام دلوانا، صلح کل کو شعار بنانا اور ان ساری مصروفیات کے علاوہ کبھی کبھی شعر کہہ لینا ——— کیا یہ تمام حقیقتیں ڈاکٹر زور کی عظمت کا ثبوت نہیں۔!

محمد اسحٰق ایوبی

ڈاکٹر زور اور مخطوطات کے تذکرے

اگر "ادارۂ ادبیات اردو" علم، ادب اور تحقیق کا میخانہ ہے تو قبلہ ڈاکٹر زور کی حیثیت "پیرمغاں" کی تھی۔ درحقیقت ان کی ہمہ گیر شخصیت ایک "جینئس" تھی جو تنقید و تحقیق" افسانہ و ناول اور شعر و شاعری کے میدان میں یکساں طور پر جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کرتی تھی۔ انھوں نے دورِ جوانی میں بزرگوں کی عقل و فہم، ذہانت و فطانت اور مردم شناسی کے جوہر دکھائے اور بڑھاپے میں جوانوں کے سے جوش و ولولے، سرگرمی و کارگزاری اور تگ و دو کی بدولت شاندار کارنامے انجام دیے۔ علم و عمل کی جولانگاہ میں ان کی کامیابیاں اپنے اندر تقلید، مثال اور سبق کے اہم پہلو رکھتی ہیں۔ یہ کارنامے دراصل بیش بہا خزانے ہیں جن سے موجودہ اور آنے والی نسلیں حسبِ استطاعت و مقدرت استفادہ کرسکیں گی۔

یوں تو ڈاکٹر زور نے علم و ادب کے شعبے میں ان گنت نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ تاہم ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ادارہ ان کے ایثار و قربانی، خلوص و بے غرضی اور جذبۂ خدمت کی جیتی جاگتی نشانی بھی ہے۔ اگرچہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں وجود میں آچکا تھا لیکن اس کے کتب خانے کی داغ بیل صحیح معنوں میں ۱۹۳۳ء میں پڑی۔ یہاں پانچ ہزار سے زائد مخطوطات اور تقریباً پچیس ہزار مطبوعات محفوظ ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر قلمی نسخے اور مطبوعہ کتابیں اردو ہی میں ہیں لیکن عربی، فارسی، ہندی، سندھی، پنجابی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی نادر و نایاب تصنیفات و تالیفات بھی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ مخطوطات اور مطبوعات اکثر و بیشتر عطیے کی شکل میں موصول ہوئے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی پانچ جلدیں اور مطبوعہ کتب، رسائل اور جرائد کی تین جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ قلمی کتابوں، بیاضوں اور رسالوں کے پانچوں تذکرے ڈاکٹر زور کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جبکہ مطبوعات کی فہرستوں کی تدوین پروفیسر اکبرالدین صدیقی کی عرق ریزی کی مرہونِ منت ہے۔

فی الحال ہم یہاں صرف مخطوطات کے تذکروں سے بحث کریں گے۔ محض تحقیق و تدقیق کا کام اتنا صبر آزما، وقت طلب اور جان لیوا نہیں ہے، جتنی کہ مخطوطات کی فہرستوں کی تدوین، تالیف اور ترتیب کی دردسری سے متعدد قلمی کتابوں میں سن تصنیف، سالِ کتابت اور نام کاتب نہیں ہوتا۔ بہت سے قلمی نسخے ناقص ہیں اور کئی مطبوعات مشکوک۔ علاوہ بریں بعض ادیبوں، شاعروں اور دیگر مصنفین کے نام، حالاتِ زندگی اور کارناموں کا علم کسی کو نہیں۔ ان تمام مشکلات پر قابو پانے کیلئے بڑی جگر کاوی، عرق ریزی اور جھان بین کرنی پڑتی ہے۔ یہ کام جتنا خشک، غیر دلچسپ اور کٹھن ہے وہ اصل میں اتنی ہی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کا حامل بھی ہے۔

ڈاکٹر زور نے قدیم و کہنہ ادبیات، شعر و شاعری اور علوم و فنون کے دفینے ڈھنڈ ڈھونڈ کر نکالے اور اپنی انتھک

کوششوں سے اردو زبان و ادب کو نئے نئے خزانوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ تاہم ادارے کے مخطوطات میں جنوبی ہند اور شمالی ہند دونوں علاقوں کی کتابیں شامل ہیں۔

اب تک ادارۂ ادبیات اردو نے مخطوطات کے تذکروں کی پانچ جلدیں شائع کی ہیں جو ڈاکٹر زور کے جوشِ عمل شغفِ علم اور زورِ قلم کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

ہم ذیل میں ان تذکروں کی امتیازی خصوصیات کا سرسری جائزہ لیں گے تاکہ جو قارئین ان غیر فانی کارناموں سے کماحقہ واقف نہیں ہیں وہ ان کے بارے میں تھوڑی بہت آگاہی حاصل کر سکیں :۔

ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کے تذکرہ کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی۔ اس جلد میں ۲۷۵ مخطوطات کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان میں ۷۵ کتابیں ایسی ہیں جو قطعی نادر ہیں یعنی وہ کسی اور کتب خانے میں موجود نہیں ہیں۔ تقریباً ۵۰ مخطوطے ایسے ہیں جنھیں مصنفین نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا ان پر ان کے دستخط پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً نصف قلمی نسخے ایسے ہیں جو اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے ہیں۔ مخطوطات صرف جنوبی ہندوستان کی تصنیفات و تالیفات پر مشتمل نہیں بلکہ لاہور، دلی، آگرہ، لکھنؤ، رام پور، بریلی، قنوج اور کلکتہ جیسے دور دراز مقامات کے معروف و غیر معروف اردو شاعروں اور ادیبوں کی کاوشیں بھی ان میں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ فرمانرواؤں مثلاً محمد قلی قطب شاہ، والیٔ گولکنڈہ علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور، عبداللہ قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ، واجد علی شاہ والیٔ لکھنؤ اور نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

اس جلد میں ۱۴۲۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیانی دور یعنی لگ بھگ پانچ سو سال کی کتابوں کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔

جلد اول میں ذیل کی فہرستیں بھی شامل ہیں :۔

۱۔ مخطوطات کی فہرست بہ لحاظ زمانۂ تصنیف۔
۲۔ قلمی کتابوں کے عطیہ دہندگان کی فہرست۔
۳۔ اشخاص، کتب اور مقامات کے ناموں کا اشاریہ۔

دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں طبع ہوئی۔ اس جلد میں اردو اور فارسی کی ایسی ۱۴ کتابیں بھی شامل ہیں جن کے مصنف و مولف ہندو ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوکاتبوں کے ۲۳ قلمی نسخے، ہندوؤں کی فرمایش پر لکھی ہوئی ۱۰ کتابیں۔ سنسکرت اور قدیم ہندی تصنیفات کے ۱۴ ترجمے اور ہندو ارباب علم کی ملک یا ان کے زیر مطالعہ رہنے والی ۵ کتب بھی شامل ہیں۔ جن مصنفین کے چار یا چار سے زائد مخطوطوں کا ذکر جلد دوم میں ہے ان کی تعداد ۹ ہے۔

دوسری جلد میں ۴۸ عربی نسخوں، ۲۵ فارسی کتابوں، ۲۵۱ اردو مخطوطوں اور ۵ ہندی قلمی کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح کل ۵۵۴ مخطوطے اس میں شامل ہیں۔ اصل میں ادارے نے ابتدا میں زیادہ تر اردو مخطوطات کو جمع اور محفوظ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں بعض عربی و فارسی وغیرہ کی قلمی کتابیں بھی ہاتھ لگ گئیں جو تحقیقی و تقابلی کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری تھیں۔

اس جلد میں فہرست مخطوطات بہ لحاظ موضوع اور اشاریہ شامل ہیں۔

تیسری جلد جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۵۰۰ کے قریب قلمی کتابوں کا ذکر ہے۔ اس کی اشاعت سے اردو ادب و شاعری کے بارے میں بعض نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں جن کا اجمال نیچے درج ہے :۔

جلد سوم میں متعدد ایسے شاعروں کے مجموعوں کی تفصیلات دی گئی ہیں جن کے کلام تو کجا خود ان کے ناموں اور تخلص سے اردو دنیا اس سے پہلے واقف نہ تھی۔ بعض شاعروں کے تخلص تو تذکروں میں ملتے تھے لیکن ان کے کلام کے مجموعوں کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔ چنانچہ ان کا کلام ادارے میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کا ذکر بھی تیسری جلد میں پہلی بار شائع کیا گیا ہے۔ چند مشہور اساتذۂ سخن کی نئی کتابوں کے قلمی نسخوں کا حال اس جلد میں درج ہے۔ قدیم اردو نثر کی بعض ایسی کتابوں کا تذکرہ بھی اس جلد میں ملے گا جن کے باعث اردو نثر کی تاریخ میں اضافہ ہوا ہے۔ جلد سوم میں چند ایسی کتابیں شامل ہیں جن کے نسخے ہندوستان کے اور کسی کتب خانے میں اب تک نہیں ملے ہیں۔ تاہم وہ صرف یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تیسری جلد میں کچھ نادر تذکرے شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں مشاہیر اردو کی کئی ایسی کتابیں ہیں جن پر دوسرے شاعروں یا ادیبوں نے اپنے قلم سے تنقیدی اور تحقیقی حاشیے لکھے ہیں۔ بعض مخطوطے حیدرآباد کی علمی و ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی اسی جلد میں ملے گا۔ اس کے علاوہ جلد اول میں جن قلمی کتابوں کا ذکر ہوا تھا، ان میں سے بعض کے بارے میں نئی معلومات بھی تیسری جلد میں دی گئی ہیں۔

چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں چھپی تھی۔ اس میں صرف دو سو قلمی نسخوں کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ اس جلد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چاروں جلدوں کی اجمالی فہرست دے دی گئی ہے۔ علاوہ بریں جلد چہارم میں فہرست معنفین، فہرست مخطوطات بہ لحاظ موضوع اور اشاریہ بھی شامل ہیں۔

پانچویں جلد ۱۹۵۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور اس میں ۲۵۰ مخطوطات سے بحث کی گئی ہے۔ اس طرح پانچ جلدوں میں مجموعی طور پر ۱۱۵۰ مخطوطوں کے بارے میں تفصیلات منظر عام پر آگئی ہیں۔

اس میں بھی ذیل کی فہرستیں دی گئی ہیں :۔

۱۔ کتابوں کے عطیہ دہندگان کے نام ۲۔ پانچویں جلدوں کی اجمالی فہرست

۳۔ پانچویں جلد کی فہرست بہ لحاظ موضوع ۴۔ اشاریہ

تعجب ہوتا ہے کہ قبلہ ڈاکٹر زور جیسا تجلی ملنسار اور ہمدرد خلائق شخص ادبی تصانیف اور روزمرہ کی گوناگوں مگر گرمیوں کے ساتھ ساتھ قلمی کتابوں کی پانچ فہرستیں مدون کرنے کا وقت کیونکر نکال سکتا تھا۔ اصل میں وہ رات دیر گئے یا صبح سویرے مخطوطات کو چھانٹتے، الگ کرتے اور ان کا مطالعہ فرماتے۔ پھر ان کی تصنیف کے دور اسلوب بیان اور طرز کتابت کی بنیاد پر نوٹ لکھتے جو اپنی جگہ جامع اور مکمل ہوتے۔ بعض اسکالر تو ڈاکٹر زور کے توضیحی نوٹوں ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر انھیں اردو کے دکھنی دور کی اتھارٹی مانا جاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر زور مخطوطوں کی چھان بین اور کھنگالنے کا کام کس طرح انجام دیتے تھے۔ سینکڑوں سال پرانی کتابوں کی گرد و غبار، خطرناک جراثیم اور ناگوار بو کسی بھی شخص کو ان سے متنفر کر سکتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف ان "اہنا الصنادید" کی

قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ زیادہ تر ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب میں جنوبی ہند کی ناقابل فراموش خدمات کا اعتراف سبھوں کو کرنا پڑا۔

"ادارۂ ادبیات اردو" میں اب بھی چار ہزار سے زائد ایسے مخطوطات موجود ہیں جن کی وضاحتی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جلد اول نایاب ہے۔ توقع ہے کہ ارباب ادارہ..... یہ کام جلد سے جلد انجام دینگے تاکہ اردو زبان و ادب کے پرستار اُن سے کما حقہ فیض یاب ہوسکیں۔ باقی ماندہ مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی ترتیب، نمونوں کی اشاعت کا کام نہ صرف ڈاکٹر زور کی یاد گار گردانا جائے گا بلکہ وہ ادارے کے بنیادی کاموں میں سے ایک اہم کام ہے درحقیقت یہ کام ایک مہم ہے جسے تحریک کے طور پر کسی کمیٹی کی تشکیل کے ذریعے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

▲ کتنی دکھ بھری خبر ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک فرد نہیں ایک انجمن تھے۔ ایسے شخص صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اردو والوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ ایسے میر کارواں ان کی محفل سے اٹھتے جاتے ہیں۔ وہ دکن میں ایوان اردو کا سب سے روشن مینار تھے جو آج سرنگوں ہے۔ وہ ہمیشہ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے کوشاں رہے ڈاکٹر صاحب سب رس کے مدیر اعلیٰ اور ادارۂ ادبیات اردو کے روح رواں تھے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کے شعبۂ اردو کے مشیر اور ماہنامہ آجکل کی مجلس ادارت میں سرفہرست تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے شمار علمی، ادبی، شعری اور تحقیقاتی کتابیں پیش کیں، جو اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علم و ادب کے علاوہ اصول پرست، بلند اخلاق، خلوص اور شرافت کے علمبردار حرکت عمل کے پیکر اور مشرقی وضع قطع اور تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آج کل وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر تھے جب کہ ۲ ستمبر کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کی موت واقع ہوی اور یہ آفتاب دکن ہمیشہ کے لیے کشمیر کی پہاڑیوں میں غروب ہوگیا۔

(دوماہی نگارش امرتسر، شمارہ ۱۱، ۱۲۔ ۱۹۶۲ء)

حکیم یوسف حسین خان

زور مرحوم کی شاعری

(ایک سرسری تبصرہ)

دوسرے ممالک میں شاعر عجوبہ ہوا کرتا ہے ہندوستان میں کسی کا شاعر نہ ہونا تعجب کی بات ہے اس لحاظ سے اور اس لحاظ سے بھی کہ زور مرحوم حضرت زعم کے فرزند تھے۔ ہم زور کو موروثی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ موروثی شاعر ضروری نہیں کہ شعر ہی کہے زور مرحوم نے نہ صرف جوانی میں بلکہ اواخر عمر میں بھی شعر کہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت فطرتاً بھی شعر گوئی کی طرف مائل تھی لیکن موروثی اور فطری شاعر ہونے سے بچ کر بھی میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اس معاملہ میں اکتساب بھی کیا اور باقاعدہ اس فن کو سیکھا۔ ان میں احساس اور شعریت پہلے ہی سے موجود تھی، ماحول بھی مشق سخن کیلئے راس ملا۔ کثرت مطالعہ اور بکثرت ملنے جلنے نے انھیں تجربہ گہرائی اور وسعت نظری بھی بخشی۔ ان تمام لوازم کی موجودگی میں ان کا ایک ہی اثر ہو سکتا تھا کہ زور کو یہ حالات ایک ایسا شاعر بنائیں جس کا نام بقائے دوام کی فہرست میں ضرور درج ہو جائے۔ ہوتا بھی ایسا ہی مگر اس کیمیا گری میں صرف ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ زور مرحوم نے مشق سخن میں مداومت نہیں کی۔ ان کی شاعری فرصت کا مشغلہ بنی رہی اور اس طرح سید محی الدین قادری زور شاعری کی حیثیت سے تو سر فہرست آنے سے رہ گئے۔ لیکن ابتدا و زمانہ نے اس کی تلافی اس طرح سے کر دی کہ ان کے تخلص کو ایوان شاعری کے ستونوں پر کندہ تو کر دیا لیکن اتنا شاعر کی حیثیت سے نہیں جتنا کہ شاعر گر کی حیثیت سے اور ایک ایسے سخن پرور اور سخن شناس کے روپ میں جو اگرچہ اچھے شعر خود بھی کہہ سکتا تھا مگر ترجیح اس کو دیتا تھا کہ اس معاملہ میں ساکن پانیوں میں کنکر پھینک کر خود بیٹھ جائے اور لطف اندوز ہوتا رہے کہ بڑی چھوٹی ہر طرح کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور کنارے چھو رہی ہیں۔ ان کی سخن فہمی سے دوسروں کا کلام نکھر جایا کرتا تھا چنانچہ شعر و ادب کی محفل میں اس قسم کے انسان کو شعراء سے الگ یا شعار سے مختلف شمار نہیں کیا جاتا۔ زور بھی شاعر کم روح رواں زیادہ تھے۔

مگر زور کی یہ کم شاعری بھی ایسی کم کم تو نہ تھی کہ اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے بعض شعراء پر گو ہوا کرتے ہیں مگر جب ان کے کلام کو پورا پڑھ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تمام دیوان میں گنتی کے چند ہی شعر ہیں جن کی بنا پر شائد ان کی حیثیت شعری تسلیم ہوئی ہو۔ ایسے بھی شاعر گزرے ہیں جن کا صرف ایک شعر زندہ ہے۔ زور مرحوم کا دوسرے لحاظ سے ہمارے ذہنوں میں جو مرتبہ اور مقام بن چکا ہے اگر ہم اُسے الگ بھی کر دیں تو ان کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ملیگا جو اس قدر قابل لحاظ ہے کہ دنیائے شعر میں ان کو نمایاں اور ممتاز جگہ دی جا سکے یہ اور بات ہے کہ عرصۂ شعر گوئی کی مناسبت سے مرحوم ذرا کم عمر ثابت ہوں اور ان کی اس کم عمری کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے کہ بزرگوں سے پہلے انھیں ساعت کر لو!

مرحوم کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے ایک دور عثمانیہ جب کہ وہ جامعہ عثمانیہ میں زیر تعلیم تھے۔ اور وہ سرا دور کشمیر کی جب کہ وہ جامعہ کشمیر میں اردو اور فارسی کے معلم اولیٰ تھے۔ ان دونوں ادوار کے بیچ میں ان کی شاعری کا تیسرا یعنی درمیانی دور سرے سے مفقود ہی ہے۔ یہی دور وہ دور ہوا کرتا ہے جس کو دیکھ کر دنیا یہ فیصلہ کیا کرتی ہے کہ شعراء کی صف میں کسی شاعر کو کونسا مقام دیا جانا چاہئے اور اس ترتیب میں اس کی حقیقی جگہ کونسی ہے۔

ہوا یہ کہ زور پر جب یہ دور آنا چاہئے تھا اس وقت وہ عارضی طور پر شاعری ترک کر چکے تھے اور انھوں نے ایک دوسرا ہی منصب العین تلاش کر لیا تھا جو ان کے فطری لگاؤ سے بہت مناسبت رکھتا تھا۔ اس میں وہ اتنا منہمک ہو چکے تھے کہ شعر گوئی جیسی فطری چیز بھی فراموش ہو کر رہ گئی۔ اس سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اظہار ذات کا یہ وسیلہ یعنی شاعری خود شاعر کی نظروں میں بھی بنیادی نہیں ثانوی درجہ رکھتی تھی، اس سے بہتر اور عمدہ وسیلہ جونہی ان کے ہاتھ آیا کمتر وسیلہ کو انھوں نے ترک کر دیا۔ میں ادب کے مختلف اصناف کا تقابل نہیں کر رہا ہوں نہ میرا مطلب یہ ہے کہ شعری ادب درجہ میں کم ہے اور نثری ادب یا تاریخی ادب زیادہ ہوا کرتا ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت صرف شاعر کی شخصیت اور شخصیت کے اظہار کے وہ وسیلے ہیں جو اپنی زندگی میں ہر ادیب یا شاعر تسکین ذات کے لئے اختیار کیا کرتا ہے اور جس کا اظہار بہرکیف روکا نہیں جا سکتا بلکہ لازم ہوا کرتا ہے۔ اس معاملہ میں زور صاحب نے بھی اولیں حیثیت ابتدا میں شاعری ہی کو دی۔ عمر کے درمیانی حصہ میں وہ نثری ادب کے ذریعہ اظہار شخصیت کرتے رہے۔ اس کے بعد دوبارہ ان پر ایک دور ایسا آیا جب انھوں نے متروک اور از کار رفتہ ذریعہ (اُن کے لحاظ سے:) ایک دفعہ پھر استعمال کرنے کے لئے چُنا۔

میں اس نقطۂ نظر کی اور زیادہ وضاحت کر دوں۔ اظہار ذات شعور سے بھی پہلے ہوتا ہے (جیسے بچہ کا مچلنا۔ جب وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں بھی ایک اکائی ہوں اور مجھے بھی حرکت اور ہاتھ پاؤں مارنے کا اتنا ہی اختیار ملا ہے جتنا کہ میرے سرپرست کو) لیکن حقیقی اظہار ذات شعور کے بعد ہی ہوا کرتا ہے اور پھر یہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن کر ہمارے ہر عمل کا محرک اصلی بن جایا کرتا ہے۔ اب ہم اپنی اپنی قدروں کے مطابق اس کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ چن لیا کرتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ قائد اسی طرح بنتے ہیں۔ آدمی مقتدی اسی طور پر ہوا کرتا ہے۔ وہ پیکر اور نوبل پرائز حاصل کرنے کا بھی محرک یہی جذبہ ہے۔ دار پر بھی اسی کی بدولت آدمی چڑھ جایا کرتا ہے۔ وہ انسان جو خود کو عمر بھر ایک بے لنگر کشتی سمجھتا رہتا ہے وہ بھی اسی لئے ہوتا ہے کہ یا تو اظہار ذات کا پتوار ہاتھوں سے کہیں چھوٹ چکا ہوتا ہے اور یا بے شعوری کی عمر میں لایعنی کو اتنا قبول کر چکا ہوتا ہے کہ جب اظہار ذات کا ذریعہ انتخاب کرنے کی نوبت آتی ہے تو کوئی واضح یا معین ذریعہ مستقل طور پر گرفت ہی نہیں کرنے پاتا۔

اس پس منظر کے ساتھ اگر ہم زور مرحوم کے کلام کو دیکھیں جو ابھی میں نے بتایا ہے تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی شاعری کے دونوں دور جیسا کہ اغلباً عبوری نوعیت کے تھے۔ پہلا دور جو جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ کا ہے اس وقت وہ اعلیٰ تعلیم ختم کر رہے تھے اور اپنے لئے کسی مستقبل کی فکر میں تھے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کا ملک اور اس کی تعمیل کے سارے امکانات وہ سوچ بھی چکے ہوں اور ممکن ہے کچھ ابھی ادھورے ہوں لیکن ان کو عملی جامہ ابھی انھوں نے نہیں پہنایا تھا۔ ایسے مرحلہ پر انسان کا ذہن کتنی کشاکش اور اضطراب میں مبتلا رہتا ہے اس کو روکے رکھنا بھی بیحد اہم ہوا کرتا ہے چنانچہ زور پر بھی اسی

کا وقت آیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب انھوں نے شعر گوئی میں پناہ لی پھر جیسے جیسے ان کے قدموں کے نیچے وہ پگڈنڈی آتی گئی اور جیسے جیسے یہ احساس تقویت پاتا گیا کہ یہ وہی جادہ ہے جو اُن کو اُن کی معینہ منزل تک لے جائے گا ویسے ویسے ان کی توانیاں اور ذہنی اپج دوسرے فقطوں پر مرکوز ہوتی چلی گئی۔ راہ نا ہموار تھی اسے آسان بنانا تھا اور یہ کام تمام تر توجہ کو ایک ہی نقطہ پر مرکوز کر رکھنے کا متقاضی تھا۔ زور بھی شاعری سے بے نیاز ہونے لگے یہاں سے اس درمیانی دور کا خلا شروع ہوا جسے اگر بھرا جاتا تو زور مرحوم بڑے شاعر کہلاتے اور جسے خالی رکھا گیا تو وہ دکن کے ناخدائے اردو ہو گئے۔ بہر حال انھوں نے ایک خلا کو بھرا اور ایک کو بالکل ہی خالی کر دیا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ دوسروں کو اکسا کر، سرپرستی کر کے، چمپوا کر، شہرت دلا کر انھیں اپنے بنیادی جذبے یعنی شعر گوئی کی تسکین کرنی پڑی مگر اس عرصہ میں خود انھوں نے ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔

ان کی شاعری کا دوسرا دور ان کے انتقال سے عین پہلے کا ہے۔ یہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ انھیں ترک وطن کرنا پڑا اور دوسرے ہی ایک گوشہ عافیت میں جا کر رہائش اختیار کرنی پڑی۔ اس وقت تک لوگ بھول بھی چکے تھے کہ زور صاحب شعر بھی کہتے ہیں۔ ایک اخبار نویس نے کسی نے پوچھا تھا کہ دکن کے کسی ایسے مشہور شاعر کا نام لو جس کا تخلص ہو مگر شعر نہ کہتا ہو اس پر اس نے برجستہ جواب دیا تھا "زور" یہ واقعہ بھی تھا۔ یہ تین حروف روا جتاً ان کے نام کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے چلے آئے تھے لیکن کشمیر پہنچنے سے پہلے تک عملاً ان کا قطعی کوئی جواز نہ تھا۔ اس زمانہ کی حد تک ان کو صرف محی الدین قادری سمجھا جاتا تو بھی ٹھیک تھا۔

یکایک ایک معجزہ ظہور میں آیا۔ کشمیر سے ان کا تازہ کلام سنائی دینے لگا!

ان کے قریبی احباب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہتا باقی دنیا کو یہ یاد بھی نہ تھا کہ مرحوم شاعر بھی ہیں۔ ان کی دو ایک غزلیں جیسے ہی چھپیں تعریف اور توصیف سے زیادہ ان پر حیرت اور تعجب کا اظہار کیا گیا۔ اس ضمن میں تذکرے اور تبصرے بھی ہوئے راقم بھی انھیں لوگوں میں سے ایک تھا جو کوئی رائے قائم نہ کر سکے، میں ان کا مداح ضرور تھا مگر جو زور میرے ذہن میں تھا وہ اس زور سے بالکل مختلف تھا جو کشمیر سے مجھے چونکا رہا تھا اور کافی دنوں تک میں یہ تصفیہ نہ کر سکا کہ ہر دو کو ایک دوسرے سے کس طرح مطابق کیا جائے۔ اس تعلق سے جو فیصلے صادر ہوئے وہ اب میں غور کرتا ہوں تو بڑی حد تک سطحی تھے مگر بات ہی ایسی اچانک تھی کہ تصفیہ گہرا ہوتا تو کیسے ہوتا عام خیال یہ تھا کہ ضرور یہ کشمیر کی کارفرمائی ہے۔ کشمیر اور رومان ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ سے متراد ف چلے آئے ہیں۔ زور صاحب کا نیا جوہر دیکھ کر بہت کم لوگوں نے زحمت کی کہ اصلی سبب دریافت کریں۔ سب ہی نے جنت نظیر کو زور کی اس تبدیلی کی اصلی وجہ گردانا شروع کر دیا حالانکہ وہ کافی سیاحت کر چکے تھے، یورپ دیکھا تھا ایک سے ایک حسین اور کیف پرور مقام پر ہو آئے تھے۔ کشمیر ان کے لئے نہ اجنبی تھا نہ غیر معمولی، نہ ان کے لئے کشمیر کوئی الف لیلہ کا ملک تھا کہ اس کے حقیقت بنتے ہی روح کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی کوئی دیوی ایسی چونک جائے کہ فکر کے چشمے پھوٹ پڑیں، معانی کا دریا بہنے لگے ایک سیلاب آجائے، ایک دو نہیں مسلسل دس پندرہ غزلیں پے در پے اس زمانہ میں زور صاحب نے کہہ ڈالیں اور سننے ہی سمجھا کہ یہ غزلیں کشمیر نے نذر سے کہلوائی ہیں۔ شاید ہی کسی نے اس کا خیال کیا ہو کہ زور اتنے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں میں سے نہیں تھے جتنے کہ عملی آدمی تھے۔ عملی آدمی کے خیال کی مہمیز پھولوں کے رنگ یا آبشاروں کی گنگناہٹ کا ظاہری اور سطحی جزو نہیں ہوا کرتی ہے ان کی بینائیوں میں پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔

زور کے اس دوسرے دور کی شاعری کو شروع کرانے میں ممکن ہے کہ نظاروں کو تھوڑا بہت دخل ضرور رہا ہو لیکن اس

کلام کو بہ نظر غائر دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ حسن کشمیر یا خنکی شالامار یا اس خطہ کی زعفران زاریت زور کی اس بے ساختہ تبدیلی کے تمام تر ذمہ دار تو ہرگز ہرگز نہیں تھے۔ اس دبی ہوئی چنگاری کو شعلہ جس نے بنایا وہ تو وہی جس ذہنی تھا وہی ایک کیفیت ایسی تھی جس نے اس دور کشمیر سے پہلے اور بہت پہلے جوانی کے دنوں میں بھی اس وقت جب کہ وہ محض ایک طالب علم ہی تھے زور سے شعر کہلوائے تھے اور ان کو تخلص شاعر بنا دیا تھا۔ وہ کشمیر پہنچے کیوں؟ حیدرآباد چھوڑا تو یہاں ان کو کس محبوب کو خیر باد نہ کہنا پڑا؟ کشمیر پہنچتے ہی کیا مستقبل درخشاں، خرابناک اور ہموار تھا؟ ان سوالوں کا جواب دے لیجئے تو زور مرحوم کے اس دوسرے دور کی شاعری کا حقیقی محرک آپ خود سمجھ جائیں گے۔ اصل میں ایک بار پھر زور ذہنی کش مکش میں پھنس گئے تھے، ایک بار پھر مستقبل دھندلا گیا تھا، ایک بار پھر وہ دوراہے پر کھڑے کر دئے گئے تھے۔ دو راہے پر فیصلے ضروری ہوا کرتے ہیں فیصلوں کا بچا ہوا اور صحیح ہونا حاضر دری ہوا کرتا ہے، افراتفری کو دور کرنے کی اہمیت ہوا کرتی ہے، اب کو یکجا کرتا پڑتا ہے، تو انائیوں کو سمیٹ کر اور ارادہ کو مضبوط کر کے وقت پر استعمال کرنے کی بھی تمامہ فراہم کی جاتی ہے۔ یہ کٹھن وقت اور عبور و سرور کا یہ غیر یقینی وقفہ آخر کیونکر گزار اجائے، یہ تھی وہ مہیب حقیقت جو دیو کی طرح ان کے سامنے کھڑی تھی اور جس سے ان کو نمٹنا تھا۔ زور نے پھر دوبارہ وہی کیا جو پہلے بھی ایک مرتبہ کر چکے تھے۔ انھوں نے شاعری کا رنگین آنچل اپنی نظروں کے آگے پھیلا لیا۔ کوئی آخری تصفیہ پر پہنچنے تک شطرنج سے دل بہلاتے ہے، کوئی کرکٹ کا میچ دیکھنے چلا جاتا ہے، زور نے غزلیں کہہ ڈالیں!

اگر مرحوم کی اس دور کی شعر گوئی محض ایک رومان انگیز فضا کا شاخسانہ ہوتی یا اس کی محرک صرف جذباتیت ہوتی تو سیاحت فرانس کے زمانہ میں بھی ایک آدھ غزل تو صادر ہوتی تھی، لندن میں ٹیمز کے کنارے کچھ نہ کچھ وہ دنیا دیتے تھے پھر اس اثر کے تحت کہے ہوئے اشعار میں بھی تو اسی رنگ کو چھلکنا چاہئے تھا۔ ان میں رومانی مٹھاس ہونی چاہئے تھی، اس قسم کا شعر ان کو نہیں کہنا چاہئے تھا ؎

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں کبھی سحر کے کبھی شب کے انتظار میں ہیں

نہ اُن کو یہ کہنا چاہئے تھا ؎

ہم اپنی گرمیٔ سوز دروں سے چیخ اُٹھے

شاداب وادیوں اور حسین و دلفریب ماحول میں انسان چیخا نہیں کرتا، لہکا کرتا ہے، گایا کرتا ہے۔ چیخ کا قافیہ بھی ایسی حالت میں انسان کے ذہن میں نہیں آتا اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ زور ایک بار نہیں کئی بار چیخ چیخ اٹھے ہیں۔

کشمیر نے ہو سکتا ہے کہ زور سے یہ شعر کہلوایا ؎

یہ ہجوم گل و لالہ یہ رنگ و بو، یہ جوش موج و خروش لب آب جو
میرے ہاتھوں ایسے سنورتے گئے، نازش ارض و فخر سما بن گئے

لیکن اسی غزل کا مطلع بھی ذرا ملاحظہ فرمایئے اس میں جنت کی کار فرمائی تو آپ کو نہیں ملے گی۔ ہاں جہنم کی حدت اور جھلسے ہوئے احساس کی چراند آپ کو ضرور آجائے گی اور یہ اسی اُدھڑ والے شعر کی غزل کا مطلع ہے۔ ہجوم گل و لالہ بعد میں سنورے ہیں، قلم اٹھتے ہی نہ رنگ بنا نہ آب جو سے نغمہ نکلا، پہلے تو انقلاب کی آنی ذہن میں اتری اور اس کے بعد بکھرتے بکھرتے

ایک قابل احترام ہستی کو بھی لگا ڈگی فرماتے ہیں ؎

انقلاب زمانہ ہے شاید یہی دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے
ہم جو بن بن کے بگڑے تو بندے بنے وہ بگڑتے بگڑتے خدا بن گئے

زور مرحوم کے قیام کشمیر کے دوران میں کہے ہوئے حسب ذیل اشعار بھی مجھے ایسے شخص کے اشعار معلوم نہیں ہوتے جو دنیا کی سیاحت کر چکنے کے باوجود صرف کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر شعر و سخن کی روایاتی رومانی فضا میں گم ہو گیا ہو اور جس نے بے مقصد طریقہ پر محض حسن و عشق اور وصل و ہجوری کے گیت تخلیق کر ڈالے ہوں ؎

حرص و ہوس کو گرمیٔ بازار چاہیئے — خستہ دلوں کو درد کے ماروں کا شوق ہے
انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر — دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے

مرحوم نے دور عثمانیہ میں جو شعر کہے ان میں اُن کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر داخلی ہے۔ کہنے کا طریقہ بھی بڑی حد تک روایاتی ہے۔ ایک ذہین ہونہار اور ابھرتا ہوا شاعر جس پر مومن اور غالب کا رنگ ابھی پوری طرح چڑھا بھی نہ ہو جس طرح کے شعر کہہ سکتا ہے کالج کی زندگی کے زمانہ میں زور نے بھی اسی طرح کے شعر کہے۔ ان دنوں کی ۵ نظمیں اور ۳ غزلیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زور کے تخیل میں اس وقت شب مہتاب، شب وصال، محبوب، نگہہ ناز، دیدۂ گریاں، انفاس مسیحا وغیرہ قسم کی اصطلاحات موجود تھیں اور ان اصطلاحات کو وہ ان ہی کے معنوں میں استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ طالب علمی کے اس دور میں زور کے کلام میں نہ تو ہمیں زیادہ بلندیاں ملتی ہیں اور نہ بہت اتھاہ گہرائیاں۔ کہتے وقت وہ ڈوبتے نہیں تھے البتہ کہے ہوئے اشعار کا جو طرز ہے وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ زبان میں روانی اور سلاست دونوں ہیں اور خیال کا رشتہ ذہنی رومانیت سے استوار ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ہم یہ اندازہ بھی بآسانی کر سکتے ہیں کہ ذوق سخن ہم نے مانا کہ عمومی ہے مگر اور کچھ پختگی پیدا ہو گئی تو یہی ذوق پھر اس سطح پر نہ رہے گا اس سے بہت اونچا ہو جائے گا۔ آثار ایک طرح سے بے حد حوصلہ افزا تھے اس وقت کے شعروں میں ایک طرح کا دلولہ بھی ہے جو اُن کے اس کلام کو عمومیت سے ممتاز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اس دور کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اُس کا اسلوب ہے۔ اس اسلوب سے ہر جگہ یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ ابھی تو بفضلہٖ ابتداء ہے، مشق جاری رہی تو سخنوری مجھ کر یقیناً چمک دمک اٹھیگی اور آئندہ کبھی ضرور اس میں ایسی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی جو منفرد کہی جا سکے اور ایک علامت فارقہ بن جائے۔ زور نے شعر کہنا چھوڑ دیا نہ چھوڑتے تو ایک وضع خود تراش جاتے اور وہ ان کے کلام کی انفرادیت ہو کر ان کو شعراء میں بھی الگ شناخت کرانے کا ذریعہ ثابت ہوتی۔

اس دور کی نظموں سے ایک تعلق خاطر کی غمازی بھی ہوتی ہے۔ نظموں سے خصوصاً اس وابستگی کا پتہ چلتا ہے جو زور مرحوم کو اپنی مادر علمی (جامعہ) سے پیدا ہو چکی تھی۔ "جامعہ عثمانیہ اور نوجوانان دکن" والی نظم کسی طرح بھی رسمی نہیں کہلا سکتی۔ اس میں احساس جھلکتا ہی نہیں چھلکتا بھی ہے۔ اسی طرح "رہبر منزل کی جدائی" بھی دوسری نظموں سے جداسی معلوم ہوتی ہے ان دونوں نظموں میں ایک ایسا تاثر ملتا ہے جو اس زمانہ کے لحاظ سے اور ان کی اس وقت کی عمر کے مدنظر قطعاً غیر معمولی ہے۔ جذبات کا یہ دھارا بعد میں جا کر نثر گوئی میں تبدیل ہو گیا۔ تغزل اور موسیقیت "چمپلم کی رقاصہ" اور "گوالکنڈے کے ہیرے" بن گئے۔ یونیورسٹی سے محبت اور دکن کی وطنیت سے والہانہ اُنس نے "سب رس" "نذر قلی قطب شاہ"

اور "تذکرہ مخطوطات" کی شکل اختیار کرلی۔ زور کو یہ سہولتیں اگر نہ ملتیں یا وہ کسی اور سبب کی بنا پر محض شاعری پر ہی رہنے پر مجبور ہوتے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ مادر وطن کی کوئی منقبت یا جامعہ کے متعلق کوئی مثنوی علم و دانش نور در وجود میں آجاتی۔ آج ہم ایران اردو پر فخر کرتے ہیں اس صورت میں ہم ان کی کہی ہوئی منقبت یا مثنوی کو دکن کے نمائندہ شاعر کا شہ کار کہا کرتے اور باقی دنیا کے سامنے پیش کیا کرتے!

زور کے دور طالب علمی کے چند شہ پارے سن لیجئے پھر ہم آگے بڑھیں گے اور اُن کے دوسرے دور کی شاعری کا اجمالاً احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

وہ بزم غیر وہ جھوٹے فسانے — انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا؟
گنا کرتے ہو راتوں کو جو تارے — یہ آخر زور تم کو ہو گیا کیا؟

دل ہوس ہائے مجازی میں ہے چشم حساد — خوف ہے راز حقیقت کہیں افشا کردے
عاشقی میں ہے مواخات کا رشتہ قائم — شمع ہر روز نہ کیوں خون کا دعوی کردے

دل جب سے ہوا ہے خوگر غم، آزار میں لذت پاتا ہوں
گلہا تنگ مسرت دور رہے ہیں اس سے بہت گھبراتا ہوں
ہر روز ہزاروں زخم نئے اس زخمی دل پر کھاتا ہوں
افتاد سے ہوں مجبور مگر، کب چاہ سے میں باز آتا ہوں

اس کے ہر ذرہ کو رشک آفتاب اب دیکھئے
عظمت ملک دکن کو بے نقاب اب دیکھئے
ہو چکا منت کشی کا سد باب اب دیکھئے
دیکھئے ہاں دیکھئے، یہ انقلاب اب دیکھئے

داغ ہائے ننگ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالان دکن شاداب ہوتے جائیں گے

اوپر کا بند اُن کی نظم "نونہالان دکن" کا آخری بند ہے۔ حب الوطنی کے باب میں تو مختصراً میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں لیکن اس نظم سے ایک اور حقیقت بھی ہم پر عیاں ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ کے زمانہ میں زور کی افتاد طبع غزل کے مقابلہ میں نظم گوئی کے لئے زیادہ موزوں رہی ہوگی۔ اُن کی دوسری نظموں میں بھی غزلوں کے مقابلہ میں ہی بیساختہ پن زیادہ پایا جاتا ہے اور اغلباً اسی صنف سخن کے لئے ان کی طبیعت میں آمد بھی زیادہ ہی تھی۔ ہاں ذرا یہ تعجب کا مقام ہے کہ

دوسرے دور میں (ایام قیام کشمیر میں) انھوں نے جس قدر طبع آزمائی کی اُس کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ دو ایک نظمیں جو اسی دور کی کہی ہوئی ہیں اُن کو پڑھا جائے تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے یعنی اب کی بار غزلوں میں آمد زیادہ ہے اور نظموں میں مقابلتہً کم ہے ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ نظم کو تسلسل اور طوالت درکار ہوا کرتی ہے اور زور زندگی کی دوسری تباہی میں اتنا منہمک ہو چکے تھے کہ تسلسل اور طوالت کو برقراری دینا ان کی مصروفیات کی بنا پر ان کے لئے قابل عمل نہیں رہا تھا۔ غزل تو ایک مصرعہ کر کے کہی جا سکتی تھی، دو شعروں میں وقفہ بھی ہو سکتا تھا۔ دو شعر مختلف الموضوع بھی لکھے جا سکتے تھے۔ دوسرے کاموں سے جو لمحات بچ رہیں ان میں انسان کی فرصت کے لحاظ سے غزل کے اجزا ڈھل سکتے ہیں نظم البتہ اس برتاؤ کی اجازت نہیں دیتی، اس کی کیا نیت کو شروع سے آخر تک تمام تر توجہ چاہئے اور وقت بھی زیادہ درکار ہوا کرتا ہے اس لئے دوسرے دور میں اس شاعر نے اغلباً غزل ہی کو فوقیت دی ہوگی۔ نظمیں انھوں نے کم لکھیں پھر بھی اس معاملہ میں ایک عجیب تضاد جو مجھے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ غزلوں کا نچ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ غزلوں جیسا ہے۔ ان میں حقائق نگاری ہے، مسایل ہیں، مسائل کے ساتھ شاعر کے برتاؤ میں مربوطیت ہے چنانچہ اس کے پیش نظر میں زور کو بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہی سمجھتا ہوں۔ مجبوری نے ان کو جو کچھ بنا دیا وہ تو مجبوری تھی لیکن ظاہری نوعیت کو حقیقت حال پر کیوں اثر انداز ہونے دیا جائے۔

مرحوم کے پہلے دور کا کلام اگر غم جاناں تھا تو دوسرے دور کا کلام قطعی یقینی اور حتمی طور پر غم دوراں ہے اور صرف غم دوراں ہے اس دور کی داغ بیلیں اور ایک خیز بقدمی نظم جو فارسی میں ہے حیات مابعد کے دامن میں آئی ہیں۔ پندرہ غزلیں کچھ ایسا بڑا سرمایہ نہیں کہ اُن کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ نہ پندرہ غزلوں پر اکتفا کر کے ان کو بقائے دوام کی سند دلانی چاہئے۔ ۵ غزلیں اتنا بڑا عدد بھی نہیں جن کی بنا پر کسی شاعر کے حسن و قبح کا تصفیہ کیا جائے، اتنا سا مواد ناکافی سمجھا جانا چاہئے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ لوٹتے ہوئے تارے کی چنگاریاں تو بیشک نہیں گنی جاتیں لیکن یہ ہماری یاد پر نقش ہو جایا کرتا ہے کہ ان اجزائے پریشاں نے روشنی کتنی دی تھی۔ زور مرحوم کی ان آخری پندرہ غزلوں میں تقریباً ۸۸ اشعار ہیں۔ یہ کہنا تو خیر مبالغہ تصور ہوگا کہ یہ ۸۸ اشعار اشعار نہیں ہیں، دوہے ہیں۔ البتہ کسی تردید کے خوف کے بغیر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے اور ایسا کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان ۸۸ شعروں میں سے بیشتر شعر ایسے ہیں جو فرداً فرداً اگر جانچے جائیں تو ان میں سے ہر ایک ایک غزل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی آخر عمر کے یہ جواہر پارے تعداد کے لحاظ سے گنتی کے ہیں لیکن (عقیدت بالاطلاق) مطالب اور تاثر کے لحاظ سے اس قدر وزنی اور وسیع ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس قدر بیش بہا کیسے ہو گئے، بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کی دین، جسے مل گئی، مل گئی۔

ان پندرہ غزلوں پر کسی خاص مدرسۂ فکر یا کسی مخصوص ادارۂ خیال کی چھاپ نہیں ہے۔ ان میں اس قدر انفرادیت بھی نہیں ہے کہ ایک الگ اور منتخب مکتب وجود میں آیا ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ مرحوم بے ارادہ طور پر سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے اور جب واپس آئے تو ہر سرزمین کا کوئی نہ کوئی نادر تحفہ لے کر آئے۔ یہ اُن کا محبوب مشغلہ نہ تھا اس لئے نہ تو خریدتے وقت کوئی خاص معیار اُن کے مدنظر تھا اور نہ جب وہ گھر لوٹے تو کسی خاص ترتیب سے انھوں نے نوادرات کو سجایا، ذوق البتہ سلیم قسم کا ودیعت ہوا تھا اس لئے جو کچھ لائے تھے اور جس طرح بھی سجایا وہ جگمگا اٹھا۔ اس کلام میں اکثر شعر آپ کو

ایک دوسرے سے الگ ملیں گے۔ کہیں میر کی جھلک ملے گی، کسی میں درد کا شائبہ، کہیں غالب طنز فرما رہے ہوں گے، کہیں اقبال لہری سچ میں ڈوبے ہوئے پائے جائیں گے۔ ان شعروں میں دکنی ادب دکنی ترقی پذیر زبان اور دکنی شعراء کا انداز بھی موجود ہے اور دلی اور لکھنؤ کی اردو کی آمیزش بھی۔ حد یہ ہے کہ آج کل کے دو بڑے مکاتیب سخن یعنی خالص متغزلیں اور جدید ڈھنگ کے صرف مسائل شاعری کرنے والے گروہوں میں سے ہر دو گروہوں کے رنگ کی بھی کامیاب نمائندگی ملے گی۔ ابتدائی دور کی شاعری میں جو بے ساختہ پن تھا زور مرحوم کے آخری دور کی شاعری میں وہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ پہلے سے زیادہ ہی نکھر گیا ہے۔ طنز تیکھا اور دھار دار ہو گیا ہے۔ اب زور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ تشکیک یا درس استعارہ نہیں بلکہ ایسی تشبیہات ہیں جو حقیقی مطلب کو مزید نمایاں کرنے اور قابل قبول بنانے کے لئے استعمال کی جایا کرتی ہیں۔ جوشیلے پن نے سنجیدگی اور بردباری تو اختیار کر لی ہے لیکن جہاں پہلے شباب کے لہجے میں جھجک تھی اور جہاں پہلے اس کے دل میں ڈر تھا کہ نہ جانے سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ وہاں بزرگی کی زبان میں صاف گوئی اور لہجہ میں اتنا تیقن آ گیا ہے کہ اُسے یہ اطمینان حاصل ہے کہ کوئی غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہو سکتی بُرا بھی کوئی نہ مانے گا۔ کیونکہ ترشا ہوا ہیرا نکلا ہے اور ہیرے سے اگر خراش لگ جائے تو کونسی بُری بات ہوئی!

اس زمانہ کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ زور بنیادی طور پر محب وطن تھے، وہ محب وطن ہی رہے۔ انھوں نے آفاقیت پر چھا جانے کی کوشش نہیں کی۔ زندگی کے جو اثرات اُن پر اُن کے وطن پر یا اُن کے ماحول پر مرتب ہوئے اپنے لہجے ہوئے کلام میں انھوں نے صرف ان ہی مسائل کو سمویا۔ اس ضمن میں اُن کے ابتدائی کلام اور ان کے آخری کلام میں مقابلتہً جو فرق پڑ گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اُن کی فکر کا مرکز داخلیت سے ہٹ کر اب ماورا ذات ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنی ذات سے بچ کر اس اصطلاح میں بھی سوچنا شروع کر دیا کہ وہ جزو ہیں کل نہیں۔ کل میں دوسرے بنی نوع بھی شریک ہیں۔ یہ شعار اُن کے اپنے ہم قوم ہم وطن افراد ہی تھے جن کے احساسات کو انھوں نے اپنے اندر منطبق کر کے شعروں کی شکل دینی شروع کر دی۔ زور کے دور جوانی میں سماجی یا معاشی طور پر کچھ زیادہ پریشانیوں کا وجود نہ تھا۔ افکار واجبی واجبی سے تھے۔ آخری دور میں ان پریشانیوں نے وسعت اور ہمہ گیری اختیار کر لی تھی۔ تقریباً ساری کی ساری دنیا اب اس کی زد میں آ چکی تھی۔ زور کی فکر نے اس کا ادراک کیا اور جب اس کا ساز چھڑا تو اس کا خاص خیال رکھا کہ نغمہ بندی ہی رہے، لے جھازی نہ ہونے پائے! اس طرح سے انکی شعر گوئی غم جاناں سے ہٹ گئی۔ نمود اور خود نمائی سے بھی بچ گئی۔ غم دوراں تو کہلانے لگی لیکن یہ غم اپنوں کا غم رہا، حدِ بند توڑ کر "ہمسایہ کی شادی میں عبداللہ دیوانہ" کا مصداق نہ ہونے پایا۔ اس کو بھی میں شاعر کی عظمت ہی کی ایک دلیل سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو محدود رکھا اور پابندیوں کو شکست نہ ہونے دیا۔ زور کا افق شخصی نہیں عمومی ہوتے پر بھی اپنا افق معلوم ہوتا ہے اور اپنی دسترس سے کبھی دور ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ نہ یہ افق ساری دنیا کے درد کی طرح بے لگام اور بے ارادہ ہی آپ کو زور کے ہاں ملے گا۔

مرحوم کے دونوں ادوار کے کلام میں ایک اور بھی بین فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق کچھ اس طرح کا ہے جیسا میر اور سودا کی طبیعتوں میں تھا۔ میر کی ٹک رونے رونے آنکھ لگ گئی تو انھوں نے بڑی سعادت مندی اور بجد و سلیقے لہجہ میں کہا کہ میاں ذرا آہستہ۔ ابھی تو سویا ہوں۔ سودا کی بالیں پہ شور مچا تو جھٹ ندامِ ادب آن موجود ہوئے اور للکار کر کہنے لگے

نگاہ رُبرو! ادب برقرار خبردار حضور کی ابھی آنکھ لگی ہے' ہاں! عہد جوانی کا زور جب تلنگانہ کی رم جھم سے دوچار ہوا اور طبیعت میں جولانی کی لہریں پیدا ہوئیں تو گنگنا اُٹھا ؎

موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی ۔۔۔ اے کاش مل سکے نگہ یار بھی وہی

لیکن یہی زور جب زندگی کے سرد و گرم دیکھ چکا' انقلابات سے گزر چکا' تلخی حیات پی پی کر کام و دہن آزما چکا' یہی زور جب تجربہ سمیٹ چکا' حقیقت کو پہنچ چکا تو اس کے باوجود کہ وہ کشمیر میں ٹھیرا ہوا تھا جہاں کی بوندا باندی کسی طور پر بھی تلنگانہ کی بارش سے کمتر نہیں یہی زور جب وہ زینہ طے کر چکا جو شاعر کو بلند مقام پر پہنچاتا ہے تو اسی زور کی زبان اسی مضمون کو اب یوں کہتی ہے ؎

پینے والے مے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں ۔۔۔ چشم ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں ہم لوگ

یہ دونوں اشعار پڑھئے اور خود اندازہ فرمالیجئے کہ زور کتنا بدل چکے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے زور اور جامعہ کشمیر کے زور ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں کہ دونوں ایک نہیں معلوم ہوتے وہ الگ الگ افراد نظر آتے ہیں۔ دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ ایک نے نگہ یار مانگی تھی دوسرا چشم ساقی جیسی چیتی شے سے بھی بے نیاز ہو چکا ہے بلکہ دوسروں کو بھی تلقین کر رہا ہے کہ اس کا بھروسہ نہ کریں وہ طوطا چشمی پر اتر آ سکتی ہے۔ حیدرآباد اور کشمیر میں جو فصل ہے' جوانی اور بڑھاپے کے درمیان جو عرصہ ہے' پختگی اور ناپختگی کے بیچ میں جو طول طویل اور پیچ راستہ ہے' حقیقتاً وہی ایک معیار ہوتا ہے جو شاعروں میں یا ایک شاعر کے دو ادوار میں مابہ الامتیاز ترقی یا تنزل کی طرف سامع کی رہنمائی کیا کرتا ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے بعد زور پستی کی طرف نہیں گئے۔ بلندی پر اپنا نشیمن بنایا۔ بلندی کوئی ادنیٰ نہ تھی' عقاب کی پسندیدہ تھی اور عقاب کی پرواز بلند ہوتی ہے' انتخاب کرتی ہے تو مان سرور یا ایورسٹ سے کم انتخاب نہیں کرتی۔ یہ اعتراف کرنا ہی پڑیگا کہ زور نے ترک سخن کر دیا تھا اور ان کی شاعری میں فصل آ گیا تھا تو یہ حال ہوا جو اوپر بیان کیا گیا ہے لیکن اگر مشق جاری رہتی اور وہ صرف اسی صنف پر اپنی تمام تر توجہ کو مرکوز رکھتے تو بلاشبہ دوسرے آسمانوں کی خبر بھی لاتے اور نئے نئے افلاک دریافت کرتے۔

ان کے مندرجہ ذیل شعر بھی میرے ادعا کو درست ثابت کریں گے ؎

جو خار کبھی تھے تنگ چمن ہیں آج وہی نسرین و سمن
کیا جانئے کس جا لالہ و گل پا بند نزاکت بیٹھے ہیں

میدان قیامت جیت لیا دیوانوں نے آگے بڑھ کر
ہاں سر بہ گریباں فرزانے با فہم و فراست بیٹھے ہیں

غور فرمائیے کہ احساس کتنا شدید اور نظر کتنی گہری ہو چکی ہے' نثر کے مصلح اور معمار تو وہ تھے ہی' شعر و سخن کے باب میں بھی قیادت سنبھال رہے تھے اور قدم بڑھا کر تیز رفتاری سے راہبروں کی صف میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو: ؎

حیرت سے دیکھتا ہوں کہ یہ گلبدن ہیں کون
کھلتا نہیں ہے ان میں سر انجمن ہیں کون
قدریں بدل چکی ہیں یہ معلوم ہی نہیں
شیریں سخن ہیں کون دریدہ دہن ہیں کون
سیکھی ہے رہبروں نے اسیروں سے رہ زنی
ارباب انبساط غریب الوطن ہیں کون

اور اس غزل کے آخری دو شعر توحیدرآباد کی جانی پہچانی اور مشہور خاص و عام قومیت اور یک جہتی اور برسوں کی بنی بنائی وطنیت کے شیرازہ کے بکھر جانے کا صحیح معنوں میں ماتم ہیں۔ یہ اشعار زندہ رہیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ آنسو جذب ہو کر ملیامیٹ نہیں ہو سکیں گے، منجمد ہو کر سنگ مرمر سے ترشی ہوئی کسی یادگار کی طرح یہ دونوں اشعار بھی قائم رہیں گے کیونکہ یہ ان کے دل ہی کی آواز نہیں، سینکڑوں دیگر محبان وطن کے دل کی بھی آواز ہیں۔ ایک دنیا اس معاملہ میں انکی ہمنوا ہے، ہاں جس جرأت اور جس نزاکت سے انھوں نے اس جذبہ کی ترجمانی کی ہے اس جرأت اور نزاکت سے ادا کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہمیں ملے۔ غالب نے جب دلی کا نوحہ کہا تھا تو اس کے بعد کوئی دوسرا ویسا ماتم کہہ سکا؟

وہ دونوں اشعار یہ ہیں ؎

شیرازۂ بہار گل تر بکھر گیا — اب کس کو کیا بتائیں کہ زیب چمن ہیں کون
کشمیر میں کوئی تو گراچی میں ہے کوئی — اے زور کس سے پوچھئے اہل وطن ہیں کون

مقطع میں کس سے پوچھنے کی بلاغت اور اس میں جو نشتر چھپا ہوا ہے اس کی اذیت میں نہیں سمجھا سکتا لیکن آپ خود محسوس کر چکے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے وجود سے مایوس ہو کر کوئی دیوانہ قزاقانہ اپنے ہی جسم کو کچوکے دے رہا ہے اور خود ہی پوچھ جا رہا ہے کہ اس درد کی لذت بیان کر!

اس چھوٹے سے مضمون میں زور مرحوم کے آخری کلام کا اور زیادہ تجزیہ کرنا اور اس کے محاسن کو ایک ایک کر کے گنانا ممکن نہیں۔ یہ تفصیل کبھی بعد میں ہوگی اور اس کے لئے مجھ سے زیادہ موزوں اصحاب شاید یہ کارنامہ انجام دیں۔ ان کا یہ آخری کلام بھی طبع تو ضرور ہی ہوگا اور اس کے مطالعہ اور ریسرچ سے جو نتائج اخذ کئے جائیں گے وہ زیادہ مفصل اور محیط ہوں گے لیکن میں جو کچھ عرض کر چکا ہوں اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ زور محی الدین قادری ہونے کی وجہ سے ہم اپنے زمانہ کے ایک اور ناخدائے سخن سے محروم رہے۔ اگر وہ صرف زور ہی رہتے تو آج اساتذہ کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ ملتا، سرزمین دکن سے چوتھی کے شاعر اس صدی میں معدودے چند ہی پیدا ہو سکے ہیں اور شاعر ہونے کی حیثیت سے مجھے بیشک اس کا قلق ہے لیکن ادب کا ایک ادنیٰ اور سچا پرستار ہونے کے ناطے سے ظاہر ہے اس قسم کے تاسف کا قطعاً نہ تو کوئی موقع ہے اور نہ جواز۔ زور شاعر ہی رہتے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کام جو وہ کر گئے اس کام کو کون انجام دیتا اور یہ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی اور یہ کام کر سکتا یا نہ کر سکتا میں تو کم سے کم نہیں کر سکتا تھا!!!

محمد اکبر الدین صدیقی

اِدارہ اور اَیوانِ اُردو

آج سے ۳۵ سال پہلے حیدر آباد میں ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے کوئی ناشر نہ تھا اور ادیب "خود کوزہ و خود کوزہ گرو خود گل کوزہ" کے مصداق تھے۔ اب تک بھی حیدر آباد کو ایسا کوئی ناشر نصیب نہ ہوا جو ادیبوں کی کتابوں کو معاوضہ دے کر نہ سہی، بلا معاوضہ ہی چھاپ لے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی کتابیں "روح تنقید" اور اس کے بعد "طلسم تقدیر" اور "مضامین" چھاپنے کا ارادہ کیا تو انھیں کوئی ناشر نہ ملا اور انھوں نے خود ہی ساری ذمہ داری اپنے سر لی۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مطبع ابراہیمیہ اور مکتبۂ ابراہیمیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا جہاں مصنفین اپنی کتابیں چھاپ سکتے اور مکتبہ میں فروخت کے لئے رکھ سکتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے "تنقیدی مقالات" نامی کتاب شائع کی۔ اس کے بعد ہی وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ گئے۔ انھیں تین سال قیام کرنا تھا اور لسانیات پر تحقیقات کرنا تھا۔ دو سال میں انھوں نے یورپ میں کھنی مخطوطات کے متعلق کام کیا اور تعطیلاتِ ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد آگئے۔ یہاں "اُردو شہ پارے" جیسی شاہکار کتاب تین ماہ کے اندر مرتب کر کے شائع کی اور پھر لندن واپس ہو گئے۔

جب سال بھر کے بعد ڈگری لے کر آئے تو جامعہ عثمانیہ میں اُردو ریڈر مقرر ہوئے اور ملک کے ہونہار اور نوجوان طبقہ کے علمی و ادبی ذوق کو اُبھارا۔ اس میں ان کے دوست احباب بھی تھے اور شاگرد بھی۔ دوست احباب کو جمع کر کے ایک علمی انجمن کی بنا ڈالی جس میں ہفتہ وار جلسے ہوتے اور ہر جلسہ میں مضامین پڑھے جاتے اور ان پر تنقیدیں ہوتیں۔ ان نوجوانوں میں میر خاں (میر انجنگ) ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ڈاکٹر یاور دت علی خاں۔ میر یٰسین علی خاں (انجینیر) پروفیسر محمد علی خاں، پروفیسر سید محمد۔ عبد الرحمن شریف۔ عبد الرزاق راشد اور عمر یا فنی شریک تھے۔ ان سب حضرات کا تعلق بالکلیہ حیدر آباد سے تھا یا یہ کہئے کہ عثمینٹ دکنی تھے۔ ریاست حیدر آباد کے ہر اہم عہدہ پر شمالی ہند کے لوگ چھائے ہوئے تھے اور انھیں قطعی گوارا نہ تھا کہ حیدر آبادی اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ انھیں بڑا خوف یہ تھا کہ اگر یہ آگے بڑھیں تو پھر ہماری کمزوریاں گرفت میں آئیں گی اور جو مقام آج حاصل ہے وہ باقی نہ رہے گا۔ یہ حضرات متقدر حضور رس اور بے تاج کے بادشاہ سر اکبر حیدری کے مصاحبین تھے۔ اسی لئے ان لوگوں نے حیدر آبادیوں کو کبھی آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا اور اگر کسی نے منت سماجت کی اور اثر اور دباؤ زیادہ پڑا تو تیس تا ساٹھ کی اہلکاری دے کر اس کو بندۂ بے دام بنا لیا۔ یہ تو عبد الرحمن خاں صدر جامعہ عثمانیہ کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے حیدر آباد کے ذہین طلبا کو یورپ بھیجا اور واپسی پر جامعہ عثمانیہ ہی میں لے لیا۔ یورپ سے

ڈگریاں لے کر واپس آنے والوں کو بھی کسی محکمہ میں اچھی جگہ نہ مل سکتی تھی۔ جب انجمن کے اراکین کی سرگرمیاں ان عہدہ داروں کے کانوں تک پہنچیں تو انھوں نے دور اندیشی سے کام لیا اور انگریزوں کی چال چل کر سر اکبر حیدری کے سامنے ان نوجوانوں کی شکایت کی کہ یہ حضرات انجمن بنا کر ریاست کے مفاد کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ اگر ابھی سے اس کا انسداد نہ ہو تو باغی سر سے اونچا ہو جائے گا۔ اور پھر کچھ بنائے نہ بن سکے گا۔ سر اکبر جیسا مدبّر ان کے چکر میں آگیا اور اس نے پورے آئے ہوئے حضرات کو فرداً فرداً چائے پر بلایا اور تنبیہہ کی کہ ایسی حرکت کی تو ملازمت سے نکال دیے جاؤ گے۔ پھر لوٹی ٹھکانا نہ ہوگا۔ سر اکبر کو بعض نوجوانوں نے بہت کچھ سمجھایا کہ ہم وہاں مضامین پڑھتے ہیں، شعر کہتے ہیں، علمی مباحث کرتے ہیں، اس کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن حضرات باراں دیدہ کے مقابلہ میں ان کا اعتبار کون کرتا۔ چنانچہ یہ انجمن برخاست ہو گئی اور ان نوجوانوں میں بعض نے ہمت ہاردی اور بعض نے کمریں کس لیں اور طے کر لیا کہ ؎

ہر چہ باد ا باد ما کشتی در آب انداختیم

چنانچہ ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے چند ساتھیوں یعنے پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ عبدالقادر صدیقی۔ عبدالقادر سروری اور نصیرالدین ہاشمی کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں علی الاعلان ادارہ ادبیات اردو قائم کیا۔ اسکے حسب ذیل اغراض و مقاصد تھے:—

(۱) اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت اور حفاظت۔
(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔
(۳) ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔
(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لئے ضروری وسائل اختیار کرنا۔
(۵) اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔
(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی ادب و آثار کی حفاظت۔
(۷) ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ خواتین کے لئے وقف رہے۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب نے ایک انجمن کو جو محدود وسایل اور گنجایش میں کام کر رہی تھی، ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ بلند عزم اور حوصلے کے ساتھ ادارہ قائم کیا اور اس کی بارہ (۱۲) شاخیں بنائیں۔ انھوں نے نہایت وسیع القلبی سے کام لے کر اپنے دوست احباب کے علاوہ اردو سے دلچسپی اور خدمت کا جذبہ رکھنے والے بوڑھوں جوانوں اور لڑکوں کو بھی اپنے اطراف جمع کر لیا۔

ارکان ادارہ نے پانچ چھ سال تک نہایت خاموشی سے علمی اور ادبی خدمات انجام دیں۔ ہر شعبہ نے اس عرصے میں کچھ نہ کچھ کام کر کے دکھایا اور پندرہ کتابیں شائع کیں۔ اُس وقت لوگوں کی آنکھیں کھلیں کہ ڈاکٹر صاحب یا ان کے رفقاء استحصال نہیں کر رہے ہیں بلکہ محض اردو کی خاطر گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں تو حمد کرنے والوں نے حمد بھی

کیا اور کچھ روشن خیال مخالفین دوست بھی بن گئے۔

ادارے کی جانب سے سب سے پہلے میر حسن اور مخدوم محی الدین کا ڈرامہ "ہوش کے ناخن" شائع ہوا۔ اس سے ڈاکٹر صاحب اور ان کے معاونین کی بے نفسی، بے لوثی اور ایثار کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ انھوں نے اپنی یا اپنے ساتھیوں کی کتاب نہیں چھاپی بلکہ اپنے شاگردوں کی کتاب پیش کی۔ یہ کتاب عبدالرحمن خاں پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نام معنون تھی۔ جن کی موت پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی موت سے چند دن قبل لکھا تھا:۔

"وہ جامعہ کے ایسے مزدور ثابت ہوئے جس کو عمارت کی تکمیل کے بعد ہی برخاست کر دیا جاتا ہے ....."

یہ ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت تھا اپنے اُستادِ مشفق کی بارگاہ میں ادارے کی سب سے پہلی کتاب اس کے بانیوں کے شاگردوں نے لکھی اور بانیوں کے استاد کے نام معنون ہوئی۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ یہ ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ انھوں نے ادارہ محض اردو کی خدمت کے لئے قائم کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اپنے شاگردوں اور ملک کے نوجوانوں میں کام کا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہو اور اُن کا یہ احساس کمتری بالکل مٹ جائے کہ دکنی کچھ نہیں کرتے۔ اس احساس کمتری کو حیدرآبادیوں کے دلوں سے نکالنے میں ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑی خدمت انجام دی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ نوجوانوں کو کام کے لئے اُبھارا بلکہ ان سے کام لے کر ان کو زندگی کے عملی میدانوں میں کام کرنے کے قابل بنا دیا یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا فیض ہے کہ آج حیدرآباد میں بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے اور شعرا منظر عام پر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:۔

"اس سلسلے کی اشاعت و طباعت مرہونِ منت ہے بعض احباب کے مالی ایثار کی جنھوں نے ازراہ علم دوستی اس کے لئے ایک ایک سو روپے کا عطیہ عنایت کیا اور اس سلسلے کی بنیاد ڈالی جو ممکن ہے کہ آج حقیر نظر آئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام کام ابتدا میں بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں"

اس طرح ادارے کے اشاعتی پروگرام کا آغاز ہوا۔ اور تمام شعبے اپنا اپنا مفوضہ کام انجام دینے لگے۔ پہلا شعبہ شعبۂ زبان تھا جس میں اردو کے مشہور اہل قلم اور ادیب اور صحافی قاضی عبدالغفار سابق مدیر "کامریڈ" اور "پیام" حیدرآباد۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے علاوہ ڈاکٹر جعفر حسن، پروفیسر سید محمد، پنڈت دتاتریہ دھرجی ودیا لنکار، پروفیسر سروری، پروفیسر ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر راحت اللہ خاں اور ڈاکٹر زور صاحب شریک تھے۔ اس شعبے نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف تھا۔ اس کی ایک قسط "سب رس" نومبر ۱۹۳۹ء میں شائع کی گئی۔ سرکاری کاروبار میں جو الفاظ استعمال ہوتے تھے اُن پر تنقیدی نظر ڈالی گئی۔ دکنی محاورے، کہاوتیں اور پہیلیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اصلاحی مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ جن میں دکن کی مروجہ زبان پر تنقیدی تنقید کی گئی۔ یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ اور ہندوستان کے اکثر رسالوں میں اس پر مضامین شائع ہوئے۔ غرض زبان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور روشنی ڈالنے کے اسباب فراہم کئے گئے۔

ادارے کی کارگزاریوں سے واقف کرانے اور نوجوانوں کے مضامین شائع کرکے ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لئے جب ایک رسالے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی تو جنوری ۱۹۳۸ء سے "سب رس" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے بعد اس کے ضمیمے "بچوں کا سب رس" اور "سب رس معلومات" بھی جاری ہوئے۔ "سب رس" ابھی تک علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ البتہ "بچوں کا سب رس" اور معلومات بند کردئے گئے۔

ایک شعبہ تنقید کا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو تنقید نگاری کے معیار کو بلند کیا جائے۔ "سب رس" میں تبصرے کے لئے وصول ہونے والی کتابوں پر بے لاگ تبصرے کئے۔ انگریزی تنقید کے اصولوں سے واقف کرایا اور ادارے کے ترجمان "سب رس" کے ذریعہ گراں قدر خدمت انجام دی۔

چوتھا شعبہ تالیف و ترجمہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دیگر زبانوں کے ادب عالیہ کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ ایسی علمی و فنی کتابوں کے ترجمہ کی ضرورت پر زور دیا جو ہمارے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے لئے مفید ہوں۔ غیر زبانوں کی ایسی کتابوں کا انتخاب کیا گیا جو قابل ترجمہ سمجھی گئیں۔

پانچواں شعبہ تاریخ دکن کا تھا۔ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ اردو میں تاریخ ہند کی اکثر کتابیں صرف انگریزی سے ترجمہ یا تالیف ہو رہی ہیں اور اس میں دکن کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاریخی ادب کی تخلیق کے لئے تحقیقی صلاحیت اور وسعت نظر کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل حقیقت سے واقف ہو سکے۔ اس شعبے کو ابھی تک بھی پروفیسر عبدالمجید صدیقی جیسے ماہر مؤرخ کی رہنمائی حاصل ہے اور ملک کے مشہور مؤرخین نواب عنایت جنگ بہادر، نواب علی یاور جنگ بہادر، نواب منصب جنگ اور علی اصغر بلگرامی کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس شعبے نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ "تاریخ گولکنڈہ"۔ "مقدمۂ تاریخ دکن"۔ میر محمد مومن۔ فرخندہ بنیاد اور داستان ادب حیدرآباد جیسی وقیع اور گراں قدر کتابوں کی اشاعت کے علاوہ دکن کی کئی مشہور ہستیوں کے حالات شائع کئے۔ قطب شاہی دور کی تاریخی عمارات کے تحفظ کے لئے حکومت کو توجہ دلائی اور کتبوں کے چربے لے کر ادارے میں محفوظ کئے۔

ادارے کا ایک شعبہ شعرا و مصنفین دکن ہے۔ دکن نے کئی ادیب اور شعرا پیدا کئے لیکن ان کے کارنامے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس شعبہ نے ان کی تصانیف کو جمع کیا اور انھیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ شعرا کے دواوین کے انتخابات شائع کئے۔ دکن کے شعرا کے تذکروں کی تین جلدیں شائع کیں اور اس طرح انھیں زمانے کی دست برد سے بچا لیا۔ اکثر شعرا کے مزاروں کا پتہ لگایا اور ان پر اپنی جانب سے کتبے نصب کئے۔

ایک شعبہ سائنس کا ہے۔ جس کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ عوام کے لئے علمی ادب عام فہم انداز میں پیش کرے۔ اس شعبے نے بھی کئی کتابیں مرتب اور شائع کیں۔ مثلاً سائنس کے کرشمے۔ آب دوز اور سرنگ۔ پانی کی کہانی۔ زہریلے پودے۔ چیونٹی۔ پودوں کی کہانی و طبیعاتی کائنات اور ہمارے پھول وغیرہ۔ یہ کتابیں غیر معمولی طور پر مقبول ہوئیں۔ یعنی بعض کے تین تین چار چار ایڈیشن شائع ہوئے اور ملک کے مؤقر جرائد اور صاحب بصیرت اصحاب نے بہت سراہا۔

علم و ادب کا ذوق رکھنے والی خواتین کو ایک مرکز پر جمع کرنے، انھیں مشورے دینے اور ان کے ادبی کام کو آگے بڑھانے کے لئے خواتین کا شعبہ قائم کیا۔ ان کی کئی مطبوعات منظر عام پر آئیں۔ خصوصاً تحقیقاتی مضامین کے

مجموعے "نذرولی" نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اس شعبے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے سارے کاروبار خواتین ہی انجام دیتی تھیں۔

نسوانی ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کی طرف توجہ دینے کے لئے ایک شعبہ اطفال قائم کیا گیا اور بچوں کیلئے کتابیں لکھوا کر شائع کیں۔

اسی طرح طلبا کے مفاد کے لئے ایک شعبہ طلبا، قائم کیا گیا تاکہ طلبا کو ابتدا ہی سے ادبی ذوق سے آشنا کرایا جائے۔ انھیں تقریر و تحریر کی عادت ہو۔ اس کے لئے ادارے کے ترجمان "سب رس" کا ایک ضمیمہ "بچوں کا سب رس" شائع کیا جو عرصۂ دراز تک جاری رہا اور اس نے کافی مقبولیت حاصل کی۔

کتب خانہ کا شعبہ نہایت اہم ہے۔ اس میں ارکان ادارہ کی مساعی سے قلمی کتابیں، شاہی فرامین۔ قدیم کاغذات دستاویز۔ قدیم مطبوعات۔ ادیبوں کے خطوط اور بیشتر ایسی مفید تحریریں جمع کی جانے لگیں جن کی اہمیت سے محققین بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ آج یہ کتب خانہ حیدرآباد کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ اتنی متنوع دستاویزی تحریریں کسی اور کتب خانہ میں نہیں۔ مخطوطات نہ صرف جمع کئے گئے بلکہ ڈاکٹر زور صاحب نے ان کی وضاحتی فہرست پانچ جلدوں میں شائع کر کے کتب خانے کی افادیت کو عام کر دیا اور کتب خانے میں جمع شدہ مطبوعات کی بھی تین فہرستیں شائع کر دیں جس میں تقریباً پندرہ ہزار کتابوں کا ذکر آ گیا ہے۔ ریسرچ کرنے والوں اور اخبارات کے مدیروں اور مالکوں کے لئے یہ بات بھی دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوگی کہ "سب رس" کے تبادلے میں جو رسائل اور اخبارات آتے ہیں انھیں سال بھر کے شماروں کی ایک جلد بنا کر کتب خانے میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح آج حیدرآباد میں رسائل کا ذخیرہ جتنا ادارے میں ہے اتنا کہیں نہیں۔

ایک شعبہ اردو امتحانات کا ہے۔ ادارے نے اردو کی توسیع اور اشاعت کے سلسلے میں بالغوں میں علم کا ذوق پیدا کرنے کے لئے اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات رائج کئے۔ ان امتحانوں نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ حیدرآباد کے اضلاع میں اور حیدرآباد سے باہر بھی اس کے کم و بیش اسّی مراکز مقرر ہوئے اور امیدواروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ یہ امتحانات اب تک بھی جاری ہیں۔

آخری شعبہ اردو انسائیکلو پیڈیا کا قائم ہوا اس کی ترتیب کے لئے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے تمام اہل علم کا تعاون حاصل کیا گیا۔ حرف الف محدودہ سے کام کا آغاز ہوا۔ بطور نمونہ اس کے سو صفحے چھاپ کر شائع کئے گئے اور پھر کام کا آغاز ہونے کے بعد صرف ۷ صفحے چھپ چکے تھے۔ علمائے ہندوستان سے رائیں طلب کی گئی تھیں یہ رائیں اتنی اچھی اور حوصلہ افزا رہیں کہ شاید ہی کسی اور کتاب کو ملی ہوں! لیکن مالی دشواریوں نے کام کو آگے بڑھنے سے باز رکھا۔ ادارہ اب تک بھی اپنے اراکین کے عطایات کا مرہون منت تھا۔ حکومت کی کوئی مدد نہ تھی۔ اسلئے اتنا بڑا کام انجام دینا آسان نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کام سے دست کشی اختیار کر لی گئی۔

ادارے کی اتنی شاخیں قائم ہوئیں۔ لیکن اس کی ہر شاخ کی عنان ڈاکٹر زور صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ یوں کہئے کہ وہ ہر شاخ کے معمار تھے۔ ہر شاخ کے روح رواں تھے۔ ہر تحریک میں جان ڈالنے والے تھے۔ ان ہی کے اشارے پر

شاخوں کے کاروبار آگے بڑھتے رہے اور ادارہ دن بدن ترقی کرتا گیا۔

ادارے نے ۱۹۴۴ء میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک شان دار کُل ہند اردو کانگریس منعقد کی۔ ملک کے صاحبانِ ذوق نے بھی دل کھول کر تعاون کیا۔ باہر سے آنے والے نمایندوں کے لئے بشیر باغ پیلس حاصل کیا۔ جہاں اُردو کے ایران کاروان یعنے سر شیخ عبدالقادر، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور افضل العلما ڈاکٹر محمد عبدالحق مقیم رہے۔ تین دن تک کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے۔ ٹائپ رسم الخط، اشاعت کتب، زبان وغیرہ ہر مسئلہ پر سیر حاصل بحثیں ہوئیں اور اس کانگرس کی روشنی میں ادارے نے اپنے کاموں کو آگے بڑھایا۔ اس طرح یہ کانگرس بہت کامیاب رہی۔

اب تک ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ حکومت کی کوئی امداد نہ تھی۔ کتابوں کی فروخت اور "سب رس" ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ یا پھر کچھ امتحانات سے مل جاتا تھا۔ ادارے کا دفتر ڈاکٹر صاحب کا ڈرائنگ روم تھا۔ کام بڑھتا گیا۔ دفتر بھی پھیلتا گیا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے دولت کدہ سے متصل ایک مکان بنایا جس میں پانچ کمرے اور ایک ہال تھا اور ادارے کو اس میں منتقل کر دیا۔

ادارے کا معائنہ اب تک کئی بڑی بڑی شخصیتیں کر چکی تھیں اور تعریف بھی خوب ہوئی تھی۔ گویا ادارہ بھی ایک شعر ہو جس پر داد دی جا رہی ہو۔ جب جناب غلام محمد صدر المہام فینانس (بعد کو گورنر جنرل پاکستان) نے ادارے کا معائنہ کیا تو فرمایا:۔

"زور صاحب جی چاہتا ہے کہ آپ کو خزانہ عامرہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔"

اس کے بعد ہی انھوں نے ادارے کے لئے کافی رقم منظور کی جس کا سلسلہ کمی و بیشی کے ساتھ اب تک جاری ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے بھی جس نے ہندوستان میں اردو کے تعلق سے وسیع التعلیمی اور بالغ نظری سے کام لیا ہے ادارے کو گرانٹ دے رہی ہے۔ اس امداد کے بعد سے ادارے کے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور حوصلے بڑھ گئے اکثر حلقوں سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ ادارے کی ایک اپنی عمارت کسی مرکزی مقام پر ہو۔ جہاں لوگوں کے لئے آمد و رفت کی سہولت ہو۔ اس بنا پر حکومت کے سامنے یہ عرضداشت رکھی گئی جس نے یک مشت رقم دینے کی بجائے سالانہ کچھ رقم عمارت کے نام سے دینے کا وعدہ کر لیا۔ کافی عرصہ گزرنے کے باوجود بھی موزوں جگہ نہ ملی۔ ہر شخص نے ادارے کی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ جب ۱۹۷۶ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی ادارہ پر تشریف لائے تو یہاں کے کاروبار کو دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ اس کا نام ہی "ایوانِ اُردو" رکھا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ادارے کی نئی عمارت جو انشاء اللہ جلد بنے گی اس کا نام "ایوانِ اردو" رکھا جائے۔

حیدرآباد کی لسانی بنیاد پر تقسیم سے پہلے محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور صاحب نے ایک قطعۂ اراضی ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے عطیہ دیا۔ جب زمین ملی تو رقم جو حکومت کے پاس جمع تھی، حاصل کر لی گئی۔ جناب فیاض الدین صاحب نظامی چیف آرکیٹکٹ نے ایک ایسا حسین نقشہ تیار کیا جس میں دنیا کے تمام طرزہائے تعمیر سموئے۔ قطب شاہی۔ مغل، عادل شاہی۔ رومن۔ الحمرا اور غرناطہ کے نقوش سب ہی اس میں شریک تھے

عمارت کی تعمیر شروع ہوئی اور قدم قدم پر مالی رکاوٹیں پیش آئیں۔ اس لئے کہ حکومت کی عطا کردہ تھوڑی سی رقم اس رفیع الشان عمارت کی بنیاد سے کچھ دور اوپر آنے کے بعد ختم ہوگئی لیکن ڈاکٹر زور صاحب اور اُن کے رفقا نے ہمت نہیں ہاری۔ عمارت کا نقشہ بجنسہ رہنے دیا اور حصول رقم کی کوشش کرتے رہے۔ مرکزی حکومت نے بھی گراں قدر عطیہ دیا۔ حکومت کشمیر نے بھی زبان اور ادب کی خدمت کی خاطر عطیہ دیا۔ حکومت آندھرا پردیش نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اسٹیٹ نواب سالار جنگ بہادر، سنگاریڈی کالریز، نظام شوگر فیکٹری اور ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ کے علاوہ اور علم دوست اور ادب نواز اصحاب نے اپنے عطایا سے عمارت کی تکمیل میں تعاون کیا۔ اور اردو کی اپنی ذاتی عمارت "ایوان اردو" کے نام سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی، جہاں ادارے کے پورے اثاثہ کو نہایت سلیقہ سے سجایا گیا۔ قدیم اشیاء عجائب خانے کی زینت بنیں۔ تاریخی عمارتوں کے کتبوں کے چربے اس کے حسن میں اضافے کا باعث ہوئے۔ ہندوستان کے تمام مشاہیر ادیبوں اور شعرا کی تصویریں اس کے لئے باعث زینت ہوئیں۔ اس کا کتب خانہ اس قدر اہتمام سے مرتب ہوا کہ خواہش مند کو دو منٹ میں کتاب مل سکتی ہے۔ اردو ادب میں جن ہتھیاروں کے نام ملتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اس کے میوزیم میں موجود ہیں۔ طومار کی شکل میں شجرے ہیں جن میں ایک تو ڈیڑھ فٹ چوڑا اور بہتر (۷۲) فٹ لانبا ہے۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دور کا شہر حیدر آباد کا ایک نقشہ ہے جو ۱۰ × ۱۰ فٹ کا ہے جس کی نقل برٹش میوزیم نے حاصل کی ہے۔ ریسرچ کرنے والوں کے لئے رہائشی کمرے موجود ہیں۔ جب یہ عمارت ان تمام قیمتی نادر، کمیاب اور حسین و جمیل ذخیروں سے آراستہ ہوگئی تو اس کا افتتاح اُردو کے بہی خواہ اور شیدائی خالد کشمیر جناب بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر کے ہاتھوں عمل میں آیا اور آج یہ ایوانِ اردو تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہا ہے۔ ؎

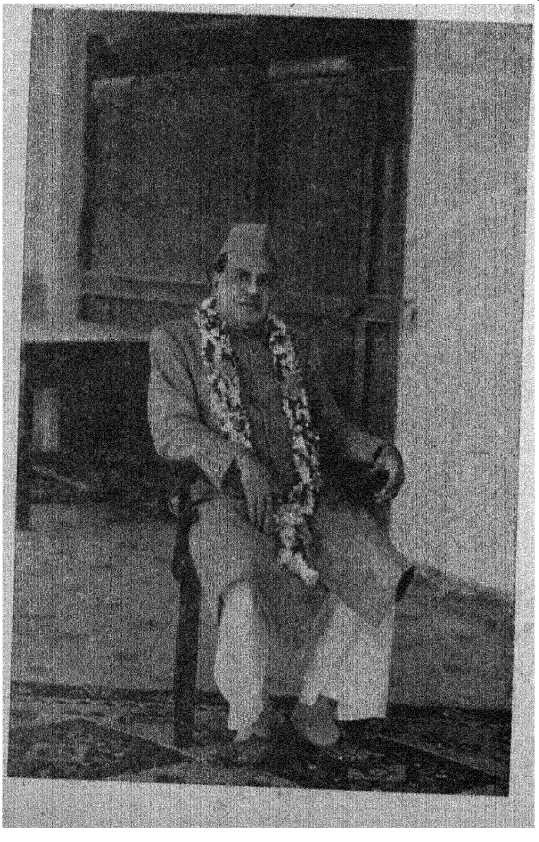
حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

بہ شکریہ "شیرازہ" سری نگر کشمیر

ڈاکٹر زور

کو

منظوم خراج عقیدت



تلوک چند محروم

رُباعیات

(بر وفات حسرت آیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

اے موت، بڑا غضب یہ ڈھایا تو نے
دیکھا بھی ہے؟ کیا سماں دکھایا تو نے
کشمیر سے تا دکن ہے ماتم کس کا
کیوں زورؔ کو دنیا سے اٹھایا تو نے

—:•:—

اپنا اک مہربانِ مخلص تھا زورؔ
تھا پیکرِ دل نشیں شرافت کا زورؔ
اے کاش اسے کوئی نہ مرنے دیتا
تقدیر پہ چلتا ہے کسی کا کیا زور

—:•:—

پھر کون سرافراز سوئے گور گیا
ماتم کا جلو اوجِ عرش تک شور گیا
افسوس، صد افسوس، ہزاراں افسوس
بزمِ ہستی سے ناگہاں زورؔ گیا

—:•:—

سب اہلِ وطن، وطن میں روتے ہیں تجھے
شہر و دشت و دمن میں روتے ہیں تجھے
تو گلشنِ کشمیر سے بو ہو کے اڑا
احباب ترے دکن میں روتے ہیں تجھے

کشمیر کو جاتے ہیں سیاحت کے لیے
یا رفعِ مرض، حصولِ صحت کے لیے
اے زورؔ یہ کیا کہ لے گئی تجھ کو قضا
کشمیر میں آہ، مرگِ غربت کے لیے

سلیمان خطیب

رستہ بتانے والا رستے میں کھو گیا جی!

دکن منے سُنے ہے اک حشر ہو گیا جی
اک آس کا گھروندا پانی میں بھو گیا جی
رستہ بتانے والا رستے میں کھو گیا جی
کیا وقت پو ہمن کے کی بخت سو گیا جی
ماٹھی پڑو ہمن پو دل گیا ہے
جیون تھا سپھول اس کا پھولاں میں مل گیا ہے

تجھ یاد کی مشعل سوں جلیا یچ تن اچھیں گا
انکھیاں میں غم ہمارے دریا منن اچھیں گا
دکنی کا اک دوانا کوہ کن گزر گیا جی
کی بعد ان نمط کا شیریں سخن اچھیں گا
دکنی کوں جھونیڑے سوں "ایواں" میں لا بٹھایا
اپنچ واسطے توں گز بھر جگا نہ پایا

پڑتے ہیں آنکھیاں سوں موتی کے سمان موتی
ماٹھی منے ملے ہے کی آب دار موتی؟
ہر اک سخن پو تیرے صدقے ہزار موتی
لیا تا تھا کا ڑ دل کے دریا کے سمار موتی
غواصی

دکھن کی کھان میں توں لعل یمن ہوا تھا
تجھ کوں نظر لگی ہے چندر بدن ہوا تھا

دکن کے دیش میانے ماتم ہے واویلا ہے
دکن کا زور جا کو بے زور ہو گیا ہے
لعوسوں خطیب اپنے یو مرثیہ لکھیا ہے
"تجھ شعر کا اوازا سب جگ منے ہوا ہے" (ولی)

ہر بیت تیز بھالا جا دل منے اڑے ہے
پھٹ کوں کلیجہ ٹکڑے انجھو ٹپک پڑے ہے
کشمیر کی پون توں جو بی ادھر گزرنا
شبنم کے موتیاں سوں سبزے کی گود بھرنا
اتا سخن اپڑنا یوں نا کیداں بسرنا
پھولاں سوں باس لے کو تربت کے پھیرے کرنا
جو لگ ہیں چاند سورج دکنی کا کام چمکے
ہر کام کی جبیں پو اس کا ہی نام چمکے

پروفیسر بیگم ثریا سلیم

زورِ دکن

مغموم و دل گرفتہ ثریا کی بات سُن
اے روحِ زور! باغِ عقیدت کے پھول چُن

جاں داد ۂ عمل سے محبت کسے نہیں
اے روحِ زور! تجھ سے عقیدت کسے نہیں

فکر حسیں پہ نور کی چادر تنی ہوئی
گویا بکھر گئی ہے تجلی خمیر کی ہوئی

تجھ سے ہے علم و فن کا ستارہ عروج پر
فخرِ دکن! سلام ہمارا قبول کر

موجود ہے جو کام، جو پیغام زندہ ہے
اُردو ادب میں زور ترا نام زندہ ہے

تیرا قلم جو روحِ روانِ سطور ہے
ایک ایک لفظ میں رخِ معنیٰ کا نور ہے

تو نے وفا کے دیس میں، فرزندِ جامعہ!
اے مردِ بے مثال! خرد مندِ جامعہ

ذرّوں میں آفتاب کے انوار بھر دیے
فنکار محوِ خواب تھے بیدار کر دیے

ہر سمت حسنِ کارگزاری کی دھوم ہے
گویا دکن میں بادِ بہاری کی دھوم ہے

تو نے دیے سنوار جو گیسوئے زبان کے
تیور ہوئے کڑے مری اردو زبان کے

ہر محفلِ دکن میں چراغاں تجھی سے ہے
ایوانِ فکر و فن میں چراغاں تجھی سے ہے

داعی ہے انقلابِ شعور و نظر کا تو
خضرِ حجستہ پا ہے دیارِ ہنر کا تو

نوکِ قلم سے سینۂ تاریخ چیر کر
جن کی نہیں نظیر نکالے ہیں وہ گہر

تیرے قلم سے تیرے وطن کا وقار ہے
تیری حیات خود سببِ افتخار ہے

ہر لفظ نورِ پاکشِ تری ہر کتاب میں
ہیجان سا بپا ہے دلِ آفتاب میں

قدرت خدا نے دی تھی جو تنظیم کار کی
پھوٹی کرن کرن سے تجلی بہار کی

اُردو میں زورِ جوشِ روانی تجھی سے ہے
روئے دکن پہ آبِ جوانی تجھی سے ہے

نورِ نگاہِ علم، جگر گوشۂ دکن
ہے تیرے کارِ فکر پہ نازاں دل وطن

اردو پہ تو نے رنگ چڑھایا شباب کا
ہے کیا جواب! زندگیٔ لاجواب کا

تو سو گیا تو قسمتِ کشمیر سو گئی
ہندوستاں میں علم کی تقدیر سو گئی

روحی علی اصغر

فخرِ تہذیبِ دکن

آسماں اردو ادب کا ہوگیا زیر و زبر!
گر رہا ہے عرش سے ایک ایک تارا ٹوٹ کر!

بجھ گئیں شمعیں تو پھر وہ گرمیٔ محفل کہاں
منزلیں اب بھی ہیں لیکن رہبرِ منزل کہاں

دل ابھی بے چین تھے بابائے اردو کے لیے
حفظ اردو کے لیے رحمت جو تھے وہ بھی گئے

دل غزل کا ہوگیا داغِ جگر سے پاش پاش
پھر رباعی نے اٹھائی حضرتِ امجد کی لاش

شارب و شاہد کا غم بھولے نہ تھے اہلِ وطن
درد میں ڈوبی ہوئی ہے آج پھر روحِ دکن

کیا خبر تھی انقلاب حشر ساماں آئے گا
زور سا پُرزور رفقادِ سخن اٹھ جائے گا

جس نے تاریخ دکن میں روحِ تازہ پھونک دی
اس کی ہستی ایک تاریخی حقیقت بن گئی ـــ!

تھی دکن کے ذرے ذرے سے محبت زور کو
گولکنڈہ کی زمیں سے تھی عقیدت زور کو

قلعۂ فکر و نظر سیلابِ غم سے بہہ گیا
یادگارِ زور ایک ایوانِ اردو رہ گیا

کارنامے اس کے ہیں سرمایۂ نازِ وطن
اس کی عظمت پر کرے گی فخرِ تہذیبِ دکن

تھا زمانے میں جو تہذیبِ دکن کی یادگار
جنتِ کشمیر میں روحی بنا اس کا مزار

خورشید نذیر

جانِ دکن

اے وادیِ کشمیر ذرا اپنا ستم دیکھ
گم ہو گیا سینے میں ترے جانِ دکن دیکھ

ہم نے ترے گلزار کو یہ کہہ کے دیا تھا
اور حسنِ طلب گار کو یہ کہہ کے دیا تھا

تیرے لب و رخسار کو یہ کہہ کے دیا تھا
اور کاکلِ خمدار کو یہ کہہ کے دیا تھا

یہ جانِ دکن جانِ زباں گوہرِ فن ہے
تاریخِ قطب شاہ کا یک تازہ بدن ہے

کیا بات ہوئی تیری فضاؤں کو ہوا کیا
دل رک گیا جاں بخش ہواؤں کو ہوا کیا

وہ دل جو سجائے کئی ایوانِ بصیرت
تھا جس کا مقدر ادب و آرٹ کی خدمت

وہ دل جسے ملتی رہی ہر گام پہ شہرت
وہ دل جسے کہہ سکتے ہیں پاکیزہ کی عظمت

اے وادیِ کشمیر ذرا اپنا ستم دیکھ
گم ہو گیا سینے میں ترے جانِ دکن دیکھ

پھولوں کی زمیں لے کے سلام اہلِ دکن کا
اے نورِ نقیں لے کے سلام اہلِ دکن کا

مہتاب جبیں لے کے سلام اہلِ دکن کا
مدفن کے قریں لے کے سلام اہلِ دکن کا

چادر کئی آہوں کی عقیدت کی اوڑھا دے
آنسو یہ ہمارے ہیں اسے پھول بنا دے
تربت پہ امانت کی ہماری تو سجا دے

جگن ناتھ آزاد (لندن سے)

ڈاکٹر زور

وطن کی سرزمیں سے آج یہ کیسی خبر آئی کہ رخصت ہو گئے صبر و سکوں، تاب و توانائی
زمانے سے بالآخر اس نے بھی رختِ سفر باندھا ادب کے واسطے ہر سانس تھا جس کا مسیحائی
زباں کو زندگی دینے کی خاطر جس نے کی ہر دم
وطن میں چار جانب کوچہ گردی، کوہ پیمائی
ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ اک خط میں نے لکھا تھا جواب خط نہ آیا اور مرنے کی خبر آئی
جہاں ہر سوختہ جاں کو حیاتِ تازہ ملتی ہے تعجب ہے وہاں کی بھی فضا تجھکو نہ راس آئی
دکن ہی پر نہیں ہندوستاں پر کوہِ غم ٹوٹا دکن ہی کی نہیں سارے وطن کی آنکھ بھر آئی
کہوں کیا ہو گئی ہے آج یہ کیسی الم افزا مقدر ہے جو میرا عالمِ غربت کی تنہائی
قیامت ہے وہ شعلہ کس طرح بجھتا ہے اک پل میں
وہ شعلہ جسکے سورج چاند تارے ہیں تماشائی
مجھے وہ آج دیرینہ مراسم یاد آتے ہیں کہ چوتھائی صدی سے کم نہیں ہے جن کی پہنائی
لڑکپن ہے مرا اس وقت بھی میری نگاہوں میں مسلسل وہ ترے نامے مسلسل یاد فرمائی
نظر آئی تری گفتار میں افلاک کی وسعت ترے افکار میں پنہاں تھی دریاؤں کی گہرائی
وہ تیری یاد سینوں میں ہمیشہ زندہ رکھے گی
زباں کو تو نے بخشی ہے جو دلسوزی و رعنائی

(بشکریہ "شیرازہ" سری نگر)

پروفیسر شیخ فرید

ڈاکٹر زور

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اور چپ بھی رہا نہیں جاتا

پھر وہی درد کی حکایت ہے
پھر وہی موت سے شکایت ہے

پھر وہی آہ و گریہ و زاری
پھر وہی محفلِ عزاداری

بخت بد نے دکھائی پھر گھڑی
غم کا سیلاب آنسوؤں کی جھڑی

جانے کس کس کو روئینگے ہم لوگ
تا بکے جان کھوئینگے ہم لوگ

آہ کیفِ سخن کا دیوانہ
تھا جو اپنا ہوا وہ بیگانہ

آفتاب سپہرِ علم و ہنر
بحرِ معنی کا شاہوار گہر

گلشنِ انتقاد کا مالی
زینت افزائے مندِ عالی

روحِ تنقید اسیرِ ماتم ہے
زور سے غمگسار کا غم ہے

کون جامِ سخن پلائے گا
نازِ افشا کے کون اٹھائیگا

کس کو ہے بادۂ سخن کا ہوش
شمعِ بزمِ ادب ہوئی خاموش

"گولکنڈہ کی سیر" کیا کہئے
ہو گیا حال غیر کیا کہئے

میر و غالب کا راز داں نہ رہا
فکرِ مومن کا ترجماں نہ رہا

نازشِ ہند افتخارِ وطن
ساتھ لیکر گیا بہارِ چمن

جس کے فضل و ہنر کی تھی توقیر
از دکن تا بخطۂ کشمیر

یہ ہجومِ ملال کیا کہئے
علم و فن کا یہ حال کیا کہئے

جیسے بے روشنی چراغ کوئی
جیسے بے آب و رنگ باغ کوئی

جیسے اجڑا ہوا سا میخانہ
جیسے ٹوٹا ہوا سا پیمانہ

جیسے بے برگ و بار شاخِ چمن
جیسے بیوہ ہو ایک شب کی دلہن

جیسے بجھتا ہوا سا انگارہ
جیسے ٹوٹا ہوا کوئی تارہ

جیسے بے ماہتاب کالی رات
جیسے الجھی ہوئی سی راہِ حیات

جیسے محوِ سکوت بزمِ سخن
جیسے آتش زدہ کوئی خرمن

گردآلودہ جیسے روئے یتیم
سرد رو جیسے نیفِ مردِ سقیم

جیسے کوئی جہاز بے لنگر
یا کوئی طائرِ شکستہ پر

جیسے آوارہ کارواں کوئی
جس کا رہبر نہ پاسباں کوئی

علم و فن کا مزاج داں نہ رہا
نہ رہا میر کارواں نہ رہا

معین الدین عارف بیابانی

ڈاکٹر زور کی رحلت پر

اے دکن کی آبرو اے زور اے گردوں وقار
کیوں جدائی پر تری ہوگا نہ ہر اک سوگوار

تاج اردوئے دکن کے بیش قیمت کوہ نور
غیر ممکن ہے تری رحلت کا غم ہو دل سے دور

گلشن اردو کو تھا تو ایک پیغام بہار
موت پر تیری نہ کیوں چشم دکن ہو اشکبار

اپنے خوں سے اس چمن کو سینچا تھا اردو کا چمن
جس سے ہند و پاک میں اونچا ہوا نام دکن

تیری ہر اک سانس سے آتا تھا اردو کا پیام
اس طرح کاٹے تھے تو نے زندگی کے صبح و شام

باغ اردو میں تری ہستی گل بے خار تھی
تو تھا سرگرم عمل روح عمل بیدار تھی

ہے درخشاں آسماں پر جس طرح بدر منیر
ہے اسی صورت سے روشن تیرا عہد بے نظیر

حق میں اردو کے ترا فیضان عالمگیر تھا
یعنی تو اردو کی جیتی جاگتی تصویر تھا

تھی تری ہستی یقیناً نازش ملک دکن
انجمن در انجمن تھا تو چمن اندر چمن

طالبان علم پر احساں وہ تو نے کر دیا
گوہر علم و ادب سے دامنوں کو بھر دیا

تجھ سے گلشن کو ملا ہے نازنوں کا راستا
تو نے گلشن کو ستاروں کی طرح چمکا دیا

کتنے ابنائے وطن کو تو نے بخشا ہے وقار
صفحۂ ہستی پہ واضح تر ہیں تیرے شاہکار

کتنے مایوسوں کو دی تو نے حقیقی زندگی
کس قدر ظلمت کدوں کو کی عطا تابندگی

تربیت کے فیض سے کتنے بنے اہل قلم
دید کے قابل ہیں جن کے آج بھی جاہ و حشم

تیری ہر اک کیفیت تھی دل پسند و دل نواز
ہے بجا جتنا بھی ہو اہل دکن کو تجھ پہ ناز

عظمت اردو کا بے شک تو علمبردار تھا
شر پسندوں کے لئے اک تیغ جوہر دار تھا

دیکھ کر اردو کے حق میں خاص تیری کیفیت
قدرداں تیرے رہے شاہان گردوں منزلت

تو نہیں باقی مگر باقی ہے فن کی یادگار
ہیں دل تاریخ پر روشن ترے نقش و نگار

قالب ایوان اردو میں ہے تو اب جلوہ گر
چشم بینا کے لئے ہے دعوت فکر و نظر

اہل اردو کے لئے پیغام ہے زندہ ترا
تو نہیں دنیا میں لیکن نام ہے زندہ ترا

تیرے رشحات قلم زندہ رہیں گے حشر تک
مثل مہر و ماہ تابندہ رہیں گے حشر تک

رنگ سب رہ جائیں گے فیضان اردو دیکھ کر
کام تیرا دیکھ کر "ایوان اردو" دیکھ کر

دہر میں باقی رہے گی جب تلک اردو زباں
زور تیرے کارنامے ہونگے زیب داستاں

دوڑی کوہ نور نکلے تھے دکن کی خاک سے
عظمتیں جن کی وراہیں وسعت ادراک سے

دو رہوں دونوں وطن سے تھا یہی تقدیر میں
ایک انگلستان میں ہو دوسرا کشمیر میں

وامق بدایونی

اُردو کے قافلہ سالار

ـــــ ڈاکٹر زور ـــــ

عقل و دانش جس کے غم پر احتمالی ہو گئی
شکل و صورت اسکی تصویرِ خیالی ہو گئی

انجمن کی انجمن سب لا و بالی ہو گئی
اک کمالی زور کی محفل زوالی ہو گئی

جنت الفردوس کے پورے دریچے کھل گئے
ہر دعائے مغفرت اُن کی مثالی ہو گئی

آہ کی تانوں میں ہیں سہمی ہوئی غمخواریاں
سازِ ہستی ٹوٹتے ہی بزم خالی ہو گئی

جن حدوں پر کانپتا رہتا ہے روحوں کا سکوں
اُن حدوں پر گم تری روشن خیالی ہو گئی

اک روپہلی چاندنی میں وادیٔ کشمیر کی
جو جلالی زندگی تھی وہ جمالی ہو گئی

غم کدوں پر پھیلتا جاتا ہے پھیکا سا غبار
گم ہجوم سوگواری میں خوشحالی ہو گئی

دل کے پورے حاشیے پر وہ نئی ضربیں پڑیں
نبضِ استقلال میں بے اعتدالی ہو گئی

غمزدہ اہلِ وطن کی مٹ گئیں رنگینیاں
دل کی بستی زندہ ارمانوں سے خالی ہو گئی

گھٹ گیا ہے اور رنجیدہ دلوں کا ارتعاش
ہر رگِ عشرت سمٹ کر انفعالی ہو گئی

کس قدر وامق وہ رخشِ زندگی تھا تیز گام
جس سے آسودہ دلوں کی پائمالی ہو گئی

حمید رونق

گوہرِ ارضِ دکن

ایک اک کرکے بجھے جاتے ہیں محفل کے چراغ
داغ اک مٹتا نہیں اک دوسرا ہوتا ہے داغ

چھوٹ کر اخبار ہاتھوں سے لرزتی ہے نگاہ
مختصر مدت میں دیکھے حاشیئے کتنے سیاہ

شارب و شاہد کے صدمے سے ابھی فارغ نہ تھے
ناگہاں آئی خبر یہ "زور صاحب چل بسے"

گولکنڈہ کی نئی تاریخ کے ترتیب کار
ہر ورق پر ہیں تری تحقیق کے نقش و نگار

دوپہر کی دھوپ میں اور مضمحل سایوں تلے
مقبرے کتبے کھنڈر چھانے تو شہ پارے ڈھلے

کیا خبر تھی جاگتا جیتا کوئی سو جائے گا
گوہرِ ارضِ دکن کشمیر میں کھو جائے گا

بارہا دیکھا ہے یہ احساس جذباتی نہیں
قابلیت کھینچ لے جاتی ہے پر لاتی نہیں

زعم کے پہلو سے دور اپنے پرستاروں سے دور
خاک پہنچی ہے کہاں دور از نگاہِ ناصبور

یہ حقیقت دوستداروں پر عیاں ہے بیش و کم
زور کے احساس میں مضمر تھا صدیوں کا بھرم

ایک پیکر میں کئی خم تھے خیالوں کے صنم
آج اردو لٹ گئی "ایوانِ اردو" کی قسم

سید احسان علی عرشی

آہ حضرت زور

ـــــ ناخدائے اردو ـــــ

"حیف در چشمِ زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد"

اے دکن کے فخر اے اُردو زباں کے غمگسار
تیرے دم سے تھی شگفتہ باغ اردو کی بہار

اے کہ دانش آفریں تیرا ہر اک انداز تھا
زندگی کو فخر تھا دنیا کو تجھ پہ ناز تھا

تیرے خال و خد میں تھی اک دل نشیں تابندگی
مختصر یہ ہے کہ تیری زندگی تھی زندگی

تیری ہستی تھی رہینِ خدمتِ اہل وطن
دلنشیں تیری ادائیں جانفزا تیرا چلن

تو رہا اِس دور میں بھی حامل و منع قدیم
ہر نفس میں تھی بہار عہد رفتہ کی شمیم

زندگی تیری سہارا تھی غریبوں کیلئے
تو پیام امن تھا ان بدنصیبوں کیلئے

تیری گردن خم نہ ہو سکتی تھی اہل جاہ سے
تیری راہ و رسم یکساں تھی فقیر و شاہ سے

دستگیر اہل حاجت تھا ترا حسن نیاز
تو گوارا کر نہ سکتا تھا گدا ملت کا ناز

زندگی کے پیچ و خم سے بھی ہوا تیرا گزر
تو نے ان راہوں کو بھی طے کر لیا ہنس بولکر

اس قدر محکم تھا تیرے قلب میں حسن یقیں
تیرے قدموں پر جھکی رہتی تھی گردوں کی جبیں

مطلع بزم ادب پر مہر عالم تاب تھا
فیلزم علم و عمل کا گوہر نایاب تھا

شمع بزم شعر کو تو نے فروزاں کر دیا
خاک کے پوشیدہ ذروں کو نمایاں کر دیا

مرحبا صد مرحبا اے زور تو انسان تھا
محرم راز عمل تھا صاحب ایمان تھا

یاد رکھے گی تجھے تا حشر بزم کُن فکاں
یہ نہیں تو اور پھر کیا ہے حیات جاوداں

موت کی گمنام وادی سے گزر سکتا نہیں
جس نے سمجھا زندگی کا راز مر سکتا نہیں

ابو سعید سید اسمٰعیل سید

آخری پیغمبر اُردو

ڈاکٹر زور کی وفاتِ حسرت آیات پر

رُباعیات

ناقابلِ اظہار زیانِ اُردو — ہے زور کے ماتم میں جہانِ اُردو
اے زور ترا نام رہے گا روشن — زندہ رہی جب تک بھی زبانِ اُردو

۲

ہے زیرِ لحد زور زبانِ اُردو — بیتاب ہے غمناک جہانِ اُردو
اک آخری پیغمبرِ اردو نہ رہا — اللہ یہ کیسا ہے زیانِ اُردو

۳

سوئی ہوئی اُردو کو جگانے والے — مرتی ہوئی اُردو کو جلانے والے
اے زور تھا زیبا نہ تجھے یوں مرنا — اک عالمِ اُردو کو رُلانے والے

نظم

علم کا تھا ایک بحرِ بیکراں — فطرتِ آدم کا جو تھا رازداں
آخری پیغمبرِ اُردو زباں — چل بسا دنیا سے جو سوئے جناں
جب تلک زندہ رہے اُردو زباں — یاد رکھیں گے جسے پیر و جواں
اہلِ اردو کا تھا میر کارواں — جس کے ماتم میں ہے اک سارا جہاں
ڈاکٹر سید محی الدین زور — حسرتا واحسرتا ہے زیرِ گور
تھی زمیں کشمیر کی تقدیر میں — زور ہے زیرِ لحد کشمیر میں
ہو گئی بے نور اردو کی جبیں — زورِ اردو ہو گیا زیرِ زمیں
جس کی رحلت پر اک عالم سوگوار — ذرّہ ذرّہ ہند کا ہے بے قرار
باعثِ صد فخرِ ہندستان تھا — وقت کا اک بے مثال انسان تھا
تا ابد زندہ رہے گا تیرا نام — بانیِ ایوانِ اردو السلام

السلام اے ڈاکٹر زور السلام — تجھ پہ ہوں لاکھوں سلام عالیمقام

خورشید احمد جامی

ڈاکٹر زور

علم و تحقیق و ثقافت کے شبستانوں میں
تیری عظمت کے خد و خال نکھر آئے ہیں
ذہنِ تاریخ میں ٹھہری ہوئی صبحوں کی طرح
جگمگاتے ہوئے کچھ نقش اُبھر آئے ہیں

جس کو صدیوں کی روایات حسیں نے پالا!
تو نے اس خواب کو تعبیر کی صورت دی ہے!
لالہ زاروں کی فسوں کار جوانی کے لیے
زندگانی کی شب و روز کی دولت دی ہے

بیکراں وقت کے بڑھتے ہوئے طوفانوں میں
عزم و اخلاق نے ڈھونڈے ہیں جزیرے کتنے
اپنے "ایوان" کے انمول خزانوں کو دیئے
آرزوؤں کے تراشے ہوئے ہیرے کتنے

میں سمجھتا ہوں کہ ہر سوچ کے آئینے میں
مدتوں صفحۂ تیری یاد کا چہرہ ہوگا
ضوفشاں قافلۂ فکر و نظر کے آگے
صرف تیرا ہی کوئی نقشِ کفِ پا ہوگا!

نرم گیتوں کی ٹپکتی ہوئی شبنم کی طرح
تیری آواز لبِ ساز پہ تھرائے گی
جب بھی گزرے گا چمن زارِ ادب سے کوئی
ایک اک پھول سے خوشبوئے وفا آئے گی

تو نے اردو کے لیے خون دیا ہے اپنا
کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا
کام زندہ ہے ترا ۔ نام ترا زندہ ہے
تو کسی طرح بھی اے زورؔ نہیں مر سکتا

سعادت نظیر

ایوان اردو کا چراغ

اداس ہوگئی کچھ یوں فضائے امکاں آج
کہ جیسے رک گئی پل بھر کو نبضِ دوراں آج

چراغ بجھ گیا ایوانِ بزمِ اردو کا
جہاں تھی نغموں کی اک گونج، ہے سماں ہوگا

دلوں پر ایسے میں کیا جانے کیا گزرتی ہے؟
کہ ایک آہ سی ہر سانس پر ابھرتی ہے

بنا ہے کون اجل کا نشانہ دنیا میں
کہ بچھ گئی صفِ ماتم چمن میں صحرا میں

یہ کس کے غم میں وطن آج خوں روتا ہے
یہ کون وادیٔ غربت میں تھک کے سوتا ہے

یہ وہ ہے جدِ مسلسل تھی زندگی جس کی
نشانِ جادۂ منزل تھی رہ بری جس کی

وہ عندلیب کہ تھا رونقِ بساطِ چمن
وہ عندلیب کہ تھا باعثِ نشاطِ چمن

ہر ایک پھول پہ سو جاں سے جو قرباں تھا
وہ عندلیب کہ رنگِ بہارِ بستاں تھا

جو تھا ثقافت و تہذیب کے نشیمن میں
تو خوش نوا تھا وہ، اے زور! کنجِ گلشن میں

عدو کو رشک ہے، احباب کو بڑا غم ہے
یہ تیری موت تری زندگی سے کیا کم ہے؟

تری مثال کہاں؟ تیرا اپنا تھا اک طور
ہوا ہے ختم ترے ساتھ اک سنہرا دور

ترے اشاروں پہ تحقیق جب مچلتی تھی
جواہرات زمینِ "دکن" اگلتی تھی

"قلی" کے شہر میں آئی وہ روشنی تجھ سے
کہ "دکھنیات" نے پائی شگفتگی تجھ سے

ہے اک بہار سی تخلیق کے چمن میں تری
ہے ایک روح سی تنقید کے بدن میں تری

حدیثِ گل جو نہیں، وہ ترا پیام نہیں
جو دل کی بات نہیں، وہ ترا کلام نہیں

تری مسائی پیہم کی دھوم ہے ہر سو
فضا میں ملتی ہے تیرے خلوص کی خوشبو

برنگِ شمس و قمر تیرا نام باقی ہے
ترا ادب، ترا فن، تیرا کام باقی ہے

مبصرین ترے مرتبے کو جان گئے
نہ مانتے تھے جو کل وہ بھی آج مان گئے

حیات مل گئی تجھ کو کس اہتمام کے ساتھ
کہ ذکر ہوتا ہے "اردو" کا تیرے کام کے ساتھ

باوا کرشن گوپال مغموم

بیاد ڈاکٹر زورؔ مرحوم و مغفور

کوئی لمحہ نہ تھا بے کار جس کی زندگانی کا
رہا وقف اَدَب ہر لحظہ جس آزادؔ[1] ثانی کا

بہت مشکل ہے میدانِ اَدَب میں ہمسری جس کی
مسلّم عالمِ تحقیق میں ہے برتری جس کی

جنونِ علم نے رکھا جسے گرمِ سفر برسوں
کہاں کا گھر؟ رہی جس کو نہ اپنی بھی خبر برسوں

روشؔ حالی کی، شبلی کی لگن، سیدؔ کی سرگرمی
بصد انداز جس کی ایک ہستی میں نمایاں تھی

جلا کر از سرِ نو شمعِ تہذیبِ دکن جس نے
فزوں کچھ اور بھی کی روشنیٔ علم و فن جس نے

کیا طے تا بہ آخر جادۂ نقد و نظر جس نے
عطا کی آگہی تحقیق نو سے بیشتر جس نے

نمایاں کی "دبستانِ دکن" کی اہمیت جس نے
بٹھا دی دل پہ آثارِ کہن کی اہمیت جس نے

لسانی زندگی میں کاوشیں جس کی مسلّم ہیں
دکن یا تی اَدَب میں کوششیں جس کی مکرّم ہیں

نوازا سرپرستی سے کئی علمی اداروں کو
سہارا تا بہ امکاں جس نے بخشا بے سہاروں کو

جو لکھا نظم میں یا نثر میں۔ اک شاہ پارہ ہے
قلم سے لفظ جو نکلا ہے اک روشن ستارہ ہے

زمینِ نثر میں جس نے شجر ایسے اگائے ہیں
بہاریں جن پہ مرتی ہیں بہاروں پر جو چھائے ہیں

دکن میں جس کی محنت کا ثمر "ایوانِ اردو" ہے
تجلّی زارِ صد فکر و نظر "ایوانِ اردو" ہے

ہمیں اوراقِ "سب رس" دیکھ کر جو یاد آتا ہے
تصوّر جس کے نغموں کی صدا سے جھوم جاتا ہے

بہت یاد آئے گی رہ رہ کے اردو دوستی جس کی
مثالی تھی، مثالی ہی رہے گی زندگی جس کی

دکن سے دور وہ زورؔ آج محوِ استراحت ہے
برنگِ شمعِ روشن خاک اُس کی زیرِ تربت ہے

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد سے مراد ہے۔ (مغموم)

صلاح الدین نیّر

آخری آنسو

وقت کے آنسو رواں ہیں گردشِ ایام پر
ہے نسیمِ صبح گریاں فصلِ گل کے نام پر
رو رہی ہے چشمِ شبنم پھول کے انجام پر
کیا جہاں بھی نیند آجائے وہیں سوتے ہیں لوگ
زورؔ! تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

فیصلہ جیسے ہی موت و زندگی میں ہوگیا
کاروانِ صبح، شب کی گود میں خوابیدہ سو گیا
چلتے چلتے اک مسافر راستے میں کھو گیا
موت آئی بھی تو کیا فن کار پھر بھی زندہ ہے
زندگی کو چھین کر دستِ اجل شرمندہ ہے

لو، چراغِ فکر و فن کی آج مدّھم ہوگئی
محفلِ شعر و ادب کی آنکھ پُرنم ہوگئی
وہ دلوں میں گونجنے والی صدا کم ہوگئی
بانیٔ ایوانِ اردو، خادمِ اُردو زباں
آج اہلِ بزم تیرے غم میں ہیں ماتم کناں

زندگی آواز ہے، آواز ہی، آواز ہے
فرصتِ عزم و عمل سب سے بڑا اعزاز ہے
موت کیا ہے زندگی کا نقطۂ آغاز ہے
عظمتِ فن کی قسم! جب تک کہ ہے اردو زباں
زر کے حرفوں سے لکھی جائے گی تیری داستاں

فصلِ گل کے واسطے جورِ خزاں رکتا نہیں
برق کی زد میں بھی کارِ آشیاں رکتا نہیں
موت کے طوفان میں بھی کارواں رکتا نہیں
اس کا غم ہے چل بسا ایسا امیرِ کارواں
آخری لمحوں میں جس کے لب پہ تھی اردو زباں

زورؔ وہ دیوانۂ اردو کہ ہنگامِ سفر
آخری سانسوں میں تھی ایوانِ اردو پر نظر
آخری آنسو گرا اردو زباں کے نام پر
دل یہ کہتا ہے کہ روحِ زور اب بھی ساتھ ہے
پرچمِ اردو نئی نسلو! تمھارے ہاتھ ہے

صائب کوہیری

حیف محی الدین قادری زور کا انتقال

۱۳۸۲ھ

زور تھا جو رونقِ ہر انجمن جاتا رہا
یعنی وہ زورِ سخن فخرِ دکن جاتا رہا

لشکرِ اردو کا والیٔ علم جاتا رہا
یوں تو باقی ہیں قلم زورِ قلم جاتا رہا

تھا وہ بے لوث اور مخلص اپنے ہر اک کام میں
سرتاپا جوشِ عمل تھا زور تھا خود نام میں

گنبدوں کو اور قلعہ کو اس نے دی تابندگی
اور قطب شاہوں کو بخشی اس نے پھر سے زندگی

اس نے ان تاریک قبروں میں اجالا کر دیا
قصۂ ماضی میں اس نے اک نیا رنگ بھر دیا

گیسوئے اردو دکن میں جب سنورجانے لگے
تب بلاوے سبھی اسے کشمیر سے آنے لگے

لوگ جاتے ہیں وہاں سیر و سیاحت کے لیے
وہ گیا بھی تو وہاں اردو کی خدمت کے لیے

ہے مفید آب و ہوا جو تندرستی کے لیے
بن گئی مہلک وہی اک اس کی ہستی کے لیے

اس نے جس دل کے بھروسے کام تھا اتنا کیا
تعجب ہے اسی دل نے اسے دھوکا دیا

آج ہے ایوانِ اردو اس کے غم میں سوگوار
اس کے احسانات اردو پر ہیں کتنے بے شمار

وقار خلیل

آہ ڈاکٹر زور

ایک پیغام تھا اک نغمۂ ساز ہستی
خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل تھا

اے دکن! وادیٔ کشمیر میں سونے والا
تیری تاریخ تمنا کا دھڑکتا دل تھا

حال و ماضی ہی نہیں بلکہ بہ شکل اردو
زور کے ہاتھ میں آئینہ مستقبل تھا

***

وہ زور دکن کا وہ چمکتا ہوا سورج
صد حیف کہ کشمیر کی بدلی میں چھپا ہے

تاریخ و تمدن کا جہاں تاب خزانہ
افسوس! بہت دور کی راہوں میں لٹا ہے

***

صدیوں کی تراشی ہوئی تہذیب کا پیکر
وہ سانولا شہزادہ! قطب شہ کے وطن کا

اے جاگ متی! تیرا شناسا نہیں ہم
کشمیر کی وادی میں چھپا چاند دکن کا

***

حیدرآباد ترا چاہنے والا نہ رہا
اک جہاں تاب اُجالا تھا اجالا نہ رہا

تیز رو وقت بھی خود آج یہ کہتا ہے وقار
زور اردو کا ہمالہ تھا، ہمالہ نہ رہا

***

ڈاکٹر زور تیری یاد کے پھول!
سارے ہندوستاں میں مہکیں گے

رند پی پی کے جام اردو کا
اور بہکیں گے اور بہکیں گے

***

آسمان دکن کے سیارے
زور کا انتظار کرتے ہیں

آرزوؤں کے نو دمیدہ گلاب
جان اس پر نثار کرتے ہیں

***

ایک ساز حیات کا نغمہ
سرزمین دکن سے چھوٹ گیا

پھول کھلتے تھے جس کے سائے میں
وہ تناور درخت ٹوٹ گیا

سلیمان اطہر جاوید

ڈاکٹر زور

(یہ نظم ڈاکٹر زور کی زندگی میں لکھی گئی تھی)

قلی کی روح کو عرصہ سے تھا یہی شکوہ
کہ کارواں کو مرے میر کارواں نہ ملا
بھٹک رہے ہیں مسافر ابھی بھی راہوں میں
ہزار حیف کہ منزل کا کچھ نشاں نہ ملا
خوش آمدید! کہ رستہ انھیں دکھائے ہو
مسافروں کو صحیح راستے پہ لائے ہو

دکن میں گیسوئے اردو کو مل گیا شانہ!
پھر اک ادا سے مرتب ہوا ہے افسانہ
وہی ہے جام، وہی مے، وہی ہے میخانہ
وہی ہے لیلیٰ اردو کا رقص فرمانا ـــــ
ہے کون جس نے کہ یہ معجزہ دکھایا ہے
خزاں کا دور تھا رنگِ بہار لایا ہے

کسی کی ناطرِ ناشاد جب ملول ہوئی
نئی ادا سے کلی بھی مہک کے پھول ہوئی
خلوص و شوق سے نکلی دعا قبول ہوئی
خوشا! کہ رحمتِ ربِ کریم نزدول ہوئی
نئی ادائیں، نیا بانکپن مبارک ہو
تجھے یہ نخرے اے ارضِ دکن! مبارک ہو

نئے ہی طور سے گلشن میں جب بہار آئی
ہر اک روش کو، ہر اک شاخ کو نکھار آئی
خوشا! کہ زلفِ عروسِ چمن سنوار آئی
زہے نصیب! کہ پھر غیب سے پکار آئی
قریبِ منزلِ مقصد ہے، فاصلہ نہ رہا
قلی کی روح کو اب اور کچھ گلہ نہ رہا

اختر رضوانی

رُباعیات

آرام کہاں چین کسے آیا ہے
کیا ایسا ہی رحمت کی تری سایا ہے
اک محسنِ اردو کو جدا ہم سے کیا
غفار یہ کیا تو نے ستم ڈھایا ہے

.....

اے گوشۂ جنّت کے بسانے والے
منہ پھیر کے احباب سے جانے والے
بھولے گا نہ تا حشر زمانہ تجھ کو
کرتے ہیں تجھے یاد زمانے والے

.....

دنیا میں ترا نام و نشاں زندہ ہے
ہاں جذبۂ تعظیم زباں زندہ ہے
تصویرِ نگارش ہے تری حسن تمام
اے زور ترا زورِ بیاں زندہ ہے

.....

وحید مرزا

یادِ زور

آراستہ ہے بزمِ مشاہیرِ علم و فن
اک شمع دل فروز مگر ہے بجھی ہوئی
کہتا ہے چپکے چپکے دلِ زار اب یہی
اس انجمن میں آج کسی کی کمی ہوئی
اردو کے کارواں پہ اداسی ہے آج بھی
چلتی ہے نبضِ وقت بھی دم توڑتی ہوئی
کس کس کو روئے لیلیٰ اردو بتائیے
یہ نامراد وقت کے ہاتھوں دکھی ہوئی
اردو زباں کے سوگ میں ایوان آج ہے
ماتم میں زور کے صفِ ماتم بچھی ہوئی
مانا کہ زور رونقِ محفل نہیں رہا
لیکن اب اس کی یاد سے پھر روشنی ہوئی
بعدِ ممات اس کو نئی زندگی ملی!
اپنے کیے پہ موت پشیمان بھی ہوئی
اک درد آنسوؤں میں سلگتا ہے آج بھی
اک ٹیس دل کے گوشوں کے اندر چھپی ہوئی

ماتم زور

اسد احسن جعفری

صاحبِ علم و فن کا ماتم ہے
رشکِ صد انجمن کا ماتم ہے

بجھ گیا روشنی کا اک مینار
ایک ظلمت شکن کا ماتم ہے

مریمِ فکر سوگوار سی ہے
ایک عیسائے فن کا ماتم ہے

ایک تنویر ہم سے روٹھ گئی
جگمگاتی کرن کا ماتم ہے

تجھ کو غربت نصیب میر اسلام
مرگِ دور از وطن کا ماتم ہے

نقشِ فریادی

حکیم یوسف حسین خاں

ہم پہ اے یوسف یہ شاید طنز ہے تقدیر کا
جس کو الفت تھی دکن سے ہو رہا کشمیر کا

قصرِ اُردو بن گیا قسمت سے اب چھاپہ محل
"ماتمی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

رنگ مہجوری بھرو خطِ شفق دھندلا کرو
نقشِ فریادی ہوا ہے شوخیِ تحریر کا

قطعہ

شیریں نے نگاہ پھیر لی ہے — نہروں کا بدل گیا بہاؤ
اب زور اِدھر نہیں اُدھر ہے — کشمیر سے جوئے شیر لاؤ

میر یٰسین علی خاں

اے وادیٔ کشمیر بتا زورؔ کہاں ہے!

(۱)

ہے یاد کہ دکن سے چلا جب وہ مسافر — سینے سے لگائے ہوئے اردو کے دفاتر
ہم سب نے کہا تھا یہی دل تھام کے آخر — اللہ نگہبان خدا حافظ و ناصر
اے وادیٔ کشمیر بتا زورؔ کہاں ہیں
کہتے ہیں یہ کچھ لوگ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں

(۲)

ہم تو یہی سمجھے تھے بہاروں میں وہ ہوں گے — کشمیر کے صف بستہ نگاروں میں وہ ہوں گے
اک چاند کے مانند ستاروں میں وہ ہوں گے — بیٹھے ہوئے اردو کے اداروں میں وہ ہوں گے
وہ پھول کھلے ہوں گے مسیحا نفسی سے
گلزار ہوں اردو کے چمن جن کی ہنسی سے

(۳)

لیکن یہ خبر آئی کہ خاموش ہوئے زورؔ — دنیا کے بکھیڑوں سے سبکدوش ہوئے زورؔ
منہ موڑ کے ہم سب سے کفن پوش ہوئے زورؔ — اے خاک لحد تجھ سے ہم آغوش ہوئے زورؔ
موت آئی مسافر کو غریب الوطنی کی
کشمیر کو سونپی گئی مٹی دکنی کی

(۴)

شاداب تھا جو پھول وہ مرجھا کے گرا ہے — دہقان نے ناپختہ ثمر توڑ لیا ہے
سرسبز تھا جو باغ وہ تاراج ہوا ہے — سرچشمۂ یک جوئے رواں سوکھ گیا ہے
جس شے کا گماں تک نہ تھا وہ بات ہوئی ہے
دن ڈھلنے سے پہلے یہ عجب رات ہوئی ہے

جمیل نقوی

خلوص کا سلام

سن تو سہی محی دیں مایۂ نازشِ دکن
فخرِ گروہِ عالماں اعلم و فقہ کہن
اے کہ ترا وجود تھا مرکزِ محفلِ سخن
تیری نوا کے سوز سے کتنے دلوں میں تھی لگن
چشمۂ فیض عام تھا تیرا ہر ایک موئے بدن
علم و ادب کے نام پر وقف تھے تیرے جان و تن
تیرا دلِ غم آشنا حامل جذبۂ وطن
تیری نظر تھی ژرف بیں تیرا قلم تھا بت شکن
تیری نگاہ نکتہ رس کم نگہوں پہ خندہ زن
تیرے عمل کا آئینہ، تیرے جنوں کا بانکپن
دہر میں ہر طرف ترا بحرِ کرم تھا موجزن
تیرے کمال کے مقر تھے سبھی شیخ و برہمن
اہلِ وطن کو بخش کر عزتِ نفس کا چلن
آپ ہی اپنی آگ میں جل بجھی شمع متوکلن

خواجۂ شہرِ جستجو مستحقِ صد احترام
اشرف و کاملِ ادب ماہر و واقفِ تمام
کاشفِ روحِ دکنیاں روحِ سلف سے ہمکلام
دینِ ادب میں مرتبہ جن کا مجدد و امام
تیرے خلوص سے ملا ان کو بلند تر مقام
بزمِ ادب میں گونج اٹھی جب سے تری صلائے عام
تیری سعی سے چھٹ گیا سایۂ داغِ ناتمام
کہنۂ ادب کے باب میں تیرا وہ حسنِ انتظام
یاد سے تیری مفتخر مسندِ شہرت دوام
تیری روانِ پاک کو میرے خلوص کا سلام

مجیب خیرآبادی

اے زور

اے زور تری گیسوؤں والی ہے پریشاں وہ ساونلی وہ نازوں کی پالی ہے پریشاں
افشاں ہے نہ سیندور نہ ٹیکہ ہے نہ چندن پھر آبروئے غالب وحالی ہے پریشاں
ڈھونڈھے گی تری صبح کو ہر راست دکن کی
روئے گی ابد تک تجھے برساتِ دکن کی

اب منت سلمائے ہنر کون کرے گا یوں پرورشِ فکر و نظر کون کرے گا
آرایشِ گیسوئے ادب ختم ہے تجھ پر تحقیق کی وادی میں سفر کون کرے گا
پائندہ زمانے میں ترا کام رہے گا
صدیوں سرِ فہرست ترا نام رہے گا

سب رس کی قسم پیکرِ شیریں سخنی تھا ولیند ولی، روحِ سراجِ دکنی تھا
کیا کیا نہ لٹائے تھے تری فکر نے موتی تو گنجِ گراں مایہ تھا لعلِ یمنی تھا
جس سمت تری طبع کی یلغار ہوئی ہے
بے آب زمیں رشکِ گلزار ہوئی ہے

کب کوچۂ جاناں میں طرحدار نہ تھا تو کب یوسفِ شہر لب و رخسار نہ تھا تو
تقریر میں کب تیری زباں سے نہ جھڑے پھول تحریر میں کب صاحبِ افکار نہ تھا تو
اردو کی لگن تجھ کو سرافراز کرے گی
تاریخِ ادب تجھ پہ سدا ناز کرے گی

دل چاک، زباں گنگ، نظر گرمِ فغاں ہے اک عالمِ حیرت ہے یقیں ہے نہ گماں ہے
اے بھاگ نگر ڈھونڈھ کہاں ہے وہ طرحدار اے لیلیٰ اردو۔ ترا دیوانہ کہاں ہے
کشمیر سے رخصت کا پیام آگیا اُس کو
یا ـــ وادیٔ گلپوش کا غم کھا گیا اُس کو

نصیر عارف

آہ ڈاکٹر زور

قطعۂ تاریخ رحلت

رحلتِ زور سے خدا کی قسم — آج ہر آنکھ ہو گئی پُرنم
بے شبہ تھے زبانِ اردو کے — ڈاکٹر "نذور محسنِ اعظم"
۸۲ — ۱۳

اے آسمانِ علم و تمدن کے آفتاب — اے ہر نگاہِ محرمِ ہستی کا انتخاب
تو ہوش کی بہار تھا تو عزم کا شباب — ممکن نہیں ملے ترا تاریخ میں جواب
گل پوش وادیوں میں تری روح کھو گئی
اہلِ وطن کی زندگی بے زور ہو گئی

جس کے غمِ حیات میں بھی تھا خوشی کا رنگ — مردوں میں بھی جو بھرتا تھا اک زندگی کا رنگ
دیکھا ہے اہلِ ہوش نے یوم قلی کا رنگ — ہر کام میں تھا جس کے نئے دلکشی کا رنگ
اہلِ زباں میں اُسکی فقط داستاں ہے اب
وہ زور وہ ادیب وہ شاعر کہاں ہے اب

بے انتہا خلوص سے عزم جواں کے ساتھ — سوزِ نہاں لئے ہوئے جوشِ عیاں کے ساتھ
رنگِ بہار بن کے تھا اس گلستاں کیساتھ — زندہ ہے تیرا نام بھی اردو زباں کیساتھ
ہر حیثیت سے ماہرِ ہر علم و فن رہا
تو اعتبارِ عظمت و شانِ وطن رہا

جذبِ وفا کی شدت تاثیر دیکھنا — ہر اک ہے تیرے واسطے دلگیر دیکھنا
اہلِ وطن کی شوخیٔ تقدیر دیکھنا — اب بس میں ہے فقط تری تصویر دیکھنا
پیوندِ خاکِ وادیٔ کشمیر ہو گیا
اک کوہِ نور تھا جو نگاہوں سے کھو گیا

انوار ظہوری

ادیبِ مشرق

(نذرِ ظہوری)

دکن میں گولکنڈہ کے در و دیوار شاہد ہیں
تری مانند میرِ باعمل کوئی نہیں دیکھا

نہیں تنہا ظہوری مضطرب، ہیں ماتمی لاکھوں
ترے ذہنِ رسا کی بھی ہمیشہ معترف دُنیا

اِدھر گوداوری اور شنکھدر اخون روتے ہیں
دھڑکتا ہے اُدھر سینہ کرشنا اور موسیٰ کا

تری ناوقت رحلت کر گئی مغموم کتنوں کو
ایلورہ کی زبیں کانپی، اجنتہ کا وطن تڑپا

ابھی امجد کو روئے تھے ابھی شاہد کو روئے تھے
ہمیں اے زورؔ تیری موت کا ماتم بھی کرنا تھا

ہیں پاک و ہند نالاں، دردمندانِ دکن گریاں
جو تیری موت نے بخشا نہیں وہ زخم بھرنے کا

درخشاں کر گیا تو نقشِ ہستی لوحِ عالم پر
کریں کیوں زورؔ ماتم تیرے دنیا سے گزرنے کا

خوشی اس امر کی ہے عمر بھر ثابت قدم رہ کر
بتایا عصرِ نو میں فرق جینے اور مرنے کا

ہٹا کر ابر کے ٹکڑے جھلکتے آفتابوں سے
یہ پاس فکر و فن سب کو دیا موقع ابھرنے کا

تری سعیِ مسلسل نے تری تحقیق پیہم نے
سکھایا نوجوانوں کو سلیقہ کام کرنے کا

ملا یہ درس تیری مخلصانہ سعی و کاوش سے
بدل دیتے ہیں خود مردانِ حُر قوموں کی تقدیریں

زمینِ وقت سے تو نے ابھارا قصرِ ماضی کو
دکھائی تھیں دکن کے عہدِ زریں کی جو تصویریں

سُنائے زندگی بھر عظمتِ رفتہ کے افسانے
کہ تھیں مقصودِ ہستی حال و مستقبل کی تعمیریں

جھنجھوڑا کتنے ذہنوں کو ترے زندہ عزائم نے
مکمل درس ہیں تیری نتائج خیز تدبیریں

بڑھائی اور بھی کچھ تو نے رونق شہرِ اردو کی
دکن کی مانگ میں افشاں ہیں گویا تیری تحریریں

تجھے بابائے اُردو سے زیادہ کام کرنا تھا
کہ سارے ہند میں اُردو کی تھی ناگفتنی حالت

سیاسی مصلحت کیشوں نے قوت آزمائی کی
مگر اُن سے بھی تو منوا گیا اُردو کی اہمیت

بخوبی رام کرتا جانتا تھا اپنے اعداء کو
دلوں کو جیتنے کے فن سے واقف تھی حسن فطرت

ہزاروں صاحبانِ علم تھے حلقہ بگوشوں میں
تجھے قدرت نے بخشی تھی وہ پہلو دار شخصیت

تری تحقیق کے جوہر کھلے جب سامنے آئے
قلی۔ وجہی۔ غواصی۔ شاہ راجو۔ نصرتی۔ ولی[1]

عمل کوشی تری رگ رگ میں تھی لہو بن کر
کوئی سیکھے ترے دل سے وفا کیشی کے پیرائے

تری خدمت نے ٹھہرایا تجھے مخدوم اردو کا
جسے بھی اس تعلق سے ہو دعویٰ سامنے آئے

دیا انجام وہ کارِ نمایاں تیس برسوں میں
جو پینسٹھ سال کے عرصے میں عبدالحق نہ کر پائے

توقع تھی کہ تو کچھ اور بھی جوہر دکھائے گا
کسے معلوم تھا منڈلا رہے تھے موت کے سائے

مقدر ہو چکی تھی جنتِ کشمیر دنیا میں
بہشتِ قدس کی آب و ہوا بھی ساز گار آئے

دلوں پر نقش ہیں محفوظ ہیں اذہان میں دونوں
نظر کا بولتا جادو۔ عمل کی سحر انگیزی

طبیعت سادہ، فطرت نیک خو، اوصاف پاکیزہ
جو تھا اخلاص نیت میں تو سیرت میں دل آویزی

ترا کردار اک تفسیر تھا آدابِ مشرق کی
مسخر کر سکی تھی کب تجھے تعلیم انگریزی

رہا بے خوف مردانہ صفت ہر آزمائش میں
مسلم ہے ترے شوقِ مسلسل کی بلا خیزی

ہنر مندوں کو لے آئی ہے آخر ایک مرکز پر
طریق کار کی خوبی، خیال و فکر کی تیزی

سدا شامل رہے تیرے مکالمہ رفیقوں میں
نصیر الدین شاہ۔ وجد بکنیہ۔ نظر۔ اکبر

ہے تیری فکر سے روشن ہے تیرے نور سے تاباں
دیا رشاد و امجد۔ ارض مخدوم و علی اختر

ہوئے منت کشِ احساں ترے اذنِ تجسس کے
قیاشی۔ تہر۔ شداد۔ یار۔ عاجز۔ مہرباں۔ انور[2]

وطن ممتاز ہے تیرا ولی کی فکرِ عالی سے
غزل کی مہر اوّل ثبت ہے اردو کے ماتھے پر

ادیبِ شرق اب قسمت زبانِ میر و غالب کی
درخشاں ہے ترے نوکِ قلم کا فیصلہ کن کر

تری بے لوث خدمت نے تری بیباک جرأت نے
کیا آدابِ ہستی سے شناسا نوجوانوں کو

مرتب تو نے کی تاریخ تہذیب و ثقافت کی
دیا آب و نمک ارض دکن کی داستانوں کو

نکالا ان کو سینہ چیر کر ادوارِ ماضی کا
زمانہ کر چکا تھا دفن جن علمی خزانوں کو

---

[1] دکن کے چند متقدمین اہل قلم۔
[2] دکن کے بعض قدیم شعراء۔

جو اندیشہ بدامن تھے غمِ حالات کے باعث
حرارت زندگی کی دے گیا اُن خستہ جانوں کو
تجھے اُردو نے پایا ہند میں یہ خوش نصیبی تھی
ملے ہیں یوں تو خادم اور بھی دیگر زبانوں کو

تری خدمات کے ہیں معترف سب عہدِ حاضر میں
ولی کی سرزمیں کا مُفتخر اسلوب سمجھایا
کیا دنیا کو تو نے آشنا ان باکمالوں سے
چھپا بیٹھا تھا جن کو زیرِ دامانِ وقت کا سایا
بہت گمنام تھے پہنچا کے ان کو بامِ شہرت پر
دکن کے صاحبانِ فکر و فن کا نام چمکایا
کبھی نقد و نظر، تجزیۂ افکار کی خاطر
کبھی اربابِ دانش کا مُرقع سامنے لایا
کسی فنکار کی، الفاظ میں تصویر دکھلائی
کسی صاحبِ خرد کی فکر کا انداز بتلایا

نکالے ڈھونڈ کر تو نے چھپے شہکار اُردو کے
کہیں تجھ سا نہیں پایا کمالِ فن کا شیدائی
بہ شکلِ نور پھیلی ملک میں تیری توجہ سے
ولی کی فکر آرائی، تصوّف کی نغمہ پیرائی
نقوشِ پا سے روشن کر گئی ہے رہگذاروں کو
ہے خود رہبر۔ تری منزل پہ منزل جادہ پیمائی
رہی تا زندگی اس طرح مقصد کی لگن دل میں
ہے تیرے بے ریا اخلاص کی دنیا تماشائی
تری مانند پاک و ہند کی آنکھوں نے کب دیکھا
کوئی اُردو کا دیوانہ کوئی اردو کا سودائی

مظہر کامل

تاریخی نظم

ڈاکٹر زور کی وفات پر

اے عاشق لیلائے اردو جب تو نے اچانک پردہ کیا — کتنوں کے دلوں میں گھر تھا ترا سو قت کہیں معلوم ہوا
ہاں نام محی الدیں تھا مگر اردو کی مسیحائی کی — دم توڑنے والی اردو کا کیا کچھ نہ مداوا تو نے کیا
کی عمر بسر تو نے ساری تاریخ و ادب کی خدمت میں — یہ ایک حقیقت ہے جس پر شاہد ہے دکن کی ساری فضا
کس زور کا ماتم ہے برپا ہر سمت جہان اردو میں — کس کس نے کلیجہ چھوڑ دیا اک تیرا فقط دل کیا بیٹھا
اردو کے پرستاروں کیلئے ایوان و ادارہ اب بھی ہے — رونق تھی مگر ان کی جس سے افسوس وہی باقی نہ رہا
تھوڑے سے تصرف سے تجھ پر یہ مصرعۂ فانی کھبتا ہے — غربت بھی نہ تجھ کو راس آئی اور ہائے وطن بھی چھوٹ گیا
اے پیکر عزم و جہد و عمل اخلاص کی برکت سے تیرے — جب تو نے اٹھایا کوئی قدم منزل نے تجھے خود بڑھ کے لیا
کردار کا تیرے یہ پہلو اربابِ نظر پر روشن ہے — تو زیست کی ہر اک منزل میں محمود رہا حاسد نہ بنا

مظہر نے حقیقت پر مبنی رحلت کی ترے تاریخ کہی
اُردو کے فدائی مونس کو کشمیر نے ہم سے چھین لیا

۱۳۸۲ ہجری

آہ ڈاکٹر زور

محمد اکبر الدین صدیقی

خوب جی بھر کے رو قطب شہ کے وطن
جس نے بخشی تجھے آن اور بانکپن
جس نے دیں تجھ کو رعنائیاں اور بھبن
تیری خاطر نہ لائی جبیں پر شکن
جس نے مہکا دیا تیرا سارا چمن
ہو گئی جس سے گلزار ارض دکن
آج پہنے ہوئے ہے وہ اُجلا کفن
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

جس سے ایک ایک ذرہ بنا آفتاب
جس نے دی کاکلوں کو نئی پیچ و تاب
جس نے الٹی معانی کے رخ سے نقاب
جس کی کوشش تھی تفسیر لی فتح باب
جس کے چہرہ پہ کھلتے تھے اکثر گلاب
جس پہ سایہ فگن تھا ابھی تک شباب
ایک ہلکورے سے آہ ٹوٹا حباب
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

جس کی باتیں ہمیشہ تھی قند آگیں
زہر ہو کر بھی رہتیں حیات آفریں
تھا وہ گاہے چناں اور گاہے چنیں
رہ کے کشمیر میں تھا دلوں کے قریں
اس کے جانے کا مجھ کو نہ آیا یقیں
کیوں نہ بھائی وطن کی اسے سرزمیں
آج تیری انگوٹھی کا اُکھڑا نگیں
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

کاشمر! تو نے چھینا ہے گنج گراں
خوب گی میہمانی بنا میزباں
اپنے محسن سے اور ایسی گستاخیاں
کتنا یہ سخت ہے ضبط کا امتحاں
اب شکایت کا موقع نہیں اے زباں!
تذر ہے میری یہ سلک اشک رواں
اس کے روضہ پہ رکھ اور ہو نوحہ خواں
حیف ارض دکن! حیف ارض دکن!!

وہ دکن جس نے اپنوں کو پوچھا نہیں
لعل گدڑی میں تھے اس نے دیکھا نہیں
عقل کے زعم میں جس کو سوجھا نہیں
جس نے اپنے جواہر کو پرکھا نہیں
یونہی دل میں میں نے تو رکھا نہیں
آہ، کہوں راز میں تجھ سے پردا نہیں
کوکھ محروم ارض دکن ہو گئی
میری تقدیر اس کا کفن ہو گئی

اس کے نغموں سے گونجیں مری وادیاں
اس نے اردو کا پرچم اڑایا یہاں
اس کی بانگ درا سے بڑھا کاروان
تھا وہ سعی و عمل کا بڑا رازداں
تو وہ برف میں تھا وہ آتش فشاں
ثبت ہو گی زمانے پہ یہ داستاں
اپنے سینے میں میں نے اسے رکھ لیا
تا کہ تاباں رہیں میرے ارض و سما

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں

آج سوفی ہے ہر بزم ہر انجمن
اور شمعوں نے پہنا دھوئیں کا کفن
نغمہ خواں بن گئے نوحہ خواں سینہ زن
دھجیاں دھجیاں ہو گیا پیرہن
لٹ گئی کاشمر میں متاع دکن
کیا خبر آ گئی ناگہاں دوستو

مرگ اعجاز میں آنسو ابھی تھے رواں
ایک شارب گیا سرور میکشاں
اٹھا دنیا سے پھر شاہد نغمہ خواں
زورؔ کی موت سے پھٹ پڑا آسماں
حیف منزل پہ آیا نہ تھا کارواں
منتشر ہو گئے رہرواں دوستو

جس نے اردو کی خاطر کمر تھی کسی
جس کی نس نس میں روح دکن تھی بسی
نام لیں قطبشہ کا تو آئے ہنسی
جس سے چھپتی رہی عمر بھر بے کسی
موت غربت میں آئی ہے اور بے بسی
اس کی میت پہ ہے نوحہ خواں دوستو

ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آج جام و سبو
اب گلوں سے بھی چھینے گئے رنگ و بو
سرخ چہروں نے زردی کی لی آبرو
ہیں سیہ پوش اردو کے سب کاخ و کو
اب خرابے میں ہوگی کہاں جستجو
اٹھ گیا حیف پیر مغاں دوستو

گر گیا ہے کلس آج "ایوان" کا
داستاں بن گیا خود ہی دستاں سرا
تھا جو لعل دکن نور تھا ہند کا
ایک عنواں تھا حرف غلط تو نہ تھا
روکتا کوئی اے کاش دست قضا
موت کیوں ہو گئی کامراں دوستو

پروفیسر ایس ایل بخشی اختر امرتسری

قطعہ تاریخ

از جہاں رفت زور بیک نہاد
لعن بر تو سپہر ظلم ایجاد
وائے اے ڈاکٹر محی الدین
حسرتا مرد فاضل و فرہاد
در فراقت چہ خوں می گرید
ملقہ ادبیات حیدرآباد
ہر تاریخ مرگ بے ہنگام
فکر چوں کرد ایں دل ناشاد
ہاتف از غیب گفت اے اختر
فرصت وقت را مکن برباد
بائے بد قطع کردہ باز بگو
حیف گل شد چراغ حیدرآباد

۱۸۸۴ شک
۲

ڈاکٹر عزیز تمنائی

میں نے تجھے دیکھا تو نہیں...

میں نے تجھے دیکھا تو نہیں تیری صناعی دیکھی ہے
شاخِ چمن کے ہر پتے پر تیری نشانی دیکھی ہے
تیرے ذہن میں جو اجڑی تھیں اب زندہ تصویریں ہیں
اردو کے رنگیں خوابوں کی یہ گویا تعبیریں ہیں
ایوانِ اردو کی اک اک اینٹ پہ تیرے بوسے ہیں
اس بستی کے سارے باسی تیرے پالے پوسے ہیں
تیرے دم سے ارضِ دکن نے لاکھوں ہیرے اگلے تھے
کتنے ڈھکے موتی دریا کی تہہ میں تو نے پائے تھے
طوفانوں نے جو پہنچالوں نے کتنا زور لگایا تھا
تو نے اک اک ستدراہ کو پھول سمجھ کے اٹھایا تھا
جن راہوں میں سرگرداں اہلِ قلم کو دیکھا ہے
ان مشکل راہوں میں تیرے نقشِ قدم کو دیکھا ہے

میں نے تجھے دیکھا تو نہیں تیری ہر صورت دیکھی ہے
خاکِ دکن کے ہر ذرے میں تیری مورت دیکھی ہے
وقت کی لوحِ رواں پر تیرے نقشِ قلم تابندہ ہیں
تو نہ رہا لیکن تیرے شہ پارے اب بھی زندہ ہیں
لاکھ زمانہ پہلو بدلے لاکھ جہاں بدلے کروٹ
گونج رہی ہوگی صدیوں کے سینے میں تیری آہٹ

قطعۂ تاریخ وفات ڈاکٹر زور

فضل گلبرگوی

ہر وقت گھٹا چھائے گی گھنگھور کہاں
وہ ہمہمہ وہ غلغلہ وہ شور کہاں
ہر بزم ادب آج ہے سونی سونی
اردو کی محفل میں ہے اب زور کہاں

۱۹۶۲

محمد عزیز الدین مبشر انصاری

زور کا تار زندگی ٹوٹا
ساز اردو کے غم نواز ہیں اب
اے مبشر کہو سن رحلت
"زور جنت میں سرفراز ہیں اب"

۱۳۸۲ھ

ڈاکٹر ثامن علی نیساں

زور کی تاریخ رحلت کی تھی فکر
پل کے کاغذ پر یہ خامے نے کہا
ماہ ستمبر کی تھی چوبیسویں
اور نیساں دن تھا وہ اتوار کا

عیسوی انیس سو باسٹھ تھا سال
زور نے کشمیر میں جب کی قضا

سلیمان خطیب

(۱)

کیا قیامت ہے ایک ساتھی کا
بیچ رستہ میں ساتھ چھوٹا ہے
زور بازو تھے زور اردو کے
آج اردو کا زور ٹوٹا ہے

(۲)

کون دنیا سے اٹھ گیا محسن
کس کے غم میں یہ کھو گئی اردو
زور صاحب کے ایک جانے سے
کتنی کمزور ہو گئی اردو

مغیث الدین فریدی

کون یہ ماجرائے درد کہے
دل زباں کا الٹ گیا افسوس
کیسا انسان ہو گیا رخصت
زور اردو کا گھٹ گیا افسوس

قطعۂ تاریخ وفات

بشیر احمد خاں

زورِ اردو کا وہ مردِ میداں
جس کی تھی اہلِ سخن میں شہرت
نہ رہی اس کو وطن کی سُدھ بُدھ
راس آیا نہ دیارِ غربت
دیکھ کر حسنِ بہارِ کشمیر
رُک گئی دل کی یکایک حرکت
فکرِ شاعر نے کہا سالِ وفات
با صد اندوہ، ملال و حسرت
حضرتِ زور بلاشبہ بشیر
ہو گئے ——— آج غریقِ رحمت

۱۹ ۶ ۶۲

قطعۂ تاریخی

ابو المجاہد محمد احمد اللہ احمد قادری

محی دین قادری زورِ خوشگو
صاحبِ علم و ہنر عاملِ حق
فخرِ تہذیب و تمدن آثار
رونقِ بزمِ سخن قابلِ حق
حامیِ خاص زبانِ اردو
خادمِ ملک و وطن حاملِ حق
در غریب الوطنی کرد قضا
از ہمہ دور شدہ شاملِ حق
سالِ رحلت ہمیں بولیں احمد
ڈاکٹر زور شدہ واصلِ حق

۸۲ ھ ۱۳

ڈاکٹر زور کے خیال میں

انجم آفندی

کتنے صدمے گزر چکے ہیں اب تک
کتنے آنسو بکھر چکے ہیں اب تک
کیا میں یہی گننے کے لئے جیتا ہوں
کتنے احباب مر چکے ہیں اب تک

قطعۂ تعزیت

سید اکرم علی

دل و جاں اپنی اُردو پر فدا کی
ابو الحسنات پر رحمت خدا کی
ملا اکرم صلہ حسنِ عمل کا
فنا سے زور نے حاصل بقا کی

تاریخ رحلت ڈاکٹر زور

عظیم الدین محبت

"اشتعالِ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور"

۱۹۶۲ء

——— رباعی ———

جنوں کی آگ پر بے چین پارہ تھا
بلندی پر سے جو چمکے وہ تارہ تھا
تری سعیٔ عمل کا زور کیا کہنا!
تو اپنی ذات سے خود اک ادارہ تھا

تاریخ وفات

عبدالحق برقؔ

از دکن چوں بہ کاشمیر رسید
بخدا حرمت ارجمی بشنید
سیّد آں فاضلی زورؔ آور
محی دیں بود و سوئے کوچۂ خمید
روح پاکش پریدتا قادر
نفس آخریں چو باز دمید
نالہ ہا زد بلابل کشمیر!
گل و ریحاں بہ تربتش بچمید
آرمیدہ بہ روضۂ اجداد
آہ محی بہ اصل خویش رسید

۱۳۸۲ ھ

تاریخ وفات

الطاف شاہد (کراچی)

بہ صد جبروت کی خدمت ادب کی
زباں ہے زورؔ کی مدحت میں قاصر
پئے تاریخ سب مانیں گے اس کو
محقق شاعر و فن کار جابر

۱۳۸۲ ھ

قطعاتِ تاریخی رحلت زورؔ

ابوالقاسم سید مہدی محی قادری مہدیؔ

۱

پردہ کرد از جہان شد پنہاں — منزلے یافت او بباغ جناں
جاں زسرفت و گشت ایں تاریخ — شد جناں زیب زور خلد مکاں

۳-۱۳۸۵ = ۱۳۸۲ ھ

۲

تھے وہ دریائے علم کی اک نہر — اور مشہور تھے وہ شہر بشہر
یہ ہے تاریخ اُن کی رحلت کی — خُلد مسکن ہیں زورؔ کامل دہر

۱۳۸۲ ھ

۳

اُن کو جتنا سراہئے کم ہے — بزم اردو میں اُن کا ماتم ہے
بر سر ہائے نکلی یہ تاریخ — رحلتِ زورؔ موجب غم ہے

۵+۱۹۵۷ = ۱۹۶۲ء

۴

دلِ احباب میں اور دیدۂ بینا میں رہتے ہیں
وہ دنیا میں نہیں ہیں منزلِ عقبیٰ میں رہتے ہیں
جب اترا سے پار زندگی تو یہ ہوئی تاریخ
محی الدین زورؔ اب محفلِ مولا میں رہتے ہیں

۲-۱۳۸۴ = ۱۳۸۲ ھ

سید احمد اللہ قادری بی اے عثمانیہ

میرِ کارواں

رُخِ حیات سے رُخ آج کس نے پھیرا ہے
فضا اداس ہے مایوسیوں نے گھیرا ہے
یہ کس نے غم کا تاثر یہاں بکھیرا ہے
کہ آج اُردو کے "ایوان" میں اندھیرا ہے
دلوں میں چھائی ہوئی سی جو ظلمتِ غم ہے
کوئی چراغ بجھا ہے کہ روشنی کم ہے

وہ زورِ عہدِ قطب شاہیوں کا متوالا
ادارۂ ادبیات کا وہ رکھوالا
وہ شمعِ بزمِ ادب وہ تجلیوں والا
دکن کے جادۂ تحقیق کا وہ رکھوالا
اِسی کے ہجر میں ہر آنکھ اشکبار ہے آج
اِسی کے غم میں وطن سارا سوگوار ہے آج

شعور جس کا تھا شامل کئی اداروں میں
تھا عکسِ فکر و نظر جس کا شاہکاروں میں
رہے گا یوم قلی جس کی یادگاروں میں
وہ ہائے کھو گیا کشمیر کی بہاروں میں
یہ گولکنڈہ کا ہیرا ہے کوہِ نور ہے یہ
ہمالیہ ہے اگر طور برق طور ہے یہ

شرف یہ وادیٔ کشمیر تجھ کو حاصل ہے
کہ تجھ میں دفن دکن کا وہ مردِ قابل ہے
ادب نواز ہے علم و عمل میں کامل ہے
دکن کا نورِ نظر ہے جنوب کا دل ہے
اب اِس کی جہدِ مسلسل کا پوچھ مت احوال
کہ جان دیکے ملا دی حدِ جنوب و شمال

رواں دواں تھا ترا قافلہ سوئے منزل
ادیب و شاعر و نقاد اس میں تھے شامل
نہ بچ سکا تری نظروں سے جوہرِ قابل
عمل کے جوش سے رفتارِ وقت بھی تھی خجل
نقوشِ عہدِ گذشتہ کا پاسباں نہ رہا
کہ کارواں تو ہے میرِ کارواں نہ رہا



ڈاکٹر زور کے

منتخب مضامین

مطبوعہ و غیر مطبوعہ



حصّہ دوم

ڈاکٹر زورؔ

کے

منتخب مضامین۔ خطبات۔ خطوط۔ نظمیں۔ غزلیں

اور

مقالہ نما

محمد قلی قطب شاہ

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈے کا پانچواں بادشاہ تھا۔ اس کے دادا سلطان قلی نے بہمنی بادشاہوں کے زوال کے بعد تلنگانہ میں قطب شاہی سلطنت کی بنا ڈالی تھی۔ اور اس کے والد ابراہیم قطب شاہ نے آندھرا دیس میں ایک ایسی سلطنت بنانے میں کامیابی حاصل کی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ اس نے فارسی اور اردو کے علاوہ تلگو ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار کو ادب اور کلچر کے لحاظ سے رنگا رنگ بنا دیا۔ اسی ماحول میں محمد قلی قطب شاہ جمعہ کے دن ۴ر اپریل ۱۵۶۵ء کو پیدا ہوا۔ وہ اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اور اس کے عہد میں گولکنڈہ دنیا بھر کے سیاحوں اور تاجروں سے اتنا معمور ہوگیا کہ اس کو گولکنڈے سے باہر نکل کر موسیٰ ندی سے متصل ایک نیا پایۂ تخت بنانا پڑا جو خوش قسمتی سے آج تک اس ملک کا پایۂ تخت بنا ہوا ہے اور اس کی خوب صورتی اور رونق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی ابتدائی زندگی کے حالات اس خوبی سے اب تک محفوظ ہیں کہ شاید ہی کسی اور بادشاہ کے ایسے حالات صدیوں بعد بھی اس تفصیل سے مل سکیں۔ وہ بچپن سے رنگین مزاج اور شعر و سخن کا دل دادہ تھا اس وقت گولکنڈے میں احمد آباد۔ برہان پور۔ احمد نگر اور بیدر کے شاعر اور ادیب جمع تھے اور ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی جس سے محمد قلی کا متاثر ہونا ضروری تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محمد قلی کی ماں بھاگیرتی ایک تلگو بولنے والی عورت تھی جس کی وجہ سے محمد قلی اس زبان میں بھی شعر و سخن لکھا کرتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائیوں کے موجود ہوتے ہوئے اس کے تخت نشیں ہونے میں گولکنڈے کے آندھرا سرداروں اور امیروں نے بڑا حصہ لیا کیونکہ وہ محمد قلی میں اس کی ماں کی وجہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور اس کے بڑے بھائیوں کے موجود ہوتے ہوئے اس کو تخت نشیں کرنے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ وہ تلگو زبان بھی بولتا اور لکھتا تھا۔

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت محمد قلی صرف پندرہ برس کا تھا۔ چنانچہ وہ چودہ (۱۴) سال سات ماہ اور آٹھ دن کی عمر میں تخت نشیں ہوا۔ اور چونکہ فطرت میں سخاوت اور کشادہ دلی تھی اس لیے بادشاہ ہوتے ہی دل کھول کر انعام و اکرام تقسیم کیا۔ عوام۔ غریبوں۔ اور مسکینوں کو اتنا دیا کہ اس روز سے گولکنڈے کی رعایا فارغ البال اور خوش حال ہوگئی۔ اس کے عدل و انصاف اور شاہانہ جاہ و جلال کا یہ حال تھا کہ باوجود کم عمر ہونے کے اس نے تمام امیروں اور سرداروں کو خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں ایک دوسرے سے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ اور اپنی تدبر و فراست سے سب کو خوش اور وفادار بنائے رکھا۔

اپنی تخت نشینی سے پندرہ سال بعد محمد قلی قطب شاہ نے شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی۔ یہ شہر اسی موضع چچلم کی جگہ بنایا گیا جہاں اس کے بچپن کی محبوبہ بھاگ متی رہا کرتی تھی۔ چنانچہ اس شہر کا نام بھی بھاگ نگر رکھا گیا لیکن جب بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب

بھاگ متی اور بھاگ نگر

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے یوم محمد قلی قطب شاہ کے بعد ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں بھاگ متی کی حقیقت کو عجیب افسانوی انداز تحریر اختیار کرکے واقعی ایک افسانہ بنا دینے کی کوشش کی ہے۔ افسوس ہے کہ انکی بزرگی کا احترام کرنے کے باوجود ان کے اس مضمون کی غلطیوں اور صحیح ماخذوں تک ان کی نارسائی اور دکنی روایات اور دکنیوں کے مزاج سے ناواقفیت کے بارے میں کچھ لکھنا پڑا۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ بھاگ متی پر اپنی تحقیقات کے سلسلے میں جہاں انھوں نے بہت سی کتابوں کی چھان بین کی ہے اور سیکڑوں صفحات پڑھ ڈالے ہیں اور متعدد مرحوم و معفور مصنفوں سے استفادہ کیا ہے دکن کی تاریخ اور اس خاص موضوع کی تلاش و تحقیق پر جن لوگوں نے عہد حاضر میں عمریں صرف کردیں اور بڑی بڑی مستند کتابیں لکھی ہیں اور جو بفضل خدا ابھی زندہ ہیں ان سے مل کر تبادلہ خیال کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ تاریخ دکن کے مخلص خدمت گزار ہیں اور دیانت اور حقیقت کے جویا ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے یہ طریقہ کار لازمی اور ضروری تھا۔ میں تو کوئی مورخ نہیں ہوں اس لئے مجھ سے نہ سہی لیکن ڈاکٹر غلام یزدانی اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی سے تو ان کو ضرور اس بارے میں مشورہ کرلینا چاہئے تھا۔

انھوں نے اپنے مضمون میں واقعہ بھاگ متی کا واحد ماخذ فرشتہ کو قرار دیا اور ان کی نظر میں وہ ناقابل اعتبار ہے۔ وہ خود بھی مورخ ہیں اور شاید ایسی جرأت ان ہی کو زیب دیتی ہے۔ میں فرشتہ پر جھوٹ تراشنے کا الزام نہیں لگا سکتا اور نہ سمجھتا ہوں کہ محمد قلی قطب شاہ کی وہ تحقیر کرسکتا ہے جب کہ وہ اپنی تاریخ میں اس کو رؤف اور علیم کی خدائی صفات سے یاد کرتا ہے اور خاص طور پر اس کی اور اس کے شہر کی خوبیوں کا رطب اللساں ہے۔

رہی عشق و عاشقی تو فرشتہ بھی اس کو گناہ نہیں سمجھتا۔ محمد قلی قطب شاہ تو اس کو لازمۂ زندگی سمجھتا تھا جیسا کہ اس کی کلیات سے ثابت ہے اور طوائف اور رقاصاؤں سے عشق و عاشقی بادشاہوں سے لے کر شاعروں اور اولیاء اللہ تک نے کی ہے۔ ایک باکمال رقاصہ اور حسین ترین طوائف کو اگر فرشتہ نے فاحشہ لکھا تو لفظ "فاحشہ" کو بابا دہرا کر شروانی صاحب نے عہد حاضر کے معیار سے بھاگ متی کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ فرشتہ کی نظر میں گانا بجانا بھی محض تھا اور محمد قلی کی خوبیوں میں وہ اس واقعہ کو شمار کرتا ہے کہ اس نے فاحشہ کو شریف اور بیگم بنا دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر فرشتہ جھوٹا بلکہ شیطان بھی بن جائے تو ابوالفضل اور فیضی کے بارے میں پروفیسر شروانی نہ معلوم کیا کہیں گے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے نہ تو دکن کی تمام تحریریں اور تاریخیں پڑھیں اور آثار دیکھے اور

۳

دکن کی جن تاریخوں میں بھاگ متی کا ذکر نہیں ملتا وہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی لکھی ہوئی ہیں جو بہت بڑا زاہد اور متقی بادشاہ گزرا ہے۔ جس نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور جس کی تہجد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔ اس بادشاہ نے اور اس کے استاد حضرت میر مومن نے مسلسل یہ کوشش کی کہ حیات بخشی بیگم ملکہ سلطنت کی والدہ بھاگ متی حیدر محل کے بارے میں لوگ تذکرہ نہ کیا کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو گی کہ فیضی اور فرشتہ نے اس کو فاحشہ لکھ دیا تھا۔ حیدر آباد سے باہر بیجاپور اور احمد نگر میں اس زمانے میں جو تاریخیں لکھی گئیں انکے لکھنے والے بقول پروفیسر شروانی میر مومن یا سلطان محمد کے زیر اثر نہیں تھے۔ لیکن تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ وہاں کے دربار اور بادشاہ حیدر آباد سے دوستانہ اور سفارتانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات قائم تھے۔ ایک جگہ کے وزیر و سفیر، شاعر، ادیب اور مورخ دوسری جگہ آزادی سے آتے جاتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ حیدر آباد میں تاریخ کے اس باب کو مصلحتاً بند کر دیا گیا ہے اور قطب شاہی بادشاہ مورخ اور شاعر نہیں چاہتے ہیں کہ تاریخ میں ان امور کو درج کریں۔ اس طرح خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لئے لازمی تھا کہ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھا جاتا۔ چنانچہ جوں ہی قطب شاہی دور ختم ہوا حیدر آباد کے مورخوں نے بھی بھاگ متی کا قصہ لکھنا شروع کر دیا۔ ماہ نامہ کے مولف نے اس کی جو تردید کی ہے اس کی وجہ (شروانی صاحب بھی جانتے ہوں گے) یہ تھی کہ آخری قطب شاہی بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے بھانجے اور متبنیٰ ابو محمد اس کے دوست تھے اور قطب شاہوں نے اس واقعہ کو چھپانے کے لئے کتنے جتن کئے تھے ان سے واقف تھے اسلئے انھوں نے اپنے اسلاف کی سنت کا ارادہ کیا اور اپنے دوست سے لکھوا دیا کہ یہ واقعہ غلط ہے۔

شروانی صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ برہان مآثر کی طباعت کے وقت سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے کئی حصے حذف کر دئے تھے۔ شروانی صاحب کو چاہئے تھا کہ اس کے قلمی نسخے دیکھتے۔ ایک مورخ سے ایسا سہو نہیں ہو سکتا جبکہ وہ صورت حال سے واقف ہو۔

حیدر آباد میں اس واقعہ پر پردہ پوشی کرنے کے لئے قطب شاہی عہد میں اتنے جتن کئے گئے کہ درباری شاعر ملا وجہی سے ایک مثنوی بطور خاص بھاگ متی کی وفات ۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی جس میں اصل واقعہ کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ پروفیسر شروانی اس کے مطالعہ اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں اب تک غلطاں و پیچاں ہیں۔ آخر ایک اجنبی سیاح ہی تھے تو بھاگ نگر کو باغ نگر سمجھ لیا تھا۔ وہ بھلا کیا جانتا تھا کہ دو اسم عام ملا کر اسم خاص نہیں بنایا جاتا۔ نگر یا باغ کے ساتھ جب تک کوئی خاص اسم یا صفت نہ ملائی جائے اسم خاص نہیں بن سکتا۔ مثال کے طور پر احمد نگر، محمود نگر، ابراہیم باغ، گیان باغ، پرتاب باغ وغیرہ ناموں پر غور کر لیجئے۔

افسوس اس کا ہے کہ شروانی صاحب نے ایک اجنبی کی تحریر کو باغ نگر کی حد تک تو صحیح سمجھ لیا لیکن اس زمانے کے دوسرے اجنبیوں کی تحریریں اور مطبوعہ کتابیں یا تو دیکھی ہی نہیں یا دیکھیں تو اپنے مقصد کے خلاف سمجھ کر ایک ذمہ دار اور دیانت دار مورخ کے فریضے سے اغماض بن گئے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جو فیکٹریاں قائم کی تھیں

ان کے کارندوں کی مراسلت کی تفصیلی روئداد یں چھپ چکی ہیں۔ ان کو ولیم فاسٹر نے مرتب کر کے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا ہے۔ ۱۶۵۵ء تا ۱۶۶۷ء کے واقعات سے متعلق جلد کے صفحہ نمبر ۳ پر لکھا ہے کہ :—

"اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اس کتاب میں جہاں جہاں گولکنڈہ لکھا گیا ہے اس سے قلعہ مراد نہیں بلکہ شہر بھاگ نگر ہے جہاں سے قلعہ (۵) میل کے فاصلہ پر ہے۔"

(ترجمہ از انگریزی)

۴

محمد قلی کی کلیات میں بھاگ متی کا نام کئی جگہ موجود ہے۔ پروفیسر شروانی کی نظر سے نہیں گزرا تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ شاید وہ دکنی زبان اور ادب کو سمجھ نہیں سکے۔ اگر بھاگ متی کا نام کلیات محمد قلی میں موجود نہ بھی ہوتا تو عجب بات نہ ہوتی۔ ہر معمولی مورخ بھی جانتا ہے کہ جب کسی دربار سے کسی کو خطاب مل جاتا ہے تو پھر اس کا اصلی نام استعمال نہیں ہوتا بلکہ اکثر غائب ہی ہو جاتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو افسر الملک یا معتمد الملک کے اصل نام سے واقف ہیں۔ نور محل نور جہاں یا ممتاز محل کے اصلی نام کتنے لوگ جانتے ہیں یا تاریخوں اور نظموں میں کوئی ان کو مہر النسا یا ارجمند بانو کے ناموں سے یاد کرتا ہے۔

خطاب یافتہ اشخاص کا ذکر ہمیشہ خطاب ہی سے کیا جاتا ہے نہ کہ اصلی نام سے۔ جب محمد قلی نے خود ہی حیدر محل خطاب دیا تو فطری بات ہے کہ وہ زیادہ تر حیدر محل ہی اپنی نظموں میں لکھتا۔ یہ اشارہ تھا اس کی اس خواہش کی طرف کہ اسکی محبوبہ کو اس کے اصلی نام سے کوئی یاد نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت سے تو اس نے اپنے شہر کا نام بھاگ نگر سے حیدر آباد بدل دیا تھا۔ مگر اس تمام اہتمام کے باوجود بعض نظموں میں بھاگ متی کا نام باقی رہ گیا ہے جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔

کلیات محمد قلی سے یہ بھی ظاہر کہ حیدر محل اس کی خاص محبوبہ تھی اور وہ اس کا بہت دلدادہ تھا۔ بھاگ متی کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو حیدر محل کا خطاب نہیں دے سکتا۔ اگر کسی اور کا یہ خطاب ہوتا تو پھر ایک محبوبہ بھاگ متی سے منسوب شدہ شہر کا نام حیدر آباد نہ رکھتا بلکہ اس دوسری محبوبہ کے لئے کوئی دوسرا ہی شہر بساتا یا کسی دوسرے آباد مقام کو اس کے نام سے موسوم کرتا۔

شاہی درباروں اور شاہی محلات کے رسم و رواج سے واقف کار لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہی حرم میں داخل ہونے کے بعد اکثر عورتوں کے نام بدل دیئے جاتے ہیں اور خاص کر ان میں سے کسی کے جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ دوسری خواتین حرم سے ممتاز ہو جاتی ہے اور خطاب سے سرفراز کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب بھاگ متی کے بطن سے ۱۰۰۷ھ میں حیات بخشی بیگم پیدا ہوئی تو بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دیا گیا اور اس وقت سے شہر کا نام بھی حیدر آباد بدل دیا گیا۔ اور یہ دونوں نام ساتھ ساتھ عرصہ تک جاری رہے۔ اسی لئے فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہیں حیدر آباد اور کہیں بھاگ نگر لکھا ہے۔

۵

محمد قلی قطب شاہ کی مطبوعہ کلیات کے صفحہ نمبر ۲۶۸ پر ایک نظم موجود ہے جس میں محمد قلی نے بھاگ متی کے اوصاف اظہار نام کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ :۔

—— اے نازنیں تجھے اُساولی چالیں زیب دیتی ہیں۔
—— تیرے بالوں کے جوڑے پر پھولوں کی مالا ایسی نظر آتی ہے جیسے سیاہ ناگن نے اژدہا کی زبان نے چڑھائی کی ہو۔
—— تیرے ہونٹوں پر جو سرخی چڑھی ہوئی ہے وہ جواہر سے زیادہ چمک رہی ہے۔
—— جب تو بال کھولتی ہے تو دن رات بن جاتا ہے اور جب تو رات میں بیٹھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُجالا ہو گیا۔
—— نازنینوں میں بھاگ (متی) ہی وہ نازنیں ہے جو اپنے جسم کی قربت سے پیا کو نہال کر دیتی ہے۔
—— علی کے صدقے میں ہمیشہ یہ نازنیں قطب شاہ کے ہونٹوں سے مئے کا پیالہ پیا کرتی ہے۔

اب اس نظم کے اصل شعر ملاحظہ ہوں ؎

ناری بہے تجھ اُتالے چالاں
سنپولی اُپر بھونگ سنیا چام — چھوٹے الکاں ہیں پھول مالا
رتن تھے ادک دیپیں ہونٹاں پر — اودھراں کے اُپر چڑی سو لالا
دن رات ہوا جو کھولے دھن کیس — نس میں جو ہنسی پڑیا اجالا
ناریاں میں جو نار بھاگ اچگل — انگ سنگ سوں کرے پیا نہالا
نت پیوے علی کے صدقے خانم — قطبا کے ادھر تھے مے پیالا

محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کے ساتھ شادی میں رسم جلوہ کے وقت گانے کے لئے جو گیت لکھا تھا وہ بھی مطبوعہ کلیات کے صفحہ نمبر ۱۶۱ پر موجود ہے اور اس میں بھی محمد قلی نے واضح طور پر بھاگ متی کا نام لیا ہے۔ اس گیت میں وہ لکھتا ہے :۔

—— پریم پیاری کا سب مل کر جلوہ گاؤ۔ پریوں نے جلوہ کے لئے اسے چاند اور سورج لگا کر سنوارا ہے۔
—— سہاگ کے پھول بھاگ متی کی پیشانی پر کھلے ہیں۔ سہیلیوں نے اس کی آرتی میں تارے اس پر سے نچھاور کئے۔
—— جلوہ دینے کے لئے خوشی خوشی ایک ایسا تخت رچاؤ جس کو چاروں طرف موتیوں سے

سجایا گیا ہو۔
—— سات سہاگنیں تیل چڑھاؤ اور زہرہ کو چاہیے کہ مشاطہ بن کر ہاتھوں پر مہندی کے نقش و نگار بنائے۔
—— دولھا دلہن (محمد قلی اور بھاگ متی) کو شربت پلا کر دونوں کے ہاتھوں میں پان کے بیڑے دو اور دونوں کے دامنوں کو باندھو۔
—— اے خدا محمد قلی قطب شاہ اور اس پری کو اس وقت تک زندہ رکھ جب تک ستارے ہیں ؎

پریم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے — اسے چند سورسوں پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھول مشک کھلے ہیں — سہیلیاں آرتی تارے نوارے
رچاؤ تخت جلوہ کا خوشی سوں — کہ چوندہر چوک موتیاں سوں سنوارے
چڑھاؤ تیل اب ساتوں سہاگاں — مشاطہ ہو کے زہرہ بہت نگارے
پلا شربت دیو ہاتاں میں بیڑے — بندا ؤ ساریاں موتیاں کنارے

محمد قطب شاہ ہور اس پری کوں
خدایا رکھ جداں لگ ہیں ستارے

عید شب برات کے موقع پر محمد قلی قطب شاہ ہر سال ایک نظم لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق کلیات میں دس نظمیں شریک ہیں۔
صفحہ نمبر ۱ پر ایک نظم درج ہے جس کے آخری دو شعروں میں وہ کہتا ہے :—
—— چونکہ محبوب کے پھول جیسے جسم کے ساتھ شب برات کی رات میں لٹ پٹ ہونا ہے اس لئے اس کو عروسی خوشبوئیوں میں از سر نو مہکایا گیا ہے۔
—— نبی کے صدقے میں قطب شاہ بھاگ (متی) سے مل کر جی بھر کر عیش وصل حاصل کر کیونکہ وہ بن سج کر پھر سے خود کو قطب شاہ کی داسی کہلوا رہی ہے۔
محمد قلی کے شعر یہ ہیں ؎

سجن کے پھول سے تن کوں لتا پٹ ہوا نندوں سوں
عروسانی سو باراں میں ادک مہکائے بھی سر تھے
نبی صدقے قطب ہو کے سوں کر سنبھوگ بھاگوں مل
قطب کی داس ہوں سج کر پیا کہوائے بھی سر تھے

بھاگ متی ہی کا خطاب حیدر محل ہونے کا ثبوت اس طرح سے بھی ملتا ہے کہ محمد قلی نے اپنی اردو کلیات میں جہاں جہاں حیدر محل کا ذکر کیا ہے اس کو رقاصہ ہی ظاہر کیا ہے۔ مثلاً ایک نظم کلیات کے صفحہ نمبر ۲۵ پر درج ہے

جس میں محمد قلی حیدر محل کو ایک ایسی رقاصہ ظاہر کرتا ہے جو اس کے سر پر تاج کی طرح سجتی ہے۔ اور جو ہر روز اطمینان سے عشق کے طبل بجاتی ہے وہ کہتا ہے :۔

——— حیدر محل محبت سے مصری کی ڈلی گھولتی ہے اور ہر روز اطمینان سے عشق کے طبل بجاتی ہے۔

——— اس کے سرو جیسے قد پر نور تن کا جلوہ نظر آتا ہے اور عشق و محبت کی رقاصائیں اس کو دیکھ کر شرماتی ہیں۔

——— وہ عشق کی چادر اوڑھ کر بہوٹی کی طرح سرخ نظر آتی ہے۔

——— نبی کا شکر ادا کر کہ تجھ کو ایک ایسی رقاصہ ملی ہے جو حیدر کی غلامی کے باعث تیرے سر پر بطور تاج کے سجتی ہے۔

اس نظم کے چند شعر یہ ہیں ؎

حیدر محل میاتے نابات گھول ساجے — دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے
اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا — عشق کے پاتراں سب اس کا سکھ لاجے
چادر عشق کا اوڑھے جوں میر بہوٹی دیسے — تیرے عشق کے لاجاں دیکھے ہیں لاجوں بھاجے
صدقے نبی شکر کر تجھ کو ملی ہے پاتر — حیدر غلامی سیتی تجھ میں تاج سلاجے

ایک اور نظم میں حیدر محل کے گانے اور ناچنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم ناقص حالت میں ملی ہے۔ صرف دو شعر (صفحہ نمبر ۲۵) مکمل ہیں جن میں محمد قلی کہتا ہے کہ :۔

——— حیدر محل محبت سے عشق کا جلوہ گائیں اور بزدانی ستار طرح طرح کے رنگ میں بجائیں۔

——— جب اپنے ہاتھ میں جلوہ کا گیت گانے کے لئے کنگن پہن رکھا ہے تو بہتر ہے کہ اپنی انگلیوں کی پتلیوں کو بھی کھیل کی پتلیوں کی طرح نچائیں۔

اصل شعر یہ ہیں ؎

حیدر محل میاتے جلوہ عشق کا گاویں — بزدانی تانت چوندہ رنگاتیں بجاویں
اپ ہاتھ میں بندی ہے جلوہ کے نادکنگن — نیناں کی پتلیاں کوں پتلیاں من نچاویں

محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دینے کے بعد اپنے ایک محل کا نام بھی حیدر محل رکھا تھا جس میں بھاگ متی حیدر محل کا قیام تھا۔ یہ محل موجودہ محلہ "مٹی کے شیر" کے پاس واقع تھا اور اس کی قدیم مسجد اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس محل میں ہر سال بھاگ متی کی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جاتی تھی اور محمد قلی قطب شاہ اپنی محبوبہ کو ہر سال نئے سرے سے دلہن بناتا تھا اور اس کے جلوے کی رسم کے لئے ناچنے اور گانے والیوں کو ایک نیا گیت بھی لکھ کر دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک گیت کلیات محمد قلی کے صفحہ نمبر ۲۱۰ پر درج ہے جس میں وہ لکھتا ہے :۔

——— حیدر محل میں ہمیشہ حیدر پیاری (بھاگ متی) کا جلوہ گاؤ اور اس تقریب میں عرش آسمان

اور زمیں پر خوشی کے دماما بجاؤ۔

——— اے ساقی سیم ساق میری اس محفل میں صراحی مئے لا اور پیالے میں شراب ڈال تاکہ مجھے پیالے کی جوت میں میری پیاری کا چہرہ دکھلائیں۔

اس کے رخساروں میں جو سورج کے ٹیغ جیسے ہیں شراب کے نقل رکھو اور پیاری محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔

نبی کے صدقے میں قطب شاہ جلوے کے تخت پر بیٹھے ہیں اس لئے حوریں اور پریاں اور سہیلیاں مل کر ان کو آئینہ دکھاؤ۔

محمد قلی کے اصل شعر یہ ہیں ؎

حیدر محل میں دائم حیدر کا جلوہ گاؤ — عرش آسماں دھرت پر نصرت طبل بجاؤ
لا سیم ساق ساقی مجھ بزم میں صراحی — پیالے کے جوت میانے سائیں صورت دکھاؤ
سورج طبق سے گالاں میں نے نقل دھر و تم — پیاری پرت کے ہاراں پیارے کے گل ہیں باؤ
صدقے نبی قطب شاہ جلوے کے تخت بیٹھے — حوراں پریاں سہیلیاں مل آرسی دکھاؤ

دکن میں جلوے کی رسم ہیں وہ لھا دلہن کو تخت یا چوکی پر ایک دوسرے کے مقابل یا برابر بٹھا کر صندل لگاتے ہیں۔ پھول پہناتے ہیں۔ میراثنیں گیت گاتی رہتی ہیں۔ طوائفیں ناچتی ہیں۔ باہر نوبت اور روشن چوکی بجتی ہے۔ دولھا اور دلہن ایک دوسرے کو مصری کے نقل دکھلاتے ہیں اور ایک پیالے میں پانی یا شراب بھر کے اس میں یا آئینے میں دولھا کو دلہن کی اور دلہن کو دولھا کی صورت دکھائی جاتی ہے۔ تمام حاضرین دولھا دلہن پر سے سونے چاندی کے سکے اتارتے یعنی صدقہ کرتے ہیں۔ یہ سب امور محمد قلی نے اپنی نظموں میں بیان کئے ہیں اور یہ سب رسوم دکن میں اب تک جاری رہے۔ البتہ اب رفتہ رفتہ ان میں کمی یا تبدیلی ہوتی جا رہی ہے۔

جلوہ کی ایک اور نظم (صفحہ نمبر ۱۶۴) میں بھی بھاگ متی کا نام شروع ہی میں لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے :—

——— قسمت والی بھاگ متی کا جلوہ تم سب گاؤ اور اس کے سہاگ کی تعریف کے دماما بجاؤ۔

اصل شعر ہے ؎

بھاگنی بھاگاں کا جلوہ گاؤ تم — اس سہاگاں کے سبد بجاؤ تم

یہ بھی واضح رہے کہ لفظ بھاگ قسمت یا حصے کے معنے و مفہوم میں بھی محمد قلی قطب شاہ نے اپنی کلیات میں کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً

حق اپ پیرت کے تئیں دو جگ بنایا — بڑے بھاگ اس کے جن یہ پنتھ پچھانے

یعنی خدائے تعالیٰ نے (نبی کے ساتھ) اپنی محبت کے ثبوت کے لئے یہ دونوں جگ بنائے ہیں۔ لیکن اس راہ کو پہچاننے والے قسمت والے ہی ہوتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتا ہے :—

قطب شاہ بھاگی توے مندر چلے ص ۱۶۵

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ' خدا نے تیری قسمت کے ستارے کو شرف بخشا ہے اس لئے تو اپنے روئیں روئیں کی زبان سے شکر ادا کر۔ شعر ہے : ؎

ہر اک روم کی جیب سوں شکر کر
کہ تجھ بھاگ تارا شرف سوں بنایا

محمد قلی نے اپنی محبوبہ کے لئے بھاگ متی اور حیدر محل دونوں نام زیادہ تر مخفف کر کے یعنے بھاگ اور حیدر استعمال کئے ہیں۔ بے تکلفی اور پیار میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا جلوہ کی نظم کے علاوہ کئی اور نظموں میں بھی اس نے بھاگ متی کے لئے بھاگ اور حیدر محل کیلئے حیدر لکھا ہے۔ ایسے اور دو شعر یہ ہیں : ؎

رتن قطبا کے ہیں نرمول نیں کس شہر میں مول اس
لے کر آؤں جو مجھ راہوے اس کا شہر حیدر نیں

"یعنے قطب شاہ کے موتی (شعر) لاقیمت ہیں۔ کسی شہر میں ان کے صحیح دام نہیں مل سکتے۔ اگر حیدر محل کے شہر میں ان کی فروخت کی توقع ہو تو لے آؤں"

بریاں نظر اں تھے اس اسپند اتارو
کہ حیدر نگر ان انداں بھرایا

یہ شعر صفحہ نمبر ۳۲۴ پر ایک نظم کے درمیان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ :—

"نظر بد سے بچانے کے لئے اسپند کے دانے اس پر سے اتار کر جلاؤ کیونکہ حیدر محل کا شہر اس نے عیش و آنند سے بھر دیا ہے"

بھاگ متی حیدر محل کے متعلق کلیات محمد قلی میں اتنے واضح اور اتنے زیادہ ثبوتوں کے بعد بھی کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ کلیات میں ذکر ہی نہیں ہے۔

یوں تو محمد قلی نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارے بھید کو نہیں سمجھ سکتے ہو تو پھر ہمارے اور ہماری پیاری بھاگ متی کے درمیان مت آؤ (دیکھو مطبوعہ کلیات صفحہ ۳۱۲)۔

شاید ایسے ہی لوگوں کے جواب میں محمد قلی نے یہ شعر لکھا تھا : ؎

ہمارا بھید نیں بوجھتے تو کو آؤ ہمارے اور پیا کے درمیانے

۶

شروانی صاحب کا یہ بیان کہ پرانے پل کی تعمیر کے وقت محمد قلی آٹھ برس کا تھا' اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ پرانے پل کا مادہ تاریخ "صراط مستقیم" تدخلہ کا مصرع ہے۔ پروفیسر شروانی کو شاید پورا قطعہ تاریخ نہیں ملا۔ اس کا ایک اور

مادۂ تاریخ "گذر گہ ما" بھی ہے جس سے ۹۸۶ھ برآمد ہوتا ہے جب کہ محمد قلی کی عمر ۱۴۔ ۱۵ سال کی تھی۔ شروانی صاحب نے پرانے پل کی تعمیر کے مشہور و معروف مادہ تاریخ کو چھوڑ دیا جس میں لکھا ہے کہ :ے

زتحت او گزر دماہ و ما برا و گذریم ازیں سبب شدہ تاریخ او گذر گہ ما
۹۸۶ھ

تلنگانہ کے دیہات میں اب بھی بھاگ متی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ حیدر آباد کے ایک قدیم اور مشہور محلہ ناگل چنتا میں آج بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو خود کو بھاگ متی کے اہل قرابت اور خاندانی عزیزوں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اس کے بھائی کے نام محصول آبکاری معاف رہنے کے جو فرامین محمد قلی قطب شاہ نے جاری کئے تھے، دس سال قبل تک نظامت آبکاری کی اشٹہ میں موجود تھے اور غالباً اب بھی ہوں گے۔

بھاگ متی کا گنبد اس وقت بھی نہایت عمدہ حالت میں موجود ہے۔ اس کو خود محمد قلی قطب شاہ نے اپنے زیر تعمیر گنبد کے پہلو میں بنایا تھا جس میں بعد کو اس کے داماد سلطان محمد قطب شاہ نے اپنی دختر کلثوم بیگم کو (اس کی نانی کے پہلو میں) دفن کیا تھا اور اب یہ گنبد کلثوم بیگم کہلاتا ہے اور جمشید قلی قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے گنبدوں کے درمیانی میدان میں محمد قلی کے گنبد کے قریب اسی کے پہلو میں موجود ہے اور اس کا کتبہ بھی اسی احاطۂ لنگر فیض آثار میں محفوظ ہے۔

بھاگ متی کو محمد قلی آخر وقت تک اتنا چاہتا تھا کہ اس کی وفات کے بعد دل گرفتہ ہو کر علیل ہو گیا اور پھر آخر تک سنبھل نہ سکا۔ اس عرصہ میں وہ باہر نکلنے کے بھی قابل نہ رہا اور جو عمارتیں بن رہی تھیں ان کو دیکھنے کیلئے تڑپتا رہا۔ اس کے ملازمین کرسی پر لٹا کر اس کے آٹھ منزلہ محل کی چھت پر اس کو لے جاتے اور وہاں وہ اپنی مرحوم محبوبہ کی یادگار (شہر حیدر آباد) کی عمارتوں کو دیکھ کر خوش ہوتا اور نو تعمیر شدہ عمارتوں کی وضع قطع پر تبصرہ کرتا اسی عالم اضطراب و مجبوری میں اپنی محبوبہ کے بعد دو ڈھائی سال کے اندر ہی وفات پا گیا۔ اس کے اس عالم کرب و بے چینی کے واقعات ایک فارسی مثنوی میں درج ہیں۔

ان سب واقعات اور ان کے ماخذوں تک پہنچنے کی کوشش مزوری تھی ان تاریخی دلیلوں اور صریحی ثبوتوں کے اظہار کے بعد یقین ہے کوئی بھی بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود سے انکار نہ کرے گا۔

یہ سلسلہ صفحہ (۲۹۵)

مفید پائیں گے۔ کیونکہ اردو کے اکثر بلند پایہ انشا پردازوں اور شاعروں کے نتائج قلم حاصل کئے جا رہے ہیں۔ اور توقع ہے کہ ہر شمارہ میں ہر ذوق کی تسکین کے اسباب مہیا کئے جائیں گے۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں خاص کر ہندی، مرہٹی، تلگو اور کنڑی کے جدید ادبی جواہر پاروں کو بھی سب رس کے ذریعہ سے اردو میں روشناس کیا جائے گا۔

سب رس میں بچوں اور طلبہ کے لئے جو سولہ صفحے وقف کئے گئے ہیں ان کو ایک علٰحدہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے تاکہ جو بچے اور طلبہ سب رس نہ خرید سکیں وہ سالانہ ایک روپیہ چندہ میں ہر ماہ سب رس کے اس حصہ سے فائدہ اٹھا سکیں جو ان کی دلچسپی اور ضروریات کی تکمیل کے لئے خاص اہتمام سے مرتب کیا جائے گا۔

بنام غالب

حضرت محترم تسلیم۔

اگرچہ آپ نے القاب و آداب کی روایات کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور آپ کی تقلید میں اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے عجیب عجیب القاب و آداب اختراع اور استعمال کئے ہیں مگر میں اپنی عادت اور طبیعت کے مطابق آپ کو روایاتی انداز ہی میں مخاطب کر رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ اس طرزِ تخاطب کو پسند نہ فرمائیں۔ مگر آپ تو اپنی عادت اور طبیعت کے خلاف سُننے اور دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اور آپ کے بعد سے اب تک اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے آپ کے بارے میں کیا کیا نہ لکھا اور آپ پر کیسے کیسے بہتان نہ تراشے۔ غالباً یہ سب بھی آپ برداشت کر چکے ہیں۔

کسی نے آپ کے کلام کو الہامی قرار دیا تو کسی نے یورپ کے شعرا سے مقابلہ کر کے خرافات ثابت کیا۔ جہاں آپ کو رشکِ عرفی و فخرِ طالب سمجھا گیا وہیں آپ کو انگریز حکومت کا خوشامدی اور ابن الوقت بھی ثابت کیا گیا۔ آپ نے یوں تو کبھی محققی و مجتہد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن عہدِ حاضر کے محققوں نے آپ کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی تفصیلات بیان کر کے خود کو محقق منوایا۔ غرض کیا کیا کہا جائے۔ مختصر یہ کہ دنیائے اُردو میں جس کسی کو آسان شہرت اور سستی قدر و منزلت کی ضرورت ہوئی آپ کے نام اور کارناموں کا سہارا لیا۔ اور اس طرح آپ سے متعلق کتابوں اور کتابچوں سے اُردو کے کتب خانے معمور ہو گئے۔

اُردو کی روایات اور اُردو بولنے والی قوم کی عادات کے پیشِ نظر یہ بھی غنیمت ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ بڑے خوش قسمت ہیں ورنہ ماضی کے کتنے اعلیٰ درجہ کے ایسے شاعر ہیں جن کو اُردو بولنے والے بالکل ہی بھلا بیٹھے ہیں اور کتنے شاعر اب بھی موجود ہیں جن کی صحیح قدر و منزلت سے یہ قوم واقف ہی نہیں ہے۔ آپ نے سچ ہی تحریر فرمایا تھا کہ ؎

ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

آپ کا کلام اس قسم کی پیشین گوئیوں سے خالی نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی صحیح نباضی کی تھی۔ آپ کی تشخیص قدم قدم پر صحیح ثابت ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے آپ کی عزت و عظمت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

کلام غالب میں جہاں اُردو کی عظمت اور ہمہ گیری موجزن ہے اُردو بولنے والوں کے مزاج اور رجحانات بھی پوری طرح جلوہ فرما ہیں۔ آپ نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی جو کوشش کی اور اپنے ماحول اور روایات سے جو بغاوت کی وہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ نے اُردو

شعروادب کی روایاتی خرابیوں اور شاعروں کی بے اعتدالیوں کا صحیح تجزیہ کیا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ ان کو نئے راستے پر لا ڈالیں۔ اگرچہ آپ کی زندگی میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اور لوگوں نے آپ کے اشعار کو اس قسم کا کلام سمجھا کہ

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اور جو لوگ ذرا مہذب اور سنجیدہ تھے انھوں نے آپ کے کلام کے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ ـــــ

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر خوشی کی بات ہے کہ آپ کی وفات کے فوراً بعد ہی آپ کے ایک شاگرد مولانا الطاف حسین حالی نے آپ کے سوانح حیات "یادگار غالب" میں آپ کے کلام کو بڑی خوش اسلوبی سے سمجھانے کی سعی کی مگر وہ بھی آپ کے باغیانہ انداز اور ابنائے زمانہ کے مزاج سے اتنے خائف تھے کہ خود کو صاف صاف آپ کا شاگرد ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ محض معتقد بننے پر اکتفا کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی افتاد طبع سے مجبور تھے۔ ان کی طبیعت میں سلامت روی اور سنجیدگی اتنی رچی ہوئی تھی کہ اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں اردو کے شاعروں کو قدیم روایات سے بغاوت یا انحراف کی تبلیغ بھی کی تو اس انداز میں کہ معلوم ہوتا ہے کوئی جدید بات نہیں کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں بھی شیفتہ اور میر کی تقلید کرنے کی کوشش کی اور طرز غالب تک پہنچنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ شاید وہ آپ کے مشہور شعر کو یوں پڑھتے ہوں گے کہ ؎

طرز غالب میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

گویا جو بات آپ کو کلام بیدل میں نظر آئی تھی وہی بات حالی کو کلام غالب میں نظر آتی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حریف مقابل خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کے سلسلے کے ایک شاگرد علامہ اقبال نے وہ کام کر دکھایا جو خود آپ کے معتقدوں اور شاگردوں یعنی حالی اور مجروح سے بھی نہ ہو سکا۔ اقبال نے نہ صرف آپ کے انداز میں شعر لکھے بلکہ آپ کے اس خیال کو بھی صحیح ثابت کر دکھایا جو آپ نے ان کے دادا استاد ذوق سے مخاطب ہو کر ان اشعار میں ظاہر کیا تھا۔

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است
آنچہ در گفتار مخمر تست آں ننگ من است

اقبال نے نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی میں بھی آپ کی جودت و جدت کی کامیاب تقلید کی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں سے بھی اردو کے در و دیوار گونج رہے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عظمت و شہرت و مقبولیت کے میدان میں اگر آج آپ کا کوئی شریک بلکہ آپ ہی کے الفاظ میں شریک غالب ہے تو وہ اقبال ہی ہیں۔

اقبال کے بعد ایک اسے شاعر نے اردو کی دنیا میں دھوم مچائی جو شاعر شباب و انقلاب سمجھے جاتے رہے، اور جنھوں نے بزعم خود صنف غزل ہی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش و جذبات اور شور و طمطراق

کے لحاظ سے جوش ملیح آبادی کی نظمیں میر انیس اور لکھنو کے دیگر مرثیہ نگاروں کے کلام کی جدید اور ترقی پسند ماڈل سمجھی جاسکتی ہیں مگر افسوس ہے کہ وہ نہ غزل کو سمجھ سکے اور نہ آپ کی عظمت کے اس راز سے واقف ہو سکے جس کی بنا پر آپ ایک جادوائی شہرت کے مالک بن گئے ہیں۔

آپ نے اپنے کلام میں جن جادوائی قدروں کی ترجمانی کی ہے ان کو آپ کے بعد اُردو کے چند اور شاعر مثلاً اصغر۔ فانی۔ جگر اور فیض وغیرہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ چنانچہ وہ ان کو اسی انداز میں برت رہے ہیں جس طرح آپ نے برتا تھا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے ان شعرا نے اپنی شیوہ بیانی میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اور معلوم نہیں کہ اس امر واقعہ سے واقف ہو کر آپ خوش ہوں گے یا ناراض۔ اس لیے کہ آپ کا جوش رقابت مشہور ہے اور آپ نے رشک کے ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں کہ شاید ہی کوئی اور شاعر اس میدان میں آپ کا مقابلہ کر سکے۔

آپ ہی کے تو یہ شعر ہیں کہ ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

———

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد مرگ — میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

———

تم ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاش تم میرے لئے ہوتے

———

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے مجھ سے

———

یہ سلسلہ صفحہ (۲۸۰)

کی بلکہ خود بھی اس کا ایسا گرویدہ بن گیا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے۔ اس طرح بارہ سال کی عمر کے بعد سے اگر اس کی عمر کا اوسط نکالا جائے تو گویا ہر روز اس نے پانچ شعر لکھے۔

اس کے اُردو کلام کی گوناگونی اور وسعت دہمہ گیری سے پتہ چلتا ہے کہ کاروبار سلطنت کے بعد اگر محمد قلی کو کسی چیز سے دلچسپی تھی وہ اُردو شعر و سخن ہی تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی۔ شاعری ہی اس کے عشق و محبت کے جذبات اور عیش و عشرت کے تخیلات کی بہترین ترجمانی کر سکتی تھی۔ قدرت نے اس کو فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ اگرچہ سب نعمتیں بخشیں لیکن صحت اور عمر کے بارے میں اس کو شاید اس لیے محروم رکھا کہ دُنیا کے تمام کمال اور قدرت کے جملہ عطیے ایک ہی شخص کو نہیں دیئے جاسکتے یہی وجہ ہے کہ وہ صرف ۴۷ سال کی عمر میں ہفتے کے دن ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء کو ڈھائی مہینے کے مسلسل بخار کے بعد دُنیا اور اس کی مسرتوں اور کامرانیوں کو اپنا سوگوار چھوڑ گیا۔ اس کے اپنے بنائے ہوئے عالیشان گنبد میں اس کو دفن کیا گیا۔ اس کی تعمیر میں بھی اس نے ہندو مسلم دونوں طرز ہائے تعمیر کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔

پیش لفظ

سب رس کا سب سے پہلا اداریہ

سب رس" ادارۂ ادبیاتِ اردو" کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لئے شائع ہوا کرے گا۔ اس ادارہ نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کر کے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن اس خدمت سے خاص خاص اہلِ ذوق ہی مستفید ہو سکتے تھے اس لئے ادارہ ابتدا ہی سے دھیان لگائے ہوئے تھا کہ ایک ایسا رسالہ بھی نکالا جائے جس کی رسائی سب تک ہو اور جس میں سب کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔

ہمارے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر یا فائدہ ایک خاص حلقہ یا طبقہ تک ہی پہنچتا ہے۔ اب ایسے کاموں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت ہے جو سب رس بن سکیں اور ایسے ماہنامے اور روزنامے نکالے جائیں جن میں بھانت بھانت کی باتوں اور طرح طرح کی معلومات کا چٹخارا ہو اور جن کو ہر وہ شخص دلچسپی سے پڑھ سکے جو کسی خاص علم و فن کا ماہر نہ ہو اور اپنی فرصت کی گھڑیوں کو خوش گوار طریقہ پر گذارنا چاہتا ہو۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور ہماری آواز دور دور تک پہنچ سکے گی۔ یہی طریقہ ہماری بہت سی خامیوں کو دور کرنے کا باعث بھی بنے گا اور ہم میں ایسی خوبیاں پیدا کرے گا جن کا نہ ہونا ہماری ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔

ہم میں اتحاد و یگانگت کی لہر اٹھیں دوڑ سکتی اور نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت یا ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جب تک ہم اپنے ملک کے زیادہ سے زیادہ بسنے والوں یا اپنی زبان کے زیادہ سے زیادہ سمجھنے والوں سے مخاطب نہ ہوں اور ان کی ضرورتوں اور رجحانوں کا اپنی تحریروں میں خیال نہ رکھیں۔ ہماری زبان کی بہت سی خرابیاں اور اسلوب کے بہت سے گھٹک بھی اس طرح دور ہو جائیں گے جن کے لئے موجودہ زمانہ میں اکثر خیر خواہانِ اردو توجہ دلا رہے ہیں۔ ہندوستان کے ایک مشہور قومی رہبر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔ "ہماری زبان کو مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم ہونا چاہئے۔ اس کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہوگی جب لکھنے والے عوام کے لئے لکھیں گے۔ ہر ادیب کو اپنے سے سوال کرنا چاہئے کہ میں کس کے لئے لکھ رہا ہوں"

سب رس" کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا کہ وہ سب کے لئے ہو۔ وہ سب کے لئے اسی وقت بن سکے گا جب اس کی زبان سلیس اور سادہ ہوگی اور جب اس میں سب طرح کے موضوعوں پر دلچسپ مضمون، نظمیں اور افسانے چھپتے رہیں۔ ادارہ اسی وقت خود کو کامیاب سمجھے گا جب سب رس بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں اور مردوں سب کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکے۔ اسی لئے بچوں اور طلبہ کا حصہ بھی رکھا گیا ہے۔ جس میں نظمیں، کہانیاں اور دلچسپ مضمون ہوں گے جو یا تو بچوں اور بچیوں اور مدرسوں کے طلبہ اور طالبات ہی کے لکھے ہوئے ہوں گے یا ان کے لئے خاص اہتمام سے لکھوائے جائیں گے۔ اسی طرح حصۂ نسوان علیحدہ تو نہیں کیا گیا (اور نہ اس کو جدا کرنے کی ضرورت تھی) مگر نونہالی

دلچسپیوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا اور ہر رسالہ کی ترتیب میں صنف نازک کا کافی حصہ ہوگا۔

مضامین کے انتخاب میں بھی بڑی وسیع نظری ملحوظ رہے گی۔ افسانوں، نظموں، علمی و ادبی اور تنقیدی مضمونوں، اور اردو کی مطبوعات پر غیر جانب دار تنقیدوں کے سوا آرٹ اور تصویر (سینما) پر بھی دلچسپ مصور مضمون چھپتے رہیں گے۔ نہ صرف دکن بلکہ تمام اردو دنیا کے اچھے، اچھے شاعروں اور انشا پردازوں کی نظمیں اور مضمون حاصل کرنے اور چھاپنے کا التزام کیا گیا ہے۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ سب رس تمام ہندوستان میں پہنچے اور ہر جگہ شوق سے پڑھا جائے۔ حسن کاری اور اردو ادب سے متعلق تصویریں بھی شامل رہیں گی۔ اور سرورق بھی رنگین اور دیدہ زیب ہوگا جس کے لئے ہندوستان کے مشہور حسن کار خاں بہادر عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنی خدمات سے ادارہ کو مستفید کیا ہے چنانچہ موجودہ سرورق انہی کے ایک سہ رنگی نمونۂ حسن کاری کا خاکہ ہے جو آئندہ پوری شان سے جلوہ گر ہوگا۔

ایسی اہم اور ہمہ گیر خصوصیتوں کا رسالہ نکالنے کا خیال ابتدا میں "خیال است و محال است و جنوں" معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب ادارۂ ادبیات اردو کے مدیر عمومی نے ادارہ کے ایک قدیم ہمدرد اور بہی خواہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و سیاسیات حکومت آصفیہ سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بڑی ہمت افزائی کی اور فرمایا کہ ایسا رسالہ ضرور نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ ان ہی کے حسب ارشاد اجازت کی درخواست دی گئی اور اُن کی اور دیگر مستند علم دوست اصحاب کی توجہ اور دلچسپیوں نے آج ہم کو اس قابل بنا دیا کہ سب رس کی اشاعت کے ذریعہ سے اس الزام کو رفع کر سکیں کہ "اعلیٰ حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی معارف نوازیوں اور علم پروری کے باوجود حیدرآباد صحافت کے میدان میں بہت پیچھے ہے"۔

ممالک محروسہ سرکار عالی سے جو اردو رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں بیشتر مدرسوں اور کالجوں کے رسائل ہیں جن کا دائرۂ عمل انہی مدرسوں اور طالب علموں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب تک محدود ہے۔ مجلہ تحقیقات علمیہ مجلہ عثمانیہ، الموسیٰ، مجلہ دکن فورس اس جامعہ عثمانیہ کی مختلف درسگاہوں کے ترجمان ہیں۔ دو رسالے مجلہ طبیہ کالج اور مجلہ نظامیہ۔ دو درس گاہوں (یعنے جامعہ عثمانیہ اور مدرسہ نظامیہ) کے فارغ التحصیلوں کی طرف شائع ہوتے ہیں۔ اور اردو انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں بلند پایہ تحقیقانہ مقالے اور ادبی مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کا ایک رسالہ "شہاب" ایسا ہے جو ماہوار ہے ادبی رسالہ سمجھا جا سکتا ہے اور پابندی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ آج حیدرآباد کو علم و فضل کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے یہاں اردو کے اہل علم ہر روز بڑھ رہے ہیں لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اخبار و رسائل کے مطالعہ کا ذوق ابھی عام نہیں ہوا۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہر اردو داں اپنی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر ضرور مطالعہ کیا کریں۔ جب تک مطالعہ کا ذوق وسیع نہ ہوگا نہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو سکیں گے نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت پیدا ہو سکے گی نہ ہمارا ادب وسعت حاصل کر سکے گا اور نہ ہماری زبان میں ترقی ہوگی۔

رسالہ سب رس ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے نکل رہا ہے اس لئے اس کی نگرانی ادارہ کے مستند عمومی کے سپرد ہے اور ادارہ کے سرگرم رکن صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کو اس کی ادارت کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایک پُرجوش اور اہل ذوق نوجوان ہیں ان کی سرگرمیوں اور سلامتی طبع سے توقع ہے کہ سب رس ان کی ادارت میں ہر طرح سے کامیاب ثابت ہوگا۔

پہلے نمبر میں جو مضامین اور نظمیں شایع ہو رہی ہیں وہ صرف چار یا پانچ ہفتوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کی خصوصیات کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہنا ضرور ہے کہ آئندہ ہر مہینہ میں ہمارے پڑھنے والے سب رس کو اپنی توقعات سے زیادہ دلچسپ اور

بقیہ سلسلہ ۲۹۰ پر ملاحظہ ہو

پنڈت ونسی دھرجی

حیدرآباد کے بابائے ہندی

پنڈت ونسی دھرجی کو میں کوئی پچیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ اورنگ آباد سے نئے نئے حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں ہندی پڑھانے کے لیے امور ہونے والے تھے۔

ان سے پہلے پنڈت ہری ہرشاستری اس خدمت پر مامور تھے اور انھوں نے اپنے علم و فضل اپنے اخلاق اور مرنجان و مرنج پالیسی کی وجہ سے ہندی کے پروفیسر کا ایک ایسا معیار مقام کر دیا تھا کہ دوسری زبانوں کے پروفیسروں کے مقابلے میں ہندی کے استاد بہت شائستہ اور نرم اور ملائم معلوم ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے بلکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بڑے شگفتہ تھے۔

پنڈت ونسی دھرجی نے پنڈت ہری ہرشاستری جی کے بعد ان کی شریفانہ اور مخلصانہ روایات کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان میں اضافہ کیا۔ ان کے دورِ ملازمت میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا جبکہ حیدرآباد میں ہندی زبان تعصب اور مخالفت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی لیکن پنڈت ونسی دھر نے اپنے میں ملاپ اور محبت و آشتی سے اس فضا کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ اور نہ صرف ہندی کے خلاف لوگوں کے جذبات کو دبا دیا بلکہ ہندی کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرا دیا۔ اور اتنے مقبول رہے کہ اُردو کا کوئی مشاعرہ ان کی شمولیت اور شرکت کے بغیر نامکمل سمجھا جانے لگا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں ہندی کے شعبے کو ترقی دینے اور دوسری زبانوں کے شعبوں کے ہم پلّہ قرار دینے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ جس کام کے لیے ابتدائے ملازمت کے وقت وہ تنہا تھے وظیفہ لینے اور جامعہ سے جُدا ہونے کے وقت انھوں نے اس کام کے لیے ایک جماعت اپنے پیچھے چھوڑی۔ یہ کام محض ان کی ذاتی مقبولیت اور اُردو والوں کے ساتھ میل ملاپ اور شخصی تعلقات کے باعث پورا ہو سکا۔ وہ تعصب اور نفرت کے جذبات سے دور رہتے ہیں اور اگر دوسری باتیں نہ بھی ہوتیں تو صرف یہی ایک خصوصیت ان کے بڑے آدمی ہونے کے لیے کافی تھی۔ مگر فراخ دلی ہمدردی اور مروّت کے علاوہ ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔

وہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ نثر اور نظم دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ اور اپنی شاعری میں ایسے سلیس اور سادہ الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں کہ ان کا کلام اُردو اور ہندی دونوں کے بہی خواہوں اور طرف داروں کو پسند آتا ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اُردو کے مشاعروں میں ان کو بہت زیادہ داد ملتی ہے اور اُردو کے شاعران کی سلیس اور سادہ زبان کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح پنڈت ونسی دھر جی نے اُردو اور ہندی دونوں کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔

مجھے جامعہ عثمانیہ کی اکثر علمی کمیٹیوں میں پنڈت جی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع ملے ہیں۔ اور میں نے قریب سے انھیں دیکھا ہے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۰۰ پر ملاحظہ ہو

میرا کشمیر کا سفر

مولانا آزاد کی یاد منانے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے جب حکومت کشمیر نے ۲۰ر سے ۲۷ر مئی ۱۹۵۸ء تک ایک آزاد سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک موضوع پر مجھے بھی تقریر کرنے کی دعوت دی۔ مجھے لکھا گیا کہ "ہندوستانی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ میں مولانا آزاد کی خدمات" پر تقریر کروں۔ چونکہ عنوان میرے لیے نیا تھا اور میرے ذوق سے ہٹا ہوا تھا اس لیے میں نے پس و پیش ہی میں رہا۔ یہاں تک کہ سری نگر سے تار پر تار وصول ہونے شروع ہوئے اور مجبور کیا جانے لگا کہ ضرور اس آزاد سمینار میں شرکت کروں۔ آخر کار میں نے رضامندی ظاہر کر دی اور ریل میں اپنی نشست محفوظ کرانے کی کوشش کی مگر وہ تو کئی روز قبل ہی حسب قاعدہ دوسروں کے لیے محفوظ ہو چکی تھی۔

ادھر میری بڑی لڑکی بھی کشمیر کی سیر کے لیے بے تاب تھی اور اس کے کالج سے جو پارٹی کشمیر گئی تھی اس میں شریک نہ ہو سکنے کے تاسف کا اظہار ایک عمدہ نظم میں کیا تھا۔ یہ نظم بار بار گھر کی محفلوں میں سنائی گئی تھی۔ اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں خود ساتھ جا کر کشمیر دکھاؤں گا۔ اب اس وعدہ کے ایفا کا موقع تھا۔ اس لیے میں نے ریل کے سفر سے مایوس ہو کر خود اپنی موٹر کار میں چلنے کا تہیہ کر لیا۔ اور آخر کار ۱۱ر مئی کو صبح صبح حیدر آباد سے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ نکلا۔ اور دوپہر میں کچھ دیر شولاپور میں آرام کر کے اسی رات پونہ پہنچ گیا۔ پونہ میں دو تین دوستوں کو اطلاع دے دی تھی کہ رات وہیں ٹھہروں گا اتفاق سے ان میں ایک ڈاکٹر دیورے بھی تھے۔ سیدھا انہی کے یہاں پہنچا۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا تھا مگر میری حیرت اور رنج کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر دیورے کا چند ماہ قبل ہی ریل کے ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔ اور ان کی بیوہ اور لڑکے نے از راہ مسافر نوازی قیام کا انتظام کیا اور میرے انتظار میں ہیں۔ ہمت نہ ہوئی کہ ان مغموم مگر مہمان نواز لوگوں کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کے یہاں جا ملوں۔ رات اسی رنج میں گزاری اور اپنی لاعلمی پر بڑا افسوس رہا کہ میں اس حادثے سے واقف نہ ہو سکا اور ان مغموم لوگوں کو زحمت اٹھانی پڑی۔

۱۲ر مئی کی صبح میں پونا سے نکل کر ناسک کے راستے سے مالے گاؤں پہنچ کر دوپہر کو آرام لینے کا ارادہ تھا مگر وہاں معلوم ہوا کہ ہیضہ پھیلا ہوا ہے اور ڈاک بنگلہ میں مسافروں کو قیام کی اجازت نہیں ہے اس لیے مجبوراً سفر جاری رکھنا پڑا۔ اور ۱۳ میل آگے جا کر ایک غیر آباد اور بے آب و گیاہ بنگلے میں کچھ دیر ٹھیرنا پڑا۔ شدت کی گرمی تھی دوپہر بڑی کرب و بے چینی میں گزری۔ ۵ بجے وہاں سے نکلے مگر دھوپ اور گرمی کی شدت نے بہت بے تاب رکھا آخر کار دھولیا کے ڈاک بنگلے میں پہنچ کر آرام سے رات گزاری۔

۱۳ر مئی کی صبح میں ناشتے اور چائے سے فارغ ہو کر پھر نکل کھڑے ہوئے اور گرمی کی شدت برداشت کرتے ہوئے ڈیڑھ بجے

اندور پہنچ گئے۔ راستہ میں موٹر کے ہارن اور سلف نے کچھ ستانا شروع کیا تھا۔ کچھ اس کو درست کرایا اور کچھ آرام لیا بعض دوستوں نے منع کیا تھا کہ اندور سے آگے شام کے چھ بجے سفر نہ کریں۔ راستہ خطرناک ہے اور کچھ عرصے سے ڈاکو بھی لوٹ مار کر رہے ہیں۔ مگر عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اسی راستہ سے رات کے وقت گزرنا پڑا۔ بڑی ہیبت میں راستہ کٹا۔ جس جگہ ٹھہرنا چاہتے تھے وہاں پہلے ہی سے مسافر بھرے ہوئے تھے۔ رات کے ۸ بجے شاجاپور کے بنگلے میں پہنچے مگر وہاں کے چوکیدار نے ڈھارس بندھائی کہ گونہ چلے جائیے وہاں رات میں آرام ملے گا۔ مگر گونہ پہنچنے میں کافی دیر ہوگئی۔ راستے میں بہت سے شکاری جانور چیتل۔ خرگوش۔ بارہ سنگھے اور لومڑیاں نظر آئیں آخر کار رات کے دو بجے ڈاک بنگلہ پہنچے اور دو گھنٹے آرام لے کر صبح ۴ بجے نکلے اور شیر پوری کے بنگلے میں پہنچ کر ناشتہ کیا اور چائے پی پھر آگرہ کے لیے نکلے آگرہ پہنچنے میں ابھی بیس (۲۰) میل باقی تھے کہ موٹر کا سائلنسر ٹوٹ کر گر پڑا۔ اس کو رسی سے باندھ کر آگرہ پہنچے کے بعد درست کرالیا گیا۔ اور ساڑھے پانچ بجے آگرہ سے دلی کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد آندھی اور گرد و غبار کے طوفان نے گھیر لیا موٹر کی رفتار سست کرنی پڑی جس کی وجہ سے دلی ۱۴ مئی کی رات دیر گئے پہنچے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ان کے گھر کے لوگ ہمارا انتظار کر کے سو چکے تھے۔ انھوں نے ہماری بڑی مہمان نوازی کی اور بڑا آرام پہنچایا۔ دلی میں دو روز ٹھہر کر موٹر کی صفائی کرالی گئی اور سلف بھی درست کرالیا گیا اور ۱۷ مئی کو صبح ۶ بجے دلی سے نکلے۔ شام کے پانچ بجے لدھیانہ پہنچے یہاں کا ڈاک بنگلہ بڑا عالیشان اور آرام دہ ہے۔ باوجود گرمی کے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ رات میں جالندھر میں قیام کیا۔ دوسرے دن موٹر کی وہیں سروسینگ کرائی اور ۱۹ مئی کو پٹھان کوٹ ہوتے ہوئے رات میں جموں پہنچ گئے۔ دلی سے پٹھان کوٹ تک تمام راستہ بارونق اور آبادہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگل میں منگل منایا جارہا ہے۔

رات جموں میں بسر کی۔ دلی میں سلف اسٹارٹر درست کیا تھا مگر جموں آنے تک وہ پھر خراب ہوگیا۔ صبح میں اس کو درست کرایا گیا اور اس کام میں اتنی دیر ہوگئی کہ سری نگر جانے والی بسوں کا قافلہ روانہ ہوگیا۔ آخر کار درست ہوکر آیا تو ہماری موٹر کا نمبر ہی نکل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد سرسبز و شاداب پہاڑیاں شروع ہوئیں اور اس اتار چڑھاؤ میں پھر موٹر میں وہی خرابی پیدا ہوئی۔ مگر ہم آگے بڑھتے ہی گئے اور رات دیر گئے باناہال کے ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ وہاں سب کمرے پہلے ہی سے معمور ہو چکے تھے۔ دو کشمیری نوجوانوں نے اپنی قیام گاہ میں سہارا دیا اور رات اُن کے کمرے میں بڑی تکلیف میں گزری۔ نہایت سخت سردی تھی۔ اتنی سردی میں نے لندن اور پیرس کے بعد پہلی دفعہ محسوس کی۔ بچے بھی کانپ رہے تھے۔ بہرصورت دن بھر کے تھکے ماندوں کو تھوڑا بہت آرام ہی غنیمت معلوم ہوا۔ صبح بہت جلد اُٹھ کر سری نگر جانے والے قافلہ میں شریک ہونا تھا۔ ہمارے میزبانوں نے ناشتہ کا عمدہ انتظام کیا تھا اور جلد ہی بیدار کر دیا تھا۔ پھر بھی قافلہ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ ہم بھی ٹنل کا راستہ بند ہونے سے کچھ پہلے ہی چوکی پر پہنچ گئے۔ جموں سے سری نگر آنے جانے کے لیے یک طرفہ ٹریفک کا انتظام ہے جس کی وجہ سے بڑی سہولت ہے۔ ورنہ حادثوں کا ہونا ضروری ہے اور گھاٹیوں اور موڑوں پر موٹروں کا ٹکرا جانا لازمی ہے۔ راستہ بہت تنگ ہے غریب کشمیری مزدور رات دن اس کی توسیع اور صفائی میں مصروف ہیں مگر آئے دن پتھر لڑھک کر اور مٹی پھسل کر راستہ کو مخدوش بنائے رہتی ہے۔ تاہم تمام راستہ پر مزدوروں کی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر وقت بچے جوان بوڑھے مرد اور عورتیں سب لوگ کام کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ راستہ عجیب خطرات کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب مناظر سے معمور ہے۔ جن کی نیرنگیاں تحریر یا تقریر میں محصور نہیں ہوسکتیں۔ سری نگر سے بہت پہلے ہی پہاڑی راستہ ختم ہوگیا اور ہم اب وادی کشمیر میں تھے۔ ۲۰ مئی کو دس بجے سری نگر ٹورسٹ سنٹر پر پہنچے اور اپنی قیام گاہ کی بابت دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ڈیرے میں بھی انتظام ہے اور ہمان گاہ میں بھی۔ ہم نے سردی کے اندیشے سے ڈیرے

کا قیام پسند نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈیرے زیادہ آرام دہ ثابت ہوئے ہیں۔

ہمارے پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد آزاد سمینار کے رضاکار آئے اور ہمارے آرام کے بارے میں ہر طرح کا انتظام کیا۔ ان سے پتہ چلا کہ سمینار صبح دس بجے سے شروع ہو چکا ہے اور دوسرے ہی دن میری تقریر ہوگی۔ ٹورسٹ سنٹر میں کسی نے اس تقریب کے وقت اور مقام کی اطلاع نہیں دی تھی۔ ورنہ میں بھی اس افتتاحی اجلاس میں شریک ہو سکتا تھا۔

ان تمام تقریبات کے روح رواں اردو کے مشہور شاعر اور ادیب علی جواد زیدی تھے جو سری نگر میں اس وقت حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے افسر تھے اور اب وزیر اعظم کشمیر کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں۔ زیدی صاحب انتہا سے زیادہ مصروف تھے مگر ہر مہمان کی شگفتہ انداز میں خاطر تواضع کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں بیچ تو یہ ہے سری نگر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے ہمارے آرام اور رہنمائی وغیرہ کے لیے ضروری انتظامات کئے۔ شام میں ہم نے نمائش دیکھی جس کا افتتاح غالباً اسی روز ہوا تھا۔ اس نمائش کے اکثر اسٹال بہت ہی رنگا رنگ تھے اور چہل پہل بھی اچھی خاصی تھی۔

دوسرے روز صبح میں دس بجے آزاد سمینار میں میری ہی تقریر تھی وہاں پہنچا تو ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب بھی ملے معلوم ہوا کہ وہ کسی اور صاحب کی تقریر کی صدارت کے خیال سے آئے تھے۔ اور وہ صاحب ابھی کشمیر نہیں پہنچے تھے۔ علی جواد زیدی صاحب اور گوپال ریڈی صاحب نے حاضرین سے میرا تعارف جن الفاظ میں فرمایا ان کو سن کر میں بڑا نادم ہوا۔ اور میری تقریر کے بعد تو تعریف و قدر افزائی انتہا پر پہنچا دی گئی۔ ڈاکٹر ریڈی صاحب نے چلتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شام میں کشمیر کے چیف جسٹس صاحب کے یہاں عصرانہ میں آپ کو لے جانے کے لیے آؤں گا۔ منتظر رہئے۔ واپسی میں ان کی بیوی میری قیام گاہ پر میرے ساتھیوں سے ملنے آئیں۔ اور ہمارے لیے گلاب کے بہت بڑے بڑے پھول بھی لیتی آئیں۔ جب ڈاکٹر ریڈی صاحب کو معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ کافی گرم بستر نہیں ہیں تو اپنی قیام گاہ پر جا کر اپنے کئی گرم کمبل روانہ کئے۔ اس طرح کئی روز تک کشمیر کی سرد راتوں کا مقابلہ کرنا ہمارے لیے آسان ہو گیا۔

آزاد سمینار کے جلسے چھ دن تک صبح میں ہوتے رہے۔ اور ان میں شرکت کے بعد ہم ہر روز شام میں سری نگر کے اطراف واکناف کے مشہور اور دلکش مقامات کی سیر کرتے رہے۔ جھیل ڈل کا نظارہ سب سے زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اس میں جو رنگا رنگ شکارے چلتے رہتے ہیں ان کی وجہ سے دن میں اور رات میں نہرو پارک اور اطراف واکناف کی روشنی کے باعث عجیب رنگین اور رومانی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز چشمۂ شاہی دیکھا ایک روز شالیمار باغ اور ایک روز نشاط باغ۔ باقی کے اوقات کشمیر کے بازاروں اور گلیوں کی سیر و سیاحت میں بسر ہوئے۔ چونکہ اپنی موٹر کار ساتھ تھی اس لیے سواری کے انتظار یا انتظام کی مجبوری نہیں تھی۔ جب جی چاہا نکل پڑتے اور جتنی دیر چاہتے باہر رہتے۔

یوں تو حکومت کشمیر نے مہمانوں کی سیر و سیاحت اور تفریح کے سارے انتظامات اچھے پیمانے پر کر رکھے تھے لیکن ذاتی سواری کا آرام ہی اور ہوتا ہے۔ کشمیر کے عہدہ دار جہاں کہیں ملتے اس بات پر مسرور دکھائی دیتے کہ ہم اپنی موٹر میں آئے ہیں۔ اور ان میں سے جو لوگ ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کسی نہ کسی وقت آ چکے ہیں وہ تو بہت تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے کہ ہم حیدرآباد سے سری نگر تک موٹر میں آئے ہیں۔ اور بخیر و خوبی پہنچ گئے ہیں۔

ایک روز بخشی غلام محمد صاحب نے تمام مہمانوں کو عصرانہ دیا اس میں صدر ریاست کرن سنگھ جی اور شریمتی وجے لکشمی پنڈت بھی شریک تھیں۔ پہلے کے بعد مختلف تقریبات میں حصہ لینے والوں کو تمغے عنایت کئے گئے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شعرا کے

تمغے دینے کا نمبر آیا تو میرا نام پکارا گیا اور مجھے شاعروں کے سب تمغے دے دینے گئے تاکہ بعد میں ان کو تقسیم کر دوں۔

اب آزاد سیمینار ختم ہو چکا تھا مگر کشمیر کا جشن بہار ابھی جاری تھا اور پہلی جون کو اس کا مشاعرہ ہونے والا تھا میں نے بخشی صاحب سے واپسی کی اجازت مانگی تو انھوں نے فرمایا کہ جشن پہلگام میں آیئے وہاں باتیں ہوں گی غرض پہلگام اور گل مرگ اور دیگر دلکش مقامات کی سیر و سیاحت بھی بہت دلچسپ رہی۔ مگر گل مرگ میں موسم کی خرابی کی وجہ سے بڑی بدمزگی رہی اور بارش میں ہم سب شرابور ہو کر قیام گاہ واپس ہوئے۔ حسرت ہی رہ گئی ٹن مرگ نہ جا سکے جو گل مرگ سے آگے ہے اور برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ یوں تو برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہماری قیام گاہ ہی سے نظر آتی تھیں اور ان کے نیچے ہر وقت ابر کے ٹکڑے آوارہ گردی کرتے دکھائی دیتے تھے مگر برف پر چلنے اور برفستان میں سے گزرنے کی مجھوں کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پہلی جون کو مشاعرہ کی صدارت کرنے کے بعد رات دیر میں سوئے اور صبح اُٹھ کر تیار ہونے میں بھی کافی دیر ہو گئی اس لیے سری نگر سے بارہ بجے کے قریب نکلے اور تمام پہاڑیوں کے چکر کاٹتے اور نشیب و فراز سے گزرتے اور بل کھاتی ہوئی جہلم کا مختلف زاویوں سے نظارہ کرتے رہنے کے بعد اسی رات میں جموں پہنچ گئے۔ اب پھر گرم موسم اور اس کی شدتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جموں سے صبح میں نکل کر ۱۲ بجے تک پٹھان کوٹ پہنچے۔ اور رات میں دیر گئے لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں پہنچ کر دم لیا۔ دوسرے روز صبح ۱۰ بجے ہم نئی دہلی میں ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب کے بنگلے میں تھے۔ ان کی بیوی نے ہمارے آرام و آسائش کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

ہم کو معلوم تھا کہ، جون کو مانسون شروع ہو جاتا ہے اس لیے چاہتے تھے کہ جلد سے جلد حیدر آباد واپس ہوں مگر دلی کی مہمان نوازی نے ۵ جون سے پہلے نکلنے کا موقعہ نہ دیا۔

آگرہ اور گوالیار میں واپسی کے وقت اور بھی سخت گرمی سے سابقہ پڑا۔ جون کو راستہ ہی میں سخت بادل اور گرج کا سامنا رہا۔ ہم دھولپور کے ڈاک بنگلہ کی گیٹ میں داخل ہی ہوئے تھے کہ طوفانی بارش شروع ہوئی اور موٹر کے اوپر جو کچھ سامان اور بچھونا بندھا ہوا تھا اوپر سے نیچے اُتارتے تک بہت کچھ بھیگ گیا۔

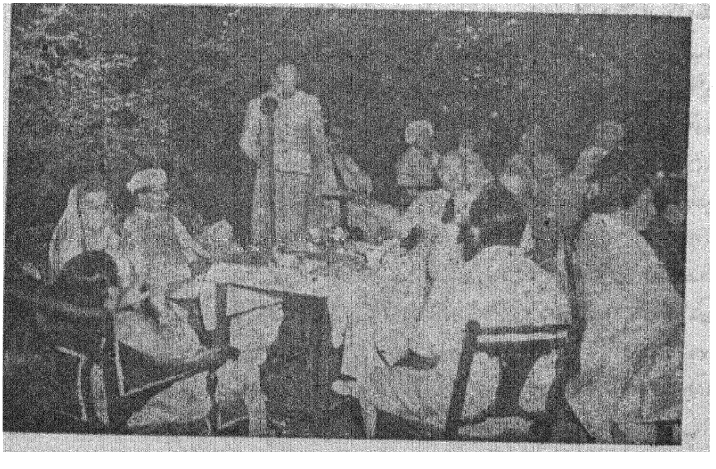
دوسری رات دھولیا کے ڈاک بنگلے میں گزاری اور تیسری بمبئی میں۔ بمبئی سے ۱۰ جون کو ۸ بجے نکلے اور اسی روز رات کے بارہ بجے اپنے گھر میں واپس آ کر دم لیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

بقیہ سلسلہ (۲۹۶)

میں نے محسوس کیا کہ وہ جتنے نرم ہیں اتنے ہی گرم بھی ہیں۔ لیکن ان کی گرمی میں بھی ایک آن ہوتی ہے اور بہت جلد ان کی نرمی ان کی گرمی پر قابض ہو جاتی ہے۔

ادارۂ ادبیات اُردو اور ہندی پرچار سبھا کی کمیٹیوں میں بھی میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور یہاں میں نے ان کی علمی شان اور اصولی آن کو زیادہ جلوہ گر پایا۔ اُصول اور راست گوئی کے معاملے میں وہ بڑے بے باک ہیں اور یہ بے باکی صرف کمیٹی کے ختم تک باقی رہتی ہے۔ پھر وہ زندہ دل اور یار باش آدمی باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ اب حیدر آباد کی اعلیٰ علمی زندگی کے ایک سوداؔ بن گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شہر میں ہندی کے جھنڈے کو بلند و بالا رکھنے اور اس کی جڑوں کو استوار کرنے میں جتنا پنڈت وفنی جی کا حصہ ہے شاید ہی کسی اور کا ہو۔ حیدر آباد کی حد تک اگر ان کو بابائے ہندی کہا جائے تو میرے خیال میں غلط نہ ہوگا۔

ڈاکٹر زور کے خطبات



خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جبل پور

۱۴ اپریل ۱۹۴۳ء

معزز حاضرینا ـــــ

صدارت شعبۂ تصنیف و تالیف اردو کے فرائض سپرد کرکے ارباب کانفرنس نے مجھ کو جو عزت بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا سہل ہے لیکن ان فرائض کی بجا آوری آسان نہیں ہے جو اس سلسلہ میں مجھ پر عاید کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ دنیائے اردو کے مسائل گذشتہ ربع صدی میں اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کا سلجھانا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اور ملک کے سیاسی اور اردو بولنے والوں کے ذہنی رجحانات کچھ ایسے ناخوشگوار اور بھیانک ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کو سنوارنے اور سلجھانے کی جتنی کوششیں کیجاتی ہیں اتنی ہی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کے اسباب یوں تو کئی ہیں لیکن بڑے سبب صرف دو ہیں۔

(۱) اردو بولنے والوں کی غفلت و سہل انگاری۔ (۲) ناخدایان اردو کی خود غرضی و غلط راہروی۔

یہ دونوں اسباب ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ ان کو صحیح معنوں میں دو سمجھنا ہی نہ چاہئے۔ یہ اصل میں ایک ہی ہیں کیونکہ جو لوگ اپنی زبان اور ادب سے غفلت برتتے ہیں وہ ہرگز توقع نہیں رکھ سکتے کہ ان میں سے غرض شناس، بے لوث اور مخلص خادم زبان و ادب پیدا ہو گئے ہیں گے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ مخلص و ایثار اور صحیح نقطۂ نظر لیکر اٹھے گا بھی تو وہ لوگ اس کو پنپنے نہ دیں گے جو محض اپنی غفلت و اقتدار کے غلام رہنماؤں کی خاطر زبان و ادب کے رہنما اور قائد بن بیٹھے ہیں۔ اور ان کی غافل قوم کی آنکھیں ان کی سیاست و اقتدار کی جلوہ گری سے چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ جب تک آفتابی قوتیں شل رہیں گی صحیح رہنمائی ممکن نہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ ٹیک نیت رہنما بھی رفتہ رفتہ رہزن بن جائیں۔

اس لئے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ اردو بولنے والوں میں اپنی زبان اور ادب کی سچی محبت کا احساس پیدا ہو۔ اور وہ واقعی محسوس کریں کہ زبان اور ادب کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بننے یا بگڑنے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ جب یہ احساس پیدا نہ ہوگا نہ زبان ترقی کر سکے گی اور نہ اس کے بولنے والے۔ اور اس احساس کی صحت مند نشوونما دوسری زبانوں سے نفرت پیدا کرانے یا دوسری زبان کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک تعمیری طریقہ ہے اور اگر پیہم تخریبی کام بامعموم جوش و جذبہ کے تحت بہ آسانی کرائے جا سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے قیادت اور رہنمائی کا مرتبہ بھی بہ آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ ایسی قیادت دیرپا ہوتی ہے اور نہ ایسے کام مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے ہمسائے کے باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز و شاداب ہیں اور آپ کے باغ میں پھاوڑے اور پھاوڑوں اور کدالوں کی

کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسایہ کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں اور روشوں پر پتھر پھینکیں بلکہ آپ کا باغ اسی قسم ہمسایہ کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جبکہ آپ اس کے لئے ویسی ہی مشقت و محنت کریں جیسی کہ وہ اپنے باغ کے لئے کرتا ہے۔ پس اردو کو پنپنے سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا پنجابی زبانوں کی مخالفت اور ان کی آبیاری کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان ہی ذریعوں اور طریقوں کو سمجھیں اور سیکھیں جن سے یہ زبانیں بار آور ہو رہی ہیں۔

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے اس کے بعض ہی خواہ تعمیری کی بجائے تخریبی اسالیب کار اختیار کر رہے ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا اور اندیشہ ہے کہ اگر ہم اسی ذہنیت کے ساتھ شغوفانہ عامل کرتے رہیں تو ہماری زبان اور ادب کی وہ مقبولیت بہت جلد ختم ہو جائے گی جو ہمارے مسلم کلاسیکی فیوں اور زندہ دل شاعروں اور آزاد منش ادیبوں کی وجہ سے ہندوستان کے اس وسیع براعظم کے دور دراز کے خطوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اردو بولنے اور سمجھنے والے کشمیر سے لنکا تک اور بلوچستان سے آسام تک محض اسی لئے اب بھی مل جاتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے تسلط جو یا نہ ملک اختیار کیا اور کبھی کسی مقامی یا دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ اس زبان کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبان تخت و تاج تھے اور ہر طرح کا سیاسی و سماجی اقتدار رکھتے تھے۔

عہد حاضر میں جبکہ ہر طرف انفرادی و اجتماعی آزادی کے چرچے ہیں اگر اردو کے مصنفین و مولفین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں گے جو ماضی دیرینہ روایات کے خلاف ہے اور جس پر اپنے حاکمانہ اقتدار کے زمانہ میں بھی انگریب اردو نے عمل نہیں کیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا نتیجہ اردو کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ اور اہل اردو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے مذموم ہو جائیں گے۔ اگر ہم میں سے بعض ایسے ہیں جو اب اردو کے نام یا اس کے رسم الخط کو پسند نہیں کرتے تو ہم انھیں کیونکر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اس کو پسند کریں؟ اور اگر ایسے لوگ خود اردو سے برگشتہ ہو کر دوسری کو بھی اس سے برگشتہ کرانا چاہتے ہیں تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اخباروں یا رسالوں میں چند حقارت آمیز یا مخالفانہ مضامین لکھ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اپنی زبان کی بڑی خدمت کی اور مخالفوں کے خلاف اہل اردو میں نفرت پیدا کر کے کوئی خاص کامیابی حاصل کی۔

ایسے وقت میں سچے اور مخلص ہمدردان اردو کا اصلی کام تو یہ ہے کہ ان لاکھوں اردو بولنے والوں کو صحیح معنوں میں اردو داں بنانے کی کوشش کریں جو اردو کی غفلت شعاری اور دوسروں کی دانائی کی بنا پر بہت جلد اردو دنیا سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ تقریباً ہر صوبہ میں ایسے لاکھوں غریب اور پریشان حال موجود ہیں جو پڑھنے لکھنے کی دولت سے محروم ہیں اگر اہل اردو چاہتے ہیں کہ ان کی زبان بولنے والوں کی تعداد میں مستقبل قریب میں معتد بہ کمی نہ ہونے پائے تو ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کریں۔ اگر ہندی کے بہی خواہ ان پڑھوں کو ہندی رسم الخط میں پڑھنا لکھنا سکھا کر اپنی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں تو وہ نہ صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی شہری آفاقی، خواندگی کو دور کرنے کی سعی کر کے اپنے ملک کے سچے محسنوں کی صف میں بھی شامل ہو رہے ہیں۔

تعلیم بالغان کی مہم بجائے خود جو اہمیت رکھتی ہے اس کی نسبت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا ضرور جی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے ہم دوگونہ فوائد حاصل کریں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کر کے ہم جہالت کی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دور کر سکیں گے جو ہمارے ملک پر چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔ اور جن کی تاریکی میں ہمارے کروڑوں بھائی بھلے اور برے، سچ اور جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کر سکتے اور اسی وجہ سے وہ آسانی سے ایسے غلط بیانات باور کر سکتے ہیں کہ اردو قرآن شریف کی زبان ہے اور اس کو مسلمان حملہ آور اپنی گھوڑے کی ٹاپ پر ہے ہندوستان میں لے آئے ہیں۔

تعلیم بالغان کا دوسرا فائدہ پہلے فائدہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری [illegible] ساتھ خود اردو بھی ترقی کرتی جائے گی۔

ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری زبان کی بقا اور اشاعت کے سلسلہ میں فی الوقت تعلیم بالغان کو جو اہمیت حاصل ہے اتنی کسی اور مسئلہ کو حاصل نہیں۔ ان پڑھ لوگوں کو اس وقت جس زبان میں بھی پڑھنا لکھنا سکھایا جائے گا ان کی اولاد بھی وہی زبان اختیار کرے گی۔ خاص کر صوبۂ متحدہ اور صوبۂ متوسط اور ان کے اطراف واکناف کے اکثر علاقوں کے باشندے ایسی زبان یا بولیاں بولتے ہیں جو محض رسم الخط سیکھنے کے بعد یا قوار دو بن جاتی ہیں یا ہندی۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کوشش انہی مقامات پر تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ہونی ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہی علاقوں میں اردو کی تعلیم بالغان سے غفلت برتی جارہی ہے اور ہمدردی اردو کے سارے مظاہرے محض نمود و نمائش اور مجلس آرائی کی حد تک آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اردو کی محبت کے دعویٰ دار ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی اور سماجی بہبودی کے بھی خواہش مند ہیں انھیں چاہیئے کہ اپنے اپنے قریوں، محلوں، گلیوں اور بازاروں میں تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کھولیں اور متحدہ طور پر سعی کریں کہ ان کے گاؤں یا محلے یا گلی میں کوئی شخص ایسا نہ رہے کہ جس کو اردو پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو۔ اور اگر متحد ہو کر کام کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو (جس کا امکان زیادہ ہے) تو ہر شخص انفرادی طور پر کوشش کرے کہ وہ سال بھر میں کم از کم ایک مرد یا عورت کو پڑھنا لکھنا سکھا کر چھوڑے گا۔ اردو کے ہر پڑھے لکھے آدمی کا یہ ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی بجا آوری کے بغیر اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔

یہ کام مشکل بھی نہیں ہے اور اس کے لئے نہ کسی انجمن کی ضرورت ہے نہ چندوں کی اور نہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری طبیعتیں ایسے ہی کاموں میں لگتی ہیں جن میں انجمن آرائی ہو یا ہنگامہ پروری۔ ہم خاموش اور مخلص کام کے ابھی عادی نہیں ہوئے ہیں اسی لئے جو لوگ خاموشی اور خلوص و ایثار کے ساتھ اپنی زبان کی ترقی اور اشاعت کر رہے ہیں وہ برق فتاری کے ساتھ ہم سے آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہم میں مولوی محمد سجاد و مرزا صاحب جیسے ماہرین تعلیم موجود ہیں جنھوں نے تجربوں اور معلومات کے بعد تعلیم بالغان کی آسان کتابیں اپنی ذاتی نگرانی میں مرتب کرائی ہیں اور جن کی عملی تجربوں کی خاطر ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی تعلیم بالغان کی مہم میں استعمال کر کے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان کے ہر علاقہ میں ان پڑھوں کو بہت جلد پڑھا لکھا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تجربے نہ صرف حیدرآباد بلکہ میسور اور جوناگڑھ کی ریاستوں اور بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں بھی روشناس ہو چکے اور تعلیم بالغان کے لئے مفید اور مقبول سمجھی جارہی ہیں۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ان کے ذریعہ سے کسی ان پڑھ آدمی کو اردو نوشت و خواند سے واقف کرا سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں ادارۂ ادبیات اردو نے اس نصاب کو روشناس کیا۔ جیوں ان پڑھ لوگ پڑھے لکھے بن گئے۔ اور اور اسے کے اردو امتحانات میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ اور اسی کی تعلیم بالغان کی مہم اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ ۱۹۳۷ء میں ریاست حیدرآباد کے تقریباً دو ہزار ان پڑھوں نے اس کے امتحان اردو دانی میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ اور اس امتحان کے مرکز ریاست حیدرآباد کے باہر بھی مقرر کرنے پڑے چنانچہ گذشتہ سال بمبئی جیسا بڑا شہر بھی ایک مرکز تھا۔

غرض اس تجربہ سے ثابت ہوا کہ اردو میں تعلیم بالغان کا کام بہت آسانی سے انجام پا سکتا ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے بسنے والے اگر توجہ کریں تو نہ صرف اپنے علاقہ سے ناخواندگی کی وبا کو دور کر سکتے ہیں بلکہ اہل اردو کی تعداد میں اضافے کا باعث اور اپنی زبان کے استحکام و اشاعت کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

اردو کی تقویت اور استحکام کا ایک دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اہل اردو مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ مطالعہ کے گوناگوں فوائد سے کیوں تو کسی کو انکار نہ ہوگا۔ لیکن جدید عناصر میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے یہ ایک زبردست اثر اور مفید تر حربہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی غیبی طاقت ہر اردو پڑھے لکھے مرد یا عورت کو اس اصلی التزام پر مجبور کرے کہ وہ روزانہ تھوڑی دیر (اس پانچ منٹ سے)

کسی نہ کسی کتاب یا اخبار کا کچھ حصہ پڑھ لیا کرے تو اور وہ تصنیف و تالیف کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر کس و ناکس سے ایک ایسے التزام کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے ایک ایسے انقلاب کی امید رکھنا بھی فضول ہے۔ البتہ سمجھ بوجھ رکھنے والے جملہ ہی خواہان اردو کو کوشش کرنی چاہیئے کہ خود ہی اس امر کا التزام کریں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس ذوق کو پھیلائیں۔ وہ دن اردو ادب کیلئے بڑا مبارک دن ہوگا جب اردو بولنے والوں کے ہر محلہ اور ہر گلی میں ایک کتب خانہ یا دار المطالعہ موجود رہے گا۔ لیکن ایک ایسا یوم عید اس وقت تک نہ آئے گا جب تک کہ اردو بولنے والوں میں اتحاد اور صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا نہ ہوگا اور انکی معاشی پستی دور نہ ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ حالات کے تحت ہر گلی میں ایک باضابطہ دار المطالعہ قائم نہ ہو سکے۔ ایسی حالت میں ایک نئی صورت یہ اختیار کی جا سکتی ہے کہ اپنے محلہ یا گلی کے کسی ایک گھر کو منتخب کر کے اس میں دو چار اخبار اور رسالے اور چند کتابیں مطالعہ کے لئے جمع کر لی جائیں اور فرصت کے اوقات میں پڑھے لکھے لوگ بلایا کریں۔ مسجدوں اور معبدوں سے بھی یہ کام بڑی خوبی سے لیا جا سکتا ہے۔

بہر حال جہاں اور جس طرح بن پڑے دار المطالعے قائم کئے جائیں اور پڑھے لکھے لوگ اپنی زبان کے ادب سے استفادہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں ایک طرف اردو ادب کا ذوق عام ہوگا دوسری طرف اردو کے اخبار، رسالے، اور تصنیفات و تالیفات زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپیں گی اور ان کے مضمون، مرتبوں اور ناشروں کی ہمت افزائی اور امداد ہوگی۔ جو اصحاب اردو اخبارات و رسائل کی کمی، کتب کی بے رونقی اور گھٹیا معیار کی شکایت کرتے ہیں وہ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس کا سبب وہ خود ہیں۔ جب تک اردو کی مطبوعات زیادہ تعداد میں صرف نہ ہونگی تب تک انکے مضمون اور ناشروں کو انہیں بہتر بنانے اور چھاپنے کی ہمت ہوگی اور نہ انکی قیمتیں کم ہو سکیں گی۔ طلب اور رسد کا یہ ایک ایسا مڑا مسئلہ ہے جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔ کتنے رنج کا مقام ہے کہ جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد فخر و مباہات کے ساتھ آٹھ دس کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے اس کا کوئی اخبار یا رسالہ پانچ ہزار سے زیادہ تعداد میں نہیں چھپ سکتا۔ اور اس کی کسی مفید سے مفید کتاب کے بھی ہزار دو ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہوتے نہیں پاتے۔ اہل اردو کے لئے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ اس کے اکثر رسالوں کے مدیر اپنے مضمون نگاروں کو کوئی معاوضہ نہیں دے سکتے۔ معاوضہ دینا تو درکنار اکثر و بیشتر رسائل ایسے ہیں جو کاغذ و طباعت ہی کے اخراجات کو تو تے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں مضامین کے معیار میں اضافہ اور رسائل کی ترتیب و دیدہ زیبی میں ترقی کیونکر ممکن ہے۔ کسی زبان کی پستی اور اہل زبان کی بے دردی کی اس سے بڑھ کر مثال شاید ہی کہیں مل سکے ہم کو دوسری ہمسایہ زبانوں اور ان کے بہی خواہوں پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے جب کہ ہم خود اپنی زبان اور ادب سے غافل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری اس بے حسی اور کم شعوری سے جتنا نقصان پہنچ رہا ہے دوسروں کی معاندانہ سرگرمیوں سے کبھی نہیں پہنچ سکتا ایسے ہی مواقع کے لئے شاید کہا گیا تھا کہ از مارست کہ بر ماست۔

ہماری زبان کے ادیب اور شاعر اپنی ذہانت، محنت، اور فن کارانہ کمال میں بڑی سے بڑی اور مہذب ترین زبان کے ادیبوں اور شاعروں سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن جس زبان کے بولنے والے خواہ امیر ہوں کہ غریب، بلکہ غریبوں سے زیادہ امیر قدر دانی کے فن سے عاری اور ادبی ذوق سے بے بہرہ ہوں اس میں علم و فن اور شعر و ادب پروان چڑھے تو کیونکر۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صاحبان علم اردو کی جگہ انگریزی اور ہندی میں لکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ جب ہم میں سے اکثروں کی ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ ہم انگریزی زبان میں چھپی ہوئی تحریر کو زیادہ مستند اور دلچسپ سمجھتے ہیں تو پھر اردو میں کون لکھے گا۔ یہ ایک میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپتی ہے تو لوگ اس کے انگریزی نسخے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اردو نسخہ دوسری اردو کتابوں کی طرح برسوں طاق نسیاں میں دھرا رہتا ہے۔ بیچارے مصنف کو پھر کبھی کوئی کتاب اردو میں چھپوانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ فرض جب اپنے شاعروں اور ادیبوں کی خود ہم قدر نہ کریں گے تو دوسرے

ان کی طرف کیوں متوجہ ہوں اور پھر ہم کیوں توقع رکھیں کہ ترکی کے صحیفہ نگار سیاح، یا ایرانی ثقافتی وفد کے ارکان بنگالی کے شاعر ٹیگور کے مقابلہ میں اردو کے شاعر اقبال سے زیادہ واقف ہوں گے۔

اس لئے اردو کے تمام ہمدردوں کو تہیہ کر لینا چاہیئے کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ اردو کتب و رسائل کی خریدی کے لئے ہر مہینے لازمی طور پر خرچ کریں گے۔ اگر دس کروڑ سے زیادہ انسانوں میں بولی جانے والی زبان میں دس لاکھ آدمی بھی ایسے نہ نکل سکیں جو اپنی زبان کی کتابوں اور رسالوں کو پابندی اور شوق سے خریدتے ہوں اور دس بارہ صاحبان مقدرت ایسے پیدا نہ ہو سکیں جو اردو تصنیفات و تالیفات پر انعام و اکرام دینے اور اردو کے ارباب قلم کی شایان شان سرپرستی کرنے کا ارادہ نہ کر سکیں تو پھر کثرت تعداد پر فخر کرنے اور اپنی زبان کی فضیلت و وسعت جتانے سے کیا فائدہ؟ اہل اردو کو اس کا قلق ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ کچھ لوگ اردو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اصل غم تو اس کا ہے کہ جو لوگ اردو کو کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتے وہ اس زبان کا کوئی درد نہیں رکھتے۔ اگر ہم جانے والوں سے جگہ خالی کرنے کی جگہ رہنے والوں کو صحیح معنوں میں زندہ اور اردو ادب کا دلدادہ بنا دیں تو پھر ہم کو نہ انگریزی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہندی یا پنجابی سے۔

غرض جس طرح ان پڑھوں کے لئے تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز ہمارے اولیں فرائض میں داخل ہے اسی طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دارالمطالعوں کے قیام اور تبلیغ اردو ادب کے اشاعت کی بھی ایک علیحدہ مہم جاری کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ اور یہ دونوں کام ایسے بھی نہیں ہیں جو کسی بڑی تنظیم یا سرمایہ کے بغیر نہ چل سکیں گے۔ ہر بہی خواہ اردو بحالت مجبوری انفرادی طور پر ہی ان کو آسانی سے چلا سکتا ہے۔ اور اگر ان کی خاطر ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعی طور پر کام شروع ہو سکے تو اردو زبان کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی خیر و خاطر میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اردو تصنیف و تالیف کی ایک نمایاں یہ قسمتی جس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا یہ ہے کہ عوام کی بے حسی اور ناقدری کے ساتھ ساتھ بعض خاصان ادب میں بھی ایسی خرابیاں نمودار ہو گئی ہیں جو زبان کی ترقی اور ادب کے نشوونما کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہیں۔ جو مصنفین و مولفین بخت و اتفاق سے کسی مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے بھی اس درجہ تک پہنچنے کے اہل ثابت ہوں۔ جس طرح میں نے آج سے چار سال قبل فروری ۱۹۳۸ء میں جامعہ عثمانیہ کی اردو کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا "اب زمانہ بدل رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی طبقے بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان طبقے کے داروں کی ذہنیت کے بدلنے میں ابھی کچھ عرصہ درکار ہو۔ لیکن اردو کے جواں ہمت خدمت گذاروں کو بددل نہ ہونا چاہیئے۔ ان کے آگے وسیع میدان ہے۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ بوسیدہ مزاروں کے ان سجادہ نشینوں کے ظاہری یا باطنی فیوض کے بغیر ہی اپنی ذاتی کد و کاوش سے اپنے ویرانوں میں چراغاں کر سکتے ہیں۔"

ایک طرف پختہ مشق ادیبوں کی علمی ارادت اور سرمایہ داری کی ذہنیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف عدم احتساب اور اہل زبان کی کم شعوری کے باعث اردو کا ہر طفل مکتب خود کو ایک بڑا ادیب اور شاعر سمجھنے لگا ہے۔ گویا اردو ادب کی دنیا آج ایک ایسی لنکا بنی ہوئی ہے جس میں ہر شخص باون گز کا ہے۔ جس محفل میں نہ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال رہا اور نہ چھوٹوں کا بڑوں کا لحاظ تو اس کے بگڑنے اور اجڑنے کا انتظار ہی بیکار ہے۔

ایک اور عیب جس نے اس زبان کی تصنیف و تالیف کے راستہ میں شروع ہی سے کانٹے بو رکھے ہیں صوبہ جاتی تعصب ہے۔ اگرچہ تعصب خواہ وہ کسی قسم کا ہو معیوب ہے لیکن علمی و ادبی فضا میں تو وہ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو صرف دلی اور لکھنؤ والے ہی اس تفاخر میں مست تھے اور دوسرے صوبوں کی اردو کو اردو ہی نہیں ماننا چاہتے تھے۔ لیکن اب تو اکثر اردو بولنے والے علاقوں میں تعصب کا بازار گرم ہے۔ اور ہر جگہ روز بروز جتھا بندی بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ بعض صوبوں میں منظم پیش بندی کی جاتی

ہے کہ خواہ ذوق و انصاف کا خون ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے علاقے کے شاعر اور ادیب کے مقابلہ میں دوسرے مقام کے صاحبان کمال کو ترجیح نہ حاصل ہونے پائے۔ اس رجحان سے اردو کی ہمہ گیری کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ اور ایک ایسی بھیانک فضا چھا جائے گی جس میں کمالِ فن اور جمالِ ادب کے جلوے شاید ہی نمودار ہو سکیں۔ جو لوگ دوسروں سے بحث کرتے وقت دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو اہلِ ہند کی ایک مشترکہ میراث ہے اور اپنی اعلیٰ خصوصیات کے باعث ہندوستان کی عام زبان کہلانے کا حق اسی کو حاصل ہے انھیں چاہیئے کہ ذرا اپنے دامن کو بھی دیکھیں اور اپنے درونِ خانہ جھگڑوں کو جلد سے جلد محسوس کر کے صوبہ واری تعصبات کا قلع قمع کے ساتھ سدِ باب کریں۔

اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو زبان و ادب اردو کی تشکیل و ارتقاء میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر علاقوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اپنی زبان کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ہم پہنچاتا ہے۔ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے غزنوی سلطنت کے زمانہ میں اردو کا بیج بویا۔ جب دلی میں ترک غلاموں کی سلطنت قائم ہوئی تو علاقہ برج (یعنے آگرہ۔ گوالیار اور دلی) کی زبان اور تہذیب نے اسکی آبیاری کی۔ پھر گجرات کی مظفر شاہی اور دکن کی بہمنی (اور بعد کو انکی جانشین قطب شاہی و عادل شاہی) سلطنتوں نے پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کے اس پودے کی ایسی اچھی پرداخت کی کہ اس میں پھول اور پھل نکل آئے۔ اور احمد آباد، گولکنڈہ، اور بیجاپور اردو ادب کے ابتدائی گہوارے کہلائے۔

عہد اورنگ زیب تک شمالی ہند میں اردو صرف بازاروں اور لشکروں کی عام بول چال کی زبان رہی لیکن اورنگ آباد کے ایک زندہ دل شاعر ولی کی کرامت نے شاہجہان آباد کے شاعروں سے فارسی گوئی ترک کرا کے ان کو اردو کا گرویدہ بنا دیا۔ جب دلی والوں نے اس زبان کو ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس نے رفتہ رفتہ ایک ایسی معیاری زبان کی شکل اختیار کر لی کہ بعد کو خود گجرات اور دکن والے بھی اپنا قدیم اسلوب چھوڑ کر اسی کی تقلید پر مجبور ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب شعرائے دہلی اس معیاری زبان کو لیکر مشرقی ہندوستان میں پہنچے تو اودھ، بہار، اور بنگالہ کے صاحبانِ ذوق نے اپنی مقامی زبانوں کی جگہ اسی کو اپنی ادبیانہ قوتوں کے مظاہرے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اودھ اور بہار کی سرزمینوں سے اردو کے بڑے بڑے صاحبانِ کمال اٹھے۔ فیض آباد، لکھنؤ، پٹنہ، اور مرشد آباد اردو کے وہ مرکز ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر اردو ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ خاص کر اردو شاعری کا دامن وہاں کے شعرا نے ایسے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا جنکی شگفتگی ہمیشہ باقی رہے گی۔

برطانوی راج کے آغاز کے بعد جب ہندوستان کے علوم و فنون نے دستہ ثانیہ حاصل کی تو دوبارہ پنجاب اور دکن ہی نے گیسوئے اردو کے سنوارنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ پنجاب میں جدید اردو ادب نے جنم لیا اور آزاد اور حالی جیسے باکمالوں کے دماغ میں جدید شاعری اور جدید نثر کے سانچوں سے روشناس ہوئے۔ ساتھ ہی حیدرآباد میں پہلے نواب شمس الامراء کی اور بعد کو جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں اردو کا خزانہ مغربی علوم و فنون خاص کر سائنس کے مضامین سے مالا مال ہو گیا۔ اُدھر سرسید احمد خاں نے دلی اور پھر علی گڑھ میں ہماری زبان کو انگریزی کا ہم پلہ بنانے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کو ان کے صاحب کمال ساتھیوں نے اس خوبی سے نبھایا کہ اردو واقعی ایک مہذب زبان بن گئی اور اس کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں کیا جانے لگا۔

عہد حاضر میں بھی اردو زبان و ادب کی جو اجتماعی اور انفرادی خدمات انجام دی جا رہی ہیں وہ بھی کسی ایک خطۂ ملک تک محدود نہیں ہیں۔ یہ اردو کی ہمہ گیری کا ایک نمایاں ثبوت ہے کہ اس کے ارتقاء میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر صوبوں کے باشندے اب بھی اپنے اپنے طور پر سرگرم عمل ہیں۔ اور یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو ہندوستان کی کسی اور زبان کو خواہ وہ اردو کی حریفِ مقابل ہی کیوں نہ ہو نصیب نہیں ہو سکی اردو کی اجتماعی خدمات میں سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ اور اس کے دارالترجمہ کا ذکر ضروری ہے یہ جامعہ سلطان العلوم اعلیٰ حضرت اعلیٰحضرت

سانح کی مسیحا نفسی کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس نے ہماری زبان کے علم و فضل اور ہمارے فخر و مباہات میں چار چاند لگا دیئے۔ جامعہ عثمانیہ ایک ایسا آفتاب ہے جس کی ضو پاشیوں سے اردو کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس لئے میں اس جامعہ سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔

جامعہ عثمانیہ کے بعد انجمن ترقی اُردو ہماری زبان کی وہ واحد انجمن ہے جس کی طرف ہر خطۂ ملک کے اردو والوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ انجمن نہ صرف اپنی قدامت بلکہ اپنے وسائل کے لحاظ سے بھی اردو کی دوسری انجمنوں اور اداروں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس نے اردو شاعروں کے تذکرے اور مختلف فنون کی اصطلاحات اور لغت شائع کر کے اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ کل ہند اسلامی تعلیمی کانفرنس کے شعبۂ تصنیف و تالیف اردو کی حیثیت سے اس کا آغاز ہوا۔ اور اس کو علامہ شبلی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صدیقی۔ یار جنگ بہادر شروانی۔ مولوی عزیز مرزا۔ اور مولوی ڈاکٹر عبدالحق جیسے فاضل اور سرگرم عمل متعلم نصیب ہوئے۔ اگرچہ کانفرنس کے اس شعبہ نے بڑھ کر انجمن ترقی اردو کی ایک جداگانہ شکل اختیار کر لی لیکن بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اس کانفرنس نے اپنے اس شعبہ کو بھی برابر قائم رکھا۔ چنانچہ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے صاحب ذوق اس کے متعلم ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر صاحب موصوف ہی کی نگرانی میں علی گڈھ کی مشہور و قدیم انجمن اردوئے معلی بھی اب تک سرگرم عمل ہے۔ اور علی گڈھ کی وہ قدیم علمی و ادبی روایات بھی برقرار ہیں جن پر اردو دنیا جتنا فخر کرے کم ہے۔

اردو کی دوسری اجتماعی خدمات میں دارالمصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور مجلس مصنفین علی گڈھ خاکسار قابل ذکر ہیں۔ دارالمصنفین علامہ شبلی کی ایک صحیح یادگار ہے اور اس کے کارکن اسی مستحسن روش پر چلنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں جو اردو کے اس بڑے ادیب اور مورخ نے اختیار کی تھی۔ شبلی کے جانشینوں کو تاریخ و علوم اسلامی کا اچھا اور پختہ ذوق حاصل ہے لیکن شبلی کا وہ دلچسپ اسلوب بیان ان کو ورثہ میں نہ مل سکا جس کے باعث شبلی نہ صرف ایک اعلیٰ مورخ اور سوانح نگار ہیں بلکہ اردو کے ان چوٹی کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے اس زبان کو اپنے پرشوکت اور رنگین اسلوب بیان کی وجہ سے ایک ایسی ہمہ گیری بخشی کہ یہ زبان اب ہر خطۂ ملک کے لکھنے والوں کیلئے آسان بن گئی اس جماعت کے روح رواں مولانا سید سلیمان ندوی نے حال ہی میں حیات شبلی شائع کر کے مولانا حالی کی وہ فضیلت چھین لی جو ان کو حیات جاوید لکھنے کے بعد اردو ادب میں حاصل تھی۔

ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کی حکومت کی اس خواہش کی بنا پر قائم ہوئی تھی کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تصنیف و تالیف کا معقول کام ہو سکے۔ لیکن کچھ تو حکومتی اور سیاسی الجھنوں کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے کہ اس تنظیم کے پیچھے اردو کے کسی بڑے ادیب اور مخلص رہنما کا سہارا نہ تھا یہ اکیڈیمی ارباب اردو کی توقعات کے مطابق کامیاب ثابت نہ ہو سکی اگرچہ حکومت نے اس کے نباہی رسالے کی ادارت یکے بعد دیگرے کئی قابل اصحاب کے سپرد کی اور اس کی مجلس منتظمہ میں بعض لائق لوگوں کو بھی شریک رکھا پھر بھی تصنیف و تالیف کا جو کچھ کام ہوا ہے ایک حد تک غنیمت ہے اور توقع ہے کہ آئندہ اس سے بہتر کام ہو سکے گا۔

ادارۂ ادبیات اُردو بھی تقریباً اسی زمانہ میں قائم ہوا جس زمانہ میں ہندوستانی اکیڈیمی قائم ہوئی تھی۔ لیکن یہ ایک بالکل نجی ادارہ ہے اور اس کے بانیوں نے حکومت یا عوام کے آگے مدد کیلئے دست طلب دراز کئے بغیر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اور کٹھن سے کٹھن گھڑیوں میں بھی ہمت و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اسی لئے اس کی جانب سے ۱۸ ماہ نامے کے علاوہ اب تک سوا سو سے زیادہ تاریخی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ عرصے سے وہ ایک مخزن علوم و فنون یعنے اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب میں بھی مصروف ہے جس کی پہلی جلد چھپ رہی ہے۔ اس ادارے نے تعلیم بالغان کی جس مہم کا آغاز کیا اس کا ذکر اس سے قبل گذر چکا ہے۔

مصنفین

ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے جس چھوٹے پیمانہ پر خلوص اور خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا اسی طرح دو سال قبل علیگڈھ میں مجلسِ مصنفین نے اردو کی خدمت کا آغاز کیا ہے۔ اس کے لائق اور مخلص محمد مولوی الطاف علی صاحب بریلوی بی اے ہیں۔ جو اس مجلس کے ترجمان مجلۂ مصنف کے مدیر بھی ہیں۔ یہ رسالہ ادب و تاریخ کے ان بلند پایہ مقالوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اس مجلس کے جلسوں میں ہر ماہ پڑھے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ مجلس خلوص اور صحیح ذوق کے تحت کام کر رہی ہے اس لئے یقین ہے کہ اردو ادب کی اجتماعی خدمات کی تاریخ میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ مخصوص کر لے گی۔

دہلی میں بھی ایک اُردو مجلس خواجہ محمد شفیع صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر قائم ہوئی ہے جس کے اجلاس ہر مہینے منعقد ہوتے ہیں۔ اور اس میں بھی اچھے مضامین اور نظمیں سنائی جاتی ہیں لیکن اس مجلس کی جانب سے کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ گذشتہ دو تین ماہ سے حیدرآباد میں بھی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ایک ایسی ہی مجلس کا افتتاح کیا ہے۔ اگر یہ مجلسیں یوں ہی خوش اسلوبی سے منعقد ہوتی رہیں اور اربابِ ذوق اسی طرح ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہیں تو یقین ہے کہ اردو ادب کا اچھا ذوق پھیل سکے گا اور لوگوں میں اپنی زبان اور ادب کے مختلف مسائل سے دلچسپی پیدا ہو کر وہ مقصد دور ہو سکے گی جس کی خرابیوں کی تفصیل اس سے قبل بیان ہو چکی ہے۔

اجتماعی کوششوں کے سلسلہ میں سب سے آخر میں ترقی پسند مصنفین کی جماعت کا ذکر ضروری ہے۔ اس جماعت کے افراد میں جو باغیانہ ذہنیت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے۔ وہ دراصل ردِ عمل ہے عام اردو دانوں کے اس جمود و غفلت اور خاصانِ اردو کی اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کا جس کا تفصیلی تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ دنیائے اردو میں گذشتہ ربع صدی کے اندر جو ایسی گن فصلیں پیدا ہو گئی تھی میری نظر میں اس کا نظری اقتضا یہی تھا کہ ایک ایسی جماعت پیدا ہوتی جو اپنے ادب کے جملہ رجعت پسندانہ خصوصیات اور گونا گوں جکڑبندیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مرض جتنا شدید ہوتا ہے اس کے علاج میں بھی اتنی ہی تلخ و تند دوائیں تجویز کرنی پڑتی ہیں۔ اور شاید اسی خیال کے پیشِ نظر ترقی پسند ادیبوں نے اپنے لہجے کو ترش اور تیز بنانے کی کوشش کی لیکن ان میں بعض ایسے گم کردہ راہ اور پرخود غلط نوجوان بھی شامل ہو گئے جنھوں نے اصل مقصد سے ہٹ کر یا تو اشتراکیت کی تبلیغ شروع کر دی یا محض گوئی پر اتر آئے۔ یہ دونوں رجحانات اصل میں ہماری موجودہ معاشرت ہی کا نتیجہ ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو بولنے والوں کے ذہن آج کل کس سیاسی اور سماجی بے چینی میں مبتلا ہیں۔ نیز ہمارے نوجوان اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے کس پست درجہ تک پہنچ چکے ہیں۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک جاری ہوتے ہی کسی قید خانے سے اچھے اور بُرے ہر قسم کے قیدی اپنی اپنی زنجیروں کو توڑ کر باہر نکل آئے ہیں۔ جو بھلے ہیں وہ اس امر کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خیال اور زبان آزاد رہ کر ادب اور زندگی کو وہ فائدہ پہنچا سکیں جو ہماری کم فہم سماج کی عاید کردہ جکڑبندیوں کی وجہ سے بحالتِ موجودہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور جو بُرے ہیں انھیں ترقی پسندی کی آڑ میں اپنی گندگیوں کو پھیلانے کی آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ گویا ایک ایسا میلہ لگا ہوا ہے جس میں اناڑیوں کی وجہ سے شریفوں کی یہ حالت ہو رہی ہے اور شریفوں کا جیسں لیکر اوباش جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ ان دونوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے میں کچھ عرصہ درکار ہوگا اور جب یہ صحیح کچھ دن خوش فعلیاں کر چکے گا اور بُروں کی برائیاں اور بھلوں کی بھلائیاں الگ الگ نظر آنے لگیں گی تو اس تحریک کی قدر و قیمت متعین ہو سکے گی۔ اور اگر اس کے چلانے والوں نے جرأت و استقلال کے ساتھ اعلیٰ کردار کا بھی مظاہرہ کیا تو امید ہے کہ موجودہ افراتفری کا سدباب ہو کر یہ تحریک صحیح معنوں میں ترقی پسند ثابت ہوگی اور اس سے اردو ادب کو فائدہ پہنچے گا ورنہ یقین ہے کہ تاریخ ادب اردو میں اس کو ایک ہنگامہ نما فوش سے بڑھ کر اہمیت حاصل نہ ہو سکے گی۔

ان چند اجتماعی تحریکوں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اقطاع میں اور بھی انجمنیں اور جماعتیں اردو تصنیف و تالیف کی خدمت کر رہی ہیں۔ اور ان کے علاوہ بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اگرچہ تنہا کام کر رہے ہیں لیکن بجائے خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سب کی اردو

خدمات پر تبصرہ کرنے کی نہ اس وقت ضرورت ہے اور نہ فرصت۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی بے بساطی اور مصروفیت کے باعث اس وقت بعض ایسے مسائل کی طرف بھی آپ حضرات کی توجہ منعطف نہ کرا سکا جن کی نسبت بعض صاحبانِ ذوق غور و خوض کر رہے ہیں مثلاً رسم الخط میں اصلاح۔ یعنی کی جگہ ٹائپ کا انتخاب۔ اور زبان کی سلاست و سادگی وغیرہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب تک جو کچھ سمع خراشی کی گئی ہے وہی ناگوارِ خاطر نہ ہوئی ہو۔ لیکن اتنا یقین ہے کہ یہ صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوگی۔ اور اردو کے مسئلہ کو ہم سب اپنا ذاتی معاملہ سمجھیں گے۔ اور جس طرح ہم اپنے ذاتی کام کو بہر صورت انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے کہ دوسرے دست تعاون دراز کریں گے تو ہم بھی اٹھیں گے اسی طرح اردو کے کام کے لئے بھی ہم میں سے ہر ایک تن تنہا میدانِ عمل میں نکل آئے گا۔ ہمیں اردو کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے جس شخص سے جتنا بھی بن پڑے غنیمت ہے۔ اردو ہم سے صرف اتنا ہی چاہتی ہے۔ وہ دنیا کی ان زبانوں میں سے ہے جن میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے۔ اور جو تمام مخالفتوں اور مصیبتوں کا خود ہی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے مقابلہ کر لیتی ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اپنی زندگی کو شگفتہ، تمدن کو پاکیزہ اور قوم کو سنجیدہ و مستحکم بنانے میں اپنی زبان کے مقبولِ عام اور ہمہ گیر اوصاف کو بطور حربہ استعمال کریں۔ ہمیں کچھ لینا چاہیئے کہ ہمارے اسلاف کے ورثہ میں ہمیں اردو کی صورت میں ایک ایسی عمدہ تلوار ملی ہے جسے جوہر اتنے ہی زیادہ نمایاں ہوں گے جتنا زیادہ ہم اس کو استعمال کریں گے۔ اگر ہم اس کو میان ہی میں پڑی رہنے دیں اور سمجھ لیں کہ یہ خود بخود ہماری تہذیب و تمدن بلکہ ہمارے قومی وجود کی حفاظت کے لئے اٹھے گی تو ہم سے بڑھ کر کم فہم اور غافل کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہ سلسلہ صفحہ ۳۲۰

کمیٹیوں کے ساتھ اردو کے دارالمطالعے بھی جگہ جگہ قائم کریں اور باہمی تعاون سے اخبار اور رسالے ان دارالمطالعوں کے لئے جاری کریں۔ یہ

اردو والوں کو اپنے ملک کی سرکاری زبان ہندی یا اپنے ہمسایوں کی زبان مرہٹی یا گجراتی یا تلنگی کے سیکھنے میں بھی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے

جب ہم نے ایک غیر ملکی زبان انگریزی سیکھی تو پھر اپنی ملکی زبان ہندی کے سیکھنے اور اس میں مشق و مزاولت پیدا کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے، بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ جب اردو بولنے والے ہندی سیکھ کر اس کے رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیں گے تو رفتہ رفتہ اردو کا اسلوب بیان ہندی پر بھی چھا جائے گا اور اس کو پڑھ کر ہندی والے محسوس کریں گے کہ اردو میں جو شائستگی روانی اور لوچ ہے اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے خود ہم بھی اردو رسم الخط سیکھیں اور اس طرح مہاتما گاندھی کا وہ منصوبہ پورا ہوگا جس میں انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی قرار دیا تھا اور اس کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں رائج ہونے پر زور دیا تھا۔

خطبۂ صدارت

جلسۂ سالانہ بزم ادب عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل منعقدہ فروری ۱۹۴۵ء

آج کے جلسہ کی صدارت کے لئے آپ نے جو مجھے مدعو کیا ہے میں اس کے لئے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ یہ درس گاہ علم و ادب کا جو ذوق پھیلا رہا ہے وہ ایک قدیم تہذیب و تمدن کے مرکز ورنگل کے لئے ہر طرح شایان شان ہے۔

اس درس گاہ سے فارغ ہوکر جو طلبہ حیدرآباد کی عظیم الشان جامعہ عثمانیہ میں شرکت کرتے ہیں ان میں اگرچہ ایک محدود تعداد سے مجھے واقف ہونے کا موقع ملا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر اردو کی جماعتوں میں اپنے شائستہ کردار اور ذوق علم و ادب کے باعث اپنے ساتھیوں میں ممتاز رہتے ہیں۔ یہاں سے جو اردو مجلہ شائع ہوتا ہے اس سے بھی ورنگل اور اس کے نواح کے طلبہ کی ذہانت اور قابلیت کے عمدہ ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ حال ہی میں ورنگل نے اس لئے بھی شہرت حاصل کی ہے کہ یہاں کے مشاعرے بہت کامیاب ثابت ہوئے اور ان میں ملک و بیرون ملک کے کثیر شعرا نے شرکت کی۔

یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر میں ورنگل آنے سے انکار نہ کرسکا اور میرا یہاں آنا اس لئے بھی میرے لئے مسرت کا باعث ہے کہ یہاں مولوی امیر علی خاں صاحب جیسے علم دوست اور مستعد صوبہ دار موجود ہیں جن کے خلوص، جوش عمل اور جذبۂ خدمت ملک و مالک نے مجھے عرصہ سے ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔

آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے کالج کے پرنسپل جامعہ عثمانیہ کے ایک ایسے قدیم استاد ہیں جن کی شفقتوں کی یاد عثمانیہ کے ابتدائی چند سالوں کے طلبہ کے دل میں اب تک موجزن ہے۔ مولوی رحیم الدین صاحب جیسے باکمال استاد کی نگرانی میں یقین ہے کہ اس درس گاہ کے طلبہ کے ذوق علم اور شائستگی میں روز افزوں ترقی ہوگی۔

ورنگل کے طلبہ شاید اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے حال اور مستقبل کی طرح ان کا ماضی بھی نہایت شاندار رہ چکا ہے۔ یہ مقام یوں تو آندھرا تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ چنانچہ آج کل ثقافت آندھرا کی جو مختصر سی نمائش یہاں منعقد ہو رہی ہے اس سے کچھ اندازہ اس کی عظمت ماضی کا ہو سکتا ہے لیکن عہد قطب شاہی میں بھی اس حصۂ ملک سے بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جن کی قدر و منزلت گولکنڈے کے سلاطین نے اس اعلیٰ پیمانہ پر کی کہ ان شعرا نے اپنی نظموں اور کتابوں میں قطب شاہی سلاطین کے علمی و ادبی احسانات کا بار بار اعتراف کیا ہے۔

بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے عہد میں ورنگل کی قسمت بھی جاگ اٹھی اور تلنگانہ کے ان کوہستانوں میں علم و ادب کی ندیاں پھر سے بہنے لگیں۔ اس کالج کے طلبہ سے اس حصۂ ملک کی بڑی بڑی

امیدیں وابستہ ہیں اور اسی لئے میری نظریں ورنگل کا مستقبل درخشاں نظر آرہا ہے۔

حضرات! ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے آپ کی یہ بزم ادب دراصل ایک گہوارہ ہے جسمیں نشوونما پاکر ہی آپ زندگی کی محفل میں شرکت کے قابل ہوسکتے ہیں۔

وہ ادب ہی کیا جو آپ کو حقیقی زندگی اور زندہ دلی سے روشناس نہ کرے۔ جو لوگ ادب کو محض اوقات فرصت گزارنے کا ایک ستا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جو ادیب و شاعر محض خیالی اور فرضی دنیا کے راگ الاپتے رہتے ہیں وہ یا تو زندگی کے مفہوم سے ناآشنا رہتے ہیں یا ذہنی عیاش ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی تعلیمی درس گاہ کی بزم ادب صحیح معنوں میں اس ادارے کی زندگی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ ہوتی ہے اور اس کی مصروفیات اور خدمات ہی سے پتہ چل سکتا ہے کہ اس درس گاہ میں کتنی بیداری اور قوت حیات موجود ہے۔

وہ بزم ادب ہی کیا جو ادب کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ اپنی درس گاہ کے دوسرے طلبہ اور اساتذہ کو بھی اپنی مصروفیات میں حصہ لینے کی طرف مائل نہ کردے۔ پس اگر آپ کی بزم ایسا کر رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ کامیابی کے راستے پر گامزن ہے اور ادب کی صحیح قدر و قیمت سے واقف۔

ادب کے دل دادہ جس میدان عمل میں کارگزار ہوتے ہیں وہ زبان ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادب میں کمال حاصل کرنے کے لئے زبان پر قبضہ اور قابو حاصل کرنا سب سے پہلے ضروری ہے۔ اس لئے وہی ادیب زیادہ کامگار ہوتا ہے جو زبان کے استعمال سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور جو ادیب یا شاعر اس کے حسن و قبح کے اسرار سے آگاہی و دسترس کی کوشش نہیں کرتا ادب کے اعلیٰ مراحل طے کرنے میں اس کو جگہ جگہ بھٹکنا پڑتا ہے۔

چونکہ آپ کی درس گاہ کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے آپ کو سب سے پہلے اسی میں کامل دستگاہ حاصل کرنی چاہئے اور یہ حسن اتفاق سے ایک ایسی گنگا جمنی زبان ہے جو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس میں ہر علاقے اور صوبے کے لفظوں کو اپنے میں شامل کرلینے کی بڑی صلاحیت موجود ہے اور یہ کسی خاص صوبے یا شہر کی زبان نہیں ہے اور نہ کسی خاص فرقے یا نسل کے لئے مخصوص ہے بلکہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت و ملک اس کو اپنا بنا لیتا ہے۔ چنانچہ جو اصحاب ادب اردو کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مختلف اقطاع ہند کے باشندوں کے علاوہ ترکستان، ایران، عربستان، افغانستان، انگلستان اور فرانس کے رہنے والوں نے بھی اس میں نہ صرف نثر و شاعری کی بلکہ علمی کتابیں بھی لکھیں۔ ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد تو سیکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن آپ کو تعجب نہ ہوگا جب آپ یہ سنیں گے کہ سیکڑوں کی تعداد میں انگریز اور اینگلو انڈین ادبا ذوق نے بھی اس زبان میں شاعری کی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مبسوط تذکرہ ایک سیویلین عہدہ دار رام بابو سکسینہ کلکٹر بلند شہر نے حال ہی میں بزبان انگریزی مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ یہ معلوم کرکے بھی آپ کو حیران نہ ہونا چاہئے کہ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے علاوہ پارسیوں نے بھی اس زبان کو اپنی زبان کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ ایک اچھے پارسی شاعر کا دیوان حال ہی میں چھپ کر شایع ہو چکا ہے۔

غرض آپ اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کریں کم ہے کہ آپ کی بزم کا تعلق ایک ایسی جامعہ سے ہے جس کا ذریعہ تعلیم

اردو جیسی ہمہ گیر زبان ہے۔ لیکن محض اپنی زبان کی عظمت دیرینہ پر فخر کرنا کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ اپنی زبان کو جدید تر ضرورتوں اور نت نئے رجحانات کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اردوئے معلیٰ کہلاتی تھی اور اردو کے بعض تنگ نظر دعویدار اپنی برتری کے تحفظ کی خاطر اس کو بعض خاص شہروں بلکہ ان شہروں کے خاص خاص محلوں تک مخصوص قرار دینا چاہتے تھے اور اس رجحان اور اس کی مسلسل تبلیغ کی وجہ سے اردو کو ایک حد تک نقصان بھی پہنچتا رہا۔ لیکن اس زبان کی ترقی پسند فطرت نے اس تحدید کو قبول کرنا کبھی گوارا نہ کیا اور بہر طرح کی حد بندیوں اور زنجیروں کو توڑ کر دور دراز کے علاقوں میں پہنچتی اور پھیلتی رہی۔

عہد حاضر میں بعض ارباب اردو اپنی زبان کے لئے جو ہر طرح کے خطرے محسوس کر رہے ہیں وہ بھی اسی قسم کے دقیانوسی تخیلات کی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ میری نظر میں اردو اس وقت تک ایک کل ہند مقبولیت حاصل نہ کر سکے گی جب تک کہ ارباب اردو کے دل و دماغ سے بے جا غرور اور اپنی عظمت ماضی کے پراگندہ نقوش محو نہ ہو جائیں گے اور وہ اس امر کی کوشش نہ کریں گے کہ ملک کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنی زبان کی تنوع پسند اور تغیر پذیر فطرت سے فائدہ اٹھائیں۔

اردو صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند زبان ہے وہ کسی خاص حلقے اور دائرے میں مقید نہیں رہنا چاہتی۔ اس لئے اس کا مستقبل بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں بہتر بن سکتا ہے جو فرقہ وار اور عصبیت کے پس پشت ڈال کر کشادہ دلی اور وسعت نظر سے اس کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔

اب وقت نہیں رہا کہ اردو کی تائید میں قدیم انگریز حاکموں اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کی اردو دوستی کے اقوال و افعال کی شہادتوں ہی پر اکتفا کیا جائے۔ اب اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے جدید رجحانات اور عوام کی روزمرہ کی زبان اور ذہنی میلان کو پیش نظر رکھ کر ایک عظیم تر اردو کی داغ بیل ڈالی جائے۔

اب اردوئے معلیٰ کا دور گزر گیا۔ گزرا ہوا زمانہ محض یاد باقی رکھنے اور افسوس کرنے سے واپس نہیں آسکتا۔ اب عمل کی ضرورت ہے۔ ایسے ترقی پسندانہ عمل کی جو رفتار زمانہ کے قدم بہ قدم ہو اور جس کے لئے ایسے کارپردازہ ہمیاروں جن میں خار دار جھاڑیوں اور دشوار گزار راستوں سے بغیر الجھے اور الجھائے آگے نکل جانے کی صلاحیت ہو۔ خدا کرے کہ آپ کی بزم ادب ایسے باہمت اور چونچال نوجوان پیدا کر سکے اور خدا کرے کہ ان کا نام اس عظیم تر اردو کے طرح اندازوں کی پہلی صفوں میں شامل ہو سکے۔

جس طرح کہ میں نے جبل پور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ تصنیف و تالیف کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا "اگر آپ کے ہمسائے کے باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز و شاداب ہوں اور آپ کے باغ میں پھلوں اور پھولوں اور شادابی کی کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسائے کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں اور روشوں پر پتھر پھینکیں، بلکہ آپ کا باغ اسی وقت ہمسائے کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جب کہ آپ اس کے لئے ویسی ہی محنت و مشقت کریں۔ پس اردو کے چمن کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا تلنگی زبانوں کی مخالفت یا انکی آبیاری کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی انہی ذریعوں اور طریقوں کو سمجھیں

اور سیکھیں جن سے ان زبانوں کو بار آور کیا جا رہا ہے۔

میں نے ابتدا میں کہا ہے ادب زبان ہی کے بل بوتے پر پروان چڑھتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اگر ادب کے دل دادہ ایک سے زیادہ زبانوں سے واقف ہوں تو ان کی ادبی قابلیتوں کے اجاگر ہونے میں مزید سہولتیں بہم پہنچتی ہیں۔ اس لئے اگر میں آپ کی بزم ادب کے ارکان کو یہ مشورہ دوں اور وہ اس پر عمل کر سکیں تو خود اردو کیلئے بہت مفید ثابت ہوگا کہ جس خطۂ ملک میں وہ آباد ہیں وہاں کی مقامی زبان میں بھی زیادہ سے زیادہ دست رس حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اہل اردو کو یہ ہر وقت یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان کی تاریخ میں کبھی کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ اردو کے رائج کرنے میں کسی جبر و اقتدار سے کام لیا گیا ہو یا جس علاقے میں وہ رائج ہوئی ہو وہاں کی مقامی زبان کو مٹانے یا گھٹانے کی کوشش کی گئی ہو۔ حالانکہ اس کے بولنے والے ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں عرصے تک صاحبان تخت و تاج رہے اور ہر طرح کا سیاسی و سماجی اقتدار بھی رکھتے تھے۔

مخالفت اور استبداد اردو کے مزاج کے منافی ہے۔ کسی میں گھل مل جانا اور کسی کے الفاظ اور لب و لہجے کو اپنے میں ملا لینا اس زبان کی گھٹی میں شامل ہے اور یہی اس کی وسعت، ہمہ گیری اور مقبولیت کا اصلی راز ہے۔

اگر آپ کی بزم ادب کے ارکان اور ورنگل اور اس کے وسیع صوبے میں رہنے سہنے والے ایسے لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ تلنگی زبان پر بھی عبور حاصل کر لیں گے تو ان کو یقین رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی زبان کو نقصان کے بجائے فائدہ ہی پہنچا سکیں گے۔

اس طرح وہ نہ صرف اپنے ہمسایوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے اور ان سے قریب تر ہو جائیں گے بلکہ ان کے قدیم و جدید ادبی و سماجی رجحانات اور سیاسی تخیلات سے واقف رہ سکیں گے اور دوسرے علاقوں کے اہل اردو کو بھی موقع بہ موقع ان سے آگاہ کر سکیں گے۔

اس امر کا ایک خوش آئند اثر یہ بھی ہوگا کہ آپ کے ہمسائے خود بھی اپنی زبان تلنگی کے علاوہ اردو کے ماہر بننے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ پسند نہ کریں گے کہ اپنے اردو داں ساتھیوں سے کسی طرح پیچھے رہیں۔

یہ ایک ایسا مفید اقدام ہے جس کے لئے اس بزم ادب کو پہل کرنا چاہئے اور اس کی سرپرستی میں یا اس کے ارکان کی انفرادی جد و جہد سے ایسی شبینہ جماعتیں کھلنی چاہئیں جن میں اردو دانوں کو تلنگی اور اردو نہ جاننے والے باشندگان ورنگل کو اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ یہ کام گرما اور سرما کی چھٹیوں میں اور زیادہ اعلیٰ پیمانے اور سہولت کے ساتھ انجام پا سکتا ہے۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اگر آپ نے ہمت سے اس کا بیڑا اٹھایا تو یقین مانئے کہ خود بخود تعلیم بالغان کی ایک ایسی مفید مہم بھی شروع ہو جائے گی جس کی وجہ سے ہمارے وطن کو گوناگوں فائدے حاصل ہوں گے۔

اگر آپ اس مہم کا آغاز کریں اس کو کامیابی سے چلا سکیں تو عام جہالت کی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دور کرنے میں ملک و مالک کی مدد کر سکیں گے جو ہمارے وطن پر چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں اور جن کی تاریکی میں ہمارے لاکھوں

(بقیہ سلسلۂ صفحہ ۳۲۳)

خطبۂ استقبالیہ

کل ہند ترقی پسند کانفرنس حیدرآباد منعقدہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء

معزز خواتین و حضرات!

میں بڑی مسرت کے ساتھ آج آپ کے اس اجتماع کا خیر مقدم کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے میل جول اور تبادلۂ خیال سے اردو زبان اور ادب کو دیرپا فوائد حاصل ہوں گے اور ہماری آپس کی بہت سی غلط فہمیوں اور خامیوں کا ازالہ ہوسکے گا۔ ہماری زبان کی ایک بہت بڑی خوبی آج ہماری سب سے نمایاں خرابی بن گئی ہے۔ ہم سب اس حقیقت حال پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری اردو زبان ہندوستان جیسے وسیع ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس ملک کے ہر خطے میں۔ خواہ وہاں کی مقامی زبان کوئی ہو۔ اردو ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مختلف مذہبوں اور نسلوں کے لاکھوں انسان ایک دوسرے کے رنج و راحت کو سمجھتے اور اپنی سماجی ضروریات کی سربراہی کرسکتے ہیں لیکن مختلف اقطاع ملک کے اہل اردو کے باہمی اختلافات اور تعصبانہ انتشار کے باعث ہماری زبان کا یہ ہنر ہمارے لئے عیب بنتا جارہا ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر وسیع نظری اور رواداری سے محروم ہیں اور ہماری اکثر و بیشتر انجمنیں اور جماعتیں پست خیالی اور کوتاہ بینی کا شکار بنتی جارہی ہیں۔ ایک جماعت دوسری جماعت کے قیام اور ایک فرد دوسرے فرد کے وجود کو گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی لئے اہل اردو کی نظر میں ہر نئی تحریک کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اور ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سال گزشتہ جب کل ہند اردو کانگریس کا ایک اجلاس ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کیا گیا تو میرے ایک خاص دوست جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اور آج کے اس اجتماع میں دوسری بار میں ان کا دلی مسرت سے استقبال کررہا ہوں بہت حیران ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ:

"ہماری نظر میں حیدرآباد تو آخری مقام تھا جہاں یہ تحریک اثر انداز ہوسکتی تھی۔ لیکن اردو کانگریس کے اس اقدام سے ہم کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔"

اُس وقت تک میرے ان فاضل دوست کو ترقی پسند حیدرآباد کے دیرینہ رجحانات سے شاید واقفیت نہ تھی اور حقیقت ان کی نگاہ سے اوجھل تھی کہ یہ سرزمین صدیوں سے اس خصوص میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اردو زبان تو خاص طور پر اس ملک کے ترقی پسندانہ رجحانات ہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ آج سے چار پانچ سو سال قبل جب کہ فارسی زبان تمام ہندوستان کی سرکاری اور علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی حیدرآباد ہی نے جرأت کی اور ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو

ایک پردیسی زبان کے طوق غلامی سے آزاد کرایا اور یہاں کے عوام بازاروں اور گھروں میں جس زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اسکو علم و ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ اردو کا ابتدائی ادب جس میں نثر و نظم کی سیکڑوں کتابیں شامل ہیں دکن ہی میں لکھا گیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تقریباً دو سو سال بعد ترقی پسندی کی یہ تحریک سرسبز ہوسکی۔ اردو وہ بھی محض دکن ہی کے ایک شاعر ولی کے سفر و قیام دہلی اور اس کے دیوان کی تشہیر کے بعد ہی خاطر خواہ ترقی کرسکی۔ اسی واقعہ کی طرف میر تقی میر جیسے وضع دار شاعر نے جس کو شاید آپ قدامت پسند بھی کہیں ایک ترقی پسندانہ انداز میں اشارہ کیا تھا کہ ؎

قائل نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اردو ادب اپنے ابتدائی دو سو سالوں میں زیادہ تر بیرج بھاشا سے متاثر رہا اور پہلے پہل دکن ہی کے ایک شاعر ولی نے اپنے سفر گجرات و دہلی کے بعد محسوس کیا کہ اس کی ترقی اور مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں۔ اس لئے وہ اورنگ آبادی دوستوں اور معتقدوں نے وہ ترقی پسندانہ رجحان اختیار کئے جن کو آگے چل کر مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم نے شاہ جہاں آباد میں رائج کیا اور اردو زبان کی وہ شکل قائم کردی جو آج تک معیاری اردو کہلاتی ہے۔

اردو زبان کی حد تک حیدرآباد کے ترقی پسندانہ رجحانات کی تاریخ یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تو اس سلسلہ کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جو اردو کی تاریخ میں حیدرآباد کی ترقی پسندانہ خدمات کو زندگی جاوید بخشنے کا باعث ثابت ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں بھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس تحریک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اردو ادب میں گندگی پھیل رہی ہے اور اس ادب کو پڑھ کر ہمارے نوجوان گمراہ ہوتے جارہے ہیں ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک غلط بھی نہیں ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خوش آیند تحریک سے فائدہ اٹھاکر بہت سے خام کاروں اور آوارہ مزاج ادیبوں اور شاعروں نے اپنے پست جذبات اور زیادہ تر شہوانی الجھنوں کی نمود و نمایش شروع کردی ہے۔ اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ میں نے یوم عالی میں بھی کہا تھا کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین" جلد سے جلد اپنے تحت ایک ایسی احتسابی مجلس قائم کرے جو موقع بموقع ان نام نہاد ترقی پسندوں کے افکار نظم و نثر کا جائزہ لیتی رہے اور ان کی نسبت اپنی صحیح رائے کا اظہار دیانت اور جرأت کے ساتھ کرتی جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی اقدام جلد نہ کیا جائے گا تو ہر ناقص شاعر اور نا اہل ادیب ترقی پسندی کے روپ میں اپنی کم علمی، ادبی بے بضاعتی اور اخلاقی نقائص کو چھپاتا رہے گا اور نہ صرف ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ حال اور مستقبل کے اردو ادب پر خامیوں اور گندگیوں کا ایک ایسا رنگ چڑھ جائے گا جسکی ذمہ داری اس تحریک کے مخلص بانیوں کے سر رہے گی اور جس کے دور کرنے میں مستقبل کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی۔

ایک ایسی ہی مجلس کی طرف سے صحیح قسم کے ترقی پسند ادب کے کئی مجموعے بھی شائع ہونے چاہئیں جو کرشن چندر کے

جدید مجموعے "نئے زاویے" کے انداز میں مرتب کئے جائیں تو جواں سال شاعروں اور نو مشق ادیبوں کی صحیح رہبری ہوگی اور وہ گمراہ ہو کر شہوانی جذبات کی ترجمانی اور عریانی کو ترقی پسندی کا لوازمہ سمجھنے سے باز رہ سکیں گے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس وجہ سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور شاید آئندہ بھی پہنچے کہ اس تحریک کے بعض علم بردار ترقی پسندی اور اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ التزام اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ترقی پسندی اور انسانیت میں ہونا چاہیئے۔ انسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہونا اور انسانی حقوق کی پامالیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ایک ایسی وسیع الخیالی ہے جس کے مقابلہ میں کسی خاص سیاسی عقیدے کی تبلیغ کرنا ایک طرح کی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اشتراکیت کی علم برداری کی بجائے اگر انسانیت کی علمبرداری کا دعوی کریں تو محض ایک اصطلاح کی تبدیلی سے ان کے بہت سے عیب ہنر نظر آنے لگیں گے اور ان کے بہت سے مخالف ان کے ہم نوا بن جائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف ہماری اس کانفرنس کو خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے اور جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے گا، یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اعتدال ہر کامیابی کا لازمی ذریعہ ہے اور یہ خوبی اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ہم اپنی ہر کاوش پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں، بڑا اندیشہ ہے کہ کہیں ترقی پسندی اور جوش و جذبات کی ہنگامہ آرائی مترادف نہ بن جائیں۔ لیکن یقین ہے کہ یہ اندیشہ دیرپا ثابت نہ ہوگا کیونکہ جیسے جیسے ترقی پسند ادیب اور شاعر پختہ مشق اور سلیم الطبع ہوتے جائیں گے، ہمارا ادب بھی نکھرتا جائے گا۔ سلامتی طبع اور خوش ذوقی بغیر اعتدال کے ممکن نہیں۔ اس لئے جب تک ترقی پسند تحریک کا ہر دلدادہ افراط و تفریط سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا وہ اس تحریک کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتا رہے گا اور اس کے ذاتی اعمال و اقوال دوسروں کو اس مفید تحریک سے بدظن کرانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد میں ترقی پسند مشاہیر کا یہ اجتماع اردو دنیا کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا اور ترقی پسند ادب کی تاریخ میں یہ کانفرنس ایک نئے اور شاندار دور کی بنیاد رکھے گی اور اس توقع کے ساتھ میں آج آپ سب دوستوں کا دلی خلوص کے ساتھ استقبال کرتا ہوں اور حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے سرگرم کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کے مساعی کے خوش گوار نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور یوم حالی کے بعد اس شاندار اجتماع کے انتظامات میں انھوں نے جس سرگرمی اور جاں کاہی سے حصہ لیا وہ اس کی متقاضی ہے کہ اگر آپ کو اجلاس حیدرآباد میں کسی قسم کی زحمت یا ناگواری محسوس ہو تو یقیناً درگزر فرمادیں گے۔

خطبۂ صدارت

(اردو کانفرنس۔ برہان پور)

بزرگو اور دوستو!

اردو زبان اور ادب عہد حاضر میں ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک دور اس زبان پر آج سے ٹھیک ایک سو سال قبل آیا تھا اور اس وقت بھی اردو بولنے والے اسی طرح منتشر اور پریشان روزگار تھے۔ لیکن خود اس زبان کے خمیر میں زندگی اور پھلنے پھولنے کی ایسی صلاحیت ہے کہ وہ نہ صرف خود اس امتحان سے صحیح وسلامت نکل آئی بلکہ اپنے بولنے والوں کو بھی بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ اپنے ملک کی آزادی اور انتخاب کے لئے وہ اس سرزمین کی دوسری زبانوں کے علمبرداروں کے ساتھ شانہ بشانہ صف آرا ہوئے اور سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان ہی میں ہندوستان کی آزادی اور بیداری کے لئے دوسری زبانوں سے زیادہ ادب لکھا گیا ہے اور اس اعتبار میں ایسے ایسے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اردو، دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف اول میں داخل ہوگئی۔

اس تجزیہ کی بنا پر اردو والوں کو مایوس اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس کی سرکاری و درباری قدر و منزلت باقی نہیں ہے تو کوئی پروا نہیں۔ یہ زبان کسی وقت بھی سرکار کی گود میں نہیں پلی۔ یہ تو بازاروں اور لشکروں، غریبوں اور مزدوروں کی زبان ہے اور انہی میں کچھ اس طرح پھولتی پھلتی رہی ہے کہ امیروں اور سرکاروں کو بھی اس کے حسن و خوبی کا گرویدہ ہونا پڑا۔

اگر اردو زبان کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک خود رَو پودے کی طرح ہندوستان کی سرزمین سے پیدا ہوئی۔ اس کا بیج کسی حکمراں یا کسی سلطنت نے نہیں بویا اور نہ یہ کسی شاہی محل کی روشوں پر لگائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بیل ہے جو بازاروں اور سڑکوں، خانقاہوں اور فوجی چھاؤنیوں میں خود بخود اُگی، پھیلی اور ایسے دلآویز پھول کھلائے اور پھل پیش کئے کہ علم و فضل اور دولت و اقتدار کے بڑے بڑے مغرور اور سرکش سرمایہ داروں کے بھی دل موہ لئے اور انھوں نے بڑے فخر و مسرت کے ساتھ اس کو اپنے قصروں اور بنگلوں میں جگہ دی اور اپنے درباروں اور محل سراؤں کو اس سے سجایا۔

ملتان اور لاہور کے بازاروں اور فوجی چھاؤنیوں سے یہ پودا دلّی اور آگرہ پہنچا اور وہاں کی زمین میں ابھی پوری طرح جمنے بھی نہ پایا تھا کہ محمد تغلق کی فوجوں اور دلّی کے عوام کے ساتھ دکن پہنچ گیا اور یہاں کی پہاڑیوں اور سبزہ زاروں میں تو ایسا پھلا پھولا کہ اس پر پہلا ادبی یادگار جنتی ہندی کے شہروں میں آیا۔ چنانچہ اردو زبان کی ابتدائی نظم و نثر دکن ہی میں لکھی گئی اور دو تین سو سال کے عرصہ میں اس ملک میں بہت بڑا ادبی ذخیرہ جمع ہوگیا جس میں اس عہد کے ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔

برہان پور کی سرزمین میں بھی اردو کا پودا ایسا پھیلا کہ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں یہاں کے بڑے بڑے

عالم اور شاعر فارسی کے ساتھ ساتھ اس زبان میں بھی لکھنے لگے۔ اور جب اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے برسوں اورنگ آباد میں قیام کیا تو اورنگ آباد کی علمی و ادبی چہل پہل زیادہ تر برہان پور ہی کے ادیبوں اور شاعروں کی مرہونِ منت رہی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر برہان پوری شاعروں اور صاحبانِ کمال کو اورنگ آباد سے خارج کر دیا جاتا تو وہاں کی محفلیں سونی نظر آنے لگتیں۔

جب اورنگ آباد سے سلطنتِ آصفی کا پایہ تخت حیدرآباد منتقل ہوا تو دوسروں کے ساتھ برہان پوری شعرا اور ادیب بھی حیدرآباد چلے گئے اور اہلِ کمال کی آمد و رفت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔

۲

ہندوستان کی آزادی کے بعد دستورِ ہند میں اردو کو بھی ملک کی دوسری (۱۴) زبانوں کے ساتھ مقامی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندی کو سرکاری زبان قرار دینے کی وجہ سے بعض علاقوں کے ہندی والے اپنی زبان کی برتری اور خوبیوں کے سوا نے میں کچھ اس طرح کا رویہ اختیار کرتے رہے ہیں جس سے اردو کی مخالفت کی بو آتی ہے لیکن اہلِ اردو کو اس سے ..... متاثر ہونے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو اس واقعہ سے خوش ہونا چاہیئے کہ ایک ایسی زبان ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے جو اردو سے زیادہ کوئی اور زبان ہندی کے قریب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بول چال کی حد تک دونوں زبانیں ایک ہیں۔ البتہ اسماء و صفات اور نت نئی اصطلاحوں کے باعث ان کے آپس میں دوری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ مشکل اصطلاحیں بھی کچھ عرصہ میں سہل بن جائیں گی اور جو بہت مشکل ہیں ان کو ہندوستان کے عوام قبول ہی نہیں کریں گے اس طرح وہ اپنی موت آپ ہی مر جائیں گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان دونوں زبانوں کے ارباب کار ایک دوسرے سے قریب ہونے اور اپنے مسائل کو مشترکہ طور پر حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اسی صورت میں ہندی پنپ سکتی ہے۔ ورنہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بنگالی و مرہٹی اور جنوب کی تامل و تلگو وغیرہ تو ہندی کو خاطر میں بھی نہیں لائیں اور عملاً اس کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔

ہم ہندی کے مخالف نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ہندی کی ترویج خود اردو کی ترویج ہے۔ اور بہت سے اربابِ ہندی بھی سمجھتے ہیں کہ اردو کی ترقی دراصل ہندی کی ترقی ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کی ہندی سبھائیں اسی نقطۂ نظر سے اردو والوں کا ہر کام میں ساتھ دے رہی ہیں۔

اردو والوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اردو رسم خط کا ہے اور اگر مخالف سے مخالف فضا بھی پیدا ہو جائے اور ہندوستان کی جمہوری اقدار سے آخر کار ہماری توقعات پوری نہ بھی ہوں تو یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اردو والے خود اس کو حل نہ کر سکیں۔ لیکن حالات روز بروز بدلتے جا رہے ہیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اردو کی مخالفت میں شدت اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ دلی میں کل ہند اردو کانفرنس کے انعقاد کے لئے مختلف نقاطِ نظر کے اصحاب مل جل کر کوشش کر رہے ہیں اور ہمارے ہر دل عزیز اور وسیع النظر وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کو مخاطب کرنے والے ہیں۔ کشمیر اور آندھرا پردیش میں اردو کے لئے تحفظات دیئے جا رہے ہیں۔ یقین ہے کہ یو۔پی اور بہار کی بھی بہت جلد باری آئے گی اور اسی کے ساتھ دوسرے پردیشوں میں رہنے بسنے والوں کو بھی اپنی زبان کی تعلیمی سہولتیں ملیں گی۔

کل ہند انجمن ترقی اردو اب بیدار ہو چکی ہے اور اردو کے تحفظ و بقا کے لئے صحیح انداز میں سرگرمِ عمل ہے۔ اس کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یقین ہے کہ ہر علاقہ کے اہلِ اردو اس کا ساتھ دیں گے اور ممکنہ تعاونِ عمل کریں گے۔ شمالی ہند میں علی گڑھ دلی، لکھنؤ اور پٹنہ میں اردو کا کچھ نہ کچھ مفید کام ہو رہا ہے اور کام سے زیادہ وہاں کے اہلِ اردو اپنی زبان کے لئے جد و جہد کے جو صحت مند طریقے اختیار کر رہے ہیں ان سے توقع ہے کہ ملک کی فضا کو کشیدہ کئے بغیر اردو والے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔

وسط ہند کے بارے میں تو زیادہ نہیں کہہ سکتا البتہ جنوبی ہند میں یعنی بمبئی، حیدرآباد، کرنول، مدراس اور بنگلور میں اردو کے لئے جو مسلسل اور خاموش کام ہو رہا ہے وہ ہمارے حوصلے بڑھانے کے لئے کافی ہے۔ بمبئی کا اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایک معیاری سہ ماہی رسالہ نوائے ادب شائع کرنے کے علاوہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی کاوشوں کے باعث اردو کی اعلیٰ تحقیق کا مرکز بن چکا ہے۔ اور علم کمیٹیوں کے سلسلہ میں اردو کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب بمبئی میں مقیم ہیں جو وقفہ وقفہ سے اردو کے لئے ساز گار ماحول پیدا کرنے کے اسباب اور ذرائع پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مدراس میں اے۔ جے اردو سمینار، اردو کا ایک شگفتہ مرکز بنا ہوا ہے اور افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق اور مولانا عبدالوہاب بخاری کی بجائے خود ایسے ادارے ہیں جن کا ہر قدم اردو زبان و ادب کی سرگرمی اور سرسبزی کا ضامن ہے۔

بنگلور اور میسور کے نوجوان بھی ابھر رہے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ کالج بنگلور اور مہارانی کالج میسور کے طلبہ و طالبات میں اردو کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنے مضامین نظم و نثر میں نمایاں ترقی کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی مہاراجہ کالج کے اردو ترجمان مخزن کا ایک شمارہ ٹیپو سلطان شہید سے متعلق شائع ہوا ہے جو ادبی و تحقیقی معیار کے لحاظ سے قابل قدر ثابت ہوا ہے۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کی شاخ بڑا اچھا کام کر رہی ہے۔ اور یہ غالباً پہلی شاخ ہے جس نے گذشتہ چند سالوں کے اندر ایک عالی شان اردو ہال تعمیر کیا ہے۔ اور ایک اردو کالج بھی چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ادارۂ ادبیات اردو ہے جو علمی و ادبی اور تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا تھا۔ اور اس نے کسی سرکاری یا درباری امداد سے مستغنی رہ کر بہت جلد ایسے قدر داں پیدا کر لئے کہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ اس نے گذشتہ ربع صدی میں حیدرآباد کے شعراء و مولفین کی ایسی ہمت افزائی کی ہے اور علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی فضا قائم کر دی ہے کہ یہ ادارہ اب اپنے ایک جداگانہ دبستان ادب پر ناز کر سکتا ہے۔ مختلف موضوعوں پر ۵۰ کتابیں چھپوا، مسلسل بیس سال تک ایک علمی و ادبی رسالہ "سب رس" جاری رکھنا۔ مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں کو پچاس روپے ماہانہ کے وظائف دینا۔ ایک وسیع مرکزی دارالمطالعہ چلانا اور تقریباً پچاس شاخیں قائم کرنا جن میں سے ہر ایک ریڈنگ روم اور اردو کی تعلیم کا مرکز ثابت ہوئی ہے۔ تعلیم بالغاں کا انتظام کرنا اور ہزاروں ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنا کر قومی بیداری میں اضافہ کرنا ایسے کام ہیں جن کے ذریعہ سے اس خطۂ ملک میں ادارے نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔

۳

یہ وہ امید افزا واقعات ہیں جن کی بنا پر آسانی سے رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اس کا مستقبل اسی وقت تاریک ہو سکتا ہے جب خود اردو والے اپنی مدد آپ کرنے کے زرین اصول کو ترک کر دیں گے اور حکومتی امداد و سرپرستی پر بھروسہ کریں گے جیسا کہ آج تک کرتے آ رہے ہیں۔ ہم آج کل شاید اس قانونِ قدرت کو بھول گئے ہیں کہ خدا نے بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلی جس کو خود اپنی حالت بدلنے کا احساس پیدا نہیں ہوا۔ اردو والے اگر محض حکومت کی غفلت یا بے مہری کا رونا روتے رہیں گے اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے تو حکومت بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرے گی۔

ہم کو پہلے خود اپنے اعمال اور کارکردگی کا جائزہ لینا چاہیئے۔ کیا ہم اپنی زبان کی بقا اور استحکام کے لیئے وہ کچھ کر رہے ہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اردو کو خود اپنوں سے جتنی شکایت ہو سکتی ہے غیروں سے نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آج کل اردو والے اقتصادی دشواریوں میں دوسروں سے زیادہ گرفتار ہیں اور ملک کے بٹوارے کے باعث ذہنی انتشار اور سماجی دشواریوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں لیکن ان پریشانیوں کے باوجود ان کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی ضرورتیں کسی نہ کسی طرح تکمیل کو پہنچ ہی رہی ہیں جہاں وہ اپنی اولاد وغیرہ کی پرورش داشت اپنے مال و اسباب کی حفاظت اور اپنی جائداد (مثلاً مکان، دوکان اور زمین) کی نگہداشت اور ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ توجہ اور محنت کرتے ہی ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اپنی زبان کی بقا اور نگہداشت کی طرف بھی متوجہ نہ ہوں۔ حالانکہ یہ بھی ان کا موروثی سرمایہ ہے جس پر ان کی تہذیب و روایات اور عزت و عظمت کا انحصار ہے۔

جب تک اہل اردو وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس نہ کریں گے اور اپنی اداری زبان کی خدمت کے لئے کمربستہ نہ ہو جائیں گے ان کی تہذیب اور روایات خطرے ہی میں رہیں گی۔ اپنی زبان سے محبت شائستہ اور زندہ قوموں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ہم اپنے شاندار ماضی سے وابستہ رہ سکتے ہیں اور ان اسباب سے واقف ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے آباؤ اجداد معزز محترم سمجھے جاتے تھے۔

میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے کہ برہان پور میں اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے اور دور دور تک عزت اور مقبولیت حاصل کی۔ اگر برہان پور کی جدید نسلیں اپنی اولاد کو اردو رسم خط سے واقف نہ کرائیں گی تو وہ کس طرح اپنے شہر کی تاریخی عظمت اور اپنے اسلاف کی کامیاب زندگیوں اور ان کے شاندار علمی و ادبی کارناموں اور روایتوں سے واقف رہ سکیں گی۔ میرے حافظہ میں اس شہر کے متعدد ایسے صاحبان فضل و کمال مثلاً ہاشم علی شاہ قاسم علی۔ شاہ نور محمد عاصی۔ میر یحییٰ عاشق علی خاں۔ مرزا ابدالی بیگ شیخ سلطان الدین شوریدہ۔ میر مہدی متین۔ شاہ ضیاء الدین پروانہ۔ شیخ غلام حسین خوبی۔ مرزا عطا ضیاء۔ مرزا عاشور بیگ عاشق لالہ دولہ رائے دبیر اور آر مبک نائک ذرہ کے نام اب تک تازہ ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب اور شعر و سخن کو سنوارنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ایسے بیسیوں بزرگ اور ہوں گے اور ہیں مگر مجھے تو انہی کے نام یاد رہے جنھوں نے اورنگ آباد اور حیدرآباد میں اپنے فضل و کمال کا ڈنکا بجایا تھا اور جن کی قلمی کتابیں اب بھی ادارۂ ادبیات اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ جب بھی اور جہاں کہیں اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی۔ برہان پور کے صاحبان کمال اور خدمت گذاران اردو کو فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

اردو رسم الخط اپنی آسانیوں اور خوبیوں کے لئے مشہور ہے اور اگر کوئی ایک دفعہ اس کو سیکھ لے تو عمر بھر بھول نہیں سکتا۔ اس کے برخلاف بعض زبانوں کے رسم الخط ایسے ہوتے ہیں جو بڑی دقت سے ذہن نشین ہوتے ہیں اور مشق و ممارست جاری نہ رہے تو سیکھنے والا بہت جلد ان کو بھول جاتا ہے۔ ایک ایسی نعمت سے اپنی اولاد کو محروم رکھنا ہمارے لئے ایک ناقابل معافی جرم ثابت ہوگا۔ اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہے تو اس کو سیکھنے اور سکھانے کے اسباب فراہم کرنے ہوں گے۔ جہاں جہاں مدرسوں میں اردو ذریعہ تعلیم نہیں ہے وہاں کی ہر خانقاہ، ہر درگاہ، ہر دیوان خانہ اور ہر دوکان میں تھوڑے سے معاوضہ پر اردو کے مدرس کام کر سکتے ہیں اور محلہ کے ان پڑھ لوگ اور مدرسوں میں جانے والے بچے صبح یا شام کے اوقات میں اردو کی تعلیم پا سکتے ہیں اور اپنے قومی مشترکہ ورثہ سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح اردو کے رسالے، اخبار اور کتابیں پڑھنا اور خریدنا ہر پڑھے لکھے آدمی کا فریضہ ہونا چاہیئے۔ اپنی کمائی کا کچھ نہ کچھ حصہ کھانے پینے اور پہننے کی اشیاء کے ساتھ ساتھ اس پر بھی خرچ کرنا ضروری ہے۔ جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوگا۔ ہماری زبان اور اس کا ادب سرسبز و شاداب نہ ہو سکے گا اور ہم بیداری اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ہم کو چاہیئے کہ اردو کے

بقیہ سلسلہ صفحہ (۳۰۹) پر ملاحظہ ہو

خیر مقدمی تقریر یوم محمد قلی قطب شاہ

[گنبد محمد قلی قطب شاہ (قلعہ گولکنڈہ) پر تیسرے یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء کے موقع پر پڑھی گئی تقریر]

خواتین و حضرات!

آج ہم سب تیسرا یوم محمد قلی قطب شاہ منانے اس پُر فضا چبوترے پر جمع ہیں اور حسنِ اتفاق سے آج ہی ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ بھی اپنا ایک ورق الٹ رہی ہے۔ عہد محمد قلی قطب شاہ سے آج تک اس تاریخ کے کئی ورق الٹ چکے ہیں جن میں سے بعض سنہرے تھے جو ورق آج الٹ رہا ہے اس کو معلوم نہیں آئندہ کے مورخ کیا لکھیں لیکن میں اپنی تھوڑی بہت تاریخ دانی کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق تھا۔

شری سنجیوا ریڈی کی چیف منسٹری کے دور میں حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نقطہ نظر سے کیا فائدہ اور کیا نقصان پہنچا اس کی سرگذشت تو میں بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس تین سالہ دور میں اس ملک کے مختلف مذہبوں کے ماننے والوں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار رہے اور یہاں کی لسانی اقلیتیں خوف و دہشت میں گرفتار نہیں رہیں جو ہندوستان کے دوسرے پردیشوں کے اردو والوں پر طاری ہے۔ یہاں اردو کو ریاست کی علاقائی زبان قرار دے کر ایک ایسی نظیر قائم کی گئی ہے جس کی آج تک کوئی دوسری صوبہ تقلید بھی نہ کر سکا۔ اسی طرح ابھی ابھی کچھ روز قبل تاریخ و سائنس کی تلگو اکاڈیمی میں اردو کو بھی شریک کر کے اور آندھرا ساہتیہ اکاڈیمی کی طرف سے تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کی اشاعت اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دیکر جس فراخ دلی کا ثبوت دیا گیا ہے وہ بھی اپنی آپ نظیر ہے۔

یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ حیدرآباد کے بانی اور آندھرا کے اس عظیم الشان حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ نے فراخدلانہ روایات کا جو پودا لگایا تھا اس کو آج بھی پھول پھل لگ رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس بادشاہ کی یاد روز بروز تازہ تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے کارناموں کا جتنا گہرا مطالعہ کیا جا رہا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے دور کی خوبیاں واضح ہو رہی ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ تیسرے یوم محمد قلی کے موقع پر اس کی مجلس انتظامی نے نواب زین یار جنگ بہادر کی رہنمائی میں بعض ایسے ٹھوس کام شروع کئے ہیں جن سے اس ملک کے باشندوں کو دور رس فائدہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ و آغاز گولکنڈہ سے متعلق ایک مختصر تربیتی کورس شروع کیا گیا جس میں متعدد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے شرکت کی۔ گولکنڈہ کے مشہور مورخ پروفیسر محمد صدیقی اور آثار قدیمہ کے نوجوان ماہر پروفیسر یم اے۔ رحمن اور میں نے گولکنڈہ کی تاریخ، آثار اور عمارات و مقابر پر نہ صرف لکچر دیئے۔ بلکہ قلعہ اور گنبدوں میں فیلڈ ورک بھی کرایا اور آخر میں تحریری امتحان بھی لیا گیا جس میں جو امیدوار کامیاب ہوئے یعنی جن کی سندیں آج تقسیم کی جائیں گی۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب نے اس ترجمتی نظام کی تکمیل کے لئے بڑے اشتیاق اور توجہ سے شرکت کی اور بعادت مہند شاگردوں کی طرح ہر پہلو سے متعلق نہایت ادب سے سوالات کئے اور ہم سبھوں کو مجبور کر دیا کہ اپنی عمر بھر کی تحقیق و تلاش و جستجو کے ذخیرے ان کو خوشی خوشی سپرد کر دیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال بھی اس ترجمتی کورس میں ایسے ہی مزید اصحاب ذوق شرکت کریں گے۔ اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا چلا جائے گا۔

اس سال ہائی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لئے اردو اور تلگو میں تحریری اور تقریری مقابلے بھی منعقد کئے گئے۔ ان میں بھی متعدد طلبہ نے حصہ لیا اردو تقریری مقابلوں کی صدارت ہمارے پرجوش میر بلدروشن علی خاں صاحب نے اور تلگو کی صدارت آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کے پرجوش متدڈی رامانجارا ؤصاحب نے کی۔ تحریری مقابلوں کے حکم کے فرائض علامہ علی اصغر بلگرامی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ ڈاکٹر شریف الشار انصاری اور پروفیسر ایم آر رحمن نے انجام دیئے۔ جس معیار کی تحریریں اس سلسلہ میں تیار کی گئیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان خواہ وہ اردو داں ہوں یا تلگو داں اپنے ملک کی تاریخ اور اپنے سابق حکمرانوں کی خصوصیات سے ناواقف نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسی علامت ہے جس کی بنا پر اس ملک کا مستقبل ابھی تابناک نظر آتا ہے۔

ایک اور پائیدار کام یہ بھی شروع کیا گیا ہے کہ قطب شاہی عہد کی تاریخوں کو خواہ وہ کسی زبان میں ہوں چھپوا کر شائع کرنے کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا جس نے کام شروع کر دیا ہے اس میں نواب عنایت جنگ بہادر۔ پروفیسر مجید صدیقی اور مولانا علی اصغر بلگرامی جیسے بلند پایہ معلمین اور آغا معصوم شیرازی، آغا حسین ضابطہ اور پروفیسر ایم آر رحمن جیسے پرجوش کارگذار شامل ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال تک کم از کم دو تاریخیں چھپ جائیں گی۔ سب سے پہلے نظام الدین احمد کی تاریخ صدیقتہ السلاطین بالتصویر چھپ رہی ہے اس تاریخ کا ایک حصہ ربع صدی قبل خود علی اصغر بلگرامی صاحب نے اپنے ذاتی صرفہ سے چھپوا دیا تھا۔ مگر وہ بھی اب نایاب ہے۔ ابوالحسن تاناشاہ کی مکسوائی ہوئی تاریخ صوانح السلاطین از علی ابن طیفور بسطامی کو ڈاکٹر شریف الناسخ نے نقل کر کے ایڈٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ گذشتہ دو سالوں کے طویل عرصہ میں ہم نے قطب شاہی دور کی ایک تاریخ بھی شائع نہیں کی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ سے کچھ فائدہ ہوا یا نہ ہو یہی ایک کام ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس یوم کے سلسلے میں کم از کم قطب شاہی تاریخیں تو چھپ گئیں اور تاریخ ہندوستان کا ایک اور گوشہ تاریخی میں تابندہ روشن ہو گیا۔

آغا حسین ضابطہ کی تحریک پر قطب شاہی بادشاہوں کے پوسٹ کارڈ بھی اس سال چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اور اب عادل شاہی نظام شاہی بہمنی اور آصفجاہی سلاطین اور ان کے آثار کی تصویروں کے کارڈ بھی چھپ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں پری اسلامک دور کی تصویروں کے پوسٹ کارڈ بھی شائع کئے جائیں گے۔ تاریخ اور آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کارڈ ایک نادر تحفہ کا کام دیں گے اور لوگ اپنے دوست احباب کے نام دور دور بطور تحفۂ عید و سال نو ان تاریخی تصویروں کو بھیج سکیں گے اور سیر و سیاحت کرنے والے ان کو شوق سے بطور سوغات اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

سال حال کے یوم محمد قلی قطب شاہ میں ایک اور اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ تلگو تقریروں اور نظموں کے لئے ایک مزید اجلاس منعقد کیا جا رہا ہے جو کل شام شری کرشنا دیوا یا یا تلگو لائبریری سلطان بازار میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی صدارت میں منعقد ہوگا۔ قطب شاہی دور اور محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں اگر چہ تلگو زبان میں بھی اچھا ادب موجود ہے اور اہل آندھرا قطب شاہی سلسلہ کو بھی اپنے قابل فخر حکمرانوں میں شمار کرتے رہے ہیں مگر ضرورت تھی کہ ہماری ان تقریبات سے بھی ان کو واقف کرایا جائے۔ گذشتہ دو سالوں کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ تلگو بولنے والوں اور خاص کر آندھرا علاقوں سے حیدرآباد منتقل ہونے والوں کی کافی تعداد اس تقریب میں شرکت نہیں کر رہی ہے۔ اس لئے طے کیا گیا کہ ایک جلسہ

محض تنگلو ان اصحاب کے لئے منعقد کیا جائے۔ مقام مسرت ہے کہ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے قبول فرمائی ہے جو ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ میں شرکت کے لئے دلی سے تشریف لا رہے ہیں۔ اور جو اصل میں اس یوم محمد قلی کے بانیوں میں شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہی اس تقریب کی اہمیت اور افادیت سے تنگلو دانوں کو بخوبی واقف کرا سکتے تھے۔ میں آپ صاحبین اور خواتین سے استدعا کرتا ہوں کہ کل کے جلسہ میں بھی شرکت فرمانے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی محفلوں کی رونق میں اضافہ کر سکیں گے۔ اور اہل اردو و اہل تنگلو ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں گے۔

آج کی تقریب میں آندھرا پردیش کے برجستہ کارنیتا اور اس کی اسمبلی کے اسپیکر جناب کالیشورا راؤ صاحب نے نمائش کتب و لقاء و یکا افتتاح فرما کر اردو اپنے مصروف ترین اوقات میں سے بہت زیادہ وقت ہم کو دے کر ہمارے دلوں کو موہ لیا ہے۔ ان کی شخصیت ہم سب کے لئے ایک نمونے کا کام دیتی ہے۔ انھوں نے حیدرآباد آنے کے بعد اردو سیکھنی شروع کی اور آج اس زبان کو نہ صرف سمجھتے بلکہ بولنے بھی ہیں ہم سب اردو والوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔ ایسی ہی مہتبیلا کو دیکھنے کے بعد سلطان محمد قطب شاہ کے ان اشعار پر یقین کرنا پڑتا ہے جن میں اس نے لکھا ہے کہ اس کے بچپنا یعنے محمد قلی اردو اور فارسی کے علاوہ تنگلو میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔

میں آخر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس اجلاس میں شرکت کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور ان سب دوستوں کا بھی جنھوں نے اس کے انتظامات میں ہاتھ بٹایا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جلسے تعاون عمل اور ایثار و اخلاص کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتے۔

میں اپنے مہمان خصوصی شری سنجیو یا نئے چیف منسٹر بھی ان کی تشریف آوری کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہم سب کی طرف سے اس توقع کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کا دور وزارت بھی آندھرا پردیش کی قدیم ترین روایات کے مطابق اپنی فیض رسانی کے باعث خوش گوار ثابت ہوگا اور اس ملک کی تاریخ کو مزید شان دار بنانے میں زیادہ حصہ لے گا۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۱۳

ہم وطن بھلے اور برے، سچ اور جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کر سکتے اور جس کی بنا پر اندیشہ ہے کہ ہماری زبان ہماری مملکت اور ہمارے بادشاہ کے متعلق غلط اور گمراہ کن بیانات کو بعض وقت سچ سمجھ لیا جائے۔

ورنگل کی اس درس گاہ کے فرہنگوں نے اب تک اپنی اس بزم ادب، اس کے رسالے کے شماروں اور یہاں کے مشاعروں میں جس شائستگی اور زندگی کے ثبوت فراہم کئے ہیں اس کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد کے دوسرے محبوں میں ورنگل کا نام بلند کرنے میں ان کی آئندہ مساعی بھی بارآور ثابت ہوں گی اور علم و شائستگی کے جس نور سے ان کے دل روشن اور ان کی زندگیاں بارونق ہو گئی ہیں وہ فرخندہ ان کے ذاتی ایثار اور رضا کارانہ خدمات سے دور دور تک پھیلتا رہے گا اور اس طرح اطراف و اکناف کے وہ دیہات بھی علم و شائستگی کی روشنی سے محروم نہ رہ سکیں گے جہاں اب تک جہالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں اور جہاں کے غریب باشندے علم و ادب تو خیر بڑی دولت ہے معمولی نوشت و خواند سے بھی محروم ہیں اور منتظر ہیں کہ اس درس گاہ اور اس کی بزم ادب کے فیض یافتہ ان کی طرف جلد سے جلد متوجہ ہوں۔

خیر مقدم صدر جمہوریۂ ہند

(۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء کو شام کے چار بجے صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد ایوان اردو میں تشریف لائے تو آپ کے مستقبل اعزازی ڈاکٹر زور صاحب نے ان الفاظ میں خیر مقدم کیا)

ہمارے ہر دلعزیز صدر جمہوریہ ہند!

آج آپ کے قدوم میمنت لزوم ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں آئے ہیں جس کو حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایوان اردو جیسا بڑا نام عطا فرمایا تھا۔ اس لئے آج ہم اپنی قسمت پر جتنا ناز کریں کم ہے ہم بجا طور پر شاعر کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جناب صدر نے لحاظ فرمایا ہوگا کہ اس ایوان کی تعمیر اردو کے مزاج کے عین مطابق عمل میں آئی ہے۔ جس طرح اردو مختلف زبانوں کے میل جول سے بنی ہے اسی طرح اس ایوان میں بھی مختلف تہذیبوں اور کلچروں کی خصوصیات کا ایک ایسا امتزاج کیا گیا ہے کہ اپنی گوناگونی کے باوجود اس میں ایک خاص کلچر اور خوب صورتی نمایاں ہے۔

جناب والا! اس ایوان اردو میں اردو کے شاعروں اور مصنفوں کی نہ صرف مطبوعہ اور قلمی کتابیں جمع کی گئی ہیں بلکہ اردو بولنے والوں کے اکثر و بیشتر تاریخی آثار، تحریریں، تصویریں، اخبار، مخطوطے، فرامین، خاندانی شجرے اور اس ہندوستانی لیس منظر کو محفوظ کیا گیا ہے جس کے مطالعہ اور واقفیت کے بغیر ہمارے ملک کی کوئی مکمل تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ یہ تمام ذخیرہ گذشتہ تیس سال کی جہد و جہد اور تلاش و جستجو نے فراہم کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس کو یہاں محفوظ کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ اب تک یا تو تلف ہو جاتا یا ہندوستان سے باہر چلا جاتا۔ ہم خوش ہیں کہ ہم اپنے ملک کے بہت سے نادر شاہ کاروں کو اپنے ہی ملک میں محفوظ کر لینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور اس طرح آندھرا پردیش کے اس فرخندہ بنیاد شہر کو جو اپنی تعمیر کے وقت ہی سے اردو کا گہوارہ رہا ہے اپنی اس خصوصیت کے باقی رکھنے میں اس ادارے نے، اپنے محدود ذریعوں کے باوجود ایک قابل ذکر خدمت انجام دی ہے۔

اس ادارے نے اب تک نہ صرف ۲۷۰ قدیم و جدید اردو کتابیں شائع کیں بلکہ اردو امتحانات کے ذریعہ سے ۱۹۴۲ء سے اب تک ہزاروں آدمیوں کو خواندہ بنایا اور ۲۵ ہزار مطبوعہ اور پانچ ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں جمع کیں۔ اس کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" ۱۹۳۵ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

یہ ادارہ اردو میں ایک انسائیکلو پیڈیا بھی مرتب کر رہا ہے جو دس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔ کتب خانے کی مطبوعات اور مخطوطات کی ضخیم توضیحی جلدیں بھی شائع کر چکا ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی اور اردو کتب خانے کو اب تک حاصل نہ ہو سکی۔

ادارہ کے شعبۂ تاریخ و آثار و کلچر کا کام رفتہ رفتہ اتنا ترقی کر گیا ہے کہ اس ایوانِ اردو کا ایک بڑا حصہ اس کے لئے مخصوص کرنا پڑا۔ اس میں جیسا جناب نے ملاحظہ فرمایا ہے۔ ہم نے زیادہ تر توجہ گولکنڈہ، بیجاپور، بیدر اور اورنگ آباد کے کلچرل شاہ کاروں کے لئے وقف کی ہے اس لحاظ سے ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ سرزمین دکن کے علم و فضل، آرٹ اور قلم کاری کا ——— جو گنجینۂ گراں بہا اس ایوان میں موجود ہے شاید ہی کسی اور جگہ مل سکے۔

جناب والا یہ بھی معلوم کر کے مسرور ہوں گے کہ اسی ایوانِ اردو میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی مصروفِ کار ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا افتتاح گذشتہ سال ماہ مئی میں پروفیسر ہمایوں کبیر کے ہاتھوں ہوا تھا اور اب تک یہ کافی ترقی کر چکا ہے۔ چنانچہ سال حال تلگو، ہندی، اردو، فارسی اور کلچر کے مختلف موضوعات پر پانچ ریسرچ اسکالر اپنے فاضل ڈائرکٹروں کی نگرانی میں اعلیٰ پایہ کا تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ اور آئندہ سال سنسکرت، عربی، مراٹھی وغیرہ پر کام ہوگا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں تالیف و ترجمہ کا کام بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب تک مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا تلگو میں ترجمہ مکمل ہو چکا ہے جس پر تلگو کے ایک ماہر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ مرحوم وہلی کالج کے مشہور پروفیسر راجپتھ کے حالات اور مضامین بھی مرتب کر رہے ہیں۔ اور اس کتاب کا بہت کچھ حصہ چھپ بھی چکا ہے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر کے مرتب کردہ آزاد میموریل والیم کے تلگو، ہندی اور اردو ترجموں کا کام بھی ہو رہا ہے جن میں سے ایک ترجمہ تو زیرِ طبع بھی ہے۔ کلکتہ کے ڈاکٹر نریندر رائے ایک قدیم تاریخی کتاب واقعات شتاقی اور ڈاکٹر شریف النسار نے قطب شاہی فارسی شاعروں کے تذکرہ صدائق السلاطین کو مرتب کر لیا ہے۔ اور قدیم تاریخی مخطوطات بھی مرتب کئے جا رہے ہیں۔

یہ انسٹی ٹیوٹ مولانا آزاد کی یاد گار کے طور پر ان تمام مشرقی علوم و فنون پر اعلیٰ تحقیقاتی کام کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے جن سے مولانا مرحوم کو دلچسپی تھی اور اس کی مختلف مجلسوں کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب مہدی نواز جنگ اور ڈاکٹر غلام یزدانی جیسے فاضل اصحاب کے سپرد ہے۔

اس انسٹی ٹیوٹ کی اپنی ایک علیحدہ عمارت اسی ایوانِ اردو کے متصل بنائی جانے والی ہے جس کے لئے شری سنجیو ا ریڈی کی تحریک پر اس سے متصلہ زمین کی خریدی کی منجانب حکومت آندھرا پردیش کارروائی ہو رہی ہے۔ اور توقع ہے کہ یہ عمارت بھی بہت جلد مولانا کے نام اور کاموں کے شایانِ شان بن جائے گی۔

ادارۂ ادبیات اردو و ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دونوں کے ارباب کار تہہ دل سے جناب والا کے شکر گذار ہیں کہ آج ایوانِ اردو کا شریف لا کر ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ آج کی اس تقریب سعید کے موقع پر ادارہ کے ایک جواں سال رفیق شری نارائن کرن ریڈی کی خواہش ہے کہ ان کے والد بزرگوار کی یاد میں کچھ زمین ایوانِ اردو کو عطا کی جائے۔ ان کے بڑے بھائی بھوپال میں رہتے ہیں اور انجمنِ ریڈی ہی نے سب سے پہلے بھوپال کے لئے وزیر اعلیٰ جی کی خدمت میں اپنی زمینات پیش کر کے نظامانہ کو شرف بخشا تھا۔ آج نارائن کرن ریڈی صاحب اپنی زمینات کا وثیقہ جناب والا کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ جناب اپنے دستِ مبارک سے ادارہ کے صدر نواب زین یار جنگ بہادر کو عطا فرمائیں۔

آخر میں اردو کے ایک ادنیٰ خدمت گذار کی حیثیت سے میں پھر اپنے وطن کی سب سے زیادہ مقتدر اور محترم ہستی کا اپنی اور اردو دنیا کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کی تشریف آوری نے یہ توقع پیدا کر دی ہے کہ اردو والوں کی جملہ ضروریتوں کی جلد سے جلد تکمیل ہو سکے گی اس کے جائز مطالبات شرفِ قبولیت حاصل کریں گے۔ اور وہ آزاد ہندوستان کی ترقی و شادکامی کے لئے آزادی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ سرگرمِ عمل رہ سکیں گے۔

ہم کو یقین ہے کہ جناب کی دعائیں اور نیک تمنائیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔

روئداد ایوانِ اُردو

(مقتدارۂ ادبیات اردو جناب ڈاکٹر زور صاحب کی تقریر جو انھوں نے افتتاحی تقریب میں کی)

آج سے تقریباً تیس سال قبل ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو اس مقصد کے تحت قائم کیا گیا تھا کہ حیدرآباد اور جنوبی ہند میں اردو کا ذوق عام کیا جائے اور اس خطۂ ملک کے موجودہ اور گذشتہ شاعر اور ادیب اردو دنیا میں اس طرح روشناس ہوں کہ ان کا جائز حق ان کو مل سکے اور ساتھ ہی یہاں کی نوجوانوں میں وہ خود اعتمادی اور شگفتگی پیدا کی جائے جس کے بغیر شعر و ادب کی ترقی اور خوشگوار ارتقا کسی ملک میں بھی ممکن نہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس مقصد میں ادارے کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور حیدرآباد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر ادیب اور شاعر ہوگا جس کے رشحاتِ قلم ادارے کی طرف سے کتابی شکل میں یا اس کے ترجمان ماہ نامہ سب رس میں شایع نہ ہوئے ہوں اور جس کا کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی طرح ادارے سے تعلق نہ رہا ہو۔

ادارے کا کام یوں تو دس شعبوں میں تقسیم ہے اور ان میں سے ہر شعبہ بجائے خود ایک ادارے کا کام انجام دیتا رہا ہے لیکن ان میں سے چند شعبوں نے بڑی غیر معمولی ترقی کی، جن میں سے ایک مخطوطات اور مطبوعات کا کتب خانہ ہے جس میں ۲۵ ہزار مطبوعہ کتابیں اور پانچ ہزار سے زائد قلمی نوادر شامل اور ان کی ضخیم توضیحی فہرستیں ہر سال شایع کی جارہی ہیں۔ چنانچہ تذکرہ مخطوطات کی پانچ جلدیں جو دو ہزار سے زاید صفحات پر مشتمل ہیں اور فہرست مطبوعات کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں اور تمام اردو دنیا ان سے مستفید ہو رہی ہے۔ چنانچہ دور دور کے اہلِ علم تحقیق کے استفادے کے لئے آتے یا مراسلت کرتے رہتے ہیں۔

ادارے کا ایک اور شعبہ تاریخ و آثار و ثقافت کے لئے وقف ہے۔ اس شعبے کا کام بھی رفتہ رفتہ اتنا ترقی کر گیا کہ ایوان اردو کا ایک بڑا حصہ اس کے لئے مختص کرنا پڑا۔ اس میں مشاہیر اردو کے اصلی خطوط، ان کے علمی و ادبی آثار، تصاویر اور گولکنڈہ، بیجاپور اور نگ آباد اور بیدر وغیرہ کے ثقافتی شہ کار، فرمانوں، کتبوں اور ان کے چربوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ دکن کے خطاطوں، فن کاروں اور نقاشوں کے اتنے عمدہ نمونے اس میں جمع ہیں کہ آج ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ اس سرزمین کے علم و فضل، آرٹ اور قلم کاری کا جو ذخیرہ اس میں موجود ہے شاید ہی کسی اور جگہ یک جا مل سکے اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس گنجینۂ علم و ہنر کا اکثر و بیشتر حصہ چند مشفق و کرم دوستوں ہی کا عطیہ ہے جس میں سر فہرست نواب عنایت جنگ بہادر کا نام نامی ہمیشہ درج رہے گا۔ دوسرے احباب میں

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، نواب یٰسین علی خاں یٰسین، سکینہ بیگم صاحبہ شہنواز کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، مولوی احمد اللہ خاں صاحب مدرس گولکنڈہ، ملا عبدالباسط صاحب پروفیسر سید مخدوم اور مرحوم محمد حسین عقبی کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ ادارہ ۱۹۴۱ء سے ہر سال اردو کے امتحانات لیتا رہا ہے جن کے مرکز حیدرآباد سے باہر بھی دور دور قائم ہوتے ہیں۔ اس طرح تقریباً بیس سال کے عرصہ میں اس نے ملک میں پڑھے لکھے افراد کا قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔

۱۹۳۳ء سے ادارے کا ماہوار ترجمان "سب رس" پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کے معتبر اور مستند رسالوں میں شمار پاتا ہے۔

ایک اردو انسائیکلوپیڈیا کا منصوبہ بھی ادارے کی طرف سے لیا گیا تھا جو ایک جلد تیار کرنے کے بعد مالی دشواریوں کے باعث روک دیا گیا۔ گراب عمارت کی تکمیل کے ساتھ اس کو پھر ایک مہم کے طور پر شروع کرنے کی توقع پیدا ہو گئی ہے۔ خدا کرے کہ ہم اس امتحان میں بھی کامیاب ثابت ہوں۔

ادارے کے بڑھتے ہوئے کاموں اور روز افزوں ذخیرہ کتب و لٹریچر نے شروع ہی سے محسوس کرا دیا تھا کہ اس کے لئے اس کی ایک اپنی عمارت تعمیر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس کے لئے نواب زین یار جنگ بہادر نے آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۴۲ء میں ایک عمدہ رنگین نقشہ تیار کرکے اپنے بصیرت افروز نوٹ کے ساتھ اسپیل شائع کی تھی جس کے باعث ادارے نے رفتہ رفتہ ۲۵ ہزار روپے جمع کر لئے تھے۔ مگر اس وقت ہماری کوشش یہ تھی کہ سرکار سے کسی مرکزی مقام پر ایک قطعہ زمین حاصل کیا جائے اور اس سلسلہ میں اس عہد کے وزرائے سلطنت سر اکبر اور ان کے بعد سر مرزا اسمٰعیل نے توجہ بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ ہماری جد وجہد اور ان کی تائید کے باوجود ہم کو کوئی مناسب جگہ حاصل نہ ہو سکی پولس ایکشن کے بعد جب حیدرآباد کی تاریخ نے پلٹا کھایا اور ہماری جمع کردہ رقم جو صدر محاسب سرکار عالی کے کھاتے میں محفوظ ہو رہی تھی بحق حکومت ہند ضبط ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو شری لکشمی نارائن گپتا صاحب نے ادارے کی مجلس انتظامی میں زور دیا کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنی کچھ زمین ادارے کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرائے تاکہ حکومت سے رقم کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔ اس وقت جملہ ارکان مجلس انتظامی سے فوراً فوراً خواہش کی گئی اور جب یہ مسئلہ دو تین اجلاسوں میں بھی طے نہ پا سکا تو گپتا صاحب نے موجودہ عمارت جس جگہ بنائی گئی ہے اس کے حاصل کرنے پر زور دیا اور چونکہ یہ میری اہلیہ کی ملک تھی اس لئے ان سے اس وقت کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر نے کچھ ایسے پیرائے میں خواہش کی کہ عطیہ حاصل ہونے میں ان کو کامیابی ہو گئی۔ اس کے بعد ہی ایک مجلس عمارت بنائی گئی جس کی معتمد محترمہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ ایم ایل اے منتخب ہوئیں۔ اور مولوی فیاض الدین صاحب سے خواہش کی گئی کہ اپنی نگرانی میں ایک ایسا نقشہ تیار کرا دیں جو ارکان کے مزاج کے موافق ہو۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب کہ ۲ نومبر ۱۹۵۵ء کو حکیم الشعرا حضرت آمجد کی دعاؤں کے ساتھ اس وقت کے چیف منسٹر ڈاکٹر رام کشن راؤ صاحب نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ادارے کے ایک دیرینہ رفیق مرزا ضامن علی غازی گنہ وار نے تعمیر کا کام شروع کر دیا مگر جلد ہی ہماری مجتمعہ رقم خرچ ہو گئی اور کام روک دینا پڑا۔

ایک کمیٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور انھوں نے ازراہ کرم حکومت ہند سے ۲۵ ہزار کا عطیہ دلوایا۔ اس کے بعد پھر کام شروع ہوا اور اسی اثنا میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے سالار جنگ اسٹیٹ سے رقم دلائی اور حضور نظام کے چیاریٹی ٹرسٹ فنڈ، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، سکریٹری کاریرا و نظام شوگر فیکٹری سے بھی عطیے حاصل ہوئے۔ مگر یہ سب

رفتہ رفتہ خرچ ہوتے گئے اور کام پھر رک گیا۔ ہم بہت مایوس ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا آخر کار میں نے عالی جناب بخشی صاحب کی خدمت فیض درجت میں رجوع کیا اس لئے کہ مولانا آزاد کے بعد ہندوستان کی اردو دنیا کے سب سے بڑے لیڈر وہی ہیں اور دو سال قبل سرینگر میں آزاد سمینار میں تقریر کرنے اور مشاعرے کی صدارت کرنے کی دعوت کے سلسلے میں ان کے قلب و دماغ کی پہنائیوں اور وسیع القلبی سے واقف ہو چکا تھا۔ جناب بخشی صاحب نے دیر سے سہی مگر کچھ اس طرح مدد کی کہ وہ دوبارہ ہمت باندھ گئی اور اب جو کام شروع ہوا تو تکمیل تک پہنچے بغیر نہ رہ سکا۔ حکومت کشمیر نے ہمارے کام میں دوبارہ جان ڈال دی۔ چنانچہ اس کے ساتھ آندھرا پردیش کی حکومت نے بھی ہماری دستگیری کی اور پروفیسر ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر گوپال ریڈی نے حکومت ہند سے بھی مزید امداد دلائی اور نواب عالم یار جنگ بہادر، وشوارم چندما ریڈی صاحب، علی حسین خاں صاحب، نواب ظہیر یار جنگ بہادر وغیرہ میں سے بھی ہر ایک نے پانچ پانچ سو روپے عطا فرمائے محترمہ شاہ بانو بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر مولوی محمد حسین خاں صاحب انجینیر نے کم سے کم صرفے میں زیادہ کام کرا کے ادارے کی بڑی مدد کی۔ آخر میں مولوی ولداحسین صاحب سابق چیف انجینیر کی صدارت میں عمارت کی باقی ماندہ ضروریات کی تکمیل اور افتتاح کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے معتمد شری نارائن کرن ریڈی اور ارکان ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، پروفیسر ایم۔ رحمن۔ کے ایم خاں اور نرسنگ راؤ صاحبان وغیرہ نے اپنے اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دیئے اس کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگا۔

آخر میں کچھ عمارت کے بارے میں بھی بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اردو زبان کی طرح اس میں بھی مختلف قوموں، مذہبوں اور کلچروں کی عمدہ خصوصیات کا خوشگوار امتزاج کیا گیا ہے اس کے لئے کسی بڑے جینیس ہی کی ضرورت تھی اور ہم شکر گذار ہیں شہزاد دکن محبوبی فیاض الدین صاحب نظامی کے جن کی دلچسپی سے عہد حاضر کی یہ عمارت زمانہ ماضی کی عظیم الشان تعمیری یادگاروں کے پہلو بہ پہلو کھڑی رہ سکی۔ اب ہم حیران ہیں کہ اس کے رکھ رکھاؤ اور مینٹیننس کا اہتمام ہم سے کیوں کر بن پڑے گا۔ دعا فرمایئے کہ اس کے بھی اسباب پیدا ہو جائیں۔

اس عمارت کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں باہر سے آنے والے ریسرچ اسکالروں کے لئے قیام کے مناسب انتظام بھی تجویز کیا گیا ہے جس میں ارباب علم و فضل قیام کر سکیں گے جو اردو کے علاوہ کسی بھی زبان تلگو، ہندی، مراٹھی، عربی، فارسی سنسکرت کے ادب سے متعلق یا تحقیقی یا تکلیفی کام کے سلسلے میں حیدرآباد آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہندوستان جدید کے مشترکہ تجربات کی ایک ایسی اہم نہج ہے جس کی طرف ملک کے ہر علمی و ادبی ادارے کو بالآخر توجہ کرنا پڑے گا۔

آخر میں آپ سب خواتین و حضرات کا شکر گزار ہوں کہ ادارے کی ہر تقریب کی طرح آج بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر ہماری ہمت افزائی کی ہے اور خاص طور پر عالی جناب گورنر صاحب اور عالی جناب بخشی صاحب کے لئے ہم سراپا سپاس ہیں کہ اپنے مصروف تمدن اوقات میں سے ہمارے لئے وقت نکالا اور ہماری عزت بڑھائی۔

آندھرا پردیش کے اہل اردو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ اس کی گورنری پر شری بھیم سین سچر جیسے اردو اور فارسی کے دلدادہ فائز ہیں اور ہمارے تمام جلسوں اور تقریبات میں شرکت فرما کر اپنے مشفقانہ اور ہمدردانہ برتاؤ سے ہم کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے عہد میں حکومت نے حیدرآباد کی اردو دنیا کے حوصلے اور بڑھا دیئے۔

عالی جناب بخشی غلام محمد صاحب ایک ایسے علاقے کے وزیر اعظم ہیں جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور آج ایک ایسے علاقے کے مرکزی اردو ادارے کے افتتاح کے لئے تشریف فرما ہوئے ہیں جس کو پورے ہندوستان میں یہ شرف حاصل ہے کہ اردو یہاں کی ایک علاقائی زبان مان لی گئی ہے۔ اس طرح کشمیر اور آندھرا پردیش کے آپس میں ایک ایسا رشتہ مواخاۃ قائم ہو گیا ہے جس میں نجانے کا

کوئی اور علاقہ شریک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اگر حکومت کشمیر نے ادارے کو امداد جاری کی ہے اور آئندہ اس میں اضافہ کرے گی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وکنیوں اور کشمیریوں دونوں پر اب اردو کلچر کے تحفظ و ترقی کی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے اور مقام مسرت ہے کہ دونوں کو اس کا احساس بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے گل سرسبد بخشی غلام محمد صاحب ہزاروں میل کی زحمت سفر برداشت کر کے ایوان اردو کے افتتاح کے لئے تشریف فرما ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی یہ تقریب کشمیر اور حیدرآباد کے درمیان ایک عقد موالصلت ثابت ہوگی اور ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی اور ہمراز اور ہم کار بن جائیں گے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۳۲

یہ امر واضح کرنا تھا کہ صرف یہ سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ منانا ہی ہمارا اصلی کام نہیں ہے۔

اس تقریب کے بانی نواب زین یار جنگ مرحوم کے مخلصانہ خدمات کا ذکر کئے بغیر میں اپنی یہ تقریر ختم نہیں کرونگا آپ میں سے اکثر احباب نے ان کو حالت علالت میں بھی اس تقریب کا انتظام کرتے اور ہماری رہنمائی کرتے ہوئے اسی چوتڑے پر دیکھا ہے۔ انسان گزر جاتے ہیں مگر ان کی خوبیاں اور خدمات باقی رہ جاتی ہیں اور بھلائی نہیں جا سکتیں۔ وہ ان خصوصیات کا ایک مجسمہ تھے جو عہد محمد قلی قطب شاہ سے حیدرآباد کے خاص خاص خدمت گزاروں میں جلوہ گر رہی ہیں۔ رواداری، محنت، خدمت، شرافت اور اخلاق ان کی زندگی کا مطمح نظر تھے اور یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی تقلید کرنے کی آندھرا پردیش کے ہر فرد کو سعی کرنی چاہیئے تاکہ یہ روایت باقی رہے اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ اسی طرح روشن ہوتا چلا جائے۔

آخر میں جناب چیف منسٹر صاحب اور آپ سب خواتین و حضرات کا اس افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے اور ہماری ہمت افزائی کرنے کے لئے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور اسی جذبہ شکرگزاری کے ساتھ ہم ہر سال یہاں آپ کا خیر مقدم کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

خیر مقدمی تقریر

بتقریب یوم محمد قلی قطب شاہ

۱۹۶۲ء

پانچ سال گزر گئے جب کہ گولکنڈے کے اس تاریخی چبوترے پر اہل حیدرآباد نے اپنے شہر کے اس عظیم المرتبت بانی اور اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی یاد منانے کی ٹھانی تھی اور اس امر کا تہیہ کیا تھا کہ تین سو سال تک اردو اور آندھرا کے اس سب سے بڑے محسن کو بھولتے رہنے کی غلطی کا اس انداز سے تدارک کریں گے کہ حیدرآباد کی زندگی اور زندہ دلی، مشترکہ معاشرت اور رواداری کی روایتیں پھر سے تازہ ہو جائیں۔

یہ بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ہم نے اس اثنا میں محسوس کرا دیا کہ اہل حیدرآباد ایک ایسے اعلیٰ کلچر اور طرز معاشرت اور ذہنی ارتقا کے مالک ہیں جس کو گردش دوراں اور فتنۂ زماں دبا تو سکتے ہے لیکن مٹا نہیں سکتا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد

لیکن یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ باہمی میل جول، محبت اور رواداری، شرافت اور اخلاق کی جو قدریں محمد قلی قطب شاہ کے دور سے اس ملک کے رہنے بسنے والوں کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں وہ سیاست کی بدلی ہوئی نظروں اور سماج کے بگڑے ہوئے تیوروں کے باعث رفتہ رفتہ دھندلے پڑ سکتے ہیں مگر پوری طرح ملیامیٹ نہیں نہیں کر دئے جا سکتے اور چونکہ اکثر قدیم قدروں اور قیمتوں میں تبدیلی ہو رہی ہے اور زمانہ کے اقتضا سے ہوتی جاتی ہم کو اپنی یہ کوشش جاری رکھنی چاہیئے کہ جو اعلیٰ قدریں ہم کو وراثت میں ملی ہیں ان کو باقی رکھیں اور ان سے اس شہر کے اور پورے آندھرا پردیش کے رہنے بسنے والوں کے مستقبل کو سنوارنے میں کام لیں۔

آج آندھرا پردیش کی موجودہ حکومت کے وزیروں اور عہدہ داروں اور ارباب سیاست کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں نے عوام کی زبان اور مذہب کے ساتھ نہ صرف رواداری بلکہ فیاضانہ سرپرستی کا برتاؤ کیا تھا اور ہر کامیاب اور روشن خیال حکومت کا فرض ہے کہ اس روایت کو نہ صرف جاری رکھے بلکہ اگر وہ اپنی سرخروئی اور کامرانی کو برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اس میں اضافہ بھی کرے۔

آپ حضرات یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ ادارہ ادبیات اردو ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ صرف نمود و نمائش یا ذوق تماشہ یا شوق ہنگامہ کے تحت نہیں مناتا آیا ہے۔ اس کی ہر سالانہ تقریب کئی ٹھوس اور دیرپا کاموں اور علمی و ادبی یادگاروں کا نقطۂ آغاز بنتی ہے۔ چنانچہ یہاں ہر سال میں اپنی خیر مقدمی تقریر میں ان گوناگوں فیوضات کا

تذکرہ کرتا آرہا ہوں۔ سال حال بھی اس سلسلے میں مجھے بہت کچھ کہنا ہے مگر میں بہت کم کہوں گا۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کم کہا جائے اور زیادہ کیا جائے۔ اگر آپ خواتین و حضرات میں سے کسی نے اس سال "ایوان اردو" ملاحظہ نہیں فرمایا ہے تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ سال میں ایک بار آپ ضرور اس کو دیکھ لیں تو معلوم کریں گے کہ دکن کے تاریخی و تمدنی آثار میں ایک "یوم محمد قلی" کے بعد سے دوسرے "یوم محمد قلی قطب شاہ" تک ہماری تہذیب و معاشرت کے نوادر کا کتنا گراں بہا اضافہ اس میں ہوتا ہے۔ آخر اس مختصر سے وقت میں ان بیش بہا نوادر کی میں کتنی تفصیلات آپ کے ملاحظہ میں پیش کرسکوں گا جن میں ہر روز وہاں اضافہ ہو رہا ہے اور کب تک اپنے منہ میاں مٹھو بنتا رہوں گا اور پھر ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اس لئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ گزشتہ سال ایک مبسوط تذکرہ "نوادر ایوان اردو" چھپا تھا اور اس اثنا میں اتنا اور گنجینۂ گراں بہا زیادہ تر نواب عنایت جنگ بہادر کی توجہ سے جمع ہو چکا ہے کہ اب اس کی دوسری جلد ترتیب دی جا رہی ہے جو جلد چھپ جائے گی۔ اہل علم و فضل اس خبر سے خوش ہوں گے کہ قطب شاہی عہد کی فارسی تاریخوں کی طباعت کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ "حدیقۃ السلاطین" چھپ چکی ہے جس کا اجرا آج کے مہمان خصوصی چیف منسٹر صاحب کے ہاتھوں عمل میں آرہا ہے۔ عہد ابوالحسن تانا شاہ کے ایک فارسی تذکرے "حدایق السلاطین" کی چھپائی کا انتظام بھی ہو چکا ہے اور "تاریخ محمد قطب شاہی" اور "مکتوبات سلاطین قطب شاہیہ بنام سلاطین مغلیہ و ایران" کی طباعت کا کام بھی شروع ہونے والا ہے۔ یہ تو فارسی زبان کا قدیم تاریخی و سیاسی ادب ہے۔ ضرورت تھی کہ سنسکرت اور تلگو ادب میں قطب شاہوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس کی بھی چھان بین کی جائے اور اس کو مرتب کرکے شائع کیا جائے۔ چنانچہ اب ڈاکٹر بی۔ رام راجو سے اس موضوع پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھوایا جا رہا ہے اور خود تلگو زبان میں "قطب شاہوں کی خدمات آندھرا تمدن" پر ایک کتاب ان ہی سے مرتب کرا کے چھپوائی گئی ہے۔ اس کا رسم اجرا بھی آج شری سنجیوا انجام دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی میں بھی اسی موضوع پر ایک کتابچہ شائع ہو رہا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے اردو دیوان کو ناگری رسم الخط میں چھپانا بھی ضروری تھا تاکہ ارباب ہندی اس سے استفادہ کریں اور محسوس کریں کہ محمد قلی قطب شاہ نے سہل اور پاکیزہ ہندی کا کیسا عمدہ معیار قائم کیا تھا۔ حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا کے تعاون کے ساتھ یہ کتاب بھی ہندی رسم خط میں اب چھپ گئی ہے اور آج ہی اس کی اشاعت بھی عمل میں آرہی ہے۔ یہ تو قطب شاہ اور اس کے عہد سے متعلق فارسی۔ تلگو۔ سنسکرت۔ ہندی اور انگریزی زبانوں میں علمی اور تحقیقاتی کاموں کی تفصیل تھی۔ خود اردو میں ادارے نے اب تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں اس موضوع پر شائع کی ہیں۔ اور یہ سب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ادب اور قدیم مخطوطات اور دکن کی نقاشی۔ خطاطی۔ حکاکی۔ ہتیار اور لکڑی اور پتھر کے اصلی کتبات اور ان کے

چریے کل آپ ایوان اردو کی اس نمایش میں ملاحظہ فرمائیں گے جس کا افتتاح آندھرا پردیش کی ایک وزیر محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ صبح دس بجے فرما رہی ہیں۔

اس کے بعد ہی مسز روڈا مستری صاحبہ کی اور سہ پہر میں چار بجے ہمارے ڈپٹی چیف منسٹر شری رنگا ریڈی صاحب کی صدارت میں اس دور سے متعلق مختلف مضامین، مقالے اور نظمیں ایوان اردو میں سنائی جائیں گی۔ ہماری ریاست آندھرا پردیش کی بڑی سرکاری زبان تلگو میں بھی گزشتہ سالوں کی طرح کرشنا دیوا رایا لائبریری سلطان بازار میں پرسوں ۱۳ر جنوری کو (۵) بجے شری اے۔ کالیشور راؤ صاحب اسپیکر آندھرا اسمبلی کی صدارت میں تلگو تقریریں اور مقالے سنائے جائیں گے۔ اور ان تمام کے مجموعے بھی ہر سال کی طرح اس سال بھی بعد کو شائع ہوں گے۔ آخر میں اسی رات کے نو بجے ایک محفل شعر و سخن ایوان اردو میں منعقد ہوگی جس کی صدارت ریاست گجرات کے گورنر اور ہمارے ایک ہر دلعزیز اور مقبول خواص و عوام لیڈر نواب مہدی نواز جنگ بہادر فرمائیں گے۔

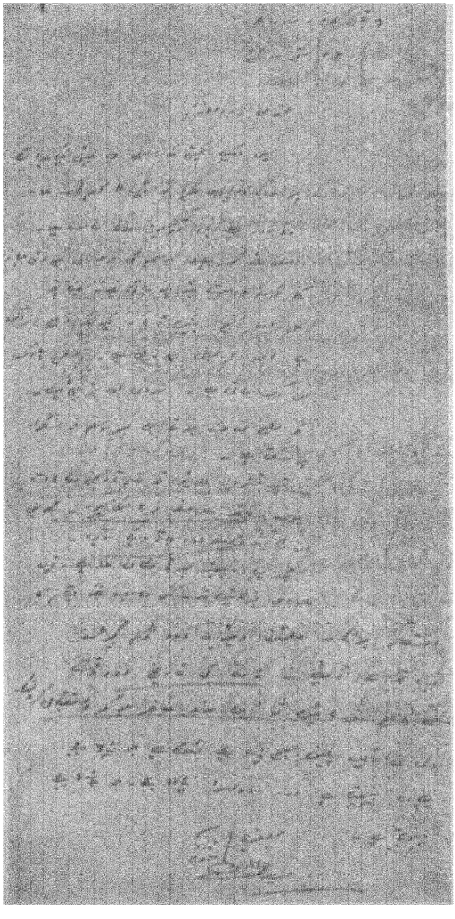
یہ ادارہ ادبیات اردو کے صرف ایک ہی شعبے مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کا کام ہے۔ ادارے کے ماہنامے "سب رس" کی خصوصی اشاعتوں، کتب خانہ کے مخطوطات اور مطبوعات کی توضیحی فہرستوں اور سامس اور دیگر علمی و ادبی موضوعوں پر ہر سال کتابیں چھپتی ہیں، ان کی تفصیلات میں یہاں بیان نہیں کروں گا ادارہ اردو کی تعلیم کے لئے پڑھائی گھروں کو جو امداد دیتا ہے اور ہر سال اردو کے جو امتحانات مختلف مرکزوں پر منعقد کرتا ہے اس کا ذکر بھی آج کی اس تقریب میں غیر ضروری ہے۔ البتہ اس واقعہ کی اطلاع ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سال سے ایک شعبۂ اشاعت ادبیات کشمیر کا آغاز کیا گیا ہے جس کے تحت پانچ کشمیری شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حکومت کشمیر ادارے کو مناسب مالی امداد بھی دے رہی ہے۔

ادارہ کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" گزشتہ چوبیس سال سے برابر پابندی سے چھپ رہا ہے اور آج بھی اردو کے بلند پایہ رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ ادارے نے گزشتہ یوم محمد قلی کے بعد سے دکن کے ایک دوسرے قدیم تاریخی مرکز بیجاپور کے صاحبان کمال کی طرف بھی توجہ کی ہے چنانچہ وہاں کی ایک اردو نثر کی کتاب کلمۃ الحقایق مولفہ شاہ برہان الدین جانم اور بیجاپور کے نابینا شاعر ملا ہاشمی کا ضخیم دیوان ریختی بھی مرتب کراکے چھپوا دیا ہے۔

شہر ناندیڑ کی ایک تاریخ اور شعرائے اردو کا اورنگ آبادی تذکرہ تحفۃ الشعرا بھی چھاپ دیا ہے۔ دو جدید انشا پردازوں کے مزاحیہ مضامین اور افسانوں کے مجموعے ٹھنڈی بجلیاں اور نیل کنول مسکائے بھی شائع کئے ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد میں ہر مذہب و ملت کی جو عبادت گاہیں ہیں، ان کا ایک تذکرہ مرتب کرایا ہے اور اس شہر کے صوفیائے کرام اور ان کی زیارت گاہوں پر ایک مبسوط کتاب لکھائی ہے۔ سلطنت گولکنڈے کا تاریخی جغرافیہ اور دکن کی سماجی اور تمدنی تاریخ بھی قلمبند کرائی گئی ہے۔ یہ سب کام گزشتہ ایک سال میں مکمل ہوئے ہیں اور توقع ہے کہ ان میں سے بعض آئندہ یوم محمد قلی قطب شاہ تک شائع بھی ہو جائیں گے۔ قصہ مختصر اس تفصیل سے

(بقیہ سلسلہ صفحہ (۳۲۹) پر داخلہ ہے)

ڈاکٹر زور
کے
خطوط



آخری مکتوب

ڈاکٹر زور بنام ہارون خاں شروانی

(۲۲ ۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر محی الدین قادری زور سرزمین دکن کے انمول رتن تھے۔ موت نے ان چند برسوں میں اردو علم و ادب کے جو چراغ بجھائے ہیں اُن میں اس چراغ کی خاص اہمیت تھی۔ اس کی روشنی سے اگر ایک طرف حیدرآباد کی محفلیں میں اجالا تھا تو دوسری طرف کشمیر میں بھی اردو سے محبت کی ایک نئی کرن پھوٹ رہی تھی۔ ڈاکٹر زور کی خدمت میں مجھے پہلے اس برس سے نیاز حاصل ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق اتنا اس قدر پختہ ہو گئے تھے کہ اگر دو سرے چوتھے ہفتے ایک دوسرے کی خیریت کی اطلاع نہ ملتی تو پریشانی ہوتی۔ ان کے اچانک انتقال سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پر دعا و شفقت کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ ان چند برسوں میں ان کے دو بھائی، بیوی میرے نام آئے ہوں گے۔ لیکن امریکہ کے سفر کی وجہ سے مجھے تلافی فرصت نہ مل سکی کہ دل جمعی سے ان سب کو تلاش کرتا اور ان کا انتخاب پیش کرتا۔ یہ چند خطوط ادھر ادھر سے جمع کر کے الگ کر آیا تھا ان کی نقل دہلی سے جناب ہربنس لال نے فراہم کی ہے۔ جس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔

ان چند خطوط سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک ادیب کے نجی لمحات کی تصویریں ہیں ـــ باتیں ہیں عام زندگی کی دکھ سکھ کی، کاروبار شوق کی اور سفر و حضر کی۔ الفاظ کی چھلنیوں سے چھانے یا منجنیقہ کاری کرنے کی انھیں نہ تو فرصت تھی اور نہ وہ اس کے قائل تھے۔ بے تکلف باتیں کرتے اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ جو صاف گوئی، سادگی، بے باکی، دو ٹوک بیانی ان کی شخصیت میں تھی، وہ ان خطوں میں بھی ملے گی۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر زور مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی وضعداری میں بے نیازی کی ایک خاص آن تھی۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے، نہ مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اچھے خاصے تھی و تنوش کے دلچسپ و تکمیل انسان تھے، اس لئے دوسروں کو بے آبرو کر کے اپنی وقعت بڑھانے کا "شیوہ" انھوں نے کبھی اختیار ہی نہیں کیا۔ چھوٹوں بڑوں سے ان کا برتاؤ نہایت محبت کا تھا۔ بے دھڑک شخص تھے، کبھی کبھی شوخی و شرارت سے بھی کام لیتے تھے۔ دو ایک خطوں میں اس کی ہلکی سی جھلک بھی ملے گی۔ آخری خطوں میں انھوں نے اپنے جس مجموعے کی ترتیب کا بار بار ذکر کیا ہے، وہ زیر طبع ہے، اور عن قریب شائع ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ یہ مجھ سے ان کی آخری فرمائش تھی۔

(نارنگ۔ امریکہ)

رفعت منزل۔ خیریت آباد، حیدر آباد (۱) ۲۲ جنوری ۱۹۵۷ء

عارف صاحب۔ آپ کے دو خط آئے تھے۔ میں ادھر کئی روز سے بیمار ہوں۔ انفلوئنزا کا سخت حملہ ہوا تھا۔ اب کچھ بہتر ہوں، مگر کمزوری باقی ہے۔ کل اڈیشنل سکریٹری رندھاوا صاحب میرے یہاں چاء پر مدعو تھے۔ ادارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ۴ فروری کو آج کل کی کمیٹی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں سے ۳ فروری کو نکلوں۔ اسٹیشن پر ریٹائرنگ روم کے لئے تار کر دوں گا۔ ایک رات رہ کر ۵ کی شام کو نکلنے کا ارادہ ہے۔ یہیں سے واپسی کے لئے ریزرو کرانے کا خیال ہے تاکہ آپ کو زحمت نہ ہو۔ البتہ آپ یکم فروری کو تصدیق کر لیجئے۔ آپ کے کاغذات بھی لیتا آؤں گا۔ عرشی صاحب اور آزاد صاحب کو مطلع کر دیجئے۔ اب کے بھاگ دوڑ نہ ہو سکے گی۔ بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ صرف آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے آ رہا ہوں۔ طبیعت یہاں بحال نہیں ہو رہی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ اس خط کی رسید دیجئے تاکہ یقین ہو کہ آپ کو مل گیا۔ آزاد صاحب کو لکھا تھا مگر جواب نہیں آیا۔ کیا بہت مصروف ہیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲) ۲۶ جولائی ۵۷ء

عزیز مکرم

آپ کے خط سے بڑی تسکین ہوئی۔ آپ نے زحمت فرما کے جملہ استفسارات کا جواب دیا۔ بہت شکریہ۔ بیگم صاحبہ کے پاؤں میں اب بھی درد ہے اور ایک طرح کا عذر لنگ پیدا ہو گیا ہے۔ میں اچھا ہوں۔ انسان بڑا سخت اور بے غیرت واقع ہوا ہے۔ اچھے ہر حالت میں کام کئے جاتا ہے، اور میں تو اپنے کو مزدور سمجھتا ہوں۔ بہر حال کئے جاتا ہے اور گرتا رہتا ہوں۔ تذکرہ شائع ہو رہا ہے، قریب ہی آپ کو بھی ملے گا۔ آپ کا مضمون میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ سب رس بھجواتا ہوں۔ وہ ہی ہو گیا ہے۔ مئی جون کا نکلا تھا۔ اب جولائی اگست کا نکلے گا۔ عرشی صاحب کا خط آیا تھا۔ مضمون کی نقل بھجوا دی ہے۔ آج آزاد صاحب کا بھی خط آیا ہے اور خوش خبری بھی ملی ہے مگر سمندر سے شبنم ملنے والی بات ہے۔ گذشتہ سال ہی کی رقم منظور ہوئی۔ حالانکہ اس سال کے موازنے میں بھی خسارہ ہے۔ بہر حال آزاد صاحب کا شکریہ ادا کر دیجئے۔ اشفاق صاحب کا پتہ لکھئے تاکہ ان کو بھی لکھ سکوں۔ عرشی صاحب کمیسیٹی کب رکھیں گے؟ لکھئے تاکہ پہلے سے پروگرام بنا سکوں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۳) یکم مئی ۱۹۵۸ء

محب مکرم

میں آپ کا پتہ بھول گیا۔ آپ نے بھی خط نہیں لکھا۔ آخر ڈاکٹر فاروقی صاحب کو لکھا کہ پتہ لکھئے۔ آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ میرے پاس آیا تھا۔ اس کو پڑھ کر آپ کی لیاقت، محنت اور عزت میری نگاہ میں بڑھ گئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ فوراً شائع کی جائے۔ اور اس اہم کام پر آپ کو انعام بھی ملے، ڈگری کے علاوہ۔ ہمارے یہاں مقالوں پر ممتحن کی رائے انگریزی میں آتی ہے، وہاں کیا قاعدہ ہے۔ عرشی صاحب سے فون پر معلوم کیجئے کہ وہ ویزا کے سلسلے میں وزارت خارجہ گئے تھے یا نہیں۔ ان کے جواب کا بے صبری سے انتظار ہے۔ فاروقی صاحب سے معلوم ہوا ہے زبانی امتحان کی ضرورت نہیں۔ البتہ مئی میں ایڈوائزری بورڈ کا جلسہ ہے۔ آؤں گا اور بالمشافہ مبارک باد دوں گا۔ آزاد صاحب کو میرا خط ملا یا نہیں؟

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۴)

۱۹ اگست ۱۹۵۸ء محب مکرم

رات یونی ورسٹی کا تار آیا کہ ۲۸ کو کمیٹی ہے۔ پہلے دن فاروقی صاحب کے یہاں رہوں گا۔ وضعداری کا تقاضا ہے۔ آزاد صاحب ۲۶ کا دن میرے لئے محفوظ رکھیں۔ ان کے روفی صورت والے دوست سے وزارت تعلیم میں ملنا ہے۔ آپ کو اطلاعاً لکھ رہا ہوں۔

مخلص زور

(۵)

۱۵ ستمبر ۱۹۵۸ء عزیز مکرم

بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹریٹ کا اعلان ہو گیا۔ اب آپ کے روشن مستقبل کا آغاز ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی کو بھی یہ خبر سنائیے۔ وہ بھی خوش ہوں گے کیونکہ آپ کے قدردان ہیں۔ ان سے ملیں تو کہئے کہ آندھرا گورنمنٹ ادارے کی عمارت کے لئے مدد دے رہی ہے۔ انھوں نے شرط لگائی تھی کہ آندھرا دے تو حکومت ہند دوسری قسط دے گی۔ نقل انھیں کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ آپ مل کر کہئے کہ اردو دنیا کی نظر میں ادارے کی عمارت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اس کا جلد مکمل ہونا ضروری ہے۔ حکومت ہند سے ۲۵ ہزار کی مطلوبہ رقم کا جاری ہونا ضروری ہے، وغیرہ۔ آپ ان سے جلد ملئے۔ آپ کی گفتگو کا اثر ہوگا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۶)

۸ اپریل ۱۹۵۹ء عزیزی نارنگ صاحب! گذشتہ بار دہلی آنے سے پہلے میں نے آپ کو اور میر حسن کو ایک ساتھ خط ڈالے۔ میر حسن سے ملاقات ہوئی، آپ سے نہیں۔ میں نے خیال کیا آپ دہلی میں نہیں ہیں۔ میں ۲۲ اپریل کو دہلی آ رہا ہوں۔ شاید بیگم صاحبہ بھی ساتھ آئیں۔ وہ اپنی لڑکی سے ملنے بمبئی جانا چاہتی ہیں۔ ۲۲ کو یونی ورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان ہے۔ آپ کو علم ہوگا۔ باقی بالمشافہ۔ آزاد صاحب بھی آپ کے عدم وجود سے ناواقف تھے۔ عرش صاحب سے بھی پوچھا۔ ہر ایک سے پوچھا۔ آخر یہی خیال ہوا کہ آپ دہلی میں نہیں۔

سید محی الدین قادری زور

(۷)

۱۲ جون ۱۹۵۹ء محب مکرم

کارڈ اور فارم مل گیا۔ آزاد انسٹی ٹیوٹ پر آپ کا مضمون کب چھپ رہا ہے۔ یاد دہانی کرائیے۔ خدا کرے یونی ورسٹی میں آپ کا انتخاب ہو جائے تو آپ اطمینان سے کام کر سکیں۔ آپ دہلی میں ادارۂ ادبیات اردو کے سفیر ہیں۔ "سب رس" کی مجلس ادارت میں آپ کا نام شامل کر رہا ہوں۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۸)

۲۳ ستمبر ۱۹۵۹ء عزیزی ڈاکٹر نارنگ۔ آپ کا کرم نامہ ملا۔ بڑا افسوس ہوا کہ آپ نے دو گھنٹے اسٹیشن پر زحمت فرمائی۔ میں نے ڈاکٹر فاروقی کو اطلاع دے دی تھی کہ نہ آ سکوں گا۔ معلوم ہوتا ہے وہ آپ کو نہیں بتا سکے۔ اس زمانے میں خانقاہ میں عرس تھا اور میرا موجود رہنا ضروری تھا۔ عرش صاحب سے کہیئے کہ کبھی تو لکھیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اب کے انھوں نے نہیں لکھا اور میں نہیں آ سکا۔ جب وہ خود لکھتے ہیں تو آنا ہو ہی جاتا ہے۔ کرپلانی صاحب فرانس سے واپس ہوئے یا نہیں؟ آپ حیدرآباد کب آ رہے ہیں؟ آجکل قاضی عبدالودود بھی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ خلیق انجم کے دوست اسلم صاحب اب کیا کر رہے ہیں۔ اگر معلوم ہو تو مطلع کریں۔

مخلص، سید محی الدین قادری زور

(۹)

۲ فروری ۶۰ء محب مکرم

ساہتیہ اکادمی کی کونسل میں شرکت کے لئے ۱۳ فروری ہفتہ کی صبح دہلی پہنچ رہا ہوں۔ ۱۵ فروری کو آپ کے لئے خریداری کرنا ہوگی۔

اور اسی روز واپسی ہے۔ تذکرہ جلد پنجم اور صبائی سخن وغیرہ آپ کے لئے لا رہا ہوں۔ چند جلدیں وہاں کتب فروشوں کو بھی دوں گا۔ اتوار کے دن فرصت ہے۔ کوئی ادبی یا سیاحتی منصوبہ بنا کر رکھئے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۰)

۷ مئی ۶۰ء مخدوم مکرم

آپ کے خط ملے تھے۔ میں خود جواب نہ دے سکا۔ دفتر سے وقار خلیل نے جواب دیئے تھے۔ آج ذرا فرصت ملی تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ حیدرآباد آنے والے تھے۔ کب ارادہ ہے۔ حیدرآباد ضرور دیکھنا چاہیئے۔ آج کل چھٹیاں ہوں گی۔ کیا معروفیت ہے؟ میں بھی لاہور جانے والا تھا مگر گرمی کی شدت سے ارادہ ملتوی کر دیا۔ یوں بھی ایوان اردو کے ابھی بہت سے کام ترتیب وغیرہ کے باقی ہیں۔ انہیں میں مصروف ہوں۔ آج کرپلانی صاحب اور حسن ثانی نظامی صاحب بھی آئے تھے۔ شام کو اقبال اکیڈیمی کی جانب سے یوم اقبال منایا گیا۔ افتتاح گورنر کرالا ڈاکٹر کرشنا راؤ نے کیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ وہاں کے حالات سنائیے۔

مخلص۔ سید محی الدین قادری زور

(۱۱)

۳۱ اگست ۱۹۶۰ء محب مکرم

آپ کا خط موخہ ۲۰ اگست ملا اور روش صاحب کی غزل بھی۔ شکریہ۔ تعجب ہے کہ میرے خط آپ کو نہیں ملے۔ ہے۔ سہیل صاحب کو آپ نے لکھنے کے لئے فرمایا ہے مگر ان کا پتہ نہیں لکھا۔ پتہ ملے تو میں ان کو خط لکھوں۔ کشمیر کا ابھی کچھ معلوم نہیں۔ آزاد صاحب کا نوٹ PEN نہیں دیکھا یہ ادارے میں نہیں آتا۔ اب وہ کیونکر نظر سے گذرے۔ آپ سب رس کے لئے جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لئے شکر گذار ہوں۔ اس کی توقع تھی۔ یہ ترقی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ماہ کا پرچہ اسی مہینے کی ۱۰ تاریخ تک نکل جائے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۲)

۱۴ اکتوبر ۶۰ء محب مکرم

آپ کہاں ہیں۔ میں نے پہلے بھی ایک کارڈ لکھا تھا جواب ندارد۔ رسالہ کا وی پی کو رسید دستخط کر کے بھیج دی تھی مگر ابھی آیا۔ چیک نہیں آیا۔ رسید وصول کر لی اور چیک غائب۔ آزاد صاحب کا بھی کوئی خط نہیں ملا۔ آپ آج کل کیا کر رہے ہیں اور کہاں رہتے ہیں مطلع کیجئے۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۳)

۲۶ ستمبر ۶۰ء محب مکرم

آپ کے ۱۷، ۲۰ اور ۲۱ ستمبر کے خطوط پیش نظر ہیں، شکر گذار ہوں۔ کرپلانی صاحب کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اب دسمبر میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ رہا کشمیر کا معاملہ۔ وہاں تو مکمل سکوت ہے، کوئی مراسلہ یا خط آئے تو غور کروں۔ آزاد صاحب کا خط اب تک نہیں آیا۔ ان سے کہئے کہ مجھ سے مراسلت نہ رکھیں گے تو دوسری جگہ سے مراسلت بند کرا دوں گا۔ آپ کے نئے کام کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ پہلے کسی کتاب زیر اشاعت ہونے کا ذکر تھا، وہ اب تک چھپی یا نہیں؟

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۴)

۲۰ اکتوبر ۶۰ء محب مکرم

دیوالی مبارک ہو۔ آپ کا خط ملا اور اس کے دوسرے روز چیک بھی آگیا۔ اس کے لئے جو زحمت ہوئی۔ شکر گذار ہوں۔ آزاد صاحب سے آپ لاکھ کہیں وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ ان کے دوست کے کامیاب آپریشن کی اطلاع بھی ان کو دی ہے اور ان کی خاطر دواخانے جاتا رہتا ہوں۔ منسٹری آف کلچرل افیرس سے معلوم کرائے کہ ان سائیکلوپیڈیا کی گذشتہ سال کی باقی امداد اور سال رواں کی جدید امداد ابھی تک نہیں ملی۔ کام رکا پڑا ہے۔ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی امداد بھی جاری نہیں ہوئی۔ جلد کچھ کرائیے۔ ورنہ یہ بے نوت مرجائے گا اور آپ کو مرثیہ لکھنا پڑے گا۔ ادارۂ ادبیات اردو کو گذشتہ سال ڈھائی ہزار روپے ملے تھے۔ امسال درخواست دی ہے کہ اس میں اضافہ کیا جائے اور گوپال ریڈی صاحب کو لکھا ہے کہ وہ کوشش کریں۔ آپ مل کر یاد دلائیے۔ آپ ٹیکسی میں سب جگہ گھومئے۔ اخراجات ادارہ ادا کرے گا۔ آپ وہاں ادارہ کے سفیر اور نمائندے ہیں۔ عرش صاحب سے کہئے ۲۷ دسمبر کا جلسہ رکھیں۔ واپسی میں ہند پاک مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے سب ایک ساتھ حیدرآباد آئیں گے۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۵)

۱۹ جنوری ۶۱ء محب مکرم

کرم نامہ مورخہ ۱۰ جنوری ملا۔ میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبات اور مہمانوں سے ابھی فارغ ہوا ہوں۔ مصروفیت کی وجہ سے جلد جواب نہ دے سکا۔ کام کلاکی قیمت اتنی زیادہ معلوم نہ تھی۔ بعد میں اطلاع دوں گا۔ یا اگر خریدوں گا۔ کشمیر والوں نے ابھی کچھ نہیں لکھا۔ سرور صاحب نے کانفرنس کے لئے دعوت دی ہے۔ ساہتیہ اکاڈیمی کا اجلاس بھی ہونے والا ہے۔ اگر دونوں کے درمیاں زیادہ دن نہ ہوں تو مخل کھڑا ہوں گا۔ اب تو رخصت کا جھگڑا بھی نہیں رہا۔ منتظر جواب مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۶)

۱۶ فروری ۶۱ء محب مکرم

آج صبح ایک خط لکھا تھا۔ اس کے بعد دعوت نامہ مل گیا۔ اب خدا کو منظور ہوا تو ۲۶ مارچ کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ انڈو پاکستان کانفرنس میں بھی شرکت کا خیال ہے۔ اور اس کی نمائش کے لئے ۱۹۴۷ء کے بعد کی مطبوعات ادارہ لیتا آؤں گا۔ آپ وہاں متعلقہ ایجنسیوں نمائش سے کہہ دیجئے۔ شاید تابان صاحب ہیں۔ آزاد صاحب کا خط آیا تھا کہ اپریل میں ان کے محکمے کی جانب سے انیسویں صدی کے اخبارات و رسائل کی نمائش ہو رہی ہے اگر وہ اپریل کے پہلے ہفتے میں ہو رہی ہے تو اس کے لئے ۱۹۰۰ء سے قبل کے بیسیوں اخبار و رسائل کی جلدیں لا سکتا ہوں۔ اگر دیر میں ہو رہی ہو تو فوٹو دیئے جا سکتے ہیں۔ آزاد صاحب کو مطلع کر دیجئے۔ اگر یہ خط وقت پر پہنچے تو جواب دیجئے۔ میں یہاں سے ۲۴ کی رات کو نکلوں گا۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۷)

۱۶ مئی ۶۱ء محب مکرم

کرم نامہ مورخہ یکم مئی مل گیا اور مبارک باد کا تار بھی۔ شکریہ۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ آپ آتے تو حیدرآباد کی ایک شادی بھی دیکھ لیتے۔ کشمیر سے احکام آئے ہیں۔ عید کے بعد نکلوں گا۔ ٹھیک تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔ خوشی ہوئی کہ آپ لسانیات کے امتحان سے نمٹ گئے اور پرچے اچھے ہو گئے ہیں۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۸)

۱۹ مئی ۶۱ء عزیز مکرم

میں نے یہاں سے سری نگر تک کا راست ٹکٹ لے لیا ہے۔ ۲۶ مئی کو یہاں سے نکل رہا ہوں۔ اور خدا کو منظور ہوا تو ۲۸ کو صبح دہلی پہنچوں گا۔ اور کیا لکھوں۔ بہت مصروف ہوں۔ جا بجا یا گھر چھوڑ کر نکلنا آسان نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ بعد میں آئیں گی۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۹)

جون ۱۹۶۱ء۔ تلسی باغ (منفصل سولنا) سری نگر۔ محب مکرم

اب میں نئے مکان میں منتقل ہو گیا ہوں۔ پتہ درج ہے۔ براہ کرم اس پتے پر مراسلت کیجئے۔ میری بچیاں شنبہ ۱۵ر جولائی کو صبح یہاں سے حیدر آباد کے لئے نکل رہی ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو پٹھان کوٹ سے آنے والی گاڑی پر پہنچئے اور انھیں حیدر آباد جانے والی گاڑی پر سوار کرا دیجئے۔ سب رس کا شکوبہ نمبر تو اچھا نکلا ہے۔ مبارک ہو۔ آپ کے مساعی کی داد دیتا ہوں اور متوقع ہوں کہ اسی طرح دلچسپی جاری رہے گی۔ مصباح الدین شکیل صاحب، امید ہے آپ سے ملے ہوں گے۔ آپ ذرا تفصیل سے خط لکھا کیجئے تاکہ آپ کی مصروفیات اور دوست احباب کے حالات معلوم ہوتے رہیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

سری نگر ۱۴ر جولائی ۶۱ء۔ محب مکرم (۲۰)

میں گو رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اپنی مصروفیتوں اور پریشانیوں کے باوجود آپ کے پتے سے غافل نہیں ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی وقت غفلت میں کچھ اور لکھ گیا ہوں۔ آپ کا وہ خط مجھے مل گیا تھا جس میں ارشد قدوائی کی ملاقات کا ذکر تھا۔ آج کل یہاں بڑی گرمی ہے۔ ..... مخلص

سری نگر ۴ر ستمبر ۶۱ء جناب نازنگ صاحب ! (۲۱) سید محی الدین قادری زور

یہاں یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ریڈر ہو گئے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو میری دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ یہ شکوہ ہے کہ آپ نے مجھے اس خوش خبری سے کیوں محروم رکھا۔ امید ہے کہ آپ کے گھر میں سب بخیریت ہوں گے۔ میں نے حیدر آباد سے ایک شکریہ نامہ بھیجا تھا اس کی رسید بھی نہ ملی۔ مخلص

(۲۲)

سید محی الدین قادری زور

۱۳ر ستمبر ۶۱ء عزیز مکرم سلمہ آپ کا خط ملا اور خوش خبری لایا کہ آپ انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے سری نگر آ رہے ہیں۔ سری نگر آپ میرے یہاں ٹھیریں۔ جگہ چھوٹی سی ہے۔ مگر مسافرت کے عالم میں گذر جائے گی۔ کوشش کروں گا کہ آپ کی بیگم اور بچہ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ کو ہو تو ہو۔ یہاں کے شعبۂ اردو کی طرف سے اردو کی علمی و ادبی کتب میں شائع کرنے کی اسکیم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ سے مشورہ کروں گا۔ کشمیر یونی ورسٹی میں آپ کو تقریر بھی کرنا ہوگی۔ مخلص

(۲۳)

سید محی الدین قادری زور

۱۸ر نومبر ۱۹۶۱ء محب مکرم۔ آپ کا کرم نامہ مورخہ ۱۱ر نومبر ملا۔ شکر گذار ہوں کہ آخر آپ نے یاد فرمایا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ میرے یہاں بار بار لکھنے کے باوجود نہیں ٹھیرے۔ شاید یہاں اتنی سردی نہ لگتی اور آرام سے رہ سکتے۔ میں پچھلے ہفتے جموں چلا گیا تھا۔ یکم نومبر سے یہاں کی سرکار اور دفاتر جموں منتقل ہو گئے ہیں۔ آج واپس آیا تو یہ خط ملا۔ راستے میں ایک ایک فٹ برف ہے۔ گاڑیاں پھسل رہی ہیں۔ ۲ دسمبر کے پہلے ہفتے میں نکلنے کا ارادہ ہے۔ دعا فرمائیے کہ خیر و عافیت سے یہ پل صراط پار کر سکوں۔ بڑی سخت سردی ہے۔ دلی آنے کے لئے نہ ہوائی جہاز میں سیٹ مل سکی نہ بس میں۔ ناچار بے بس ہو کر بیٹھ رہا۔ آپ سے شرمندہ ہوں۔ دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں انتظامی مصروفیات روز بروز بڑھ رہی ہیں اور سردی ان سے بھی زیادہ۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے اور فرزند ارجمند کا کیا حال ہے۔ ہم سب خیریت سے ہیں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۴)

۱۲ر فروری ۶۲ء محب مکرم نارنگ صاحب

حیدر آباد آنے کے بعد بے انتہا مصروف ہو گیا ہوں۔ آپ کو یہاں کے رسالے اور کتابیں ملی ہوں گی۔ پرسوں ایک انگریزی کتاب بھی بھیجا ہے۔ حسب خواہش کاغذ پر دستخط کر کے بھیج رہا ہوں۔ میں ۲۴ر فروری کو دہلی آ رہا ہوں اور ۲۵ر کو صبح بذریعہ موٹر کار جمبون کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ کے لندن جانے کا کیا ہوا۔ معلوم ہوتا ہے آپ بھی ہر بات راز میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یکایک چلے جائیں گے اور بعد میں معلوم ہو گا۔ میں بے حد مصروف ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۵)

سری نگر ۲۸ر اپریل ۱۹۶۲ء مجتبیٰ نارنگ صاحب

ایک خط پہلے لکھ چکا ہوں، ملا ہو گا۔ مجموعے کے لئے ایک اور مضمون بھیج رہا ہوں۔ اس کو بھی شامل کر لیجئے اور اطلاع بخشئے کہ اس کا کام کس منزل تک پہنچا۔ کتابت کتنی ہوئی؟ آپ کا مقدمہ تیار ہو گیا کہ نہیں۔ مجھے بھی تو دکھائیے۔ رومی اور اقبال والا مضمون بھی شامل کر لیجئے۔ اور یہ بھی۔ وہ مضمون آخر کہاں بھیجا ہے۔ مگر اس کی نقل رکھ لینی چاہیئے تھی۔ جواب کا منتظر مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۶)

سری نگر ۵ر جون ۱۹۶۲ء۔ محب مکرم

آپ کا کرم نامہ مورخہ ۲۶ مئی یہاں آیا تھا اور میں حیدر آباد اسی روز نکلا تھا۔ واپسی پر خط دیکھا۔ میں نے حیدر آباد میں ادارے کی طرف سے اس کی اشاعت کا تصفیہ کر لیا تھا۔ مگر اب پبلشرز راضی ہے تو وہیں شائع کرائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دلی کی طباعت ہو۔ وہاں کی طباعت کی بات نہیں اور نہیں قیمتی بک ڈپو نے چار سو ایڈیشن کے دیئے تھے۔ اب یہ رقم طے تو منصف آپ لیں۔ آپ کا مقدمہ کہاں ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کتابت طباعت دلی میں ہو اور اس کے اخراجات قیمتی بک ڈپو ادا کرے اور کتابیں اٹھائے۔ غرض یہ لکھ کر دیکھئے اور کچھ رقم پیشگی کتابت اور کاغذ کے لئے منگوا لیجئے۔ میں آج ہی حیدر آباد سے آیا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ میرا مضمون "اردو اور قومی یک جہتی" آپ کو ملا یا نہیں۔ اس مضمون کو شریک کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہاں یہ بھی تو لکھئے آپ نے ترتیب کیا رکھی ہے۔ مضامین کی جو ترتیب ہے، اس کی نقل (یعنی فہرست) جلد بھجوائیے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲۷)

۲۲ر جون ۶۲ء محب مکرم زاد لطفہ۔ کرم نامہ مورخہ ۲۰ر جون کل شام کو ملا۔ بڑے انتظار میں تھا اور خوشی ہوئی کہ آپ نے تفصیل سے لکھا۔ میں نے کل ہی شکیل صاحب کو لکھا ہے کہ آپ کو یاد دلائیں۔ ان کے لئے آپ نے پی ایچ ڈی کا بہت اچھا موضوع منتخب کیا ہے۔ مبارک ہو کہ آپ اب اتنے دیدہ ور ہو گئے ہیں۔ اب قیمتی بک ڈپو سے معاملہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ نقد رقم آپ کو بھی اس محنت اور دوڑ دھوپ کے معاوضے میں ملے۔ جب آپ یہ نہیں لینا چاہتے تو پھر کتاب ادارے ہی کی طرف سے چھپے گی۔ میں نے شاید پہلے لکھا ہے کہ ختم مئی پر حیدر آباد گیا تھا تو ادارے کی مجلس انتظامیہ میں طے کرا آیا تھا کہ میرا ایک مجموعہ آپ کی ادارت میں دلی میں چھپے گا۔ اس طرح اب کاغذ اور کتابت کے لئے کتنی رقم درکار ہو گی، فوراً لکھ بھیجئے۔ میں چیک بھیج دوں گا یا نقد۔ آپ نے اردو اور ہندی والے مضمون کو بھی شریک کرنے کے بارے میں پوچھا ہے۔ یہ مضمون آکر کشمیر سے پہلے نقوش کے لئے لکھا تھا۔ چند ماہ ہوئے محکمہ زبان پٹیالہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اردو، ہندی اور پنجابی پر ایک مقالہ لکھوں۔ چنانچہ اسی مضمون کو مناسب اضافے کے بعد ان کے یہاں بھیج دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی نقل بھیج دوں۔ ریڈیو کشمیر سے میری ایک تقریر "اردو شاعری میں انسان دوستی" اور ریڈیو حیدر آباد سے "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظ

ہو رہی ہیں۔ آپ فرمائیں تو یہ دونوں بھیج دوں۔ اس دوران میں کئی اور مضمون لکھے۔ یعنی چند یاد ہیں، بحر العلوم عبدالقدیر صدیقی، عبدالرحمٰن خاں کیا ان کی نقلیں آپ کو ملیں؟ کون کون سے مضمون آپ کے یہاں ہیں، اگر زحمت کر کے فہرست بھیج دیں تو عنایت ہوگی اور مذکورہ مضمونوں میں سے جس کی نقل کی ضرورت ہو یا جس کو آپ شامل کرنا چاہیں، اس کا نام لکھ بھیجیں۔ وہ بھی بھیج دوں گا۔ آپ کے دوست غلط کہتے ہیں۔ میں نے ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی سانیات لکھی تھی۔ اور اس میں پہلی بار اکثر و بیشتر سانیاتی اصطلاحوں کے ترجمے کئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کے سلسلے میں سانیاتی اصطلاحیں مرتب کر کے ماہرین کو بھجوائی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر سید صفیر ورا نے ان کی توثیق کی تھی اور مشورے دیئے تھے۔ آپ کے مقدمہ کا انتظار ہے۔ محمد بن عمر کی کتاب آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ اردوئے معلیٰ کے دو آف پرنٹ مل چکے ہیں۔ اگر کچھ اور ہوں تو بھجوائیے۔ اور کیا لکھوں، آپ تو بہت مصروف رہتے ہیں؟ اور میں جب سنتا ہوں دعا کرتا ہوں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی المناک وفات نے برصغیر کی علمی اور ادبی بساط سے ایک جید عالم محقق اور ادیب کو اٹھا لیا ہے اور علمی اور ادبی فضاؤں پر تاسف کی لہر چھا گئی ہے۔ مرحوم ہماری اکیڈیمی کے مرکزی کمیٹی اور مختلف سب کمیٹیوں کے ممبر اور سرگرم کارکن بھی تھے۔ دوسرے ادبی اداروں کے ساتھ اکادمی بھی شریک غم ہے۔ اور مرحوم کو خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے "شیرازہ" کا آئندہ شمارہ زور نمبر کی صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ خصوصی شمارہ ان کی حیات اور افکار کی ایک مستند دستاویز کی حیثیت سے شایع ہو۔

علی جواد زیدی

سکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس،

کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر

بنام عارف الدین حسن صاحب

(۱)

۱۳ جون ۱۹۶۱ء

محب محترم زاد لطفہ

تسلیم مع التکریم

کرمنامہ مورخہ ۹ جون نے شاد کام کیا۔ یاد آوری کے لئے شکر گذار ہوں۔ میں یہاں خیریت سے پہنچ کر ابھی ٹورسٹ سنٹر میں مقیم ہوں۔ کئی مکان دیکھے مگر ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا۔ اردو کی خدمت کے ذوق نے اس دور دراز علاقہ میں غریب الدیار بنا کر پہنچایا ہے۔ دعا فرمائیے کہ اردو والوں کی کچھ خاطر خواہ خدمت کر سکوں۔ یہاں اب تک پی ایچ ڈی کا کچھ انتظام نہ تھا۔ میری آمد کے بعد آٹھ خواتین و اصحاب نے درخواستیں دی ہیں۔

کشمیر اردو اکیڈیمی کے قیام کے لئے بھی کوشاں ہوں۔ انشاء اللہ جلد اس کا افتتاح عمل میں آئے گا۔

یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ اردو والے اور خاص کر مسلمان ہر جگہ سست گام اور آہستہ خرام واقع ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے حیدرآباد ہی کچھ تیز گام نظر آتا ہے جہاں آپ جیسے مخلص اور مستعد اصحاب اس گئے گزرے زمانے میں بھی موجود ہیں۔

میں ۲۱ جون کو ذریعہ ہوائی جہاز بمبئی جا رہا ہوں وہاں سے ۲۴ کو حیدرآباد پہنچوں گا۔ آپ اتوار ۲۵ کو مجھے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع عطا فرمائیں تو باعث کرم ہوگا۔ ۲۶ کو وہاں سے واپس ہوں گا اور ۲۸ کو سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ انشاء اللہ باقی بالمشافہ

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲)

۹ تلسی باغ۔ سری نگر

۷-۴-۶۲ء

مولانائے محترم زاد مجدکم

السلام علیکم

کرم نامہ مورخہ ۲۲ رپاچ یہاں آیا۔ اور میں ۲۱ کو جموں گیا اور وہاں سے دلی۔ آخر ۲ اپریل کو واپس ہوا۔ اس لئے جواب

لکھنے میں تعویق ہوئی۔ معافی کا خواستگار رہوں۔
دلی میں گرمی تھی۔ اور یہاں پہنچا تو پھر برف خانہ میں بند ہو گیا۔ بلا کی سردی ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے صحت و عافیت سے رکھے۔ آسمان پر بادل ہیں۔ دن کے وقت ایسی تاریکی ہے جیسے وہاں صبح ۶ بجے صبح ہوتی ہے۔
ایسے موسم اور ایسی سردی میں کیا کام ہوگا۔ اور میں کام کا بندہ ہوں۔ اور خدا نے مزدور پیدا کیا ہے۔ اور قسمت میں کام لکھا ہے۔ میں یہاں ہوں مگر دل آپ لوگوں میں رہتا ہے۔
چھوٹے گودام کا کام اب تک مکمل ہو گیا ہوگا۔ جو بیکار ردی نکلے (اس کو جانچ کر کہ سب بیکار کاغذ ہیں) فروخت کرا دیجئے۔ اور ہر چیز درج رجسٹر کرا دیجئے۔
امید کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی اور آپ ہمیشہ کی طرح ادارے کے کاموں میں دلچسپی اور رہبری فرماتے رہیں گے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۳)

۹ تلسی باغ۔ سری نگر
۸ مارچ ۶۲ء روز عید

مولانائے محترم زاد لطفہٗ
السلام علیکم۔ عید مبارک۔
ابھی جامع مسجد سے نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ شیر خرما تیار ہو رہا ہے۔ خیال آیا کہ آپ کو عید کی مبارک باد بھی نہیں بھیجی اور نہ کارڈ کا جواب دیا۔
یہاں بلا کی سردی ہے۔ تین روز سے بارش ہو رہی ہے۔ اس لئے عیدگاہ میں نماز نہیں ہو سکی۔ آج بارش نہیں مگر سردی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم اور تقدیر کے جتنے منتظر یہاں کے لوگ ہیں شاید ہی کوئی ہوں۔ راستے بند نہ ہوائی جہاز چلتے ہیں نہ بسیں۔
آپ جو دلچسپی ادارے کے کاموں میں شروع سے لیتے رہتے ہیں اس کے لئے ہمیشہ شکرگذار رہا ہوں۔ کھاتے مکمل ہو چکے ہوں گے۔ اب غلام دستگیر کمپنی سے آڈٹ کرا کے فوراً حکومتوں کو ادا دکے لئے لکھنا ہے تاکہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑے۔
امتحانات کا نتیجہ تو اخبارات میں شائع فرما چکے ہوں گے۔ وقار صاحب سے کہیئے کہ سیاست پہلی مارچ کا یہاں آنے کے بارے میں کہا تھا۔ مگر اب تک نہ آیا۔ پھر وہاں تاکید کیجئے۔ بلکہ تحریری مراسلہ لکھوائیے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

بنام ممتاز حسن صاحب صدر ترقی اردو بورڈ کراچی

(۱)

یونیورسٹی آف جموں اینڈ کشمیر سری نگر

۵ر جون ۱۹۶۱ء

محب محترم۔ تسلیم

ایک عرصے کے بعد آپ نے یاد فرمایا اور آپ کا خط حیدرآباد ہوتا ہوا یہاں پہنچا۔ شکر گذار ہوں۔

میں مئی میں یہاں آگیا اور اردو کی خدمت میں منہمک ہوں۔ ایک "کشمیر اردو اکیڈیمی" بھی بنا رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ اردو ادب اور زبان کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو سکے۔

آپ جیسے اصحاب وہاں اردو کے لئے جو کچھ توجہ فرما رہے ہیں غنیمت ہے مگر ضرورت ہے کہ مزید توجہ منعطف ہو۔

مدی را تیز نرمی خواں چو محفل را گراں بینی

سنا کہ مولوی عبدالحق صاحب علیل ہیں اور دواخانہ میں زیر علاج۔ اگر ان کی علالت کی نوعیت اور موجودہ حالت سے اطلاع بخشیں تو کرم ہوگا۔

میرے بارے میں آپ جو کچھ سنتے ہیں وہ حقیقت سے زیادہ ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ شاید صاحب حیدرآباد میں بہت مصروف رہتے تھے۔ وہاں ان کی علمی و ادبی مصروفیت کے کوئی ثبوت وہاں کے رسائل و جرائد میں نہیں ملتے۔

امید کہ کبھی کبھی اس طرح یاد سے شاد فرمایا کریں گے۔ مذکورہ بالا پتہ کافی ہے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

بنام سید مبارز الدین رفعت

(۱)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔

محب مکرم۔ کرم نامہ ملا۔ مضمون وصول ہوا۔ دونوں کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پہلے کا مضمون نہیں ملا۔ اس طرح کے مضامین پابندی سے بھیجواتے رہیئے۔ اس کے بعد سب رس بھی پابندی سے آپ کو ملتا رہے گا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور ۲۵/۹/۵ء (۲)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ عزیز مکرم۔ آپ کا تفصیلی خط مل گیا۔ اور انشاء اللہ سفارش کروں گا۔ بمبئی سے واپسی پر۔ میں ۲۴ کی رات میں یہاں سے نکل رہا ہوں۔ گاڑی تو گاڑی بڑی رات میں پہنچتی ہوگی۔ سب رس کے لئے مضامین بھیجئے۔ اور اس کے لئے خریدار بھی وہاں بنائیے۔ آپ حیدرآباد کب آرہے ہیں؟ مخلص

سید محی الدین قادری زور (۳)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ آپ کا خط مل گیا۔ شکریہ۔ یا فعی صاحب کی ملاقات کا حال معلوم ہوا۔ ابھی ان کے یہاں سے اطلاع نہیں ملی۔ اگر ملے تو ضرور جاؤں گا۔ جولائی کی کمیٹی کی ابھی تک تاریخ نہیں آئی۔ میں جاؤں گا تو ضرور آپ کے نام کوئی کتاب ترجمہ کرنے کے لئے ضرور مقرر کرا کے وہیں سے اطلاع بھجواؤں گا۔ بے فکر رہیں۔

پن چکی کی اشاعت ابھی نہیں ہوئی۔ انتخابات کے کام میں پریس مصروف تھا۔ کل پرسوں شاید اس طرف توجہ کرے۔ آپ کا مضمون معارف میں بھی آگیا ہے۔ ملا ہوگا۔ سنا ہے کہ تعلیمات میں کمیٹی ہوئی اور اتنی ہی امداد منظور ہوئی جو گذشتہ سال ملی تھی۔ اضافہ ہوتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ آپ نے اس مرتبہ ادارے کے لئے جو بہمدردانہ سعی فرمائی، اس کے لئے دل سے شکرگذار ہوں۔ گلبرگہ کے بعض پرانے گھروں میں تلاش کیجئے۔ ممکن ہے کوئی قلمی کتابیں یا کاغذات مل جائیں۔ یہ ادارے کی بڑی خدمت ہوگی۔ ضرور اس طرف توجہ فرمائیں۔

آپ نے خانقاہ کے کتب خانے کے لئے کچھ کتابیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی ابھی نہیں ہوا۔ آپ کا نام بھی بطور معطی وہاں فہرست میں چھپے گا۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اور کتابیں تلاش کرتے رہیں گے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور ۲۶/۶/۲۷ء (۴)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ عزیزی رفعت صاحب۔ مخمس وصول ہوا۔ شکریہ۔

ایک غزل بھی بھیج سکیں تو مزید عنایت ہوگی۔ آپ کی کتاب چھپ گئی ہے۔ آپ کو اس خط کے ساتھ مل جائے گی۔ کہئے کون اس کے نسخے خریدنا چاہتا تھا؟ فوراً ان کو لکھئے کہ ختم نومبر سے پہلے کام ہو جیسا کہ آپ کا خیال تھا۔

اب آپ یہاں کن چھٹیوں میں آئیں گے؟

خواجہ بندہ نواز پر ایک مبسوط (علمی انداز میں) مقالہ کئی سو صفحات کا لکھئے۔ ان کے مرشد نصیر الدین چراغ دہلوی کی بھی ایک ہندی کتاب

اردو رسم خط میں مجھے مل گئی ہے جس سے اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز ہی کی کتاب ہوگی ؎

ایں سلسلہ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

اگر آپ ان پر لکھیں تو بجائے خود دکن کے چند بڑے عوامی خدمت گزاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی ———

تازہ خواہی داشتن ایں داغ ہائے سینہ را!

ایک بات یہ بھی ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ علمی و ادبی کام کو ذریعہ آمدنی نہ بنائیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ملازمت اور باعزت ملازمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ کچھ کام محض علم و فن کی خاطر کیجیے۔ دولت و عزت خود بخود ملتی جائے گی اور یہ عارضی چیزیں ہیں۔ دائمی چیز تو کام ہے اور کام خود انعام ہے۔

مخلص

(۵) سید محی الدین قادری زور ۱۲/۸/۶۶ء

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ عزیز مکرم۔ آپ کا خط۔ کارڈ اور شاہی کی غزل مل گئی۔ شکریہ۔ آپ کو رین چکی کی کتابیں ملیں یا نہیں۔ ٹائٹل پتلا لگ گیا۔ حضرت بندہ نواز پر ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے جو میری "حیات میر مومن" سے دوگنی ہو۔ محنت سے مواد جمع کیجیے۔ اچھا کام ہو جائے گا اور ہم خرا دہم ثواب۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے اور رفتار کار سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ کب آ رہے ہیں۔

مخلص

(۶) ۲۳/۱۱/۶۶ء سید محی الدین قادری زور

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ آپ کا کارڈ ۴ دسمبر کا۔ میں مدینہ، الہ آباد، دلی سے ابھی واپس ہوا ہوں اور بہت مصروف رہا۔ کتاب تو چھپ گئی، مگر اخراجات کچھ نکل آئیں تو دوسری کتابیں بھی چھپ سکتی ہیں۔ کوشش فرمائیے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز پر ضرور کام کیجیے۔ بہت عمدہ اور مفید کام ہوگا۔

مخلص

۱۲/۶۶ء سید محی الدین قادری زور (۷)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ کرم نامہ اور کارڈ وصول ہوئے۔ سب رس مندرجہ پتہ پر بھجوا دیا جائے گا۔ جمال الدین صاحب آج کل انفلوئنزا سے بیمار ہیں۔ نئے پرچے میں آپ کا مضمون بھی چھپا ہے۔ حیدرآباد میں آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس ہے۔ بہت سی باتیں کہنے کی تھیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز پر آپ نے مضمون مکمل کر لیا۔ بڑا اچھا ہوا۔ میں دیکھ لوں گا۔ سالار جنگ میوزیم کی کتاب ادارے سے کوئی نہیں خریدے گا۔ نہ بک ڈپو ہے نہ تشہیر ہے۔ آپ رائٹرس ایمپوریم بمبئی سے مراسلت کر کے ان کے پاس بھجوائیے۔

کوئی اور مضمون بھیجیے، اور کبھی کبھی خیریت سے مطلع فرماتے رہیے۔

مخلص

(۸) ۱۲/۶۶ء سید محی الدین قادری زور

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ محب مکرم۔ آپ کا خط ملا۔ میں خود آپ کو لکھنے والا تھا۔ مگر میری بیوی کو ہارٹ اٹیک ہو رہے تھے۔ بڑا پریشان رہا۔ اب کچھ روبصحت ہیں مگر عرصہ تک لیٹے رہنا ہوگا۔ میرے معمولات روزمرہ میں فرق آ گیا۔ اور کسی کو نہ لکھ سکا۔

ہمایوں کبیر کے جلسے کے کاغذات، خطبہ وغیرہ ملا تھا۔ میں آپ کو مبارک باد دینا چاہتا تھا۔ آپ نے کچھ نہیں لکھا کہ ان سے کیا گفتگو ہوئی۔ اور کچھ علمی کارروائی امداد وغیرہ کی ہوئی یا نہیں۔ لکھ تو دیجیے۔ باضابطہ درخواست کی شکل میں دلی کو۔ اور مجھے تفصیلات سے آگاہ کیجیے۔

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے فیلوشپ فل ٹائمرس (ہمہ وقتی) طلبہ کو دیئے جانے کا تصفیہ ہوا ہے۔ آپ کو ترتیب EDITING COMPILATION کا کام مل سکتا ہے۔

آپ نے جو تاریخ محمد قطب شاہی مرتب کی تھی وہ کہاں ہے؟ کس نوبت پر ہے؟ اس کی ترتیب کا معاوضہ دے کر اس کو چھپوایا جا سکتا ہے۔ پھر بھی فیلوشپ کے لئے درخواست دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ اصولاً میں منع نہیں کر سکتا۔ اگر دوسری درخواستیں اچھے لوگوں کی نہ آئیں تو آپ کو موقع مل جائے گا۔ جامعہ عثمانیہ کی درخواست پی ایچ ڈی کے فارم پر بھجوائیے۔

آپ کی جو دو کتابیں ادارے کی مارف سے طبع کے لئے لکھی ہوئی ہیں ان میں پرسی براؤن کی کتاب چھپ سکتی ہے۔ کیا اس کے لئے اجازت لینی پڑے گی؟ اور کیا اس میں تصویروں کے بلاک بھی ہیں؟ اطلاع بخشئے۔

امید کہ آپ کی صحت اچھی ہوگی۔ میں ۲ دسمبر کی چھٹیوں میں گلبرگہ اور بیجاپور کے لئے نکلنا چاہتا ہوں۔ سجادہ صاحب نے بھی آنے کی دعوت دی ہے۔ اگر بیگم صاحبہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں تو نکلوں گا۔ مخلص

(۹) ۱۳/۱۱ ۵۹ء سید محی الدین قادری زور

بنام محمد قلی قطب شاہ: دفتر ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد۔ حیدرآباد (اے پی) مورخہ ———

محبی۔ آپ کا کارڈ ملا۔ کمیٹی نے جو فارم تیار کرایا ہے مرسل ہے۔ اس پر درخواست بعد خانہ پری عالی کے سائہ بھجوائیے۔ ۴ فارم کے ہیں۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ میں پرسوں دلی جا رہا ہوں۔ دوسری ڈسمبر تک آجاؤں گا۔ آپ دفتر ادارہ کے پتہ پر فارم بھیج دیں۔ مخلص

(۱۰) ۲۰/۱۱ ۵۹ء سید محی الدین قادری زور

۹۔ تلسی باغ۔ سری نگر۔ محب عزیز سلمہٗ۔ کارڈ مورخہ ۲ راج وصول ہوا۔ میں یہاں آنے کے بعد سے متعدد کمیٹیوں میں بیحد مصروف ہوں۔ ۱۲ کو جموں جا رہا ہوں۔ اور پھر واپس آنے کے بعد ۲ کو دلی جاؤں گا۔ خیال ہوا کہ فوراً جواب دیدوں۔ اس لئے عجلت میں لکھ رہا ہوں۔

آپ کی علمی اور تحقیقاتی کاوشوں سے بڑی خوشی ہوتی ہے اور باوجود ناسازی مزاج کے آپ جو کام کرتے رہتے ہیں اس کا دلی قدردان ہوں۔ حضرت بندہ نواز رحمتہ اللہ علیہ کی اردو نظم و نثر کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ اور جب معراج العاشقین ان کے نام سے چھپی تو میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کسی عقیدت مند نے ان کی گفتگو یا فارسی رسالے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ مگر یہ محض شبہ ہے۔ اور چونکہ مولوی عبدالحق اس کو مان چکے تھے اس لئے اس کے خلاف کچھ کہنے یا لکھنے کے لئے باضابطہ ثبوت اور دلائل کی ضرورت ہے جو اب تک نہ مل سکے۔ یہی حال شکارنامہ، تلاوت الوجود اور رالاسرار کا ہوگا۔ اور جن تین رسائل کا آپ نے سراغ لگایا ہے ان کا شمار میں ایسے ہی منسوبہ رسائل میں کروں گا۔ مگر میرے اس ذاتی شبہ کی بنا پر آپ اپنا کام ملتوی کا نہ فرمائیں۔ یہ بجائے خود ایک اہم اور ضروری کام ہے اور اس سے اردو کی قدیم ترین نظم و نثر میں اضافہ ہوگا۔

مجھے اس وقت یاد نہیں کہ یہ تین رسالے کہاں موجود ہیں۔ اور کہیں ہیں بھی یا نہیں۔ یہاں تو میں بالکل بے دست و پا اور بے پر و بال ہوں۔ اور محض اس خطے میں اردو کی خدمت کے لئے بطور غریب الوطن مقیم ہوں۔ اور اپنی بساط کے مطابق اردو کا کام کر رہا ہوں جس کے نتائج کچھ عرصے کے بعد ظاہر ہوں گے۔ خدا کرے کہ میری یہ خدمت مقبول ہو اور خود اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمالیں۔ مخلص

۱۶/۱۲/۶۲ء سید محی الدین قادری زور

بنام خواجہ حمید الدین شاہد

(۱)

۲۵-۶-۵۹ء محب مکرم آپ کے دو خط ۱۱ اور ۱۶ جون کے اور وحید النساء بیگم کا ایک کارڈ ۱۰ جون کا ملا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ سب بخیر و عافیت ہیں۔ احمد علی صاحب دو بار ملے تھے، بہت متاثر ہیں۔ تاب صاحب نہیں ملے..... ڈاکٹر خیر کے بچوں کے لئے سفارش کر دی ہے۔ بے فکر رہیں۔ الماری کی قیمت یہ لوگ بہت کم بتا رہے ہیں۔ آپ کا خیال معلوم ہونے کے بعد رامانجا صاحب کو بھجوا دوں گا۔

تسنیم آرکی لکچرار اور توفیق بی اے میں شریک ہو رہی ہیں۔ سب لوگ گھر میں اور باہر باد کرتے رہتے ہیں..... نیلم[1] تک کہیں آنا جانا بند ہے سید صاحب کی لڑکی کی شادی تھی۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ حکومت سے امداد کی توقع پیدا ہو گئی ہے۔

بچے کیسے ہیں، خسر صاحب، خوشدامن صاحبہ، منعم صاحب اور آپ کی بیوی کو حسب مراتب کہیئے۔ وحید النساء کو الگ عوا ب نہیں دیتا۔ اب آپ ہی میرا جواب بن کر وہاں گئے ہیں۔ ان سے کہیئے کہ ان کی امانت دیر ہی سے سہی ان کے پاس واپس کر دی گئی ہے۔ اطمینان سے رہیں اور دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔ موٹر خریدیں تو فوراً تحفہ دے کر بٹھائیں۔

یہاں سب خیریت سے ہیں۔ تہذیب کا ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بڑی فکر ہے۔ خدا کرے کہ جلد کسی اچھے گھر میں بٹھا جائے۔ لکچراری کا بھی کچھ نہ ہوا۔ بیگم صاحبہ اور بچے سب سلام کہتے ہیں اور خیر و عافیت کے طالب ہیں۔ مخلص سید محی الدین قادری زور

[1] ڈاکٹر صاحب کی والدہ وفات پائی تھیں۔

(۲)

۱-۷-۵۹ء عزیز مکرم آپ کا خط بڑے انتظار کے بعد ملا۔ جلد جلد لکھتے رہیئے۔ میری طبیعت بہت پست ہو گئی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ عمارت کی تکمیل کا انتظار ہے، بڑی دیر لگ رہی ہے۔

احمد علی صاحب ہر جمعہ کو ملتے ہیں اور آپ کے فراق میں روز بروز دبلے ہو رہے ہیں۔ میں دل بہلانے کی مختلف ترکیبیں سوچتا ہوں۔ انھوں نے آپ کو خط لکھا ہے اب تک مل گیا ہوگا۔ وہ آپ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔

دکن کے شاعروں کی چوتھی سری جلد کا کام آپ وہیں سے کر سکتے ہیں یا نہیں؟ رامانجا راؤ صاحب محرم کے بعد کمپنی رکھنے والے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ آپ سے لکھ کر پوچھوں گا۔ کمپنی میں آپ ہی کے سپرد کراؤں گا۔ نہ ہو سکے تو بعد میں انکار کر سکتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کا اسکیم بھجوایا ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ سب کو سلام کہہ دیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں لگا ہوا ہے۔ سامنے کی بات اور ہوتی ہے۔ آپ نے خود بھی ان لوگوں کو لکھا یا نہیں۔

یہاں بارش شروع ہو گئی ہے، مطلع ابر آلود ہے، پھوار جاری ہے۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔ ہر طرف سبزہ ہے اور موسم خوش گوار ہے مگر اب دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ قلمی و ادبی کاموں سے بھی لگی سی لگن باقی نہیں رہی۔

پرسوں حافظ گڈا ابراہیم صاحب وزیر مرکزی حکومت ادارہ دیکھنے آئے تھے۔ زین یار جنگ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ محرم کی وجہ سے محفل شعر و سخن نہیں ہوئی۔ خشک سی صحبت رہی مگر حافظ صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہاں نادر کام ہو رہا ہے۔ مگر یہ سب باتیں آپ کو لکھنے سے کیا فائدہ؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے جنت کو یا عالم بالا کو خط لکھ رہا ہوں۔ نہ آپ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جنت والوں کو دنیا کے مخمصوں اور جھگڑوں سے دلچسپی تو ہو سکتی ہے۔ مگر وہ ان میں کسی یا ان کے سلسلے میں مدد نہیں کر سکتے، ہاں دعا کر سکتے ہیں اور اس سے تو آپ بھی دریغ نہیں کریں گے۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اب اچھی ہے مگر میری طرح وہ بھی زوال آمادہ ہو گئی ہیں۔ قانون فطرت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

بچے کیسے ہیں۔ ان کی اچھی پرداخت کیجئے۔ لاڈ پیار کا وقت گزر چکا۔ منعم صاحب کیسے ہیں سب کو اور خسر صاحب کو سلام کہیئے۔ یہاں تقریباً روز آپ کا ذکر رہتا ہے معلوم نہیں ملاقات کب ہوگی اور ہو بھی تو وہ اگلی سی بات کہاں؟ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۳)

۱۸-۸-۵۹ء عزیز مکرم مطلع الرسول صاحب آپ کے خط لائے اور سب کو تقسیم کر دیئے گئے۔ آپ کی علالت کی خبر سے بڑی تشویش ہے۔ خدا کرے کہ اب تک صحت ہو گئی ہو۔ انفلوئنزا کے بعد بڑی کمزوری ہو جاتی ہے۔ احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے۔ یہاں بیگم صاحبہ کی طبیعت بھی خراب ہے۔ گردوں کی علالت تھی اب کچھ آرام ہے۔

احمد علی صاحب نے آپ کو تین خط لکھے مگر آپ کہتے ہیں کہ ایک بھی نہیں ملا کیا بات ہے۔ محمود صاحب اور فریدی صاحب کو آپ کے پیامات پہنچا دیئے گئے۔ ان لوگوں نے آپ کو لکھا ہوگا۔ سب لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں اور فاروقی صاحب نے آپ کی عمدہ ملازمت کے لئے ایکسپرس خط دلی سے بھیجا تھا۔ میں نے جواب دیدیا کہ شاید وہ وہاں نہ آسکیں۔ شعرائے حیدرآباد کا کام آپ نہیں کر سکیں گے اور نہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذمہ لیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۴)

۲۲-۱۰-۵۹ء عزیز مکرم آپ کا خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ملا۔ آپ کی صحت کا حال شوکت سے بھی معلوم ہوا۔ خدا کرے کہ جلد پہلی سی توانائی حاصل ہو جائے اور آپ جوش و خروش کے ساتھ کام کر کے وہاں اپنی زندگی بنائیں اور عزت و شہرت حاصل کر سکیں۔ باقی صاحب کی بیوی کو خط لکھ دیا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ راست آپ سے مراسلت کریں۔ شعرائے عثمانیہ کے لئے راست رائٹرس امپوریم کو لکھیئے وہ فراہم کر دیں گے۔ اور یہ بھی پوچھیئے کہ پاکستان میں ان کے کون ایجنٹ ہیں۔ ہم نے بھی دریافت کیا ہے۔ علاء الدین خالد صاحب کو میرا خط اور پروف ملے یا نہیں، انھوں نے جواب نہیں دیا، پوچھ کر لکھیئے۔

کل جمعہ ہے، احمد علی صاحب آئیں تو کہوں گا۔ وہ گذشتہ جمعہ کو آئے تھے۔ کہتے تھے کہ بیمار رہا، اس لئے نہیں آیا تھا۔ حالت مالی اور جسمانی خراب معلوم ہوتی ہے۔ تاب صاحب کا ذکر ہی بیکار ہے۔ ان کو کوئی احساس نہیں ہے۔ آپ کیوں بار بار یاد کرتے ہیں۔ راما جگاراؤ صاحب کو خط پہنچا دیا۔ دیکھیں آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۵)

۴ نومبر ۱۹۵۹ء محب مکرم! خط مورخہ ۲۹ اکتوبر ملا۔ اس سے پہلے کارڈ بھی ملا تھا۔ حفیظ صاحب کو میں نے کاج سے لکھ دیا تھا۔ نقل نہیں رکھی۔ اگر ان کو خط ملے تو گفتگو کریں ورنہ ضرورت نہیں۔

میں بیحد مصروف اور بیگم صاحبہ کی صحت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بیگم صاحبہ کو فم معدہ میں درد ہوتا تھا اور سینے میں بھی۔ کارڈیوگرام لیا گیا تو قلب کے عارضہ کا بھی شبہ ہے۔ اس لئے کئی روز سے اسٹاپ دیا گیا ہے۔ کمزوری بھی محسوس کرتی ہیں۔ مجھے ہر وقت ان کے

قریب نہ ہونے سے بے چین رہتی ہے۔ وہ بھی غصے میں ہیں کہ خواہ مخواہ ہم کو بے کار بنا کر ڈال دیا گیا ہے۔ آج ڈاکٹر[1] صاحب کہہ رہے تھے کہ کل سے ٹیکا لگا کر بٹھیں۔ اب تکلیف کم ہے گر جب تک حسب معمول چلنے پھرنے نہ لگیں پریشان رہوں گا۔ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لئے ۳۱ ہزار رقم آگئی ہے۔ اس کا کام اور کمیٹیاں بھی شروع ہیں۔ بہت زیادہ مصروفیت ہے۔ افتتاح عمارت اور یوم محمد قلی وغیرہ کے انتظامات بھی ہیں۔ غرض کہ ایک سر ہزار سودا کا حال ہے۔ جب تک اللہ چاہے کام لیتا رہے گا اور جب تک اس کو منظور ہو میں محنت کروں گا۔ اس لئے زیادہ بار برداشت کر رہا ہوں کہ جب تک برداشت کی قوت ہے نہ کرنا کفران نعمت ہے۔

آپ کی صحت و عافیت اور آپ کے متعلقین کی خوشی و خوش حالی کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ یہاں سے اور کیا کر سکتا ہوں۔ بہت سے کام لیجئے جلد تو آجائے گی اور چاق و چوبند ہو جائیں گے۔ مخلص سید محی الدین قادری زور (۶)

[1] ڈاکٹر گھوشندن راج سکسینہ جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ہم جماعت مخلص دوست اور خاندانی معالج ہیں۔

۲۵-۱۱-۵۹ء محب مکرم کیا بات ہے اب کے آپ بہت خاموش ہیں۔ خط کے جواب کا اب تک انتظار کیا۔ میرا خط تو آپ کو مل چکا ہے مگر آپ نے یا تو جواب نہیں دیا یا راستے میں غائب ہو گیا۔ ۱۰ر جنوری کو یوم محمد قلی ہے۔ آپ آرہے ہیں یا نہیں۔ حفیظ جالندھری صاحب کو اب تک خط لکھا یا نہیں۔ ان سے کیا گفتگو ہوئی جلد جواب دیجئے تاکہ میں پھر ان کو لکھوں۔

بیگم صاحبہ لڑا دی گئی ہیں۔ یہ سلسلہ اور کئی ماہ تک جاری رہے گا۔ گھر کے سب معاملات منقلب ہو گئے ہیں۔ میں پرسوں دو روز کے لئے دلی جا رہا ہوں۔ کالج سے کئی بار لکھنا چاہا مگر وہاں پتہ یاد نہیں رہتا۔ آپ کے خط کا بے حد انتظار ہے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور (۷)

۹-۱۲-۵۹ء محب مکرم آپ کا تفصیلی خط ملا۔ شکریہ۔ میں دلی سے واپس آگیا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ اب اللہ کے فضل سے بہتر ہیں۔ آج ڈاکٹر شاہ نواز آئے تھے اور دیکھ کر کہا کہ آپ تھوڑی دیر اٹھ کر بیٹھ سکتے ہیں۔ چند روز بعد چلنے پھرنے کی اجازت ملے گی۔

آپ ۱۰ر جنوری کو یوم محمد قلی میں شریک ہوں گے یا نہیں۔ حفیظ صاحب آرہے ہیں یا نہیں۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ آپ کہیں تو پھر دعوت نامے بھیجوں مگر اب دن کم رہ گئے ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی مصروفیتوں کا بھی علم نہیں ہوا۔ تو قیر کے خط آرہے ہیں۔ یہاں سے ان کو پابندی سے لکھا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بعض خط نہیں ملے یا دیر سے ملتے ہیں۔ شادی کے ساتھ ہی ان کی قومیت بدل گئی۔ اب قومیت حاصل کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ سب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ عبدالرحیم[1] اور پہلوان صاحب سلام کہتے ہیں۔ بچے سب آپ کو یاد کرتے ہیں اور احباب بھی۔ وہاں سے جو رسائل و جرائد آتے ہیں ان میں آپ کا نام ڈھونڈتا ہوں کہیں نظر نہیں آتا۔ بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ میں انتہا سے زیادہ ہی مصروف ہوں۔ پہلے میں کام ڈھونڈتا تھا لیکن اب کام مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آرہے ہیں۔ جلد جلد لکھا کیجئے۔ مخلص

[1] رشید پہلوان اورنگ کالج کا جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اور مجھے ہفتے میں دو دن مالش کرتے تھے۔ سید محی الدین قادری زور

(۸)

۸-۴-۵۹ء محبی شاہد صاحب

مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ آج نہیں آئیں گے۔ آپ سے ملنا ضروری ہے۔ میرا ارادہ دلی سے بمبئی جانے کا ہے۔ آپ کے مشورے کے بعد طے کرنا ہے۔ بنگلہ پر آج یا کل ضرور ملئے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور (۹)

۲۵-۶-۶۰ء عزیز مکرم آپ کے تین خط تینوں کے نام ملے۔ خدا کا شکر ہے کہ بیگم صاحبہ روبصحت ہیں۔ اصل معاملہ ان کی صحت ہے۔

شادیاں تو ہوتی رہیں گی۔ تو قیر آجائے تو اچھا ہو۔ آپ کا شکر گذار ہوں کہ بڑی محبت سے خطوط لکھے۔ اس عمر میں محسوس ہو رہا ہے کہ مخلصوں کی قربت کتنی مفید ہوتی ہے۔ آپ کے خالو صاحب کے پوتے امجد علی صاحب کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں بھی بچوں کو لے کر گیا تھا۔ البتہ ولیمہ میں شریک نہ ہو سکا۔ سنا کہ وہ بھی بہت عمدہ اہتمام سے ہوا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۰)

۶-۱۰-۶۰ء محبی شاہد صاحب فرزند ارجمند کی تقریب تسمیہ کا رقعہ اور خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اتنے عرصے کے بعد آپ نے اتنی اعلیٰ پیمانہ کی اور عمدہ تقریب انجام دی۔ خدا مبارک کرے اور اس کو آپ کی زندگی کا ایک نیا موڑ ثابت کرے۔

میں ہمیشہ آپ کی ترقی علم و اقبال کی دعا کرتا رہتا ہوں۔ "میں گو رہا رہین ستم ہائے روزگار ؎ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا" اب کام کرتے کرتے بہت گیا ہوں۔ چھوڑنا چاہتا ہوں مگر کام پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یکے بعد دیگرے سلسلہ بند ہا ہوا ہے۔ اب یوم محمد قلی قطب شاہ کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ گھر بلو معاملات پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اداروں کے کام بڑھے جا رہے ہیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۱)

۲۳-۴-۶۱ء عزیز مکرم ایک خط اس سے پہلے دلی سے واپسی کے بعد لکھ چکا ہوں ملا ہوگا۔ جواب کا انتظار ہے۔ تہذیب کی شادی ۷ مئی کو مقرر ہوئی ہے۔ لطیف احمد فاروقی صاحب کے فرزند کے ساتھ۔ آپ معلوم نہیں اس قدر جلد آ سکتے ہیں یا نہیں۔ کوشش تو کیجئے۔ ہمت مرداں مدد مولا۔

مقبول نواب کو بھی لکھا ہے اور تو قیر کو بھی۔ اس موقع پر وہاں کے لوگوں کی شرکت کی کچھ توقع معلوم نہیں ہوتی۔ پھر بھی لکھ تو رہا ہوں۔ مئی میں سری نگر جانے کا ارادہ ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ابھی کوئی قطعی بات نہیں معلوم ہوئی اور نہ تاریخ مقرر کی ہے۔ بیگم صاحبہ فراق ہیں کہ وحید الدین کو لے آئیے۔ وہ جانے کے بعد پھر آئیں ہی نہیں۔ اس طرح موقع نکل آئے گا۔ انڈو پاک کلچرل کانفرنس میں جناب حقی صاحب تشریف نہیں لائے۔ بڑی امید تھی کہ ان سے ملاقات ہو جائے گی مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

آپ اب کیا کر رہے ہیں۔ مضامین وغیرہ برابر لکھتے رہیئے۔ دفتری کام کے علاوہ۔ امجد صاحب کی وفات بڑا سانحہ تھا اور خدا کا شکر ہے کہ مختلف اخباروں اور رسالوں میں ان کی خدمات کو سراہا گیا اور اب بھی سراہا جا رہا ہے۔ ملاپ میں بھی کئی مضامین چھپے۔ یہ تو آپ کو نہیں ملتا ہوگا۔ وہاں کیا کیا ہوا۔ آپ کی موجودگی کے باعث بہت کچھ توقع ہے۔ بیوی اور بچے کیسے ہیں۔ منعم صاحب کو سلام کہیئے۔ وہ تو بالکل دفتری آدمی بن کر رہ گئے ہیں۔ باقی خیریت۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

یہ خط لکھا تھا کہ آج آپ کا ۱۸ اپریل کا کارڈ ملا۔ آپ اپنے پیٹ کے درد کا ٹھیک علاج اور تشخیص کرائیے۔ میں اب بہتر ہوں اور شادی کے انتظامات میں مصروف۔

(۱۲)

۴-۷-۶۱ء عزیز مکرم۔ آپ کا خط مورخہ ۱۶ جون ۱۹۶۱ء اس وقت پیش نظر ہے۔ میں یہاں سے بمبئی اور وہاں سے حیدرآباد گیا تھا۔ ۳۰ جون کو واپس ہوا ہوں۔ بیگم صاحبہ اور سب بچے بچیاں ساتھ ہیں۔ ایک مکان بھی مل گیا ہے، موٹر بھی آگئی ہے۔ صرف تہذیب وہاں اپنے گھر میں ہے۔ ہمارا مکان منتقل ہوگیا۔

ادارے کا کام صدیقی صاحب اور مہندر راج صاحب دیکھ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کا مکان جلد تیار ہوجائے اور آپ صحت و عافیت اور مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کریں اور علمی و ادبی دنیا میں مناسب شہرت پائیں۔ ممتاز صاحب کا بھی خط آیا ہے۔ ان کو بھی جواب دے رہا ہوں۔

مقبول نواب جو کام کر رہے ہیں اس میں ممکنہ مدد دیجئے۔ میری قسمت بھی عجیب ہے۔ اس اہتمام سے دیکاہ کی عمارتیں بنوائیں اور کچھ عرصے کے بعد اس سے بے تعلق ہوگیا۔ ایوان اردو بنایا۔ اپنی زندگی ہی میں چھوڑ آیا۔ اب یہاں کشمیر اردو اکیڈیمی کی بنیاد ڈال رہا ہوں۔ شاید عمارت بن جانے کے بعد اس کو بھی چھوڑ دوں۔ "موتو قبل ان تموتو" کی مثل صادق آرہی ہے۔ مذکورہ بالا پتہ پر جواب دیجئے۔ یہاں خطوط وہاں سے برابر آتے ہیں۔

مخلص سید محی الدین قادری زور

(۱۳)

۱۴-۸-۶۱ء عزیز من زاد لطفہ۔ عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ سری نگر سے آپ کو خط لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہاں کے پتے پر برابر خطوط تو قیر کے اور مقبول نواب کے آرہے ہیں، آپ بھی لکھئے۔ اعلم صاحب کے بھی برابر آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ نے کیوں نہیں لکھا، فکر ہے کہ علیل تو نہیں ہیں۔ کسی اور ذریعے سے بھی آپ کی مصروفیت کا اور حالت کا علم نہ ہوسکا۔

میں ۱۲ اگست کو یہاں آیا۔ ۱۹ کو الہ آباد جا رہا ہوں وہاں سے ۲۲ کو نکل کر ۲۴ کو سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ انشاء اللہ ۱۸ اگست کو حضرت کا عرس ہے۔ بارش کی وجہ سے مختصر کر رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ اور سجاوے صاحب وہیں ہیں۔ میں صرف اکیلا آیا ہوں۔ توفیق، تسنیم یہاں ہیں۔

ممتاز حسن صاحب کے خط کا جواب وہاں سے آیا تھا، معلوم نہیں ان کو ملا یا نہیں۔ آپ اپنی، وحید النساء کی، بچوں کی، خسر صاحب اور خوشدامن صاحبہ کی اور منعم صاحب کی خیر و عافیت سے جلد مطلع کریں۔ ہاں کل یہاں مغت کا نمونہ ملا۔ ماشاء اللہ بہت عمدہ کام ہے اور اردو کے اور آپ لوگوں کے شایان شان۔ اگر یہ مکمل ہوجائے تو بڑا کارنامہ ہوگا۔ میں نے اکبر الدین صاحب سے کہا ہے کہ اس پر سب رس میں رائے ضرور چھاپیں۔

آج کل یہاں سے اور وہاں سے بہت لوگ یورپ اور امریکہ جا رہے ہیں۔ آپ بھی کیوں نہ قصد کریں مگر پہلے کسی یونیورسٹی میں منتقل ہوجائیے، وہ ضروری ہے۔ جواب ضرور دیجئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں بھی آپ کے خط نہیں آئے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۴)

۲۹-۸-۶۱ء عزیز مکرم زاد لطفہٗ آپ کا کارڈ اور خط (جو حیدرآباد سے ری ڈائرکٹ ہو کر آیا) ایک ساتھ ملے۔ بڑی خوشی ہوئی مگر فکر پیدا ہو گئی کہ آپ کی صحت وہاں ٹھیک نہیں ہے۔ شاید تعمیر مکان کی مصروفیتوں کے باعث تکان ہو جاتی ہو۔ مجھے بھی درگاہ کی تعمیر کے زمانے میں ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ آپ فکر نہ کریں اور اس کو بیماری نہ سمجھیں۔ انشاء اللہ ختم کار کے ساتھ ہی آپ چاق و چوبند ہو جائیں گے اور پھر پرانی توانائی اور مستعدی عود کر آئے گی۔

آپ کی ترقی کے امکانات ابھی بہت باقی ہیں۔ کسی ناکامی سے اثر نہ لیجئے۔ میری زندگی کا نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ تو ابھی کم عمر ہیں اور آپ کی بیوی بھی اشاء اللہ کمار ہی ہیں اس لئے اثر نہ لیا کیجئے۔ پھر آپ تو صوفی منش انسان بھی ہیں۔

فراست اور بچوں اور سسرال کے تمام اصحاب اور خاص کر معظم صاحب کو حسب ما وجب پہنچائیے۔ کبھی کبھی فاتحہ بدلنے ہی کی خاطر خط لکھا کیجئے۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۵)

۲۸-۴-۶۲ء عزیز مکرم۔ ۱۸ مارچ کا کارڈ ملا تھا۔ اس کے بعد سے آپ نے کیوں نہیں لکھا سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے ۱۵ اپریل کو ایک کارڈ اور ۱۹ اپریل کو لفافہ بھیجا تھا۔ جس میں "رومی اور اقبال" پر مضمون بھی تھا۔ کیا یہ دونوں نہیں ملے؟

اب ایک اور مضمون "اردو اور فوق یک جہتی" بھیج رہا ہوں۔ اس ایک سال کے عرصے میں کئی مضمون لکھے ہیں۔ جس میں سے چند آپ کو بھیجوں گا تاکہ آپ جمع کر کے ایک مجموعہ اپنے مقدمے کے ساتھ وہاں چھپوا لیں۔ بعض مضمونوں کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ قدیم اردو ادب کی تحقیقات ۲۔ دکنی ادب ۳۔ کشمیری اور اردو ۴۔ رومی اور اقبال ۵۔ اردو اور قومی یک جہتی وغیرہ وغیرہ۔

آپ چاہیں تو کسی نام سے ان کو کتابی صورت میں چھاپ سکتے ہیں۔ اپنے ارادے سے مطلع کریں۔ مکان تو بن چکا ہوگا۔ آپ منتقل ہوئے یا نہیں۔ صحت کیسی ہے، بچے کیسے ہیں، وحید النساء کا کیا حال ہے، کچھ معلوم نہ ہوا۔ آپ کو چاہئے کہ ہر پندرہ روز کو پابندی سے لکھتے رہیں۔ بڑی فکر ہو گئی ہے کہ آپ کی صحت کیسی ہے ورنہ میرے ۱۵ اپریل کے کارڈ کا جواب تو اب تک آ جاتا۔

حیدرآباد سے خط آیا کہ پہلی مبارک با تہذیب کے بچے کی آپ نے دی۔ مگر مجھے آپ نے نہیں لکھا۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آپ کی یاد ہر وقت اور ہر موقع پر آتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن کو قریب رکھنے کی کوشش کی وہی دور ہو گئے۔ آپ کا بھی وہی ہوا اور تہذیب کا بھی وہی۔ حالانکہ اس کے لئے بار بار کتنے عمدہ عمدہ پیام آئے تھے۔ اس خیال سے نہیں دیا کہ قریب رہے مگر فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ شادی کے بعد ہی خود مجھے وہاں سے نکل جانا پڑا۔ اس سے پتہ چلا کہ قسمت میں عزیزوں سے فراق اور دوری لکھی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک خاص سوز و کرب دل میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ آپ کا اردو نامہ بھی آج تک نہیں ملا۔ اور نہ کوئی اور کتاب یا رسالہ جس میں آپ کا ذکر یا تعلق ہو۔ مقبول نواب کے خط برابر آتے رہتے ہیں مگر آپ کے نہیں۔ اس لئے بھی زیادہ خیال رہتا ہے۔ بیگم صاحبہ ابھی وہیں ہیں معلوم کب آئیں۔ میں یہاں لڑکوں کے ساتھ ہوں اور ماں اور باپ دونوں کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

یوں بھی قسمت میں لکھا تھا ہمیں معلوم نہ تھا مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۶)

۶-۶-۶۲ء عزیز من آپ کا خط ملا تھا۔ میں اس اتوار میں جا کر بیگم صاحبہ اور بچوں کو لے کر آیا۔ رضی پاشا کی تصویر سے کام نکل گیا

ہو تو واپس فرمادیں۔ اردو نامہ مجھے اب تک نہیں ملا۔ آپ خط پر تاریخ اور پتہ نہیں لکھتے۔ میرا مضمون "اردو اور قومی یک جہتی" ملا یا نہیں۔ مقبول نور سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی کتاب کی تصویریں اب تک تیار نہیں ہوئیں۔ خالد صاحب سے ملیں تو کہئے کہ عجلت کریں۔

دوست اب بھی ضد کرتے ہیں یا سنجیدہ اور سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ نویں جماعت تو کافی بڑی ہوتی ہے۔ محنت کرنی چاہئے۔ استاد دیکھئے۔ منعم صاحب کیا لنڈورے ہی رہنا چاہتے ہیں۔

مکان اب تک مکمل ہو گیا ہوگا۔ صفر کے آخر میں یا ربیع الاول میں گھر بھرائی کیجئے اور منعم صاحب کی شادی۔ بچے سب اچھے ہیں۔ رفیع کو کچھ نزلہ کھانسی ہے۔ قاضی صاحب کی میت میں شریک ہوئے تھے یا نہیں۔ تو قیر تو آج کل میرپور میں ہے۔ چہلم تک رہے گی۔ آپ کو کوئی مناسب خدمت مل جائے تو اچھا ہے۔ باقی خیریت۔

مخلص
سید محی الدین قادری نذر

بنام سید محمد مورخ بیدری

(۱) محبت کریم

میں نے آپ کا ذخیرۂ نوادر دیکھا۔ آپ نے بڑی محنت و جستجو سے بعض نہایت اہم و نادر کاغذات و کتب و قطعات جمع کئے ہیں۔ اس پر میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ ہمارے انطلاع میں آپ جیسے اور اصحاب ذوق پیدا ہو جائیں تو ہمارے ملک کی تاریخ کے وہ گوشے بھی منظر عام پر آجائیں جو اب تک تاریکی میں ہیں۔ آپ کو تاریخ کا اچھا ذوق ہے اور تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے۔ ایسے اصحاب کی ملک اور عہدہ داران مقامی کو خدر کرنی چاہئے اور عملی طور پر مدد کر کے حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ میں مکرر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ادارۂ ادبیات اردو سے بھی گہرا تعلق رکھیں گے۔ مخلص

سید محی الدین قادری نذر

(۲) ۱۳۲۱ھ محبی مولوی سید محمد بیدری صاحب

آپ نے میری خواہش پر اردو کانفرنس میں شرکت کی جو زحمت گوارہ فرمائی اور تنگ وقت میں مضامین لکھے اور اردو سے متعلق گراں بہا کتب و کاغذات لاکر نمائش میں حصہ لیا۔ اس کے لئے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ جیسی ہستیاں اردو والوں کے لئے قابل فخر ہیں کہ اپنی بے مائگی اور تنگ دستی کے باوجود کام کئے جارہی ہیں۔ اور اتنا عمدہ ذخیرہ نادر و تاریخی اشیاء کا جمع کر رہی ہیں۔ خدا آپ کی ہمت میں ترقی دے اور کاموں میں برکت عطا فرمائے۔ پروفیسر سروری عنایت نگر نارائن گوڑہ حیدرآباد و بروئے مسجد سلیمہ خاتون کے پتہ پر لکھے کہ وہ آپ کا مضمون سب رس کے اڈیٹر سلیمان اریب صاحب کو دیدیں تاکہ چھپ جائے۔ میرا ارادہ عید کے بعد جون کی دو بیچ تک بیدر آنے کا ہے۔ مولوی بدیع الزماں خاں صاحب کے ہاں ٹھیرنا ہوگا۔ ان کا بہت تقاضہ ہے۔ ان کے لائق داماد مولوی مظہر حسین صاحب بھی یہاں ان کی طرف سے کہتے رہتے ہیں۔ ان سے مل کر میرے بارے میں

مطلع فراہم کیجئے۔ غالباً اب ان کی طبیعت اچھی ہوگی۔ مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۳) رفعت منزل۔ حیدرآباد ۳۰/۳/۱۹۵۴ء
محب مکرم۔ آپ کا کارڈ ملا۔ افسوس ہے کہ میں اس سے قبل جواب نہ دے سکا۔ کانفرنس ۳۰ اپریل تا ۲ مئی ہوگی۔ ۳۰ اپریل کو نمائش کا اکبوٹے صاحب وزیر تعلیم افتتاح کریں گے۔ اس میں آپ اپنی اشیاء شریک کریں۔ اور اردو سے متعلق ایک مقالہ بھی قلمبند فرمائیں۔ دوسرے مقالوں کے ساتھ یہ بھی چھپ جائے گا اور موقع ملے تو پڑھا بھی جائے گا۔ کانفرنس میں ضرور شرکت فرمائیں۔ مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۴) رفعت منزل خیریت آباد۔ ۲۳-۴-۱۹۵۴ء
محب مکرم۔ کارڈ موصولہ ۲۰ اپریل ملا۔ شکریہ۔
نمائش میں صرف اردو سے متعلق اشیاء رکھی جائیں گی۔ عربی۔ فارسی وغیرہ نہ لائیے۔ نمائش کا انتظام ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب کے سپرد ہے۔ اور وہ ۲۸ کو سب جاوینا چاہتے ہیں۔ پھر بھی میں ان سے کہہ دیتا ہوں کہ کچھ جگہ آپ کے لئے رکھیں مگر عین وقت پر گڑبڑ ہو جائے گی۔ آپ کے مضمون کا عنوان کیا ہے۔ آج کل یہاں ترقی پسندی زور پر ہے۔ نمائش اسٹیٹ گرلز ہائی اسکول میں ہوگی۔ آپ سیدھا وہیں پہنچ جائیں۔ وہ فوکسٹ تعلیمات کے سامنے کا مدرسہ ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ اردو سے متعلق جو چیزیں لائیں اس کے لئے جگہ رکھی جائے فقط مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۵) مولوی سید محمد صاحب بیدری
اس دفعہ قیام بیدر کے زمانہ میں آپ سے ملنے اور آپ کے دولت خانہ میں آکر آپ کے باقی ماندہ خزینہ نوادر کو دیکھنے سے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے واقعی بڑی محنت سے کام کی اور نادر کتابیں جمع کی ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ ان سے خاطر خواہ مستفید نہ ہو سکے۔ اور نہ آپ کی جستجو اور تلاش کی قدر کی گئی۔ آپ کا بہت سا ذخیرہ نادر و نایاب حیثیت رکھتا ہے۔ کاش کہ اس کی قدر کی جائے اور آپ کی محنت و کاوش کی داد ملے۔ آپ نے جس خلوص کے ساتھ میرا استقبال کیا اور تحفے عطا کئے اس کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ بیگم صاحبہ کی بی کا افسوس اور بہت تعلق رہا کہ ان کو آپ کے پاس اترنے نہیں دیا گیا فقط مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۶) رفعت منزل خیریت آباد ۳۰/۳/۱۹۵۵ء۔ محب مکرم
کارڈ کے لئے شکر گزار ہوں۔ مثنوی حسن المطلب پر ضرور مضمون لکھئے۔ اس کے مصنف میر سلطان علی طالب کے بارے میں اب تک کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ آپ جو لکھیں گے وہی مستند ہوگا۔ مثنوی کے گہرے مطالعہ سے آپ کو معلومات ہوں گی وہی لکھ دیجئے۔ سب رس میں یہ مضمون ضرور چھپ جائے گا۔ فقط مخلص
سید محی الدین قادری زورؔ

(۷) ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد دکن
نشان ۳۵۰، ۲۴/۲ ۱۹۵۷ء
محترمی۔ تسلیم۔ مکتوب گرامی مورخہ ۱۹ اگست اور اس کے ساتھ ایک مضمون (مثنوی حسن المطلب) کا شکریہ۔ یہ مضمون انشاء اللہ سب رس کے قریبی اشاعت میں چھپ جائے گا۔ امید کہ جناب بخیر و عافیت ہوں گے۔ مضمون بڑی محنت سے آپ نے لکھا ہے مبارک فقط مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۸) رفعت منزل خیریت آباد۔ ۶-۷-۱۹۵۶ء
محبّ کرم۔ آپ کا کرم نامہ ملا۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ صدر جمہوریہ نے آپ کے جمع کئے ہوئے خزانہ کو بہت پسند فرمایا۔
میں نے کل صبیح شاہد صاحب کے ذریعہ سے آپ کی دو تصویر بھجوائی ہے جس میں آپ صدر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مبارکباد آپ نے اپنی تصنیف کردہ کتاب کا جو نسخہ تحفتہً صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا ہے غالباً اس کی نقل آپ پاس ضرور ہوگی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اپنے ذخیرہ کی ایک فہرست روانہ فرمائیں تاکہ اس سے آپ کو کچھ فائدہ پہونچے۔ ورنہ خالی زبانی تعریف سے تو آپ کا پیٹ نہ بھرے گا۔ فقط مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۹) ۸-۱۲-۶۰ء محبّ کرم۔ آپ کا کارڈ مورخہ ۲-۱۲-۶۰ء وصول ہوا تھا۔ میں نومبر کے مہینہ میں زیادہ تر دلّی میں رہا اس لئے جواب نہ دے سکا۔
آپ بیدر اور گولکنڈہ کے عنوان پر ضرور مقالہ لکھئے اور عجلہ لکھئے۔ شاید ۱۲ جنوری کے اجلاس میں جو حافظ محمود اعظم صاحب کی صدارت میں ہوگا اس کو سنانا ہوگا۔ مولوی بدیع الزماں خاں صاحب کی صحت اب کیسی ہے۔ علالت کی خبر سنی تھی۔ میری طرف سے جا کر ملئے اور کیفیت سے مجھے جلد واپسی مطلع فرمائیے۔ میری طرف سے ان کو سلام کہنا فقط مخلص
سید محی الدین قادری زور
نوٹ:۔ کشمیر سے کراچی کے پتہ پر میرے نام قبلہ زور مرحوم کا آخری خط۔

(۱۰) ۹ ہمسی باغ سری نگر۔ ۲۱ جون ۱۹۶۲ء
محب مکرم زاد لطفہٗ۔ تسلیم۔ کرم نامہ بلا تاریخ وصول ہوا۔ پتہ اوپر درج ہے۔ اس پتہ پر مراسلت فرمائیں۔
آپ کی خیر و عافیت معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ اور آپ کی پریشانیاں اور فکریں دور ہو گئیں یہ معلوم کر کے مزید اطمینان ہوا۔ اللہ تعالیٰ تادیر آپ کو اپنے خاندان کے سر پر سلامت باکرامت رکھے اور وہاں حیدرآباد کی تہذیب و کلچر کی ترویج اور علم و ادب کی خدمت کا موقع عطا فرمائے۔
افسوس ہے کہ دکن روز بروز اجڑتا جا رہا ہے اور لائق اور اچھے لوگ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ بیدر چھوٹنے کا

غم آپ کو آخر وقت تک رہے گا مگر "وطن میں آ کر کیا رہنا جو ہوے آبرو رہنا" بیگم صاحبہ اور بچوں کو ابھی اوائل جون میں لے آیا ہوں۔ ۲۰ مئی کو حیدرآباد گیا تھا اور پرسوں روزہ کر آیا۔ کیا آپ وظیفہ لینے بھی نہیں جائیں گے۔ صمد بیگی صاحب تو آتے جاتے رہتے ہیں اور اس لئے ملاقات کی امید رہتی ہے۔

شاہد صاحب کو میرا سلام کہیئے۔ اُن سے ملتے رہیئے۔ بڑی خوبیوں کے انسان ہیں اور حیدرآبادی شرافت اور اخلاق کے مکمل نمونہ۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر زور مرحوم کی خدمات علمی و ادبی کسی فرد یا ادارے کی سند و تحسین کی محتاج نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ محقق اور صاحب بصیرت نقاد تھے۔ انھوں نے علم و ادب اور زبان اردو کو ایک شاندار مقام تک پہنچانے میں اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ ہماری زبان اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں طور پر یاد کئے جائیں گے۔

جمیل الدین عالی
معتمد انجمن ترقی اردو پاکستان

ادارۂ "الشجاع" کے لئے یہ خبر انتہائی اندوہناک ہے کہ ۲۴ ستمبر کو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، چابک ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور اردو زبان ایک مخلص خدمت گذار سے محروم ہو گئی۔ ڈاکٹر زور اردو کے ایک صاحب طرز انشا پرداز، بلند پایہ شاعر، ممتاز محقق اور عظیم نقاد تھے۔ گزشتہ تیس سال سے وہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سرگرم عمل تھے۔ قدیم دکنی ادب کو منظر شناس کرانے کا سہرا مرحوم کے سر ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں ڈاکٹر زور نے اردو کے تحفظ و بقا کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، مستقبل کا مورخ اور اردو کے پرستار انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مرحوم لسانی عصبیت کے حوصلہ شکن اور صبر آزما ماحول میں جس جرأت اور بے باکی سے اردو کی خدمت کر رہے تھے اس کی کوئی دوسری مثال ہندوستان میں نہیں مل سکتی۔ موجودہ دور میں جبکہ اردو کو مخلص خدمت گزاروں کی خاص طور پر ضرورت ہے، ڈاکٹر زور کا سانحۂ ارتحال اردو ادب کا ایک ایسا نقصان ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

(ماہنامہ "الشجاع" کراچی۔ نومبر ۱۹۶۲ء)

بنام محترمہ جہاں بانو نقوی

(۱)

محترمہ

آپ نے جتنے مضامین بھیجے تھے۔ سب چھپ چکے۔ عمدۃ النساء بیگم صاحبہ کا مضمون بھی اپریل میں آرہا ہے۔ البتہ محشر صاحب قبلہ کی غزل رکھی ہوئی ہے آج تک سب رس میں کوئی فارسی کلام نہیں چھپا۔ اگر اردو کلام سے نوازیں تو عنایت ہوگی۔

آپ کے مضمون کا انتظار رہے گا اور آپ کے تلامذہ کے مضامین کا بھی جواب خود استاد بن گئے ہیں۔ زینت کو کیوں خاموشی چھوڑ دیا ہے؟ کیا ان کے یہاں تنقید کے لئے کتابیں بھجوائی جائیں؟

مخلص

۱۲/۳ ۵ء سید محی الدین قادری زور

(۲)

محترمہ

عنایت نامے کا شکر گذار ہوں۔ رفیعہ سلطانہ تک میرا سلام اور مضمون (افسانہ) کا شکریہ پہنچا دیجئے۔ آپ کی توجہات کا ممنون تو عرصے سے ہوں۔ تنقید کے لئے کتابیں بھی بھجوا دوں گا۔ اکبر کی غزل ملی ان کو الگ شکریہ کا خط لکھا ہے۔ آپ کا مضمون کہاں ہے؟ مخلص

۲۶/۳ ۵ء سید محی الدین قادری زور

(۳)

محترمہ

کرم نامہ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ جلسے کی صدارت کی دعوت غالباً کسی تقریر کے لئے مشروط نہ ہوگی۔ بہرحال ۷ ستمبر کو ۳ بجے آپ یہ جلسہ منعقد فرمائیں اور مجھے مطلع فرمادیں تو حاضر خدمت ہوجاؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ ۳ بجے پابندی وقت کے ساتھ حاضر ہوجاؤں گا۔ مخلص

۳ ستمبر ۵۰ء سید محی الدین قادری زور

بنام ڈاکٹر خلیق انجم

(۱)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۴-۱۰-۵۷ء

محب مکرم

کرم نامہ موزخہ ۶-۹-۵۷ کا شکریہ۔ میں شاید ۱۲ اکتوبر کو دلی میں رہوں گا۔ ماہنامہ آجکل کی کمیٹی ہے۔ عرش صاحب سے فون پر آپ کو میرا پروگرام معلوم ہو جائے گا۔

آپ دلی میں کہاں رہتے ہیں؟ میں جگن ناتھ آزاد صاحب کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ آپ کی دعوت کا شکریہ۔ میں ایک دن زیادہ سے زیادہ دو دنوں کے لئے آتا ہوں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۲۴-۱۰-۵۷ء

عزیزی خلیق انجم صاحب

آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں خیریت سے وقت پر حیدرآباد پہنچ گیا۔ افسوس ہے کہ میں آپ کے گھر پر نہ آسکا ایک ضرور تھوڑی دیر کے لئے آؤں گا اور آپ کے دوستوں اور ساتھیوں سے بھی ملوں گا۔ نثار صاحب کو اور آپ کے دوسرے شاعر دوست صاحب کو میری طرف سے سلام کہیئے۔ ان کا نام یاد نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دلی کے مسلم نوجوان اب ابھر رہے ہیں اور جو خلا محسوس ہو رہا تھا وہ انشاء اللہ آپ جیسے نوجوانوں کے باعث پُر ہو جائے گا۔ آپ سے میری بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۳)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۰۔ ۱۲۔ ۵۶ء

محب مکرم

آپ کے خط موخرہ ۷ر ڈسمبر کے جواب میں عرض ہے کہ میں آپ کے پہلے خطوں کے جواب دے چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو نہ ملے۔

میں خفا کیوں ہوں گا؟ میں تو خوش ہوں کہ دلی میں آپ جیسے نوجوان موجود ہیں جن کا مستقبل روشن ہے اور جو اپنے وطن کے نام کو درخشاں کر سکیں گے۔

میں آج کل یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات میں مصروف ہوں اور بہت مصروف۔ اس لئے کارڈ کے ذریعے سے اطلاعاً رسید بھیج رہا ہوں۔ دلی آنے کی ابھی کوئی اطلاع یا دعوت نہیں آئی ہے۔ ۲۹ ڈسمبر کو اردو کانفرنس کی صدارت کے لئے برہان پور سے دعوت آئی ہے۔ شاید وہاں جاؤں۔

دلی جب آؤں تو آپ کو پہلے سے مطلع کروں گا۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

میں خطوں کے جواب عموماً فوراً دیتا ہوں سوائے علالت یا انتہائی مصروفیت کے۔

(۴)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۴۔ ۲۔ ۵۸ء

محب عزیز

آپ کا کرم نامہ ملا۔ شکریہ۔ میں نے جگن ناتھ آزاد صاحب سے پہلے ہی وعدہ کر لیا ہے کہ ان کے یہاں جاؤں گا البتہ آپ کے خلوص و محبت کی خاطر ایک روز آپ کے یہاں گذاروں گا۔ امید کہ آپ برا نہ مانیں گے۔

میں ۲۳ کی صبح میں دلی پہنچ رہا ہوں اور ۲۵ کو واپسی کے لئے رزرو کرانے آزاد صاحب کو اطلاع دے دی ہے۔

مشاہیر شعرائے دہلی کی یادگاروں اور آخری آرام گاہوں پر تختیاں لگانے کے بارے میں آپ نے اب تک کیا کام ہے۔ ہو سکے تو ایک کمیٹی ان تین دنوں میں سے کسی ایک روز کر لیجئے۔ اکاڈیمی کی کمیٹی اتوار کو ۳ بجے سے ہے۔ اس کے سوا کوئی اور وقت مقرر فرمائیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۵)

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔

۷-۳-۵۸ء

محب خلیق سلمہٗ

میں دلی سے آکر ایسا مصروف رہا کہ وقت کیسے گزر گیا کچھ پتہ نہ چلا۔ آپ نے اور اسلم پرویز صاحب نے اس دفعہ بڑی زحمت اٹھائی۔ آپ کی والدہ صاحبہ اور بہنوں کو بھی میری وجہ سے پکوان کی تکلیف ہوئی۔ سب کا شکر گذار ہوں۔

آپ کی مرتب کی ہوئی کتاب معراج العاشقین بہت دیدہ زیب اور عمدہ چھپی ہے اور اس میں نظموں کی شرکت کے باعث خواجہ بندہ نواز کا مکمل مجموعۂ اردو بھی مکمل ہو گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کاوش مقبول ہوگی۔

آپ دلی کے شعراء مشاہیر کی آخری آرام گاہوں پر مضامین کا سلسلہ جلد شروع کر دیجئے۔ تصویر کے ساتھ مکمل جغرافیۂ حال اور تفصیلات ضرور لکھئے۔ یہ کام آپ کی شہرت کا باعث بھی ہوگا اور ضروری بھی ہے۔ آپ کے کالج میں اردو کا پوسٹ قائم ہو جائے گا۔ آپ کے پرنسپل صاحب سے موٹر میں گفتگو رہی۔ خدا کرے کہ آپ نہ صرف مستقل ہو جائیں بلکہ مسلسل ترقی کرتے رہیں۔

پی ایچ ڈی کی جلد تکمیل کر لیجئے۔ یہ ڈگری مزید ترقیوں میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ وہاں کے حالات لکھتے رہیئے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۶)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۱-۳-۵۸ء

عزیز مکرم

آپ کا کارڈ وصول ہوا۔ اس سے پہلے ایک خط ڈال چکا ہوں آج ہی ڈاکٹر محمد بن عمر صاحب مرحوم کے بھائی کو اطلاع دی ہے کہ ان کی کتابیں ڈاکٹر تیواری کے نام ذریعہ وی پی بھیجدیں۔ ان کا گذشتہ ماہ ترکی میں غریب الوطنی میں انتقال ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ انڈیا بک ٹرسٹ کو لکھا ہے کہ آپ کو ترجمہ کا کام دیں۔ انھوں نے نام پوچھے تھے۔ وہاں سے آپ کو اطلاع ملے گی۔

(۷)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۲۴-۴-۵۸ء

محب مکرم

آپ کا ایر لیٹر آیا تھا۔ میں نے فوراً محمد بن عمر صاحب کے بھائی کو اطلاع کر دی تھی کہ کتابیں بھجوا دیں۔ ملیں یا نہیں۔

اسلم پرویز کی غزل بھی سب رس میں چھپی تھی وہ سب رس ملا ہوگا۔
کیا آپ لائبریری سائنس کے امتحان میں شریک ہو رہے ہیں۔ بہت اچھا کیا۔ اسی طرح اپنی علمی و ادبی فتوحات میں اضافہ کرتے رہیئے۔
پی ایچ ڈی میں بھی داخلہ لے لیجئے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب اور اپنے پرنسپل کو ملا کر رکھئے۔ ان دونوں سے ملتے رہیئے اور ان کے کاموں اور دلچسپیوں میں ہاتھ بٹاتے رہیئے۔ دوسری باتوں سے زیادہ ان کا خیال رکھیئے۔
خدا وہ بھی دن لائے گا کہ آپ دلی میں اردو کے سب سے بڑے ماہر اردو رہیں گے۔ اس کے لئے بڑی ریاضت اور سعی کی ضرورت ہے چونکہ آپ میں صلاحتیں ہیں اس لئے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیے۔ ورنہ ضایع جائیں گی۔ وقت بڑا قیمتی ہے۔ اس کا خیال رکھیئے۔
ہمیشہ بڑے لوگوں سے ملتے رہیئے۔ ان سے تعلقات بڑھائیے عرش، آزاد صاحبان وغیرہ سے بھی ملتے رہیئے۔ حسن ثانی نظامی صاحب کے یہاں بھی کبھی کبھی جاتے رہیئے۔ یہ اچھے لوگ ہیں۔
اپنی والدہ صاحبہ کو سلام اور بہنوں کو دعائیں پہنچائیے۔ اسم با مسمّٰی ثابت ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔
دہلی میں مشاہیر اردو کے مزارات کے سلسلے میں آپ کو غیبی فتوح بھی حاصل ہوں گی۔ جو دوسروں کے نام نیک کو زندہ رکھتا ہے خدا اس کے نام اور کام کو ضایع نہیں ہونے دیتا۔
زیادہ کیا لکھوں آپ خود ماشاء اللہ بہت ذہین و فہیم ہیں۔ خط کالج کے پتہ پر ملے یا نہ ملے اطلاع دیجئے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۸)

رفعت منزل۔ خیریت آباد
۱۲۔ ۲۔ ۵۹ء

محب مکرم
میں صبح ۲۱ فروری کو دلی آ رہا ہوں۔ ۲۲ کو ۵ بجے واپس ہو جاؤں گا۔ معلوم نہیں آپ کیوں خاموش ہیں۔ عرصہ سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کے دوست کیسے ہیں۔ بی اے پاس ہو گئے یا نہیں۔ شاید ایک سال سے ان کو بھی نہیں دیکھا۔
میں بے حد مصروف ہوں اور روز نئے کاموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ آپ کی والدہ صاحبہ اور بہنیں کیسی ہیں۔ کوشش کیجئے کہ اس دفعہ ملاقات ہو جائے۔ میں غالباً اپنے ایک شاگرد میر حسن صاحب (۲۶ پٹودی ہاؤس نئی دہلی) کے یہاں ٹھہروں گا۔ ظ انصاری صاحب دلی میں ہیں یا چلے گئے۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

(۹)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۹-۱-۶۰ء

محب کرم

خط ملا تھا۔ میں یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات میں مصروف تھا اس لئے جواب نہ دے سکا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے تفصیلات معلوم ہوں گی۔

اب ادارے کی عمارت میں سامان کی منتقلی میں مصروف ہوں۔ مارچ میں انشاء اللہ افتتاح ہو جائے گا اور اس کے بعد آپ خوشی سے تشریف لائیں۔

اسلم پرویز کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں ان کا اکثر خیال رہتا ہے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۰)

رفعت منزل۔ خیریت آباد

محب مکرم

میں ۱۰ نومبر کی صبح دلی آ رہا ہوں۔ ۱۱ کو ساہتیہ اکاڈیمی کے اڈوائزری بورڈ میں شرکت کروں گا۔ اور ۱۲ کو وہاں سے واپس ہو جاؤں گا۔

میرا قیام حیدرآباد ہاؤس میں رہے گا آپ اور اسلم پرویز صاحب ملیں تو خوشی ہوگی۔

مخلص

۶-۱۱-۵۹ء سید محی الدین قادری زور

(۱۱)

محب مکرم

میں پہلی ڈسمبر کو دلی آ رہا ہوں۔ آپ کا خط اور شاہراہ کے تبادلہ کتب کا خط ملا۔ ان کو جواب دیدیا ہے۔ اور فہرستیں بھیجدی ہیں۔ ادارے کی کتابیں میں ساتھ لاؤں گا۔ اور آپ ان کی کتابوں کا بنڈل تیار رکھیئے۔ یہاں کا بنڈل ان کو دیکر ان کا بنڈل لے لیجئے۔ باقی بالمشافہ۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۱۲)

۹ تلسی باغ سری نگر

۶۱-۸-۶

عزیز مکرم زاد لطفہٗ

میں پٹھان کوٹ سے ۱۸ اگست کو ۹ بجے رات کی گاڑی سے نکلا صبح ۱۹ اگست دلی پہنچ رہا ہوں۔ ریل گاڑی کا نمبر غالباً UP ۱۵ ہے۔ اگر آپ کو سہولت ہو تو اسٹیشن پر مجھ سے ملئے۔ باقی بالمشافہ۔

اسی روز حیدرآباد جا رہا ہوں۔ نازنگ صاحب اور دوسرے احباب کو مطلع فرما دیں۔ میں یہاں سے ذریعہ بس نکل رہا ہوں۔ اگر بس وقت پر پٹھان کوٹ نہ پہنچا تو دوسرے دن دلی پہنچوں گا۔ دعا کیجئے کہ وقت پر پروگرام پہنچ جاؤں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۱۳)

۹ تلسی باغ۔ سری نگر

۶۱-۹-۴

محب مکرم۔ تسلیم

آپ کا کارڈ ملا۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ رام پور کب گئے تھے اور کیوں گئے تھے۔ اسلم پرویز صاحب سے بھی دلی میں ملاقات نہ ہو سکی۔

سنا کہ ڈاکٹر نازنگ صاحب ریڈر مقرر ہو گئے ہیں؟ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ عرصے سے ان سے بھی مراسلت بند ہے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۱۴)

۹ تلسی باغ۔ سری نگر

۶۱-۹-۱۴

انجم صاحب آپ کا خط ملا خوشی ہوئی کہ آپ نے یاد فرمایا۔ نازنگ صاحب کی ریڈری کی خبر سے بھی خوشی ہوئی۔ اسلم پرویز صاحب کا کیا ہوا۔ اب مجھے ان کی فکر ہے۔ آپ کی پی ایچ ڈی کا بھی خیال رہتا ہے۔

مجھے ان پیران پارسا کے بارے میں کچھ علم نہیں جن کا آپ نے خط میں ذکر فرمایا ہے۔ امید کہ آپ کے یہاں سب بخیریت ہوں گے نثار احمد فاروقی صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

(۱۵)

۹ تلسی باغ۔ سری نگر
۱۶-۳-۶۲ء

محب عزیز

آپ کا کرم نامہ موضعہ ۹ مارچ ملا۔ حیدرآباد کے لئے خان بہادر تاراپور والا معتمد ہزاکز الیٹڈ ہائی نس دی نظام چیریٹیبل ٹرسٹ کے نام انگریزی میں ایک درخواست بھیجئے۔ اور کشمیر کے لئے جناب بخشی صاحب سے مل کر کہنا ہوگا جب کہ وہ دلی آئیں۔ یہ دونوں صورتیں اور زیادہ بااثر ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ کوئی انجمن یا ادارہ بنا کر اس کی طرف سے درخواست بھیجیں۔ یا کسی موجودہ انجمن کی طرف سے کارروائی کریں۔ انفرادی طور پر اثر کم ہوگا۔

امید کہ آپ اور اسلم پرویز بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں ۳۰ مارچ کو دلی آرہا ہوں۔ پرتھوی راج روڈ پر کشمیر امپوریم میں دو روز ٹھہروں گا۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

بنام اسلم پرویز

۹ تلسی باغ۔ سری نگر
۲۵ اپریل۔ ۶۲ء

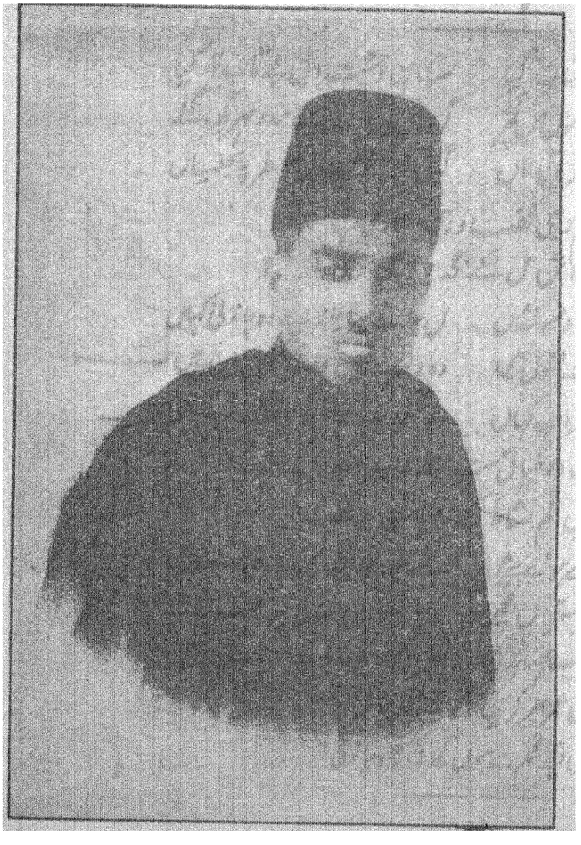
عزیز من سلمہٗ

آپ کے دو خط پیش نظر ہیں۔ میں ابھی جموں سے واپس ہوا ہوں وہاں اس ماہ کئی روز قیام کرنا پڑا کیونکہ مختلف کمیٹیاں تھیں۔ آپ کی کتاب ملی۔ کچھ لکھوں گا۔ بسمل سعیدی صاحب کا میں خود معتقد ہوں اور ان کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا کر دیا ہے۔ ۴ مارچ کو ایک کمیٹی ہے۔ شاید اس کے بعد رقم ارسال ہو۔ ان کو میری طرف سے مطمئن کر دیجئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم اور آپ سے میری بہترین توقعات ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔

مخلص
سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر زور
کی
نظمیں اور غزلیں



چاندنی

پھر ذکرِ رونقِ شبِ مہتاب آگیا — سامانِ وحشتِ دلِ بے تاب آگیا
نقشے شبِ وصال کے آنکھوں میں پھر گئے — گردوں پہ بادلوں میں مہ و مہر گھر گئے
میں اور یادِ نعمتِ دیدار الاماں — گرتی ہیں خرمنِ دلِ مضطر پہ بجلیاں

موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی
اے کاش مل سکے نگہِ یار بھی وہی

ہوگا یونہی فلک پہ سدا ماہ ضوفشاں — مل جائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں
میں ہوں وہی مگر وہ طبیعت وہ دل نہیں — وہ ولولے نہیں وہ امنگیں نہیں رہیں
وہ جوشِ داد خواہیٔ بیداد اب کہاں — وہ شکوہ ہائے خاطرِ ناشاد اب کہاں

اب وہ خیالِ مستیِ مئے خواب ہوگئے
غرقِ الم نشاط کے اسباب ہوگئے

نشترِ دل و جگر میں چبھوئے ہوئے ہیں — نغمے مرے رباب میں سوئے ہوئے سے ہیں
آتی ہیں یادِ شوق کی سرمستیاں مجھے — تڑپاتی ہیں زمانہ کی نیرنگیاں مجھے
اب دل میں خواہشِ شبِ مہتاب ہی نہیں — تفریح و انبساط کے اسباب ہی نہیں

ہاں عمر بھر کریں گے تجھے یاد چاندنی
اس قیدِ غم سے ہوں گے نہ آزاد چاندنی

آسمان کی زبان سے

عرصۂ امکاں پہ ہوں دیر سے میں حکمراں
حکم سے میرے رواں
بادلوں کے کارواں
کشتیوں کے بادباں
باغ کی سب نالیاں
عرصۂ امکاں پہ ہوں دیر سے میں حکمراں

۲

قافلۂ زیست کا کارواں سالار ہوں
مخزنِ اسرار ہوں
مطلعِ انوار ہوں
مرجعِ افکار ہوں
در پئے رفتار ہوں
قافلۂ زیست کا کارواں سالار ہوں

۳

سامنے میرے ہوئیں معرکہ آرائیاں
شہروں کی زیبائیاں
قوموں کی رعنائیاں
حسن کی پرچھائیاں
عشق کی رسوائیاں
سامنے میرے ہوئیں معرکہ آرائیاں

۴

حامیٔ تدبیر ہوں مالکِ تقدیر ہوں
عرش کی تفسیر ہوں
خلد کی تصویر ہوں
حسن کی تنویر ہوں
خواب کی تعبیر ہوں
حامیٔ تدبیر ہوں مالکِ تقدیر ہوں

۵

با ایں ہمہ برتری خاک میں آلودہ ہوں
میں نہ تو محدود ہوں
اور نہ مفقود ہوں
نام کو موجود ہوں
شعلۂ بے دود ہوں
با ایں ہمہ برتری خاک میں آلودہ ہوں

افسانۂ محبّت

بھر دے مئے الفت سے ساقی مرا پیمانہ — آباد رہے دائم یہ عشق کا مے خانہ
ہنستوں کو جو رلوا دے مستوں کو جو تڑپا دے — مردوں کو جو گرما دے وہ ہے مرا افسانہ
ہیں یاد ابھی وہ دن تجھی تیری جبیں سادہ — عاری تھا جفا سے تو تھا جور سے بیگانہ
تھا دخل نہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی — انداز سے کچھ مطلب شوخی سے نہ یارانہ

وہ راحتِ جاں بننا وہ روٹھ کے من جانا — وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا
وہ نور کی کرنوں کا چہرہ پہ چمک جانا — وہ وقتِ خرام ان کے اعضا کا لچک جانا

مخمور سی آنکھیں وہ محجوب سی وہ باتیں — محجوب ادائیں وہ رفتار وہ مستانہ
مجنوں کو ہو حیرانی، وامق کو پریشانی — فرہاد کو ہو سکتہ، خسرو بھی ہو دیوانہ

آباد ہے الفت سے داتا کی عنایت سے
دنیا مری نظروں کی دل کا مرے کاشانہ

رہبرِ منزل کی جدائی

آج گلشن کے اجڑنے کی خبر آئی ہے — دلِ ناشاد پہ کلفت کی گھٹا چھائی ہے
نہ وہ ساقی ہے نہ وہ انجمن آرائی ہے — چار سو مجمعِ اغیار ہے رسوائی ہے
رقص کرتے نظر آئیں گے نہ ارماں دل میں
کوئی بے تاب رہیگا کوئی حیراں دل میں

عندلیبانِ چمن کا نہیں پرساں کوئی — نظر آتا نہیں اب شعلۂ عریاں کوئی
پھول ہیں باغ میں لیکن نہیں خنداں کوئی — اس گلستاں کو کہے گا نہ گلستاں کوئی
نظر آتا نہیں سامانِ مسرت باقی
اب وہ اگلی سی نہ راحت ہے نہ فرحت باقی

شعلے اٹھنے ہی کو تھے وادیٔ سینا سے ابھی — مست آنکھیں نہ ہوئیں کیفِ تماشا سے ابھی
لہریں اٹھتی ہیں مری چشمِ تمنا سے ابھی — جان آئی نہ تھی انفاسِ مسیحا سے ابھی
سیکھتے تھے ابھی پرواز پر پروانہ
تشنہ لب تھے ابھی زندانِ درِ میخانہ

کوئی بے وقت یہ محفل کا اجڑنا دیکھے — راہ میں رہبرِ منزل کا اجڑنا دیکھے
شاہدِ حسن کی محفل کا اجڑنا دیکھے — کس طرح اپنے کوئی دل کا اجڑنا دیکھے
یاد تڑپائے گی زور اس کی ہمیشہ ہم کو
نہ ملا ہے نہ ملے گا کوئی ایسا ہم کو

جامعہ عثمانیہ اور نونہالانِ دکن

مژدہ باد اے ہم صفیر و پھر بہار آنے کو ہے
شاہدِ ملکِ دکن پر پھر نکھار آنے کو ہے
پھر صبا آنے کو ہے بے اختیار آنے کو ہے
جوشِ پر پھر رحمتِ پروردگار آنے کو ہے
ظلمتِ جہل زبوں کافور ہوتی جائے گی
کلفتِ ادبار و نکبت دور ہوتی جائے گی

آج کل غنچوں کی وہ دل آنگیاں باقی نہیں
کشت زاروں میں تروو کے نشاں باقی نہیں
پیچ سنبل میں میانِ بوستاں باقی نہیں
طائروں کے دل میں بھی خوفِ خزاں باقی نہیں
پھول پھل سب نشۂ آبِ طرب میں چور ہیں
مست ہیں خوش ہیں جوانانِ چمن مسرور ہیں

زینتِ فصلِ بہاراں نونہالانِ چمن
ہیں خوشی میں نغمہ زن سب مثلِ مرغانِ چمن
اُف رے گلشن کی فضا اللہ رے شانِ چمن
کیا سرور افزا نظر آتے ہیں سامانِ چمن
جامعۂ عثمانیہ اب جلوہ گاہِ طور ہے
ہر طرف پرتو فگن علم و عمل کا نور ہے

اس کے ہر ذرہ کو رشکِ آفتاب اب دیکھئے
عظمتِ ملکِ دکن کو بے نقاب اب دیکھئے
ہو چکا منت کشی کا سدِ باب اب دیکھئے
دیکھئے ہاں دیکھئے یہ انقلاب اب دیکھئے
داغ ہائے منتِ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ دکن شاداب ہوتے جائیں گے

خیر مقدم

بہ تقریب ورودِ مسعودِ اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران در کشورِ ہندوستان

○

ستم دوست بجا ہست امروز — شاید از ما کہ خطا ہست امروز
تو چہ دانی کہ چہ باشد فردا — آنچہ نقشِ کفِ پا ہست امروز
ایں مپندار کہ خالی ز خطر — راہِ اربابِ وفا ہست امروز
حافظ و سعدی ہمی یاد آیند — شاہِ ایراں کہ بہ ما ہست امروز
ساقیا! بزمِ رباب و چنگ است — مئے و پیمانہ کجا ہست امروز
بادۂ عہدِ جہانگیر بیار — محفلِ شاہِ رضا ہست امروز
شجرِ رشتۂ دیرینہ را — موسمِ نشو و نما ہست امروز
بہرِ خوشنودیِ فتحیِ ہند و ایراں — ہر کجا دستِ دعا ہست امروز

فیضِ مہمانِ عزیز است اے زور
فکرِ شاعر کہ رسا ہست امروز

○

مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ مئی ۱۹۵۶ء

غزلیں

(۱)

شبِ غم کی نہ ہوگی انتہا کیا
نہ لائے گا خوشی کا دن خدا کیا
مری آنکھوں میں جلوہ اپنا دیکھو
یہ ہر دم دیکھتے ہو آئینہ کیا
خضر کیا جانیں تم پر جان دینا
انھیں اس مرحلہ سے واسطہ کیا
کروں کس منہ سے غیروں کی شکایت
سناؤں اپنے غم کا ماجرا کیا
ترے در پر جو آیا پھر نہ اٹھا
یہی دنیا میں تھا اک آسرا کیا؟
بتوں سے مہربانی کی توقع
مرے ذوقِ طلب کا پوچھنا کیا
وہ بزمِ غیر وہ جھوٹے فسانے
انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا
نہیں معلوم نکلیں گے یہ کیوں کر
دلِ غمگیں میں ہیں ارمان کیا کیا
بڑھے جوشِ محبت میں جب آگے
بلند و پست کیا ارض و سما کیا
گنتا کرتے ہو راتوں کو جو تارے
یہ آخر زور تم کو ہو گیا کیا؟

(۲)

دل جب سے ہوا ہے خوگرِ غم آزار میں لذت پاتا ہوں
گلبانگِ مسرت دور رہے میں اس سے بہت گھبراتا ہوں
ہر روز ہزاروں زخم نئے اس زخمی دل پر کھاتا ہوں
افتاد سے ہوں مجبور ہوا کب چاہ سے میں باز آتا ہوں
وہ ناز و ادا میں سرگرمی سو رنگ سے جب دکھلاتے ہیں
جذبات کو لے کر پہلو میں سرگرم وفا ہو جاتا ہوں
اے زورؔ نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے یہ سب دھوکے کی جگہ
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

یوں تو کہنے کو یہاں سے گذر جائیں گے
کیا بتائیں کہ آخر کدھر جائیں گے

میری آنکھیں ترستی رہیں گی مگر
وہ جو آئیں گے دل میں اُتر جائیں گے

بوئے گل ہو کہ سیلابِ برقِ تپاں
سعیٔ انسان سلامت، سنور جائیں گے

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی
زندہ دل ہنستے ہنستے گذر جائیں گے

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

بن کے انگشت اشارت جو اشارا کر دے
نگہ ناز تری کیا کہوں کیا کیا کر دے

بھر دے آہوں میں خیال رُخِ تاباں آتش
اور اشکوں کو مرے رو کشِ دریا کر دے

دلِ پُر یاس ہے صد تشنۂ سوزِ پنہاں
اس کو مرہونِ شرر ہائے تمنّا کر دے

ضبط آخر یہ ترا دیدۂ گریاں کب تک
کیفیت ابر بہاراں کی ہویدا کر دے

دل ہو سہائے مجازی میں ہے چشمِ حساد
خوف ہے رازِ حقیقت کہیں افشا کر دے

عاشقوں میں ہے مواخات کا رشتہ قائم
شمع پر زورؔ نہ کیوں خون کا دعویٰ کر دے

ہم اپنی گرمیٔ سوزِ دروں سے چیخ اٹھے
خوشا کہ مستیٔ فیضِ جنوں سے چیخ اٹھے

بہ نازِ طبعِ بلند و بہ زعمِ خود نگہی[1]!
زمانہ سازیٔ دنیائے دوں سے چیخ اٹھے

ذرا سی بات سے، سارے جہاں میں دھوم ہوئی
جو کم سوادیٔ صبر و سکوں سے چیخ اٹھے

بہ پاسِ خاطرِ جاناں خموش بیٹھے تھے
مگر خرابیٔ بازیٔ خوں سے چیخ اٹھے

کہاں ہے وعدۂ پرویز و جلوۂ شیریں
عجب نہیں جو دلِ بے ستوں سے چیخ اٹھے

○

مطبوعہ "نقوش" ۱۹۶۶ء

○

فردوس آب و گل کے نظاروں کا شوق ہے
چشموں کا رنگ و بو کا بہاروں کا شوق ہے

انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر
دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے

ہستی کی تلخیاں جو گوارا نہ ہو سکیں!
زندوں سے ہے نفور، مزاروں کا شوق ہے

حرص و ہوس کو گرمیٔ بازار چاہیئے!
خستہ دلوں کو درد کے ماروں کا شوق ہے

عزمِ خودی ہے بیچ سمندر میں غوطہ زن
امواجِ بے خودی کو کناروں کا شوق ہے

رہتے ہیں دل میں اور سمجھتے ہیں خود کو دور
ایسے ستم شعار پیاروں کا شوق ہے

○

---

[1] بیاض مکررہ ڈاکٹر زور میں "خود نگہی" اور "۲" "بہ تنگ آنکے جو" درج ہے۔

ہم نے سیکھا ہی نہیں آپ کی چاہت کے سوا
کام آیا نہیں دنیا میں محبت کے سوا
دل ہو بیدار تو انسان سمجھ سکتا ہے
قوتیں اور بھی ہیں دولت و ثروت کے سوا
دل کے بہلانے کو ہیں من کی باتیں شاید
یہ بھی افسانہ و افسوں ہے حقیقت کے سوا
نطقِ انساں رہا پابندِ سلاسل ہی سدا
شاعری عشوہ گری کیا ہے سیاست کے سوا
یوں تو کرنے کو بہت کام ہیں لیکن اے نور
کام آتا ہے ہنر کوئی نہ خدمت کے سوا

عزم و ہمت ہے تخیل ہے کہ ذوقِ یقیں
یہ جو پھر خاک نشیں ہوتا ہے افلاک نشیں
ذوقِ پاکیزہ سے ہر چیز ہے پُر لطف و حسیں
یہ نہ حاصل ہو تو بے کار ہے دنیا ہو کہ دیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آ نکلے!
ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے جب دل کے قریں
کیا تم ہے وہی بے نام و نشاں رہتے ہیں
جن غریبوں کے پسینوں سے نکھرتی ہے زمیں
یہ جو خوش پوش ہیں پروردۂ تہذیبِ جدید
ڈھونڈتا ہوں کوئی انسان ہے ان میں کہ نہیں

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں
کبھی سحر کے کبھی شب کے اعتبار میں ہیں
یہ راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں
وہ سوئے دار چلے ہیں جو کوئے یار میں ہیں
سمجھ ہی سکتے نہیں ہیں حقیقتِ امروز
وہ لوگ جو کسی فردا کے انتظار میں ہیں
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
فریب خوردہ خزاں ہیں نہ خوش بہار میں ہیں
بفیضِ سوز دروں و بطرزِ اہلِ جنوں
وہی ہے منزلِ لیلیٰ کہ جس دیار میں ہیں
جہاں میں اب بھی کچھ ایسے قبوں کی جلتی ہے
کچھ اپنے بس میں نہ اوروں کے اختیار میں ہیں
کبھی تو ایک جھلک سی دکھا پئے ہم کو
ابھی تک آس لگائے ہیں انتظار میں ہیں
جنابِ زورؔ بھی شاعر ہیں سنتے آئے ہیں
کسی قطار میں شامل نہ کچھ شمار میں ہیں

ٹوٹیں جو روز سر پہ بلائیں تو کیا کریں
وہ بھی ہنسا ہنسا کے رلائیں تو کیا کریں
ہر دم نئے نئے یہ دکھاتی ہے شعبدے
ہستی کا پھر فریب نہ کھائیں تو کیا کریں
اچھا ہے آپ ہم سے کریں عہدِ سرخوشی
لیکن اگر نہ اس کو نبھائیں تو کیا کریں
جی جی کے انتظار میں مرتے رہے ہیں ہم
آخر وہ آتے آتے نہ آئیں تو کیا کریں
اچھا نہیں یہ شکوۂ شام و سحر مگر
افکارِ روزگار ستائیں تو کیا کریں

○

انقلابِ زمانہ ہے شاید یہی دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے
ہم جو بن بن کے بگڑے تو بندے بنے، وہ بگڑتے بگڑتے خدا بن گئے
ہم جو تھے اک تہی مایہ و بے نوا، ہم نے الفت جو کی تو بفیضِ وفا
ساز و آہنگ ایسے ہویدا ہوئے جو دھڑکتے دلوں کی صدا بن گئے
جن کو اپنا سمجھتے رہے عمر بھر، ان کی بیگانگی اور بڑھتی گئی
میری دیوانگی کا اثر یہ ہوا جو تھے نا آشنا، آشنا بن گئے
یہ زمین و زماں یہ مکین و مکاں آدمِ نو کی ضو سے ہوئے ہیں جواں
زندگی کروٹیں ہیں سحر لینے لگی، ولولے حاصلِ مدعا بن گئے
یہ ہجومِ گل و لالہ، یہ رنگ و بو، جوشِ موج و خروشِ لبِ آب جو
میرے ہاتھوں سے ایسے سنور تے گئے نازشِ ارض و فخرِ سما بن گئے

○

احباب سے وفا کا صلہ گر نہ پائیے — دشمن کے باب میں بھی بدی پر نہ آئیے
آنا ہے آپ کو تو کچھ اس طرح آئیے — آنکھوں میں بیٹھیے مرے دل میں سمائیے
انسان مر چکا ہے مشینوں کا دور ہے — اب کیا کسی کو زہر کہ امرت پلائیے
فردا کے انتظار میں کٹتی ہے زندگی — بہتر ہے روز و شب کا نہ پردہ اٹھائیے

احساسِ آگہی تو بہت عام ہے مگر
کس بات کی تلاش[1] ہے یہ تو بتائیے

[1] ڈاکٹر زور نے اپنی قلمی بیاض میں نظر ثانی کرتے ہوئے "کا شعور" پنسل سے تحریر کیا ہے مگر تلاش کو قلمزد نہیں کیا۔

○

ایسے بے درد و بد اندیش یہاں ہیں کچھ لوگ
جو سمجھتے نہیں پابندِ فغاں ہیں کچھ لوگ

پینے والے مئے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں!
چشمِ ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں کچھ لوگ

ہم غریبوں پہ امیروں کی خدائی چلتی
باعثِ برہمیٔ بزمِ بتاں ہیں کچھ لوگ

قافلے چل بھی پڑے لے کے شعورِ فردا!
اور بھی مست مئے خوابِ گراں ہیں کچھ لوگ

طرحِ افسانہ و افسوں کی حقیقت معلوم
درپسِ کارگہِ شیشہ گراں ہیں کچھ لوگ

بانیٔ فکرِ جدید، آذرِ طرزِ فردا
ان ہی گمنام غریبوں میں نہاں ہیں کچھ لوگ

ہم سے شرحِ غمِ اندوہِ عزیزاں مت پوچھ!
محوِ تفسیرِ حدیثِ دگراں ہیں کچھ لوگ

اک نگاہِ غلط انداز سہی، دیکھ تو لیں
آپ کے چاہنے والوں میں یہاں ہیں کچھ لوگ

زندگی، زندہ دلی، ذوقِ طلب، شوقِ عمل
عہدِ پیری میں بھی اے زورِ جواں ہیں کچھ لوگ

○

بعض ہمدرد سے آجاتے ہیں انساں کے قریب
قصر والوں سے پرے کوئے غریباں کے قریب

اپنی کوتاہیٔ دانش کا گلہ کیا کیجئے!
بارہا ہم بھی گئے تھے درِ زنداں کے قریب

پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی ہیں بیگانے سے
اب بھٹک کر بھی نہ جائیں گے گلستاں کے قریب

وہ پہاڑوں کو بگولوں کو سمٹ لیتی ہے
اک قیامت ہے بپا گردشِ دوراں کے قریب

دوستو دیکھ بھی لینا کہیں واعظ تو نہیں
کوئی بھٹکا ہوا آتا ہے بیاباں کے قریب

ساتھیو!

پونچھ بھی ڈالو اب چشمِ نم ساتھیو!
کیوں کریں آج بھی کل کا غم ساتھیو!

اپنی تقدیر منتی ہے تدبیر سے
اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو!

منحصر ہے یہ دنیا جو اسباب پر
سب ہی اسباب ہوں گے بہم ساتھیو!

ہم دمو! جی نہ چھوڑو یہی وقت ہے
یوں ہی بڑھتا رہے ہر قدم ساتھیو!

ہمتیں پست ہونے نہ پائیں گی اب
ختم ہونا ہے دورِ ستم ساتھیو!

○

اہلِ دکن

حیرت سے دیکھتا ہوں کہ یہ گلبدن ہیں کون
کھلتا نہیں کہ ان میں سرِ انجمن ہیں کون

قدریں بدل گئی ہیں کہ معلوم ہی نہیں
شہرِ سخن ہیں کون دریدہ دہن ہیں کون

سیکھی ہے رہبروں نے امیروں سے رہزنی
اربابِ انبساط غریبِ وطن ہیں کون

شیرازۂ بہارِ گلِ تر بکھر گیا
اب کس کو کیا بتائیں کہ زیبِ چمن ہیں کون

کشمیر میں کوئی تو کراچی میں ہیں کوئی
اے زورؔ کن سے پوچھیے اہلِ دکن ہیں کون

○

آگ بھڑکتی ہی رہی

آپ آئیں گے مگر آئیں گے، کب کس کے لئے
ڈر یہ ہے آپ کے سودائی گذر جائیں گے
آپ کے شوق میں جیتے ہی رہے مر مر کے
اور زمانے نے یہ سمجھا کہ یہ مر جائیں گے

ولولے دل کے مگر سرد نہ ہونے پائے
مضمحل ہو کے بھی جذبات نہ سونے پائے
کمر ہمت و تدبیر بندھی رکھی ہے
گوہر عزم کسی حال نہ کھونے پائے

سختیاں زیست کی سہہ سہہ کے جیئے جاتے ہیں
تلخ ماحول کے سب گھونٹ پیئے جاتے ہیں
بے کسی کے ہیں اسیر ابلہ فریبی کے شکار
آس کے مارے ہیں اور آس کئے جاتے ہیں

فتنے اٹھتے ہی رہے آگ بھڑکتی ہی رہی
یہ نہیں وہ کہ کسی طرح سے ڈر جائیں گے
آندھیوں میں بھی دیا دل کا نہ بجھنے پایا
آپ اس سمت نہ آئیں تو کدھر جائیں گے

(سری نگر کشمیر، ۱۲ نومبر ۱۹۶۱ء)

جہاں آشوب

دریوزہ گر و کوتاہ نظر باعیش و فراغت بیٹھے ہیں
تھا ناز شرافت جن کو کبھی محروم شرافت بیٹھے ہیں
جو خار کبھی تھے ننگِ چمن، ہیں آج وہی نسرین و سمن
کیا جانیے کس جا لالہ و گل پابند نزاکت بیٹھے ہیں
میدانِ قیامت جیت لیا دیوانوں نے آگے بڑھ کر
یاں سر بگریباں فرزانے با فہم و فراست بیٹھے ہیں
ہر سمت ہیں چرچے امن ہی کے ہر روز ہے چرچا امن ہی کا
ہم رنگِ زمیں اک دام بچھا کر اہلِ سیاست بیٹھے ہیں
کیوں اہلِ جنوں سے پوچھتے ہیں کیوں تیشہ و سنگ سے کھیلتے ہیں
انداز جنوں وہ کیا سمجھیں جو سر بہ سلامت بیٹھے ہیں
ہم اور غمِ دوراں کی خلش، ہم اور غمِ جاناں کی تپش
کچھ لوگ ابھی تک منتظرِ فردائے قیامت بیٹھے ہیں
کیا جانیے کیا کیا گزری ہے انداز و ادا سہتے سہتے
کیا پوچھئے اب کیوں اہلِ وفا با اشکِ ندامت بیٹھے ہیں

مقالہ نما

ڈاکٹر زور

مرتبہ

وقار خلیل



مقالہ نما

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱	ادبی تنقید (دو قسطیں)	"تحفہ" حیدرآباد دکن	جولائی، اکتوبر ۱۹۲۴ء
۲	طرز بیان	〃	ستمبر ۱۹۲۴ء
۳	فرانسیسی ادب (دو قسطیں)	〃	نومبر ۱۹۲۴ء اور فروری ۱۹۲۵ء
۴	حبِ وطن	"ارتقا" حیدرآباد دکن	نومبر و دسمبر ۱۹۲۴ء
۵	حدیقۂ سنائی	"تحفہ" 〃	فروری ۱۹۲۵ء
۶	تعصب	"ارتقا" 〃	〃
۷	طبقاتِ ناصری اور اس کا مصنف	"تحفہ" 〃	مارچ ۱۹۲۵ء
۸	انگلستان اور ارتقائے تعلیم	"ارتقا" 〃	اپریل 〃
۹	ہوریس اسمخ کی شاعری	"تحفہ" 〃	〃 〃
۱۰	ابوالحسن تاناشاہ کی قبر پر	〃 〃	مئی ۱۹۲۵ء
۱۱	زندۂ جاوید	〃 〃	ستمبر 〃
۱۲	اُردو کے اسالیبِ بیان	"سہیل" علیگڈھ	اپریل ۱۹۲۶ء
۱۳	تازیانہ (دو اقساط)	"نگار" لکھنؤ	مئی، جون 〃
۱۴	میر انیس کی شاعری پر ایک نظر (دو اقساط)	"نیرنگِ خیال" لاہور "الناظر" لکھنؤ	جون ۱۹۲۶ء
۱۵	میر کی مثنویاں	"تحفہ" حیدرآباد دکن	جولائی 〃
۱۶	غالب کی ذہنیت (دو اقساط)	"نگار" لکھنؤ	اگست، ستمبر ۱۹۲۶ء
۱۷	اُردو کے اسالیبِ بیان 〃	"سہیل" علی گڈھ	ستمبر ۱۹۲۶ء
۱۸	میر تقی میر اور خارجی حالات کی ترجمانی	"نگار" لکھنؤ	نومبر ۱۹۲۶ء
۱۹	مشربِ ناسب	ہمایوں لاہور	〃
۲۰	حالی اور نثرِ اُردو	"نگار" لکھنؤ	جنوری ۱۹۲۷ء
۲۱	نواب آصف الدولہ کا شکار اور میر و سودا	"زبان" آگرہ	〃
۲۲	فارسی نثر کا آغاز اور ابوعلی بلعمی	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	فروری ۱۹۲۷ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۲۳	ادبیاتِ اُردو اور تنقید نگاری	"تجلی" حیدرآباد	اپریل ۱۹۲۷ء
۲۴	اردو کے پیغام گو شاعر	"زبان" آگرہ	جولائی "
۲۵	فارسی ادب کے ابتدائی گہوارے	"تجلی" حیدرآباد	" "
۲۶	ادبیاتِ ایران کا عہد زرّیں	"نظر" لکھنؤ	ستمبر "
۲۷	غزنوی دور کا آغاز اور ایرانی علم و فضل	"تجلی" حیدرآباد	اکتوبر "
۲۸	طامس گرے کے کلام پر تنقیدی نظر	"ہمایوں" لاہور	" "
۲۹	"فسانۂ عجائب" و باغ و بہار	"نیرنگِ خیال" لاہور	سالنامہ دسمبر ۱۹۲۷ء
۳۰	سلطان محمود غزنوی اور علم و ادب	"نگار" لکھنؤ	جنوری ۱۹۲۸ء
۳۱	واجد علی شاہ کے خطوط اکمیل محل کے نام	"نظام گزٹ" حیدرآباد	اپریل "
۳۲	کتب خانہ جات شاہانِ اودھ اور دکھنیات	"تجلی" حیدرآباد	"
۳۳	کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیاتِ شرقی	" "	مئی ۱۹۲۸ء
۳۴	دیوانِ یقین	"نگار" لکھنؤ	جون "
۳۵	بہرام گور دکن میں	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	نومبر "
۳۶	شمالی اور دکنی اردو کی علیحدگی	"جامعہ" دہلی	دسمبر "
۳۷	گولکنڈہ کا ایک قدیم زرّیں ادبی شاہ پارہ	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	اپریل ۱۹۲۹ء
۳۸	دکنی اثر شمالی ہند پر	"اردو" اورنگ آباد	" "
۳۹	ابن نشاطی اور "پھول بن"	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	جولائی ۱۹۲۹ء
۴۰	دکنی مرثیے ایڈن برا میں	"مجلہ اردو" اورنگ آباد	"
۴۱	اُردو انشا پردازی	"رہبر دکن" حیدرآباد	سالنامہ دسمبر ۱۹۲۹ء
۴۲	اورنگ زیب اور تاناشاہ	" "	" "
۴۳	شیطان	"مجلہ مکتبہ" "	دسمبر ۱۹۲۹ء
۴۴	اخبار رنگین	"مجلہ عثمانیہ" "	مارچ ۱۹۳۱ء
۴۵	گارساں دتاسی	"ہندوستانی" الہ آباد	اپریل "
۴۶	افسانے	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	جون "
۴۷	صوتیاتی تحقیقات	"مجلہ مکتبہ" "	اکتوبر "
۴۸	اردو شاعری کا پہلا سرپرست شہزادہ	"رہبر دکن"	ولی عہد نمبر

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	مراحت اشاعت
۴۹	حاتم کی مسلسل نظمیں	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	جنوری ۱۹۳۲ء
۵۰	ہندوستانی کا آغاز	"مجلہ عثمانیہ" "	جون "
۵۱	دہلی میں اردو شاعری کا آغاز	"ہندوستانی" الہ آباد	جولائی "
۵۲	لسانیات	"مجلہ مکتبہ" حیدرآباد	ستمبر "
۵۳	ہندوستانی کا ارتقا	"مجلہ مکتبہ" "	اکتوبر "
۵۴	مثنوی قہوہ	" "	نومبر "
۵۵	زبان اور سیاسیات	"کاروان" لاہور	سالنامہ "
۵۶	لے کونت دے خوب ترنگ (فرانسیسی)	"ژورنل ایشیاتیک جرنل" (پیرس)	جولائی "
۵۷	میر حسن کی "سحر البیان" اور مرزا قتیل	"مجلہ تحقیقات علمیہ" حیدرآباد	اکتوبر "
۵۸	چار کمان	"حسن کار" حیدرآباد	" "
۵۹	شہر حیدرآباد کا آغاز	" "	نومبر "
۶۰	جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات	"مجلہ عثمانیہ" "	" "
۶۱	ناول کا ارتقا	"منشور" "	سالنامہ نومبر "
۶۲	حیدرآباد کی آبادیاں	"رہبر دکن" "	" "
۶۳	سٹی کالج کی تربیت	"مجلہ سٹی کالج" "	سالنامہ اپریل ۱۹۳۴ء
۶۴	جواہر سخن پر ایک نظر	"مجلہ عثمانیہ" "	جون ۱۹۳۴ء
۶۵	سٹی کالج کے بعض قدیم طلبا	"مجلہ سٹی کالج" "	جولائی "
۶۶	حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات	"مجلہ عثمانیہ" "	اگست ۱۹۳۴ء، مارچ جون ۱۹۳۶ء ستمبر ۱۹۳۶ء
۶۷	اردو کا قدیم ترین معیار سخن	"نظام گزٹ" "	سالگرہ نمبر اکتوبر ۱۹۳۴ء
۶۸	اردو شاعروں کی شاہ پرستی	"منشور" "	اکتوبر ۱۹۳۴ء
۶۹	قدیم اردو مٹتا جاتی	"رہبر دکن" "	" "
۷۰	حالی کی شخصیت ان کے کارناموں میں	یادگار حالی ...	مقالہ "یوم حالی" ۱۹۳۴ء
۷۱	اردو مرثیوں کے ابتدائی گہوارے	"مجموعہ تحقیقات علمیہ" "جامعہ عثمانیہ" حیدرآباد	جلد دوم ۱۹۳۴ء
۷۲	ادبی معمائیں	"المرسی" (مجلہ سٹی کالج) "	۱۹۳۵ء
۷۳	حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	سنہ ۱۹۳۵ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۷۴	اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانیں (دو قسطیں)	"آئینۂ ادب" حیدرآباد	۱۹۳۵ء
۷۵	گلکرسٹ کی اردو خدمات (مقالہ)	"اورنٹیل کانفرنس" میسور	〃
۷۶	فرزندان جامعہ عثمانیہ کے علمی و ادبی رجحانات اور ان کا مستقبل۔	"شہاب" حیدرآباد	اپریل ۱۹۳۶ء
۷۷	مشک محل (آثار قطب شاہی)	〃 〃	اکتوبر 〃
۷۸	چچلم کی رقاصہ	〃 〃	نومبر 〃
۷۹	ولی کا وطن	"مجلۂ الموسیٰ" 〃	۱۹۳۶ء
۸۰	ولی کے قلمی نسخے	〃 〃	〃
۸۱	ہماری شاعری کا لفظی خزانہ	"رہبر دکن" 〃	سالنامہ ۱۹۳۶ء
۸۲	مکہ مسجد	"شہاب" 〃	دسمبر 〃
۸۳	شیخی امداد (افسانہ)	"مجلہ عثمانیہ" 〃	جون 〃
۸۴	چاندنی (نظم)	〃 〃	〃 〃
۸۵	دورِ آصفیہ میں حیدرآباد کی اردو شاعری	"ہندوستانی" الہ آباد	جولائی 〃
۸۶	عہد عثمانی میں اردو مطبوعات (حیدرآباد)	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	مارچ ۱۹۳۷ء
۸۷	استادِ کل حضرت فیض کا زمانہ	"شہاب" 〃	اکتوبر 〃
۸۸	استاد الاساتذہ حضرت فیض	"رہبر دکن" 〃	سالگرہ نمبر 〃
۸۹	سرو صحرا (افسانہ)	"مجلہ عثمانیہ" 〃	جولائی 〃
۹۰	شیخ چاند کی وفات	〃 〃	۱۹۳۷ء
۹۱	استادِ کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض	"ہندوستانی" الہ آباد	اپریل ۱۹۳۸ء
۹۲	"سب رس" (تین سو گیارہ سال قبل کی مطبوعہ کتاب)	"سب رس" حیدرآباد	جنوری 〃
۹۳	بادشاہی عاشور خانہ بیجاپور	〃 〃	محرم نمبر مارچ ۱۹۳۸ء
۹۴	اردو مرثیوں کا ارتقا	〃 〃	〃 〃
۹۵	اقبال کا اثر اردو شاعری پر	〃 〃	
		"مجلہ عثمانیہ" جنوری ۱۹۳۸ء	اقبال نمبر جون ۱۹۳۸ء
۹۶	حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی اردو خدمات	"سب رس" حیدرآباد	اگست ۱۹۳۸ء [مئی ۱۹۶۳ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۹۷	ادارۂ ادبیات اردو کی سرگذشت	"سب رس" حیدرآباد	ستمبر ۱۹۳۸ء
۹۸	خطبۂ صدارت (یوم اقبال منعقدہ بمبئی)	〃 〃	اکتوبر 〃
۹۹	کیوں لکھیں ؟	〃 〃	نومبر 〃
۱۰۰	کیا لکھیں ؟	〃 〃	دسمبر 〃
۱۰۱	گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت	〃 〃	"مرقع" دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء
۱۰۲	مشاہیر گولکنڈہ	〃 〃	〃 〃
۱۰۳	راشد الخیری	"عصمت" دہلی	فروری ۱۹۳۹ء
۱۰۴	کس طرح لکھیں ؟	"سب رس" حیدرآباد	〃 〃
۱۰۵	اسلوب بیان	〃 〃	اپریل 〃
۱۰۶	عہد سلطان العلوم سے قبل کا آصفی ادب	"مجلہ عثمانیہ" 〃	〃 〃
۱۰۷	اُپج پیدا کرنا	"سب رس" 〃	مئی 〃
۱۰۸	علامہ سر ڈینی سن راس	〃 〃	جولائی 〃
۱۰۹	محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں	〃 〃	〃 〃
۱۱۰	گولکنڈے کے نئے قلعے میں ملا خیال کی مسجد	〃 〃	اگست 〃
۱۱۱	بھاگ متی یا حیدر محل (دو قسطیں)	〃 〃	〃 〃 مارچ ۱۹۴۱ء
۱۱۲	سلطان محمد قلی قطب شاہ اور تصوف	"مجلۂ نقش اوّلیں" ورنگل کالج	جنوری ۱۹۴۰ء
۱۱۳	حیدرآباد کے عاشور خانے	"سب رس" حیدرآباد	فروری 〃
۱۱۴	سراج اورنگ آبادی (دو اقساط)	〃 〃	مارچ 〃 دسمبر ۱۹۴۳ء
۱۱۵	شاہ سراج کا تکیہ اور عرس	〃 〃	اپریل 〃
۱۱۶	عظمت اللہ خاں	〃 〃	ستمبر 〃
۱۱۷	میر محمد مومن کا ذوق تعمیر (تین اقساط)	〃 〃	جون۔جولائی۔اگست ۱۹۴۱ء
۱۱۸	گارساں دتاسی (اردو کا پہلا پروفیسر)	〃 〃	نومبر ۱۹۴۱ء
۱۱۹	حضرت بابا شرف الدین	〃 〃	جولائی ۱۹۴۲ء
۱۲۰	بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی	〃 〃	اگست 〃
۱۲۱	پروفیسر عبدالقادر سروری	〃 〃	ستمبر 〃
۱۲۲	تذکرۂ اردو مخطوطات	〃 〃	جنوری 〃
۱۲۳	اردو مخطوطات ادارہ کے کتب خانے میں (چار اقساط)	〃 〃	فروری تا مئی ۱۹۴۳ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اخاعت
۱۲۴	مشرقی طب عہد قطب شاہی میں	"سب رس" حیدرآباد	اپریل ۱۹۴۳ء
۱۲۵	ہدایت کے تاریخی قصائد (تین اقساط)	〃 〃	اگست۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء۔ فروری۔ ۱۹۵۰ء
۱۲۶	ولی کی یاد کیوں منائی جاتی ہے؟	〃 〃	ستمبر ۱۹۴۳ء
۱۲۷	داغ دہلوی	〃 〃	فروری ۱۹۴۴ء
۱۲۸	اردو کی کہانی (شمالی ہند کا دور)	〃 〃	اپریل 〃
۱۲۹	خطبۂ صدارت	〃 〃	مئی 〃
۱۳۰	اردو کے علمی و ادبی رسائل	〃 〃	جون 〃
۱۳۱	عظیم ترحیدرآباد	〃 〃	دسمبر 〃
۱۳۲	خطبۂ صدارت (بزم اردو و رنگل کالج)	〃 〃	مارچ ۱۹۴۵ء
۱۳۳	ادبی تنقید کی لفظیات	〃 〃	اپریل 〃
۱۳۴	غالب کی ترقی پسندی	〃 〃	مئی 〃
۱۳۵	عہد غفران مکان کے شاعر	〃 〃	اگست 〃
۱۳۶	ترقی پسند ادب	〃 〃	〃 〃
۱۳۷	خطبۂ استقبالیہ (کل ہند ترقی پسند کانفرنس)۔	〃 〃	نومبر 〃
۱۳۸	علمی نشر	〃 〃	اپریل ۱۹۴۷ء
۱۳۹	اصغر گونڈوی	〃 〃	جولائی۔ اگست ۱۹۴۷ء
۱۴۰	میکش مرحوم (ایک تعارف)	〃 〃	میکش نمبر مارچ اپریل ۱۹۴۸ء
۱۴۱	سر مہدی یار جنگ مرحوم	〃 〃	مئی۔ جون ۱۹۴۸ء
۱۴۲	"سب رس" کا مستقبل	〃 〃	ستمبر 〃
۱۴۳	ادارۂ ادبیات اردو میں قلمی کتابیں (مسلل)	〃 〃	اکتوبر ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۰ء
۱۴۴	تحسین سروری	〃 〃	مارچ ۱۹۴۹ء
۱۴۵	نواب سالار جنگ مرحوم (چند تاثرات)	〃 〃	اپریل 〃
۱۴۶	عزیز یار جنگ عزیز کی شاعری	〃 〃	مئی 〃
۱۴۷	دکن کی آخری طویل اردو مثنوی	سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی	جنوری ۱۹۵۰ء
۱۴۸	اردو کے علمی و ادبی رسائل	"آج کل" دہلی	اگست 〃
۱۴۹	بہمنی ادب	سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی	اکتوبر 〃

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۵۰	مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی تحقیق (دو اقساط)	"سب رس" حیدرآباد	فروری، مارچ ۱۹۵۱ء
۱۵۱	ایم، اسلم	" "	اپریل ۱۹۵۱ء
۱۵۲	کشن پرشاد میں السلطنۃ	" "	اگست "
۱۵۳	ولی اورنگ آبادی اور ولی گجراتی	"آج کل" دہلی	ستمبر ۱۹۵۲ء
۱۵۴	اردو کے آرمینی شاعر	"سب رس" حیدرآباد	
		"مشرب" کراچی	اگست ۱۹۵۳ء
۱۵۵	موجودہ اردو ادب کے چند رجحانات اور مسائل	"سب رس" حیدرآباد	فروری مارچ ۱۹۵۴ء
۱۵۶	دکن میں اردو شعر و سخن کا ارتقا	"شاہراہ" دہلی	اگست ۱۹۵۵ء
۱۵۷	خواجہ حسن نظامی	"سب رس" حیدرآباد	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۵ء
۱۵۸	اردو کا لسانیاتی ادب (دو اقساط)	"آج کل" دہلی	اکتوبر - دسمبر "
۱۵۹	پنڈت ذکا تاریہ کیفی دہلوی	"سب رس" حیدرآباد	نومبر - دسمبر "
۱۶۰	قاضی عبدالغفار	" "	سالگرہ نمبر جنوری فروری ۱۹۵۶ء
۱۶۱	دو ساتھی بچھڑ گئے (علی منظور، حفیظ محمد صدیقی)	" "	" "
۱۶۲	سپاس نامہ	" "	امجد نمبر - جولائی اگست "
۱۶۳	جعفر زٹلی	"صبا" حیدرآباد	جلد ۷ شمارہ ۴ - ۱۹۵۷ء
۱۶۴	یادگار ضیغم	"آج کل" دہلی	اکتوبر ۱۹۵۷ء
۱۶۵	مدراس کا ایک غیر معروف اردو شاعر (غلام علی بسمل)	"سب رس" حیدرآباد	مئی - جون ۱۹۵۷ء
۱۶۶	غلام محی الدین خاں متین	" "	جولائی - اگست "
۱۶۷	شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات	"صبا" حیدرآباد	شبلی نمبر ۱۹۵۸ء
۱۶۸	بھاگ متی اور بھاگ نگر	"سب رس" حیدرآباد	محمد قلی قطب شاہ نمبر
			اپریل تا جون ۱۹۵۸ء
۱۶۹	شہید دہلوی	" "	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۸ء
۱۷۰	میر عبدالحی تاباں	"شاعر" بمبئی	خاص نمبر ۱۹۵۹ء
۱۷۱	شاہ نصیر دہلوی	"نقوش" لاہور	مئی ۱۹۵۹ء
۱۷۲	کیا موجودہ ادب رو بہ تنزل ہے؟ (سمپوزیم)	" "	دسمبر "

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۷۳	جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور اس کا پس منظر	"مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد	جامعہ عثمانیہ نمبر ۱۹۵۹ء ۱۹۶۰ء
۱۷۴	محلاتِ قطب شاہی	"سب رس" "	محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری ۱۹۶۰ء
۱۷۵	خیر مقدمی رپورٹ بموقع محمد قلی قطب شاہ	" "	" "
۱۷۶	ہندوستانی کلچر کی نشاۃ ثانیہ میں مولانا آزاد کی خدمات۔	"آندھرا پردیش" "	مارچ ۱۹۶۰ء
۱۷۷	آندھرا کا پہلا اردو شاعر	"فروغ اردو" لکھنؤ	" "
۱۷۸	قصۂ پنجۂ آفتاب و مہر شاہ	"سب رس" حیدرآباد	اپریل "
۱۷۹	واجد دہلوی	سہ ماہی "مجلس" "	اپریل، جولائی ۱۹۶۰ء
۱۸۰	مثنوی چھومنتر	"سب رس" "	ایوان اردو نمبر مئی ۱۹۶۰ء
۱۸۱	خیر مقدمی رپورٹ (تقریب افتتاح ایوانِ اردو)	" "	" "
۱۸۲	اردو اور پنجابی	"نقوش" لاہور	ادب عالیہ نمبر جولائی ۱۹۶۰ء
۱۸۳	علامہ اقبال اور حیدرآباد	"سب رس" حیدرآباد	جولائی ۱۹۶۰ء
۱۸۴	دیوانِ اشرف	" "	اگست "
۱۸۵	من سمجھاون اور گیان سروپ	"نیا دور" لکھنؤ	اسپیشل نمبر اگست ۱۹۶۰ء
۱۸۶	حضرت جگر مرادآبادی	"سب رس" حیدرآباد	ستمبر ۱۹۶۰ء
۱۸۷	تاذک گلشن آبادی	" "	اکتوبر "
۱۸۸	جیون خاں (گولکنڈے کے قلعہ دار)	" "	نومبر "
۱۸۹	حیدرآباد کا ایک قدیم مورخ	"آندھرا پردیش" "	سالنامہ نومبر ۱۹۶۰ء
۱۹۰	مولوی عبدالحق صاحب	سہ ماہی "مجلس" "	عبدالحق نمبر جنوری ۱۹۶۱ء
۱۹۱	اردو غزل کے ارتقا میں فکر و فن	"نیا دور" لکھنؤ	اسپیشل نمبر ۲ جنوری ۱۹۶۱ء
۱۹۲	بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی	"تعمیر" سرینگر	خالد کشمیر نمبر جولائی ۱۹۶۰ء
۱۹۳	صحفۂ شعرائے سری نگر	" "	اگست ستمبر ۱۹۶۱ء
۱۹۴	خیر مقدمی رپورٹ محمد قلی قطب شاہ	"سب رس" حیدرآباد	محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری ۱۹۶۱ء
۱۹۵	مولوی محمد تقضل مرحوم	" "	مئی ۱۹۶۱ء
۱۹۶	انشائے فضائل خانی	" "	ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء
۱۹۷	دیوان محشری حیدرآبادی	" "	دسمبر ۱۹۶۱ء

نمبر	عنوان مضمون	نام رسالہ	صراحت اشاعت
۱۹۸	محمد قلی کی شاعری	"سب رس" حیدرآباد	محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری فروری ۱۹۶۲ء
۱۹۹	رسا جاودانی	دوماہی "شیرازہ" سری نگر	جنوری ۱۹۶۲ء
۲۰۰	قدیم اردو ادب کی تازہ تحقیق	〃	مارچ 〃
۲۰۱	اردو کی ابتدا	مجلہ اردوئے معلی" دہلی	لسانیات نمبر ۱۹۶۲ء
۲۰۲	حضرت امجد حیدرآبادی	"سب رس" حیدرآباد	امجد نمبر مئی جون 〃
۲۰۳	پروفیسر محمد عبدالرحمن خاں مرحوم	〃	اگست 〃
۲۰۴	مولانا روم اور علامہ اقبال	سہ ماہی" اردو نامہ" کراچی	جولائی تا ستمبر 〃
۲۰۵	یہ جو اردو زبان ہماری ہے !	"ہم قلم" کراچی	اکتوبر نومبر 〃

فہرست تصانیف و تالیفات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

نمبر	نام کتاب	موضوع	سن اشاعت	صفحات	طابع / ناشر
۱	رُوحِ تنقید	تنقید	بار اول ۱۹۲۵ء دوم ۲۷ء سوم ۳۱ء چہارم ۱۹۴۰ء	۲۹۰	مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد
۲	طلسمِ تقدیر	ناول	۱۹۲۶ء ۱۹۳۷ء	۸۰	شمس الاسلام پریس 〃
۳	تازیانہ	افسانہ	۱۹۲۷ء		
۴	تنقیدی مقالات	ادب	۱۹۲۷ء (تین ایڈیشن)	۴۹۶	〃 〃
۵	تین شاعر (میر، انیس اور مورس اسمتھ)	تنقید	۱۹۲۷ء		〃 〃
۶	محمود غزنوی کی بزمِ ادب	ادب	〃		
۷	اُردو شہ پارے	〃	۱۹۲۹ء	۳۵۶	مکتبۂ ابراہیمیہ 〃
۸	ہندوستانی فونی ٹکس (انگریزی)		۱۹۳۰ء		پیرس
۹	ہندوستانی لسانیات	لسانیات	۱۹۳۲ء	۱۶۰	شمس الاسلام پریس 〃
۱۰	قصۂ خوب ترنگ (بزبان فرانسیسی)	ادب	۱۹۳۳ء	۱۴۸	مطبوعہ پیرس
۱۱	عہدِ عجمانی میں اردو کی ترقی	〃	۱۹۳۴ء	-	-

نمبر	نام کتاب	موضوع	سن اشاعت	صفحات	طابع / ناشر
۱۲	تذکرۂ گلزار ابراہیم	تذکرہ	۱۹۳۲ء	۳۰۰	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۱۳	جواہر سخن	ادب	〃		
۱۴	فن انشا پردازی	〃	۱۹۳۵ء	۱۱۶	اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد
۱۵	مرقع سخن (جلد اول) باتصویر	تذکرہ	〃	۴۵۰	ادارۂ ادبیات اردو 〃
۱۶	متاع سخن (عزیز یار جنگ)	انتخاب کلام	〃	۱۲۶	〃 〃
۱۷	کیف سخن (رضی الدین حسن کیفی)	〃	〃	۱۲۲	〃 〃
۱۸	بادۂ سخن (احمد حسین مائل)	〃	〃	۱۲۸	〃 〃
۱۹	سیر گولکنڈہ (۲ - ایڈیشن)	افسانے	〃	۱۱۲	〃 〃
۲۰	گولکنڈے کے ہیرے	〃	۱۹۳۷ء	۱۲۶	اعظم اسٹیم پریس 〃
۲۱	مرقع سخن (جلد دوم) باتصویر	تذکرہ	〃	۴۳۲	ادارۂ ادبیات اردو 〃
۲۲	فیض سخن (میر شمس الدین محمد فیض)	انتخاب کلام	〃	۱۴۴	〃 〃
۲۳	محرم نامہ	ادب	۱۹۳۸ء	۱۱۲	〃 〃
۲۴	روح غالب	〃	۱۹۳۹ء	۱۷۵	〃 〃
۲۵	سرگزشت غالب	تذکرہ	〃	۶۴	〃 〃
۲۶	مکتوبات بشاد عظیم آبادی	مکاتیب	〃	۲۹۷	〃 〃
۲۷	اردو کے اسالیب بیان	ادب	تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۰ء	۱۲۸	〃 〃
۲۸	سلطان محمد قلی قطب شاہ (باتصویر)	سوانح ادب	۱۹۴۰ء	۵۰۰	
۲۹	کلیات محمد قلی قطب شاہ	کلام	〃	۱۰۶۸	مجلس اشاعت دکنی مخطوطات سالار جنگ۔ حیدرآباد
۳۰	ہندوستانی موسیقی	صوتیات		۱۲۸	
۳۱	عمارستان دناسی	ادب	۱۹۴۱ء (دوسرا ایڈیشن)		بار اول ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد بار دوم ادارۂ ادبیات اردو
۳۲	دیوان زادہ حاتم	〃			
۳۳	تاریخ ادب اردو	ادب	چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۲ء	۱۲۸	ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد
۳۴	میر محمد مومن (باتصویر)	سوانح	بار اول ۱۹۴۲ء بار دوم ۱۹۵۸ء	۳۱۰	〃 〃
۳۵	تذکرۂ اردو مخطوطات ادارہ	تذکرہ	جلد اول ۱۹۴۳ء	۳۹۶	〃 〃
۳۶	〃 〃	〃	جلد دوم ۱۹۵۱ء	۱۸۰	〃 〃

سب رس ـــــــ ـــــــ ـــــــ

تبصرہ

"شیرازہ" زورؔ نمبر

"شیرازہ" جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ کنگلوجیز سری نگر (کشمیر) کا دو ماہی رسالہ ہے جس کا زورؔ نمبر اس وقت زیر تبصرہ ہے جہاں تک اس کے ظاہری حسن کا تعلق ہے، شیرازہ سلیقہ اور ستھرے ذوق کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی ترتیب اور اس کو صحیح معنوں میں ایک سنجیدہ علمی اور ادبی رسالہ کی شرائط پر پورا اتارنے میں اس کے ایڈیٹر محمد یوسف ٹینگ نے جو محنت کی ہے اس کے لئے وہ توصیف اور ستائش کے مستحق ہیں۔

شیرازہ" کا یہ خاص نمبر ان مضامین پر مشتمل ہے جو زورؔ صاحب کے احباب، معاصر ادیب اور شاعر، ان کے شاگرد اور رفقائے کار نے لکھے ہیں۔ ان مضامین میں زورؔ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے خلوص اور محبت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور جہاں تک زورؔ صاحب کی علمی اور ادبی شخصیت کا تعلق ہے، ان مضامین میں بہت کچھ مواد مہیا کیا گیا ہے۔ اس شمارہ میں جتنے مضامین ہیں ان میں زورؔ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر انہی لوگوں نے قلم اٹھایا ہے جن کو زورؔ صاحب کی شخصیت کے کسی ایک خاص پہلو سے زیادہ نسبت رہی ہے۔ یوں تو زورؔ صاحب پر دکن کے لکھنے والوں میں جن میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر مغنی شوکت، اکبرالدین صدیقی وغیرہ کے مضامین خاصے ہیں لیکن وہ مضامین جو زورؔ صاحب کے کشمیری شاگرد اور شریک کار جیسے مخمور حسین بدخشی، قاضی غلام محمد، حامدی کاشمیری اور عبدالاحد رفیق وغیرہ نے لکھے ہیں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زورؔ صاحب خود جتنے بڑے تھے اپنے ساتھیوں، شاگردوں اور رفیقوں کو بھی اتنا ہی بڑا بنانا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ کشمیر پہونچتے ہی انھوں نے کشمیری مضمونوں کو اردو دنیا سے روشناس کروانے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ اس کو عملاً پورا بھی کیا۔

زورؔ صاحب پر بہ حیثیت استاد شاید مخمور بدخشی کے علاوہ ان کے کسی شاگرد نے کچھ نہیں لکھا۔ اسی حیثیت سے مخمور بدخشی کا مضمون نہ صرف پہلا مضمون ہے بلکہ اپنی اوائی، اپنے خلوص اور سیرت نگاری کے نقطۂ نظر سے بڑا خوبصورت مضمون ہے۔ یہی حال حامدی" کاشمیری، قاضی غلام محمد، محمد صدیق صدیقی اور عبدالاحد رفیق کے مضامین کا ہے۔ ان میں زورؔ صاحب کی بڑائی کا اظہار محض اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ دنیا ان کو بڑا آدمی سمجھتی تھی اور ان کی بڑائی سے واقف تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے زورؔ صاحب کی بزرگی کا اندازہ اپنے طور پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تمام مضامین بے شک انتشار پروری کے اعلیٰ نمونے نہیں ہیں لیکن ان کی خوبی ان کے خلوص میں پوشیدہ ہے۔

اس شمارہ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان خطوط کو بھی شائع کیا ہے جو ڈاکٹر زورؔ نے ان کو مختلف اوقات میں لکھے۔

اس شمارہ کا سب سے دلچسپ حصہ یہ خطوط ہیں اور بلاشبہ اپنی بے پناہ سادگی اور بے ساختگی، خلوص اور بے تکلفی کی بنا پر یہ خطوط اردو ادب میں ایک نئی چیز ہیں۔ ان خطوط میں زورؔ صاحب نہ شاعر ہیں نہ ادیب، نہ محقق نہ مفروہ صرف ایک ایسے عام آدمی ہیں جو بزعم انشا پردازی معمولی واقعہ کو بھی "حادثہ" بنا دیتا ہے اور جن خطوط میں بجائے اپنی خود ساختہ ادبیت اور شعریت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جن حضرات کے پاس زورؔ صاحب کے خطوط موجود ہیں، ان کو ان کی اشاعت کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

حصہ نظم میں شاذ تمکنت اور جگن ناتھ آزاد قابل ذکر ہیں۔

نذیر محمد خاں

مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات کی کتابیں

گذشتہ شمارہ سب رس میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی کتابیں حاصل کرکے اس کی فروخت شروع کرے گا۔ ہم مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کتابیں حاصل کرلی ہیں اور ان کی فروخت شروع کردی ہے۔ فہرست ملاحظہ ہو۔

۱۔ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ:- مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ گولکنڈے کے پانچویں تاجدار اور اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) کے اردو کلام کا مجموعہ (۳۵۲) صفحات کا طویل مقدمہ ہے جس میں مرحوم نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کا کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ صفحات معہ تصاویر ایک ہزار ساڑھے سات قیمت (پندرہ روپے)

۲۔ کلیاتِ سراج:- مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ یہ سید شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے کل اردو اور فارسی کلام اور از منتخب بیجاپوری مرتبہ پروفیسر عبدالحق و سروری۔ یہ منظوم قصہ تمیم انصاریؓ کے نام سے مشہور ہے۔ تین سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے اس کا مصنف صنعتی عادل شاہی خاندان کے چھٹے حکمران محمد عادل شاہ کا معاصر تھا۔ یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے جس کی مرکزی شخصیت حضرت تمیم انصاریؓ ہیں۔ فاضل مرتب نے ۱۳۶ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ اصل قصہ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپے۔

۴۔ پھول بن:- (۱۰۷۶ھ) از ابن نشاطی مرتبہ پروفیسر سروری۔ ابن نشاطی گولکنڈہ کا باشندہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر ہے۔ اس کی تصنیف "پھول بن" صوری اور معنوی ہر اعتبار سے ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے اور اس زمانہ کی بہترین نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ (۱۹۱) صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں شاعر کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اصل قصہ کی بھی تشریح کردی ہے جس سے قصہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اصل کتاب (۱۷۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپے۔

۵۔ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال: (۱۰۳۵ھ) از غواصی مرتبہ میر سعادت علی رضوی امروہوی۔ ملا غواصی سلطان ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں شاعری کرتا رہا۔ لیکن اس کو دربارِ شاہی میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں اس کو شہرت نصیب ہوئی اور ملک الشعراء کے درجہ تک پہونچ گیا۔ یہ بہ حیثیت سفیر بیجاپور بھی روانہ کیا گیا تھا۔ اس کی تصنیفیں "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" بہت مشہور ہیں۔ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا مقدمہ ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے اور بقیہ کتاب کے ۱۷۹ صفحات ہیں قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۶۔ **طوطی نامہ** :- ۱۰۴۹ھ ، از غواصی مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ طوطی نامہ کی زبان بہ نسبت سیف الملوک کے سلیس ہے لیکن شاعرانہ خصوصیات کے لحاظ سے سیف الملوک کا اسلوب طوطی نامہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ ۱۳۴ صفحات کا مقدمہ ہے اور کتاب ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۷۔ **کلام الملوک** :- سلاطین دکن کا فارسی کلام۔ مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ سلاطین بہمنیہ۔ سلاطین عادل شاہیہ اور سلاطین قطب شاہیہ کا فارسی کلام کلام الملوک کے نام سے پیش کیا گیا ہے اور قارئین کی سہولت کے لئے ان خاندانوں کے شجرے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۸۔ **کلیات عبداللہ قطب شاہ** :- ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ ساتویں فرماں روا سلطان عبداللہ قطب شاہ کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد۔ بانی دیدہ ور آباد سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نواسے اور گولکنڈہ کے قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۹۔ **گلشن عشق** (۱۰۶۸ھ) :- از نصرتی مرتبہ پروفیسر سید محمد۔ یہ بیجاپور کے سب سے بڑے شاعر اور دربار علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے ملک الشعرا نصرتی کی مشہور عشقیہ مثنوی ہے جسمیں حسن، عشق اور رزم و بزم کے دلکش مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں نصرتی کے حالات زندگی اور اس کی تصانیف کے بارے میں بڑی تحقیقی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نیز اس کے شاعرانہ کمال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ فی جلد پانچ روپے۔

۱۰۔ **علی نامہ** :- از نصرتی۔ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ علی عادل شاہ ثانی کے دور کے حالات ہیں۔ یہ اردو کی بہترین رزمیہ مثنوی ہے۔ اور فاضل مرتب کے مقدمہ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے۔

۱۱۔ **مثنوی رضوان شاہ و روح افزا** :- تصنیف فائز ۱۰۹۴ھ۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد صاحب۔ یہ مثنوی فائز کی واحد ادبی یادگار ہے۔ فائز قطب شاہی خاندان کے آخری فرماں روا ابوالحسن تاناشاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ قصۂ رضوان شاہ و روح افزا فارسی نثر میں تھا۔ فائز نے اس کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی زبان سلیس اور شستہ ہے۔ یہ کتاب ۱۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی شریک ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ۔

۱۲۔ **مثنوی چندر بدن و مہیار** :- تصنیف مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری۔ مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ مقیمی سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے عمر کا بڑا حصہ بیجاپور میں گزارا گولکنڈہ اور احمد نگر میں بھی اس نے سفارتی خدمات انجام دی ہیں۔ چندر بدن و مہیار کا قصہ دکن میں ہر شخص کی زبان پر تھا۔ مقیمی نے اس کو اردو میں نظم کیا۔ مرتب نے ۴۰ صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب کے صفحات (۱۲۰) ہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

۱۳۔ **مثنوی تصویر جاناں** :- تصنیف لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی ۱۱۸۵ھ۔ مرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد۔ شفیق کی سب سے زیادہ اہم مثنوی تصویر جاناں ہے۔ شفیق نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے مشہور شاعر تھے۔ مرتب نے ۴۰ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ مثنوی (۶۹) صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۱۴۔ **پنچھی باچھا** (۱۱۴۶ھ) :- از وجدی مرتبہ پروفیسر سید محمد۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ دکن کی قدیم کتابوں میں بہت ہی مقبول کتاب ہے۔ شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ ہے جسمیں وجدی کی ادبی خدمات پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد ۲۳ اے پی

The

SABRAS

ZORE NUMBER

1963

Organ Of The Idara

Idara - e - Adabiyat - e - Urdu Aiwan - e - Urdu.

Khairatabad - HYDERABAD A. P.